جنوری 2010

دُنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

دو سلسلے وار تحریریں

سحر زادی۔ کارواں

اسلم راہی کی تاریخی کہانی

فتح کا دیوتا

ایم اے راحت کا معاشرتی ناول

انوکھی داستان

عنوان	مصنف	صفحہ	تعارف
باتیں آپ سے	مدیر	10	قارئین کے محبت نامے، گزشتہ شمارے پر تبصرہ اپنی پسند...... چاہتیں، مدیر کے نام......! آپ کی آراء، پسند......ناپسند مشورے
فتح کا دیوتا	اسلم راہی	12	اس تاریخی کہانی میں آپ کو جہاں جنگوں کا احوال ملے گا، وہیں محبت کی لازوال داستان بھی نظر آئے گی۔ تاریخ کے اوراق سے
زہر	احمد صغیر صدیقی	48	ہیری کی کہانی پر شک کی کوئی گنجائش نہ تھی اور کسی کریٹ کے لیے اس طرح کا عمل ناقابل قیاس بھی نہ تھا۔ایک غیر ملکی کہانی
قصہ تمام	ایم الیاس	59	رسولی دو میل پر واقع تھا اور کشتی اس فاصلے کو ایک گھنٹے سے پہلے طے نہیں کرسکتی تھی۔ رسولی کم چوڑا اور لمبوترا جزیرہ تھا۔
سحر زادی	سبحان راشد	72	بعض اوقات انسان کی زندگی ایسے ایسے موڑ اختیار کرتی ہے کہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے۔ ایک حوصلہ مند نوجوان کی داستان
انجان	محمد صدیق طاہر	99	محبت کی نرم کونپلیں پتھر ایسے دلوں میں بھی پھوٹ پڑتی ہیں ایک سخت گیر شخص کی تصویر کشی جو خود اپنے حال دل سے ناواقف تھا۔
آخری وار	طارق حفیظ	105	یہ سنتے ہی خاموش فضا میں بہ یک وقت دو گولیاں چلنے کی آواز گونجی۔ دونوں بوڑھوں نے ایک ساتھ فائر کیا تھا۔ایک دلچسپ تحریر
ساکھ	عابد علی سید	109	خالہ جین بال روم کے دروازے پر کھڑی ہوئی مہمانوں کا انتظار کرتی رہیں وقت گزرتا رہا۔ ملازم کن انکھیوں سے دیکھنے لگے۔
تعارف	حسن علی خان	112	وہ ابھی گفتگو کر رہی تھیں کہ ایک مردانہ آواز نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہارے کولھے کی ہڈی ٹوٹنے پر بہت افسوس ہے"
داؤ	کبیر احمد صدیقی	117	وہ رونالڈ کے ساتھ پوکر کھیلنے بیٹھا تو اس کا ذہن ابھی پانچ ہزار ڈالروں میں الجھا ہوا تھا۔ رونالڈ نے جب یہ محسوس کیا کہ اس کی توجہ......!
ماضی کے فرار	کرم الٰہی	121	اس کی نگاہ پیلی رنگت والے ایک لمبے آدمی پر جم کر رہ گئی۔اس آدمی کے پورے جسم پر چھوٹے چھوٹے بال اگے ہوئے تھے اور......!
میٹھی آگ	ایس اے ہاشمی	127	نیلم کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ حالات نے اسے زندگی کے کس نازک موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔
کارواں	ایم اے راحت	162	وہ ایک وقتی دستور رکھتا تھا، وہ تجربے کار تھا، مگر معاشرے نے اسے بہت کچھ سکھا دیا۔ زندگی کے مسافر کی تلخ و شیریں داستان
چٹھی رساں	آغا بابر	191	آہستہ آہستہ گلاب دین کو سب کے اندرون خانہ کا حال معلوم ہوتا چلا گیا۔ مثلاً یہ کشادہ مکان جس میں بدرو اور قدرو رہتی تھیں۔
قالین	مختار مسعود	206	وہ جیلر کے دفتر میں پہنچی تو اسے کچھ دیر ایک طرف بیٹھ کر بدمزاجی کا ایسا مظاہرہ دیکھنا پڑا کہ وہ مایوس ہوگئی۔ ادب سے انتخاب
داغ	قاضی عبدالستار	211	بیوی کا خیال آتے ہی ایک لالٹین سی جلنے لگی اور قلعی کی ہوئی سفید اینٹوں کی دیوار پر ایک سایہ تھرتھرانے لگا، جس کے گیسو لرز رہے تھے۔
دو تھکے ہوئے آدمی	معین نظامی	214	لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ وہ ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی بن گئے۔ وہ ایک دوسرے کا سامنا کیوں نہیں کرسکتے۔
پابریدہ	موپساں / ڈاکٹر مرتضٰی عادل	219	مادام مارا ایمیل غور و فکر کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔اس نے ایک عرصہ تک اس شخص کے تابناک مستقبل کے سہانے سپنے دیکھے تھے۔
ڈیڑھ ہاتھ	غلام دستگیر ربانی	223	وہ دونوں بت بنے بیٹھے تھے اور ان کے پاؤں ایک ایک انچ زمین میں دھنسے ہوئے۔ یہ کوئی اور ہی لمحہ تھا۔
معمولی سی بات	دانش کمال	226	دوسری صبح جب سورج نے اپنا چہرہ زمین کے کنارے سے آدھا ہی نکالا تو میرے جی میں آئی کہ ابھی اٹھ کر دفتر روانہ ہو جاؤں۔
الجھاؤ	ہما صفدر	232	عمران اور اس کی امی سے ملنے کے لیے میں اپنے کمرے سے باہر نہیں آنا چاہتی تھی پھر اس سے مل کر میں کرتی بھی کیا۔
سازشی	سیما کاجل	245	تینوں خالاؤں کی اب تک شادیاں نہیں ہوئی تھیں۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ سب سے بڑا سبب تو ممانی تھیں۔
درماندہ	صائمہ کاردار	256	میں ڈرتا تھا کہ یہ بات رضیہ کو معلوم ہوگئی تو کیا ہوگا۔ وہ یقیناً مجھ سے طلاق لے لے گی اور جمیلہ کا عشق فاش بھی کردے گا۔
انوکھی داستان	ایم اے راحت	264	دو تین دن گزر گئے۔ اس دوران فائزہ نے قصبہ نوید آباد جاکر فیکٹری کا چارج سنبھال لیا۔ جمشید یاور بیگ کا خاص آدمی تھا اور......!

❖ جنوری 2010ء ❖ قیمت 35 روپے ❖ جلد 39 ❖ شمارہ 9

آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37 اردو بازار، کراچی

قارئین محترم — سلام مسنون!

سال کا پہلا شمارہ حاضر ہے۔ ملک کی صورت حال بہت ہی دگرگوں ہے۔ بہت سے معاملات میں تو یوں لگتا ہے کہ کسی کی کوئی توجہ ہی نہیں ہے۔ قانون اور اخلاقیات کا شیرازہ بکھیرا جا رہا ہے۔ حالات کیا اور کیسے کروٹ لیں گے' اس کے بارے میں کچھ بھی حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ کسی کے بارے میں کچھ کہنا صرف دل کے پھپھولے پھوڑنے کے مترادف ہی ہوگا...... لہٰذا صرف پرچے کے متعلق بات کرتے ہیں۔ اس ماہ نئی سلسلے وار تحریر ''سحر زادی'' کی دوسری قسط حاضر ہے۔ اس کے بارے میں آپ کی رائے اچھی ہے' بقول قارئین کے آگے چل کر ہی صورت حال واضح ہوگی۔ تاریخی اوراق میں اسلم راہی کی ''فتح کا دیوتا'' پسند کی جا رہی ہے۔ دیگر تحریریں بھی شامل ہیں' جن پر آپ حضرات کی رائے کا انتظار رہے گا۔ آیئے اب اپنی محفل میں چلتے ہیں۔

......عزیز الدین بدر بہاولنگر سے اپنے خط میں دسمبر کے عمران ڈائجسٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس شمارے میں سلسلہ وار تاریخی کہانی اسلم راہی کی ''فتح کا دیوتا'' نئی سلسلے وار تحریر سبحان راشد کی ''سحر زادی'' اور ایم اے راحت کی ''کارواں'' بہت اچھی ہیں۔ ان کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ''طاؤسی'' ایم الیاس کی ''جال'' نورافروز کی ''پیش کش'' محمد صدیق طاہر کی ''حسن مطلع'' حسن علی خان کی ''رخنہ'' طارق حفیظ کی ''پرستار'' سیما کاجل کی ''لواسٹوری'' ایس اے ہاشمی کی ''مسافر'' نوازش شاہین کی ''بے مہار قاتل'' آغا دلاور کی ''یہ دُنیا'' ادب سے انتخاب میں سے آغا بابر کی ''دل کی بستی'' دانش کمال کی ''مطمئن زندگی کا راز'' یونس پٹیالوی کی ''میں چپ رہوں گی'' اختر جمال کی ''خالہ'' محمد تقی کی ''شگون'' الطاف فیروز کی ''کفن دفن'' حساس و دلگداز بچی کہانیوں میں ہما صفدر کی ''دم'' اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ''ہمراز'' جاندار تھیں۔

......راولپنڈی سے معین احمد کہتے ہیں کہ دسمبر کے شمارے میں سلسلہ وار تاریخی کہانی اسلم راہی کی ''فتح کا دیوتا'' نئی سلسلے وار تحریر سبحان راشد کی ''سحر زادی'' اور ایم اے راحت کی ''کارواں'' بہت اچھی ہیں۔ ان کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ''طاؤسی'' ایم الیاس کی ''جال'' نورافروز کی ''پیش کش'' محمد صدیق طاہر کی ''حسن مطلع'' حسن علی خان کی ''رخنہ'' طارق حفیظ کی ''پرستار'' سیما کاجل کی ''لواسٹوری'' ایس اے ہاشمی کی ''مسافر'' نوازش شاہین کی ''بے مہار قاتل'' آغا دلاور کی ''یہ دُنیا'' ادب سے انتخاب میں سے آغا بابر کی ''دل کی بستی'' دانش کمال کی ''مطمئن زندگی کا راز'' یونس پٹیالوی کی ''میں چپ رہوں گی'' اختر جمال کی ''خالہ'' محمد تقی کی ''شگون'' الطاف فیروز کی ''کفن دفن'' حساس و دلگداز بچی کہانیوں میں ہما صفدر کی ''دم'' اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ''ہمراز'' اچھی تھیں۔

......لاہور سے شوکت علی لکھتے ہیں کہ دسمبر کا شمارہ بہترین تحریروں کی وجہ سے بہت پسند آیا۔ اس ماہ کی پسندیدہ تحریروں میں سلسلہ وار تاریخی کہانی اسلم راہی کی ''فتح کا دیوتا'' نئی سلسلے وار تحریر سبحان راشد کی ''سحر زادی'' اور ایم اے راحت کی ''کارواں'' بہت اچھی ہیں۔ ان کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ''طاؤسی'' ایم الیاس کی ''جال'' نورافروز کی ''پیش کش'' محمد صدیق طاہر کی ''حسن مطلع'' حسن علی خان کی ''رخنہ'' طارق حفیظ کی ''پرستار'' سیما کاجل کی ''لواسٹوری'' ایس اے ہاشمی کی ''مسافر'' نوازش شاہین کی ''بے مہار قاتل'' آغا دلاور کی ''یہ دُنیا'' ادب سے انتخاب میں سے آغا بابر کی ''دل کی بستی'' دانش کمال کی ''مطمئن زندگی کا راز'' یونس پٹیالوی کی ''میں چپ رہوں گی'' اختر جمال کی ''خالہ'' محمد تقی کی ''شگون'' الطاف فیروز کی ''کفن دفن'' حساس و دلگداز بچی کہانیوں میں ہما صفدر کی ''دم'' اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ''ہمراز'' شامل ہیں۔

......محمد طاہر، ملتان کینٹ سے لکھتے ہیں۔ اس ماہ مجھے سب سے زیادہ سلسلہ وار تاریخی کہانی اسلم راہی کی ''فتح کا دیوتا'' نئی سلسلے وار تحریر سبحان راشد کی ''سحر زادی'' اور ایم اے راحت کی ''کارواں'' بہت اچھی ہیں۔ ان کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ''طاؤسی'' ایم الیاس کی ''جال'' نورافروز کی ''پیش کش'' محمد صدیق طاہر کی ''حسن مطلع'' حسن علی خان کی ''رخنہ'' طارق حفیظ کی ''پرستار'' سیما کاجل کی ''لواسٹوری'' ایس اے ہاشمی کی ''مسافر'' نوازش شاہین کی ''بے مہار قاتل'' آغا دلاور کی ''یہ دُنیا'' ادب سے انتخاب میں سے آغا بابر کی ''دل کی بستی'' دانش کمال کی ''مطمئن زندگی کا راز'' یونس پٹیالوی کی ''میں چپ رہوں گی'' اختر جمال کی ''خالہ'' محمد تقی کی ''شگون'' الطاف فیروز کی ''کفن دفن'' حساس و دلگداز بچی کہانیوں میں ہما صفدر کی ''دم'' اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ''ہمراز'' پسند آئیں۔

......اسلام آباد سے ارشد علی امجد لکھتے ہیں کہ دسمبر کا عمران ڈائجسٹ پڑھا' اردو ادب سے انتخاب خوب تھا۔ دیگر تحریروں میں سلسلہ وار تاریخی کہانی اسلم راہی کی ''فتح کا دیوتا'' نئی سلسلے وار تحریر سبحان راشد کی ''سحر زادی'' اور ایم اے راحت کی ''کارواں'' بہت اچھی ہیں۔ ان کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ''طاؤسی'' ایم الیاس کی ''جال'' نورافروز کی ''پیش کش'' محمد صدیق طاہر کی ''حسن مطلع'' حسن علی خان کی ''رخنہ'' طارق حفیظ کی ''پرستار'' سیما کاجل کی ''لواسٹوری'' ایس اے ہاشمی کی ''مسافر'' نوازش شاہین کی ''بے مہار قاتل'' آغا دلاور کی ''یہ دُنیا'' ادب سے انتخاب میں سے آغا بابر کی ''دل کی بستی'' دانش کمال کی ''مطمئن زندگی کا راز'' یونس پٹیالوی کی ''میں چپ رہوں گی'' اختر جمال کی ''خالہ'' محمد تقی کی ''شگون'' الطاف فیروز کی ''کفن دفن'' حساس و دلگداز بچی کہانیوں میں ہما صفدر کی ''دم'' اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ''ہمراز'' پسند آئیں۔

......نسیم انور صاحب کوئٹہ سے رقم طراز ہیں کہ اس ماہ کی کہانیوں میں سلسلہ وار تاریخی کہانی اسلم راہی کی ''فتح کا دیوتا'' نئی سلسلے وار تحریر سبحان راشد کی ''سحر زادی'' اور ایم اے راحت کی ''کارواں'' بہت اچھی ہیں۔ ان کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ''طاؤسی'' ایم الیاس کی ''جال'' نورافروز کی ''پیش کش'' محمد صدیق طاہر کی ''حسن مطلع'' حسن علی خان کی ''رخنہ'' طارق حفیظ کی ''پرستار'' سیما کاجل کی ''لواسٹوری'' ایس اے ہاشمی کی ''مسافر'' نوازش شاہین کی ''بے مہار قاتل'' آغا دلاور کی ''یہ دُنیا'' ادب سے انتخاب میں سے آغا بابر کی ''دل کی بستی'' دانش کمال کی ''مطمئن زندگی کا راز'' یونس پٹیالوی کی ''میں چپ رہوں گی'' اختر جمال کی ''خالہ'' محمد تقی کی ''شگون'' الطاف فیروز کی ''کفن دفن'' حساس و دلگداز بچی کہانیوں میں ہما صفدر کی ''دم'' اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ''ہمراز'' اچھی تھیں۔

......کوٹری سے عزیز احمد اپنے محبت نامے میں لکھتے ہیں کہ عمران ڈائجسٹ کے دسمبر کے شمارے میں سلسلہ وار تاریخی کہانی اسلم راہی کی ''فتح کا دیوتا'' نئی سلسلے وار تحریر سبحان راشد کا ''سحر زادی'' اور ایم اے راحت کی ''کارواں'' بہت اچھی ہیں۔ ان کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ''طاؤسی'' ایم الیاس کی ''جال'' نورافروز کی ''پیش کش'' محمد صدیق طاہر کی ''حسن مطلع'' حسن علی خان کی ''رخنہ'' طارق حفیظ کی ''پرستار'' سیما کاجل کی ''لواسٹوری'' ایس اے ہاشمی کی ''مسافر'' نوازش شاہین کی ''بے مہار قاتل'' آغا دلاور کی ''یہ دُنیا'' ادب سے انتخاب میں سے آغا بابر کی ''دل کی بستی'' دانش کمال کی ''مطمئن زندگی کا راز'' یونس پٹیالوی کی ''میں چپ رہوں گی'' اختر جمال کی ''خالہ'' محمد تقی کی ''شگون'' الطاف فیروز کی ''کفن دفن'' حساس و دلگداز بچی کہانیوں میں ہما صفدر کی ''دم'' اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ''ہمراز'' اچھی تھیں۔

......عبدالخالق آرائیں، فیصل آباد سے اپنے محبت نامے میں لکھتے ہیں کہ دسمبر کے شمارے میں سلسلہ وار تاریخی کہانی اسلم راہی کی ''فتح کا دیوتا'' نئی سلسلے وار تحریر سبحان راشد کی ''سحر زادی'' اور ایم اے راحت کی ''کارواں'' بہت اچھی ہیں۔ ان کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ''طاؤسی'' ایم الیاس کی ''جال'' نورافروز کی ''پیش کش'' محمد صدیق طاہر کی ''حسن مطلع'' حسن علی خان کی ''رخنہ'' طارق حفیظ کی ''پرستار'' سیما کاجل کی ''لواسٹوری'' ایس اے ہاشمی کی ''مسافر'' نوازش شاہین کی ''بے مہار قاتل'' آغا دلاور کی ''یہ دُنیا'' ادب سے انتخاب میں سے آغا بابر کی ''دل کی بستی'' دانش کمال کی ''مطمئن زندگی کا راز'' یونس پٹیالوی کی ''میں چپ رہوں گی'' اختر جمال کی ''خالہ'' محمد تقی کی ''شگون'' الطاف فیروز کی ''کفن دفن'' حساس و دلگداز بچی کہانیوں میں ہما صفدر کی ''دم'' اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ''ہمراز'' بہت اچھی تھیں۔

......ڈاکٹر احمد حسین لکھتے ہیں کہ اس ماہ سلسلہ وار تاریخی کہانی اسلم راہی کی ''فتح کا دیوتا'' نئی سلسلے وار تحریر سبحان راشد کی ''سحر زادی'' اور ایم اے راحت کی ''کارواں'' بہت اچھی ہیں۔ ان کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ''طاؤسی'' ایم الیاس کی ''جال'' نورافروز کی ''پیش کش'' محمد صدیق طاہر کی ''حسن مطلع'' حسن علی خان کی ''رخنہ'' طارق حفیظ کی ''پرستار'' سیما کاجل کی ''لواسٹوری'' ایس اے ہاشمی کی ''مسافر'' نوازش شاہین کی ''بے مہار قاتل'' آغا دلاور کی ''یہ دُنیا'' ادب سے انتخاب میں سے آغا بابر کی ''دل کی بستی'' دانش کمال کی ''مطمئن زندگی کا راز'' یونس پٹیالوی کی ''میں چپ رہوں گی'' اختر جمال کی ''خالہ'' محمد تقی کی ''شگون'' الطاف فیروز کی ''کفن دفن'' حساس و دلگداز بچی کہانیوں میں ہما صفدر کی ''دم'' اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ''ہمراز'' بہترین تھیں۔ دسمبر کا شمارہ مجموعی طور پر بہترین تھا۔

قارئین آئندہ ماہ تک کے لیے اجازت — اللہ حافظ — مُدیر

فتح کا دیوتا

اسلم راہی

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے دور میں
سب سے زیادہ سازشیں ہوئی ہیں' اس کا اہم سبب جہاں اختیارات'
اقتدار اور دولت رہی ہے' وہیں عورت بھی ہے جو اس معاملے میں اہم
حیثیت کی حامل ہے۔ اچھے برے ہر دور' ہر مذہب اور ہر دور میں
موجود رہی ہیں۔ اسلامی مملکتوں کے استحکام کے لیے مذہب
پر کاربند سپہ سالاروں اور جنگ جو سپاہیوں نے اہم کردار ادا
کیا۔ زیر نظر طویل تاریخی' کہانی میں آپ کو جہاں
جنگوں کا احوال ملے گا' وہیں محبت
کی لازوال داستان بھی نظر آئے گی۔
مسلمان حکمرانوں نے اپنی مملکت کو مضبوط کرنے کے لیے کن کن امور پر
توجہ دی اور اسے کمزور کرنے کے لیے سازشی عناصر نے کیا کیا جتن کیے۔

مسلمان حکمرانوں کا احوال' تاریخی حقائق' طویل داستان

اس کی ماں بنارہ اور بہن روجینا نے جزیرہ نربس میں قیام کیا ہوا تھا وہاں یونانیوں کے علاوہ قسطنطنیہ سے بھاگے ہوئے لشکریوں فرانسیسیوں اور بحری قزاقوں کے کئی گروہوں نے ایک خاصی بڑی عسکری قوت جمع کر لی تھی اور وہ اس تیاری میں تھے کہ مسلمان کو نقصان پہنچانا شروع کریں ان کی سمندری ناکہ بندی کر دیں اور پھر آہستہ آہستہ قسطنطنیہ پر چھاپے مارنے کی ابتداء کر دیں۔

جزیرہ نربس میں اب سلطان کے خلاف دشمن کی سرگرمیاں بڑے عروج پر آ گئی تھیں۔

ایک روز روجینا اپنے گھر سے نکلی شاید وہ کسی کام کے سلسلے یا کوئی چیز خریدنے کے لیے بازار کا رخ کرنے والی تھی۔ وہ اپنے گھر سے چند قدم ہی دور گئی ہوگی کہ اچانک پیچھے سے کسی نے اسے پکارا۔

''خاتون محترم! سنیے۔''

روجینا رک گئی جب اس نے لڑ کر دیکھا تو ایک مسلح جوان جس کے گلے میں صلیب لٹک رہی تھی اس کے قریب آیا اسے دیکھ کر روجینا لرز کانپ گئی تھی۔ کہ شاید وہ اس کو نقصان پہنچائے وہ قریب آیا اور بڑی اپنائیت اور ملائمت میں روجینا کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ''میری بہن آپ کہاں جا رہی ہیں۔''

لفظ بہن پر روجینا چونکی بھی تھی اور اسے کسی قدر سکون بھی ہوا تھا کہ شاید وہ نوجون اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا اس پر روجینا نے کچھ سوچا اور اس کی طرف گھورنے کے انداز میں کہنے لگی۔

''تم کون ہو اور تم نے مجھے آواز دے کر کیوں روکا ہے۔'' اس پر وہ نوجوان مسکرا دیا کہنے لگا۔

''آپ کو اس سے غرض نہیں کہ میں کون ہوں میں جانتا ہوں آپ کا نام روجینا ہے آپ کی ماں کا نام نبارہ اور آپ کے بھائی کا نام کارلوس ہے کیا میری طرف سے آپ کو اطمینان دلانے کے لیے یہی کافی نہیں کہ میں آپ کو بہن کہہ کر مخاطب کر رہا ہوں۔''

روجینا نے اس بار پھر اس کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''آخر تم چاہتے کیا ہو۔''

اس پر وہ نوجوان پھر ملائمت اور نرمی میں کہنے لگا۔ ''آپ یوں بازار نہیں جا سکتیں۔''

''کیا مطلب ......!'' اپنے دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھتے ہوئے اور گھورتے ہوئے روجینا نے اس سے کہا تھا۔

اس پر وہ نوجوان پھر بولا اور کہنے لگا۔

''آپ کا چہرہ ننگا ہے اس کے علاوہ آپ کا اکیلے بازار جانا آپ کے لیے خطرناک ہے کوئی آپ کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔''

''تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو تم ہو کون اور کیوں مجھ سے ایسی ہمدردی کی گفتگو کرنا چاہتے ہو۔'' اس پر وہ نوجوان پھر بولا اور کہنے لگا۔

''روجینا خاتون بھول جائیں میں آپ کے محافظوں میں سے ایک ہوں اور اس حالت میں میں آپ کو بازار نہیں جانے دوں گا بلکہ آپ یہیں سے واپس اپنے گھر جائیں میں آپ کو بتاؤں کہ اس وقت جزیرہ نربس میں حالات بڑے خراب ہو رہے ہیں اگر بازار میں کوئی آپ سے الجھ گیا کسی نے آپ کو اٹھا لیجانے کی کوشش کی تو ظاہر ہے میں اس سے الجھوں گا اسے ایسا نہیں کرنے دوں گا اور جب ایسا ہوگا تو آپ کی اور میری یعنی دونوں بہن بھائی کی جان خطرے میں پڑ جائے گی لہٰذا میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ یہیں سے لوٹ کر اپنے گھر چلی جائیں میں کون ہوں اس سے متعلق مت پوچھیے گا جیسے کہ میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ میں آپ کے محافظوں میں سے ہوں اس کا مطلب ہے آپ کے یہاں اور بھی محافظ ہیں اور وہ بھی یہاں اردگرد ہی کھڑے ہیں کہاں ہیں آپ کو دکھائی نہیں دے رہے ہوں گے اوٹ میں ہیں بس آپ واپس چلیے اور گھر جا کر آرام کیجیے ان دنوں ہرگز بازار نہ جایئے گا اس لیے کہ جزیرہ نربس میں اس وقت مختلف عسکری قوتیں جمع ہو چکی ہیں اور ان عسکری قوتوں کے سامنے کسی بھی خوب صورت اور نوجوان لڑکی کی عزت اور آبرو محفوظ نہیں ہے اس بناء پر میں آپ سے کہتا ہوں گھر لوٹ جائیں۔''

اس نوجوان کی گفتگو سے روجینا خاصی متاثر ہوئی تھی آگے بڑھنے کے بجائے وہ پلٹی اور اپنے گھر کی طرف ہولی گھر کے دروازے پر اس نے دیکھا تو وہ نوجوان پہلے تو اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا لیکن اب نجانے وہ کدھر چلا گیا تھا۔

روجینا جب گھر میں داخل ہوئی اور جب وہ اس کمرے میں داخل ہوئی جس میں اس کی ماں نبارہ بیٹھی ہوئی تھی اسے دیکھتے ہی نبارہ بول اٹھی۔

''بیٹی تم تو بازار گئی تھیں اتنی جلدی لوٹ آئی ہو اور آئی بھی خالی ہاتھ کیا بات ہے۔'' اس پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے روجینا آگے بڑھ کر اپنی ماں کے پہلو میں بیٹھ گئی پھر دھیمے لہجے اور حیرت سے انداز میں کہنے لگی۔ ''اماں مجھے راستے میں ایک حادثہ پیش آ گیا جس کی بناء پر میں لوٹ آئی۔''

روجینا کی اس گفتگو سے نبارہ پریشان اور فکر مند ہو گئی تھی۔ ''کیسا حادثہ میری بیٹی۔'' اس پر روجینا نے راستے میں گفتگو کرنے والے اس نوجوان سے ملاقات کی تفصیل کہہ دی تھی۔

روجینا جب خاموش ہوئی تب نبارہ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''میری بیٹی اس کا مطلب ہے وہ نوجوان ہمارے مخلصوں میں سے ایک ہے میری بیٹی اس نے تجھے بہن کہہ کر مخاطب کیا اور اس نے تمہیں جو مشورہ دیا وہ تمہاری سلامتی اور تمہاری بہتری بھلائی پر منحصر ہے لہٰذا میں یہ خیال کرتی ہوں کہ وہ شخص ہمارا مخلص ہے اور تمہیں یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اس جیسے یہاں ہمارے اور بہت سے محافظ بھی ہیں تو یہ سارا معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔''

نبارہ کی اس گفتگو کا جواب روجینا دینا ہی چاہتی تھی کہ عین اسی لمحہ دروازے پر دستک ہوئی تھی اس پر نبارہ اور روجینا چونکی تھیں نبارہ اٹھی اور کہنے لگی۔

''بیٹی تو بیٹھ میں دیکھتی ہوں دستک دینے والا کون ہے۔'' نبارہ نے جب اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے کارلوس تھا کارلوس جب اندر داخل ہوا نبارہ نے دروازہ بند کیا اور اسے مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''بیٹے تو کہاں چلا گیا تھا تو نے تو مجھے کہا تھا کہ میں ابھی آتا ہوں اور تجھے گئے کتنی دیر ہو گئی ہے تمہارے بعد روجینا کے ساتھ ایک حادثہ بھی پیش آیا ہے اس نے مجھے پریشان فکر مند بلکہ ایک طرح کی جستجو میں ڈال دیا ہے۔''

کارلوس اپنی ماں کے ساتھ اسی کمرے میں داخل ہوا جس میں روجینا بیٹھی ہوئی تھی اپنی بہن کے پاس بیٹھ گیا پھر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''اماں روجینا کو کیسا اور کون سا حادثہ پیش آیا۔'' جواب میں جو تفصیل روجینا نے نبارہ سے کہی تھی وہی نبارہ نے کارلوس سے کہہ دی تھی۔

کارلوس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ کہنے لگا۔ ''یہ تو بہت اچھا حادثہ ہے ایسے حادثات تو روز ہونے چاہیے ایسے بھائی کہاں ملتے ہیں ایسے محافظ کسی کو نصیب ہوتے ہیں۔'' کارلوس کے ان الفاظ پر غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے روجینا کہنے لگی۔

''بھائی آپ مذاق پر اترے ہوئے ہیں میں اور اماں دونوں سنجیدہ ہیں۔''

''میں بھی سنجیدہ ہوں۔'' کارلوس بہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''پر وہ محافظ تو اچھے

لوگ ہیں میں انہیں جانتا ہوں تم انہیں جانتے ہو۔'' روجینا نے تجسس بھرے انداز میں کارلوس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ لیا تھا۔

کارلوس جواب میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ نبارہ بھی بول اٹھی۔ ''اگر تم انہیں جانتے ہو تو بتاؤ بیٹے وہ کون ہیں۔'' کارلوس پھر مسکرایا کہنے لگا۔

''وہ ہمارے اپنے آدمی ہیں ہمارے محافظ ہیں ان سے متعلق پریشان اور فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔''

کارلوس کے خاموش ہو جانے پر روجینا اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہنے لگی۔

''پھر بھائی یہ تو بتاؤ وہ ہیں کون اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے مجھے جب مخاطب کیا تو مجھے بہن کہا گفتگو بھی بڑی اچھی کی اس کی آواز میں اپنائیت تھی اس کے بولنے کے انداز میں ایک خلوص تھا اپنائیت تھی پھر یہ تو پتا چلے کہ وہ ہیں کون۔''

روجینا کے اس سوال میں کارلوس تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا اس موقع پر وہ کافی سنجیدہ ہو گیا تھا اس کے بعد اس نے جھکی ہوئی گردن سیدھی کی ایک گہری نگاہ باری باری اس نے اپنی ماں اور بہن پر ڈالی اس کے بعد کارلوس اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''اماں آج پھر میں آپ دونوں پر ایک انکشاف کرنا چاہتا ہوں اور اس سے پہلے میں چاہتا ہوں آپ دونوں مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ مجھ سے ناراض نہیں ہوں گی۔''

کارلوس کے خاموش ہو جانے پر روجینا اکتائے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔

''بھائی یہ آپ کس قسم کی گفتگو کر رہے ہیں میں اور اماں تم سے کیوں ناراض ہوں گی آپ کے علاوہ میرے بھائی اس دنیا میں ہمارا ہے ہی کون میرے بھائی ہم تم سے ناراض ہوتی ہیں تو اس کا مطلب ہے ہم اپنے آپ سے ناراض ہوتے ہیں بھائی آپ جانتے ہیں اس سے پہلے بھی آپ نے ایک بار اسی قسم کی گفتگو کی تھی جب آپ خیرالدین سے مل کر آئے تھے کیا اس وقت میں اور اماں نے کوئی اعتراض کھڑا کیا تھا ہم دونوں میں سے کوئی آپ سے ناراض ہوا تھا آج بھی کہیں کیا معاملہ ہے میں اور اماں آپ سے کیوں ناراض ہوں گی۔''

روجینا کی اس گفتگو سے کارلوس کو کسی قدر حوصلہ ہوا تھا کچھ سوچا پھر بڑی آس اور امید بھرے انداز میں اپنی ماں نبارہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''اماں بات یہ ہے کہ میں اسلام قبول کر چکا ہوں۔'' کارلوس کے اس انکشاف پر نبارہ اور روجینا ایسی خاموش ہو گئی تھیں جیسے دونوں کو سانپ سونگھ گیا ہو کچھ دیر تک دونوں یونہی بیٹھی رہیں آخر گفتگو کا آغاز روجینا نے کیا اور کارلوس کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''اس میں ناراض ہونے کی کوئی بات نہیں اگر آپ اسلام قبول کر چکے ہیں تو ایسا کرنے کا آپ کو حق حاصل ہے کوئی دین یا مذہب کسی پر تھوپنا پاٹھونسا نہیں جا سکتا اگر آپ نے اس مذہب میں کوئی بہتری اور بھلائی دیکھی ہے تو میں سمجھتی ہوں آپ کا فیصلہ اچھائی پر مبنی ہے۔'' اس پر نبارہ بھی بول اٹھی کہنے لگی۔

''بیٹے تیرے اس فیصلے کے خلاف مجھے اور روجینا دونوں کو کوئی اعتراض نہیں ہے سن میرے بچے یہ بتا یہ معاملہ کیسے ہوا۔'' اس پر کارلوس کہنے لگا۔

''اماں میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں خیرالدین سے ملتا رہا ہوں اس کے پاس جاتے ہوئے اکثر و بیشتر میری اس کے دوستوں اور اس کے لشکر میں شامل مذہبی لوگوں سے بھی گفتگو ہوتی رہی اور انہی سے متاثر ہو کر میں نے اسلام قبول کر لیا ہے اماں آپ اور روجینا میری زندگی سرمایہ ہیں اپنے دل میں میرے لیے کوئی

میل نہ لائیے گا۔''

اس پر نبارہ اٹھی ہلکی سی ایک چپت اس نے کارلوس کو لگائی اور کہنے لگی۔ ''کیسی احمقانہ گفتگو کر رہے ہو میں اور نبارہ تمہارے لیے اپنے دل میں میل لائیں گی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

اپنی ماں کے ان الفاظ پر کارلوس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی بہرحال کارلوس نے اسلام قبول کر لیا تھا اور مورخین بھی وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ قسطنطنیہ کے شہنشاہ قسطنطین کے ایک پوتے نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

اس موقع پر روجینا نے کارلوس کو مخاطب کیا اور کہنے لگی۔

''بھائی قسطنطنیہ تو ختم ہو گیا اس ٹکراؤ میں ہمارا دادا بھی مر گیا بھائی قسطنطنیہ میں داخل ہونے کے بعد مسلمانوں نے وہاں کے لوگوں کا بڑا قتل عام کیا ہو گا لوٹ کھسوٹ کی ہو گی۔''

کارلوس مسکرایا اور کہنے لگا۔

''ہرگز نہیں کچھ بھی نہیں ہوا لوگ اپنی مرضی سے قسطنطنیہ نکل کر مختلف علاقوں کی طرف گئے ایسا ان لوگوں نے کیا جو مسلمانوں سے خوفزدہ تھے ورنہ زیادہ تر لوگ قسطنطنیہ میں ہی رہے بہرحال جو بھاگے بھاگے ان کے مکان حویلیاں خالی پڑی رہیں قسطنطنیہ اندر جو لشکر بچا تھا وہ بھی یہاں لزبیں کی طرف آ گیا ہے اس کے علاوہ جنیوا کا سپہ سالار جان عطیاس یونانی سپہ سالار ڈیوک فوکارس بھی اپنے لشکریوں کو لے کر یہاں پہنچ گئے ہیں اور قسطنطنیہ کے لشکریوں کا سپہ سالار اعلیٰ جسٹینائی جو قسطنطنیہ کی جنگ میں زخمی ہوا تھا وہ بھی اب ٹھیک ہو چکا ہے اور وہ بھی لزبس میں اپنے بچے کھچے لشکریوں کو منظم کر رہا ہے اور ان کی تنظیم درست کر رہا ہے اس لیے کہ انہیں یہ خبریں پہنچ چکی ہیں کہ سلطان کا ایک لشکر اب لزبیں کو اپنا ہدف بنائے گا میری بہن جہاں تک قسطنطنیہ کا سوال ہے تو وہاں کوئی قتل عام نہیں ہوا آیا صوفیہ کے بجائے سارے گرجوں اور کلیساؤں کو بحال رکھا گیا ہے آیا صوفیہ کو مسلمانوں کے سلطان نے بہرحال مسجد میں تبدیل کیا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں اس سے پہلے ان گنت نصرانی حکمران مسلمانوں کی مسجد کو کلیساؤں میں تبدیل کرتے رہے ہیں اور اگر مسلمانوں کے سلطان محمد نے ایسا کیا ہے تو یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں ہے۔''

کارلوس جب خاموش ہوا تب روجینا دکھ بھرے انداز میں کہنے لگی۔

''آخر مسلمانوں نے قسطنطنیہ پر حملہ کیوں کیا۔'' اس پر کارلوس مسکرایا اور کہنے لگا۔

''میری بہن یہ اب کی بات نہیں یہ طویل داستان ہے روجینا میری بہن جو سوال تم نے مجھ سے کیا ہے یہی میں نے خیرالدین سے بھی کیا تھا اس نے مجھے جو اس کی تفصیل بتائی تھی وہ کافی لمبی ہے اور میں سمجھتا ہوں اتنی لمبی تفصیل تم سننا پسند نہیں کرو گی۔''

اس پر روجینا نے نفی میں گردن ہلائی کہنے لگی۔

''کیوں سننا پسند نہیں کروں گی خیرالدین نے جو آپ سے کہا ہے مجھے بھی بتائیں تاکہ میں جان سکوں کہ اس طویل داستان میں کون کون سے کردار آتے ہیں اور کیا کیا اور کس کس نے زیادتیاں کی ہیں۔''

کارلوس سنبھل کر بیٹھا پھر اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اماں آپ بھی سنیں گی۔''

جواب میں نبارہ مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

''کیوں نہیں سنوں گی بیٹے کہو۔'' کارلوس نے کہنا شروع کیا۔

''روجینا میری بہن یہ چپقلش اسلام کے شروع دور سے ہی عمل میں آ گئی تھی جب قسطنطنیہ کے حکمران ہرکولیس نے مسلمانوں کو اپنا ہدف بنانا شروع کیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہرکولیس سے اس کے سارے شامی مقبوضاجات چھن گئے اس

کے بعد یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہا میری بہن مسلمانوں کے اندر دو بڑے خاندان شروع میں حکمران رہے ایک کو امول دوسرے کو عباسی کہتے ہیں امویوں کے عہد زوال میں رومنوں کو موقع مل گیا اور انہوں نے جگہ جگہ جوابی حملے شروع کر دیے اس کے بعد پھر دوسرے قبیلے بنو عباس کا دور شروع ہو گیا بنو عباس کو اندرونی استحکامات کی تکمیل میں کچھ وقت لگا رومنوں کے لیے یہ پیش قدمی کا بہترین موقع تھا لیکن رومنوں مسلمانوں سے ٹکراتے رہے ان کے مفادات کو نقصان پہنچاتے رہے آخر مسلمانوں کے ایک خلیفہ مہدی نے اپنے بیٹے ہارون الرشید کی سرکردگی میں قسطنطنیہ پر یورش کرنے کے لیے روانہ کیا اس وقت قسطنطنیہ سارس اور اس کی ماں ملکہ آئرن با اشتراک حکمرانی کے فرائض انجام دے رہے ہارون الرشید پیش قدمی کرتا ہوا اس کو تری یعنی اسکدار پہنچ گیا جو قسطنطنیہ کے سامنے ہے چنانچہ ملکہ آئرین نے خراب کا وعدہ کر کے صلح کر لی۔

اس موقع پر وہ معاملہ ٹل گیا اس کے بعد ہارون خود خلیفہ بن گیا ادھر ملکہ آئرین اور اس کے بیٹے میں اختلاف پیدا ہوئے آئرین نے بیٹے کی آنکھیں نکلوا دیں وہ فوت ہو گیا آئرین تنہا سلطنت کی مالک بن گئی اور ایک شخص نسی فورس جس کو تکفور بھی کہا گیا ہے اس کا خزانچی تھا۔

چنانچہ اسی نسی فورس نے بعض بلند پایہ کارکنان حکومت کو ساتھ ملا کر سازش کی آئرین کو تخت سے اتارا اور خود شہنشاہ بن گیا معذولی کے بعد آئرین نسی فورس کے سامنے پیش ہوئی تو اس نے نئے بادشاہ پر اس کی بدعہدی صاف صاف واضح کر دی اور ساتھ ہی یہ کہا۔

میں بہت سے انقلاب دیکھ چکی ہوں اب اس کے سواء کچھ نہیں چاہتی کہ کسی گوشے میں جا بیٹھوں اور عزت آرام کی زندگی بسر کروں۔

نسی فورس اس کے لیے معمولی گزارے کا انتظام بھی کرنے پر آمادہ نہ ہوا اور کہتے ہیں آئرین کی زندگی کے باقی ایام اسی جزیرے لزبیس میں بسر ہوئے جس میں اس وقت ہم بیٹھے ہوئے ہیں۔

نسی فورس کے متعلق لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ نسی فورس سے کئی زیادہ بڑے مجرم گزرے لیکن اپنی رعایا میں اس سے زیادہ گھراہا گیر تنفر شاید کسی نے پیدا نہ کیا ہوا اس کی سیرت تین مکروہ العیوب کے داغ دار تھی ریاکاری حسن کشی اور حرص وہ ہر نیکی سے عاری بھی تھا اور تلافی کے لیے اس میں کوئی اعلیٰ جوہر موجود نہ تھا اخلاقی جو ہروں سے خالی ہونے کے باوجود اس میں کوئی پسندیدہ خصوصیت بھی نہ تھی۔

چنانچہ اس فورس نے ہر مسلمانوں کو اپنے خلاف ابھارا چونکہ ملکہ آئرین نے مسلمانوں کو خراج ادا کرنے کے وعدے پر صلح کر لی تھی چنانچہ نسی فورس نے جس نے سازش سے سلطنت پر متصرف ہوتے ہی یہ عزم اور فیصلہ کیا کہ مسلمانوں خراج گزاری کا طوق گردن سے نکال ڈالے اس نے ہارون الرشید کو ایک خط بھیجا جس میں شطرنج کے استعارے استعمال کرتے ہوئے اس نے لکھا۔

ملکہ نے تمہیں رخ اور اپنے آپ کو پیادہ سمجھا وہ بزدل عورت خراج ادا کرنے پر آمادہ ہو گئی حالانکہ اسے تم جیسے وحشیوں سے دوگنا خراج لینا چاہیے تھا تم نے بے انصافی سے جو وصول کیا وہ واپس کر دو یا تلوار کے فیصلے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

جس قاصد کے ہاتھ یہ پیغام بھیجا اسی کے ہاتھ یونانی تلواروں کا ایک گٹھا بھی بھیج دیا تا کہ ہارون الرشید پر خوف طاری کرے قاصد نے خط پیش کرنے کے بعد یہ گٹھا بھی سامنے رکھ دیا ہارون الرشید خط پڑھ کر دو اور تلواروں کا گٹھا دیکھ کر مسکرایا پھر اس نے اپنی تلوار اٹھائی جس کو اس

نے صمصامہ کا نام دیا ہوا تھا اور ایک ہی ضرب میں ان ساری یونانی تلواروں کے ٹکڑے کر ڈالے۔

بہر حال ہارون الرشید نے نسی فورس کے نام وہ مکتوب لکھا جو اختصار، جامعیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے اسے صدیوں سے عالمگیر شہرت حاصل ہے پہلے اس نے اپنے مذہب کا کلمہ لکھا اس کے بعد اس نے لکھا۔

امیر المومنین ہارون الرشید کی طرف سے رومن کتے نسی فورس کے نام اوکافرماں کے بیٹے میں نے تیرا خط پڑھا اس کا جواب تو سنے گا نہیں آنکھوں سے دیکھے گا۔

یہ بات دھمکی نہ تھی ہارون الرشید خون آشام لشکر کے ساتھ رومن شہنشاہ کی سرکوبی کے لیے روانہ ہو گیا نسی فورس کے خیال و خواب میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ ہارون اتنی تیزی اور متعدی سے کام کرے گا اسے کوئی راہ نجات نظر نہ آئی تو سر تسلیم خم کر دیا پہلے کی طرح اخراج ادا کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

نسی فورس جتنا بزدل اور حریص تھا اتنا ہی بد عہد بھی تھا خلیفہ ادائے خراج کا وعدہ لے کر لوٹ آیا تو نسی فورس نے اپنا عہد توڑ دیا یہ سمجھتا رہا کہ موسم سرما آ گیا ہے خلیفہ سردی میں کہاں پیش قدمی کرے گا ہارون اس وقت اپنے رقہ نام کے ایک شہر میں تھا جو دریائے فرات کے کنارے واقع ہے اگرچہ یہ مقام قسطنطنیہ سے بہت دور تھا اور سردی کے موسم میں لشکر کے ساتھ پہاڑی علاقے سے گزرنا بہت مشکل تھا تاہم خلیفہ عین موسم سرما میں بدعہد نسی فورس کو سزا دینے کے لیے دوبارہ پہنچ گیا نسی فورس نے میدان جنگ میں تین زخم کھائے اور بھاگ نکلا اس کی رعایا کے چالیس ہزار افراد مارے گئے خلیفہ نے پوری اشیائے کوچک کو پامال کر ڈالا اسلامی بحری بیڑے جزیرہ روڈس پر سخت حملہ کیا آخر بحرہ اسود سے بحر قبرص تک ہر طرف تباہی پھیل گئی تو نسی فورس کو پھر صلح کے لیے التجا کرنی پڑی قرار یہ پایا کہ ہر قلیہ شہر ہمیشہ کے لیے کھنڈر کی حالت میں پڑا رہے اور رومنوں کو ہر لحہ اس کی بدعہدی کا انجام یاد دلاتا رہے ساتھ ہی نسی فورس اس بات پر بھی مجبور ہوا کہ قسطنطنیہ کے سکوں پر ہارون اور تین فرزندوں کے چہرے کندہ ہوں۔"

یہاں تک کہنے کے بعد کارلوس رکا دم لیا دوبارہ اپنی بہن اور ماں کو مخاطب کرتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

"بدبختی یہیں پر ختم نہیں ہوئی نسی فورس کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا لیکن اس نے ایک جنگ میں ایسے زخم کھائے کہ تخت چھوڑ کر ایک خانقاہ میں جا بیٹھا پھر نسی فورس کے داماد نے عنان حکومت سنبھال لی مگر دو برس کے اندر ہی اندر اسے معزول کر دیا گیا اور لیو خامس جو آرمینیا کا رہنے والا تھا اس کے سر پر تاج رکھا گیا سات برس کے بعد وہ بھی مارا گیا پھر ایک نیا خاندان برسر اقتدار آیا اس نئے خاندان کے بانی شہنشاہ میخائل ثانی کے عہد حکومت کا قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ ٹامس نامی ایک سپہ سالار نے اشیائے کوچک میں بغاوت کی اس کی پیش قدمی کے باعث دو مرتبہ قسطنطنیہ خطرے میں پڑ گیا آخر ٹامس نے تھر میں شکست کھائی گرفتار ہوا اور مارا گیا اس خاندان کے دوسرے بادشاہ تھیوفلس کے عہد میں دوسری مرتبہ عباسیوں کے ساتھ خون ریزیوں کی کشمکش ہوئی اس وقت ہارون الرشید کا تیسرا مخصم عباسی تاج و تخت کا مالک تھا۔

اس مرتبہ بھی پہل رومنوں کے حکمران تھیوفلس ہی کی طرف سے ہوئی تھی شام میں ایک چھوٹا سا شہر زبطرہ ہے جہاں مخصم کی ولادت ہوئی تھی اسی وجہ سے مخصم کو اس مقام سے خاص محبت تھی تھیوفلس نے اس شہر پر حملہ کیا وہاں کے باشندوں کو بڑے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا ان کی پیشانیوں پر داغ لگائے ایک ہزار

خواتین کو وہ گرفتار کر کے لے گیا ان میں ایک عباسی خاتون تھی جس نے بیچارگی کے عالم میں مخصم کو دہائی دی تھی۔

مخصم دربار میں بیٹھا ہوا تھا جب اسے زبطرہ کی تباہی کی خبر ملی اور قاصد نے عباسی خاتون کی فریاد کا ذکر کیا تو مخصم بے اختیار لبیک کہتا ہوا اٹھا وہیں سے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے لشکر خاص کے ساتھ روانہ اور دوسرے لشکر کو جلد از جلد پیچھے پیچھے آنے کے لیے کہا۔

مخصم رومی سلطنت کے قلب کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور مختلف شہر برباد کر دینے آخر دریائے ہالیس کے کنارے رومنوں کو بدترین شکست دی فتح کے بعد اس نے پوچھا کہ رومن شہنشاہ کو سب سے زیادہ کس شہر کے ساتھ تعلق اور پیار ہے جب اسے بتایا گیا کہ عموریہ اس شاہی خاندان کا مولا ہے تو مخصم نے زبطرہ کی بربادی کا انتقام لینے کے پیش نظر افوریہ کا محاصرہ کر لیا بچپن روز کے محاصرے کے بعد شہر فتح ہوا تو اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔"

یہاں تک کہنے کے بعد کارلوس رکا دوبارہ اپنی بہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"روجینا میری بہن بات یہیں تک ختم نہیں ہوگئی قسطنطنیہ والوں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف زیادتیاں ہی زیادتیاں ہوتی رہیں چنانچہ جب تھیوفلس کا خاندان ختم ہوگیا تو ایک مقدونی خاندان قسطنطنیہ پر برسر اقتدار آیا جس کا پہلا بادشاہ باسل اپل تھا اس خاندان کے حکمرانوں کی تعداد کم و بیش تیرہ ہے ان میں سی دو ملکائیں بھی تھیں قسطنطنیہ کے عام شہنشاہوں کی طرح بعض بادشاہ طبعی موت مرے بعض بادشاہوں کو زہر دے کر مارا گیا اور بعض قتل ہوئے پھر ایک انتخابی خاندان حکمران بنا اور قسطنطنیہ کے تمام خاندانوں سے نااہل اور نالائق خاندان تھا۔

اس خاندان کی ایک ملکہ یوڈوشیا تھی جو اپنے شوہر کے ساتھ تاجدار بنی اس کی وفات پر تنہا حکمران رہی پھر اس نے ایک شخص رومانوس سے شادی کر لی آخر رومانوس کی وفات پر شاہی محل سے نکال دی گئی اور اس نے گمنامی میں زندگی کے دن گزار دیے۔

اس کے بعد اینڈرونکس حکمران بنا لیکن معزول ہوا اس کی آنکھیں نکالی گئیں ہاتھ کاٹے گئے اونٹ پر سوار کر کے شہر میں پھرایا گیا جہاں لوگوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

اس کے بعد ایک شخص آئزک ثانی اپنے بیٹے کے اشتراک سے حکمران بنا تھوڑی ہی مدت میں دونوں مارے گئے۔

اسی دوران مسلمانوں کا ایک اور خاندان وسیع علاقوں پر قابض ہو کر اپنی حکمرانی قائم کر چکا تھا ان کی فتوحات اشیائے کوچک تک پھیل چکی تھی اس خاندان کا بانی طغرل بیگ تھا جس نے عباسی خلافت کی مختاری سنبھال لی تھی اور ایک عباسی شہزادی سے شادی بھی کر لی تھی طغرل بیگ کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی اس نے اپنے بھتیجے الپ ارسلان کو جانشین نامزد کیا یہ شخص اپنی یگانہ خصوصیتوں کے لحاظ سے شہنشاہوں اور سلطانوں میں سب سے زیادہ ممتاز حیثیت کا مالک تھا شجاعت میں بے مثل فنکار اور عمل کے اعتبار سے اسلامیت کا پیکر رعایا کا انتہائی ہمدرد اگرچہ زندگی کا بڑا حصہ مجاہدات اور رزم و پیکار میں گزرا اور ظاہر ہے رزم پیکار میں خون ریزی کے علاوہ چارہ نہیں لیکن الپ ارسلان ہر موقع پر انتہائی کوشش کرتا کہ لڑائی کی نوبت نہ آئے لڑائی پیش آتی تھی تو مسلمانوں کی شہادت پر خون کے آنسو بہاتا تھا۔

چنانچہ اس کے عہد میں بھی قسطنطنیہ کے حکمرانوں نے مسلمانوں کے خلاف شرارتیں شروع کر دیں قسطنطنیہ کا حکمران رومانوس جسے تاریخ میں اعرمانوس بھی کہا جاتا ہے مسلمانوں کے

علاقوں میں خود پیش قدمی کی اور بے شمار لشکری لے کر سلجوقی سلطنت پر حملہ آور ہوا اس کے لشکر میں بے شمار وحشی اور جنگجو ارمن بھی شریک تھے اور اس کے رسالے کا افسر وہ شخص تھا جس سے اس کاٹ لینڈ کے بادشاہوں کی نسل چلی بعض روایتوں میں رومانوس کے لشکر کی تعداد کئی لاکھ تھی۔

چنانچہ مسلمانوں کے سلطان الپ ارسلان نے رومانوس کے حملے کی اطلاع پاتے ہی اس طرف کا رخ کیا جدھر سے رومن لشکر آرہا تھا ملازکرد کے مقام پر مقابلہ ہوا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ رومانوس کے لشکر میں کئی لاکھ جنگجو تھے جو اپنے آپ کو بڑے وحشی جنگجو اور ناقابل تسخیر خیال کرتے تھے اس کے مقابلے میں مسلمانوں کا سلطان الپ ارسلان پندرہ ہزار کا لشکر لے کر آیا۔

الپ ارسلان نے میدان جنگ میں پہنچتے ہی معمول کے مطابق مصالحت کی کوشش کی رومانوس کو پیغام بھیجا آخر خون ریزی کی کیا ضرورت ہے کیوں نہ ہم باہم مل جل کر کوئی فیصلہ کر لیں تاکہ بندگان خدا کی جانیں تلف نہ ہوں۔

میری بہن رومانوس نے جو مسلمانوں کے سلطان کو جواب دیا جانتی ہو وہ کیا ہے۔"

جواب میں روجینا مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

"اس نے کیا جواب دیا۔"

کارلوس کہنے لگا۔

"رومانوس نے بدنیتی کی بناء پر جواب دیتے ہوئے اس پیغام صلح کو الپ ارسلان کی کمزوری یا خوف پر معمول کیا جواب میں پیغام بھیجا۔

اگر مسلمانوں کا سلطان صلح کا خواہاں ہے تو سب سے پہلے وہ جگہ چھوڑ کر چلا جائے جہاں وہ خود لشکر کے ہمراہ ہے تاکہ رومن لشکر اس کی جگہ ڈیرہ جما سکے نیز سلمان اپنا شہر جس کا نام رے ہے وہ ضمانت کے طور پر رومنوں کے حوالے کر دیں ورنہ صلح اس کے دارلحکومت میں پہنچ کر ہوگی۔

الپ ارسلان یہ مطالبہ سن کر مسکرایا لیکن کیونکہ یقین ہو چکا تھا کہ لڑائی کے سواء کوئی چارہ نہیں اس لیے یہ سوچ کر کے کہ آئندہ نا جانے کتنے مسلمانوں کا خون بہے گا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

میری بہن خیر الدین نے جو مجھے بتایا اس کے مطابق اس کے بعد الپ ارسلان اٹھا نہایت خصوع خشوع کے ساتھ اس نے عبادت کی جسے مسلمان نماز پڑھنا کہتے ہیں جو میں بھی اب پڑھتا ہوں اس کے بعد اس نے دعا مانگی اپنے ہاتھ سے سواری کے گھوڑے کی دم میں گرہ لگائی ترکوں میں گھوڑے کی دم کو گرہ لگانے کا مطلب یہ تھا کہ فتح حاصل کرنے یا جان دے دینے کا آخری فیصلہ کر لیا ہے۔

مجھے بتایا گیا کہ اس سلطان نے زرہ اتار دی اور سفید لباس پہن لیا جسے وہ کفن کہتے ہیں ساتھ ہی اپنے سالاروں کو وصیت کر دی کہ اگر میں میدان جنگ میں مارا جاؤں مجھے اسی جگہ دفن کر دیا جائے جہاں میری لاش گرے اس نے اپنے رفیقوں میں اعلان کر دیا کہ موت وحیات کی جنگ درپیش ہے جسے مرنا منظور ہو میرے ساتھ رہے جسے جان عزیز ہو وہ بھی الگ ہو جائے اس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی۔

اس طرح الپ ارسلان میدان کارزار میں پہنچا اور تھوڑے سے لشکر کے ساتھ رومنوں کے ٹڈی دل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

لڑائی شروع ہوئی تو الپ ارسلان کے شیرانہ حملے سے بہت جلد رومنوں کی صفیں درہم برہم ہوگئیں سلجوقیوں نے تیروں کا مینہ برسایا تو جس رومن دستے کو جس سمت عافیت نظر آئی ادھر بھاگ نکلا اور خود رومانوس بہت سے ساتھیوں اور پادریوں کے ہمراہ گرفتار ہوگیا۔

الپ ارسلان نے اومانوس کی گرفتاری کے

بعد اس سے نہایت اچھا سلوک کیا اپنے برابر خیمے میں ٹھہرایا اور آٹھ روز تک مہمان رکھا اس اثناء میں ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا تو اومانوس کے لے اہانت یا نفرت کا باعث ہوتا البتہ یہ ضرور واضح کیا جاتا رہا کہ جنگ کے دوران اس سے کیا کیا غلطیاں سرزد ہوئیں پھر پوچھا آپ کس سلوک کے متوقع ہیں۔

اومانوس نے جواب دیا اگر سلطان ظالم ہے تو مجھے موت کی سزا دے گا اگر وہ فخر اور غرور کا پیکر ہے تو مجھے ساتھ ساتھ لیے پھرے گا اگر اس کی نظر اپنے مفاد پر ہے تو مجھ سے فدیہ لے کر آزاد کر دے گا۔

سلطان نے پوچھا۔ ''اگر تم کامیاب ہوتے تو مجھ سے کیا برتاؤ کرتے۔''

اس پر اومانوس نے جواب دیا۔ ''اگر میں کامیاب ہوتا تو میں سلطان کے جسم پر بہت سے تازیانے برساتا۔''

سلطان یہ سن کر مسکرایا اور خفگی کی کوئی علامت اس کے چہرے پر نمودار نہ ہوئی صرف یہ کہا کہ مسیح قانون میں دشمن سے بھی عفو و محبت کی تاکید کی گئی ہے لیکن میں ایسے کسی برتاؤ کا روادار نہیں ہو سکتا ہے جو ناز یبا ہو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ مستقل طور پر صلح کر لو دس لاکھ سرخ دینار تاوان ادا کرو تین لاکھ ساٹھ ہزار دینا سرخ سالانہ خراج دیتے رہو اور جتنے مسلمان اس وقت قسطنطنیہ میں اسیر ہیں سب کو رہا کر دو۔

آخر رومانوس کو شکست کے بعد یہ سب کچھ قبول کرنا پڑا اور مسلمانوں کے سلطان کی فراخدلی کا یہ عالم کہ رخصت کرتے وقت الپ ارسلان نے رومانوس کو خلعت دیا اور دس ہزار دینار سرخ زادراہ کے لیے عنایت کیے جتنے پادری اومانوس کے ساتھ اس پر ہوئے تھے ان سب کو ہی آزادی دے دی گئی۔''

یہاں تک کہنے کے بعد کارلوس رکا دم لیا پھر اپنی ماں اور بہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''اب تم دونوں ماں بیٹی بتاؤ کہ جو طویل داستان تم سے کہی ہے اس میں کس کا قصور ہے۔''

اس موقع پر نبارہ اور روجینا دونوں نے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر روجینا کہنے لگی۔

''بھائی اس میں مسلمانوں کے سلطانوں کا تو کوئی قصور نہیں ہے یہ سارا قصور قسطنطنیہ کے حکمرانوں کا ہے۔''

اس پر بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کارلوس کہنے لگا۔

''یہاں بھی سلطان محمد کا کوئی قصور نہیں سارا قصور ہمارے دادا قسطنطین کا ہے میرے دادا کو اس کے سارے سالاروں نے سمجھایا کہ مسلمانوں کی طرف توہین آمیز پیغام مت بھجواؤ لیکن وہ باز نہیں آیا دو بار اس نے توہین آمیز انداز میں اپنے قاصد مسلمانوں کے سلطان کی طرف بھجوائے اور سلطان نے اس کا جواب یہ دیا کہ اس نے قسطنطنیہ پر حملہ آور ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے آخر اس نے قسطنطنیہ فتح کر لیا۔

ہمارے دادا میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کی قوت تھی ہی نہیں اس سے پہلے سلطان محمد نے ہنگری کے نواح میں پورے یورپ کی عسکری طاقت کو بدترین شکست دی تھی اور یورپ والوں کو بلغراد شہر کے اندر پناہ لینا پڑی تھی اس سے بھی دادا کی آنکھیں نہ کھلیں اور مسلمانوں سے ٹکرانے کا عزم کر لیا اور جو انجام ہوا میری بہن وہ اب ہمارے سامنے ہے اور اب کیونکہ قسطنطنیہ سے بھاگے ہوئے لشکریوں اور قسطنطنیہ کے سالار جسٹینانی کے علاوہ جنیوا کا سپہ سالار یونانی سپہ سالار اور دیگر اپنے اپنے لشکریوں کے ساتھ جزیرہ نرجس میں آ گئے ہیں لہٰذا اب مسلمانوں کا لشکر نربس پر حملہ آور ہونے کے لیے قسطنطنیہ سے کوچ کر چکا ہے اور اس لشکر میں سالار کی حیثیت

سے خیر الدین بھی شامل ہے جسے میں اب اپنا بھائی کہہ کر پکارتا ہوں۔''

کارلوس جب خاموش ہوا تب اس کی ماں بڑی پریشانی اور فکر مندی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''بیٹے اس کا مطلب ہے کہ چند دن تک اس جزیرے میں بھی آگ اور خون کا کھیل شروع ہو جائے گا اگر ایسا ہے تو پھر تو ہمارے لیے اذیتوں اور مصیبتوں کے نا ختم ہونے والے طوفان اٹھ کھڑے ہوں گے بیٹے چلو قسطنطنیہ میں حالات خراب ہوئے تو ہم وہاں سے اٹھ کر یہاں جزیرہ نربس میں آ گئے اب تمہارا کہنا ہے کہ مسلمان اس پر حملہ آور ہونے کے لیے آ رہے ہیں اس لیے کہ یہاں ان کی بہت سی مخالف قوتیں جمع ہو گئی ہیں اگر ایسا ہے تو تمہارا کیا اندازہ ہے کہ کیا مسلمان قسطنطنیہ کی طرح جزیرہ نربس کو بھی فتح کر لیں گے اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر یہاں سے نکل کر ہم کدھر کا رخ کریں گے۔''

نبارہ جب تک بولتی رہی کارلوس مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھتا رہا اس کی اس حرکت پر نبارہ کہنے لگی۔

''بیٹے تم مسکرا رہے ہو میں سنجیدہ ہوں۔''

جواب میں کارلوس بھی کہنے لگا۔

''اماں میں بھی سنجیدہ ہوں میں آپ کی بات کو مذاق میں تو نہیں لے رہا آپ اور روجینا سے بڑھ کر مجھے دنیا میں کوئی عزیز نہیں ہے آپ کی سلامتی میری زندگی کا مقصد ہے آپ کو پریشان اور فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے یہاں سے نکل کر ہم واپس قسطنطنیہ جائیں گے۔''

کارلوس کے ان الفاظ پر روجینا چونکی تھی کہنے لگی۔

''بھائی یہ کس قسم کی گفتگو کر رہے ہو قسطنطنیہ سے نکل کر اپنے جانیں بچانے کی خاطر ہم یہاں آئے اماں پریشان ہیں کہ جب مسلمان جزیرہ نربس پر بھی قبضہ کر لیں گے تو ہم کہاں جائیں گے آپ کہہ رہے ہیں کہ واپس قسطنطنیہ کی طرف جائیں گے وہاں ہمارا کیا ہے اور کون ہمیں وہاں رہنے دے گا وہاں تو ہم غیر محفوظ ہوں گے اور جب وہاں لوگوں کو یہ خبر ہو گی کہ ہم مرنے والے شہنشاہ قسطنطین کے رشتے دار ہیں تو وہ ہماری گردنیں نہ کاٹ دیں گے۔''

کارلوس نے لحہ بھر کے لیے غور سے اپنی بہن روجینا کی طرف دیکھا پھر اس کی نگاہیں اپنی ماں نبارہ پر جم گئیں پھر خوش کن انداز میں کہنے لگا۔

''میری عزیز ماں اور بہن میں سارا معاملہ تفصیل کے ساتھ تم سے کہتا ہوں دراصل اسلام قبول کرنے کے بعد میں تم لوگوں سے کچھ باتیں چھپاتا رہا ہوں یوں جانو اماں یہ میری مجبوری تھی لیکن اب کیونکہ آپ کو میرے اسلام قبول کرنے پر کوئی اعتراض نہیں لہٰذا میں ساری باتیں کھل کر کہوں گا آپ کو پتا ہے کہ یہاں آنے کے بعد چند دن میں جزیرے سے غائب رہا تھا آپ سے اجازت لے کر گیا تھا کہ میں یہ دیکھوں گا کہ ہمارے عزیز اقارب جزیرہ نربس کے اندر ہی ہیں یا وہ کہیں اور چلے گئے ہیں اماں یہاں سے نکل کر میں سیدھا قسطنطنیہ گیا تھا خیر الدین سے ملا تھا خیر الدین نے بڑے پرتپاک انداز میں میرا استقبال کیا سلطان محمد نے اسے قسطنطنیہ شہر میں رہائش کے لیے ایک حویلی بھی دے دی تھی جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے پہلے میری بہترین تواضع کا اہتمام کیا اس وقت وہ لشکر کے اندر موجود تھا دوران گفتگو اس نے مجھ سے پوچھا کہ جب ہم لوگ قسطنطنیہ میں رہتے تھے تو ہماری رہائش کہاں تھی میں نے اس پر انکشاف کیا کہ قسطنطنیہ میں جب ہم رہتے تھے تو ہماری دو رہائش گاہیں تھیں ہم قصر کے ایک حصے میں بھی رہتے تھے جو ہمارے دادا نے ہمارے لیے مختص کر رکھا تھا اس کے علاوہ ایک شاندار حویلی بھی دادا کی طرف

سے ہمیں ملی ہوئی تھی اور اس حویلی میں بھی ہم رہائش اختیار کرتے تھے قصر میں کبھی کبھی آتے تھے زیادہ تر اس حویلی کے اندر ہی رہتے تھے۔

اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے خیرالدین کہنے لگا قسطنطنیہ میں سلطان نے مجھے بھی رہائش کے لیے ایک حویلی دی ہے آؤ میں تمہیں دکھاتا ہوں اماں جب وہ مجھے ساتھ لے گیا تو جو حویلی اس نے مجھے دکھائی تو وہ ہماری ہی حویلی تھی جس میں ہم رہا کرتے تھے میرے منہ سے یونہی نکل گیا کہ پہلے ہم اسی حویلی میں قیام رکھتے تھے اس پر خیرالدین سنجیدہ ہوگیا لہٰذا اس نے وہ حویلی ہمارے حوالے کردی اور مجھے کہا کہ تم اپنے اہل خانہ کے ساتھ جب اور جس وقت چاہو اس حویلی میں آکر قیام کرسکتے ہو اس کے بعد وہ سلطان سے ملا سلطان سے کہہ کر وہ حویلی ہماری ملکیت قرار دے دی اور اس کے ساتھ ہی ایک دوسری حویلی سلطان خیرالدین نے دے دی ہے۔

اماں خیرالدین نے مجھ سے کہا تھا کہ جس رات مسلمان قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوئے تھے تو ہمیں قسطنطنیہ چھوڑ کر ادھر نہیں آنا چاہیے تھا وہ کہہ رہا تھا جس وقت قسطنطنیہ فتح ہوا اس وقت میں تم لوگوں کو تلاش کرتا رہا تاکہ تمہاری حفاظت کا اہتمام کروں اس کا کہنا تھا کہ اگر تم وہاں ہوتے تو میں تم سب کی حفاظت کا خوب اہتمام اور بندوبست کرتا اس بناء پر اماں اب ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے یہاں سے نکل کر ہم قسطنطنیہ کا رخ کریں گے اماں حیرت کی بات یہ ہے کہ قسطنطنیہ میں ہماری حویلی کے اندر جو سامان تھا وہ سارے کا سارا ویسے کا ویسا ہی پڑا ہوا ہے کسی نے اس کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔'' کارلوس کے اس انکشاف پر بناوہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی کہنے لگی۔

''بیٹے اگر یہ بات ہے تو پھر میں سمجھتی ہوں ہم نے کچھ کھویا ہی نہیں میرے بچے ہم تو جانیں بچانے کی خاطر بڑی بھاگ دوڑ میں قصر سے نکلے تھے اس لیے کہ اس وقت ہم اپنی حویلی کے بجائے قصر میں قیام کیے ہوئے تھے میرے بچے تیرے باپ کے دور سے اس حویلی کے اندر جو خزانے دفن ہیں جس سے متعلق تمہارا باپ میں یا تمہارا دادا جانتے تھے تمہارا دادا چاہتا تھا کہ جب تم دونوں جوان ہوجاؤ گے اور جب تمہاری شادی کا اہتمام کیا جائے گا تو اس وقت وہ خزانے تم پر ظاہر کیے جائیں گے اب اگر حویلی پھر ہماری ہے ہم نے وہاں جا کر رہنا ہے تو میرے بچے میں سمجھتی ہوں یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ایک بار پھر ہمیں ہماری حویلی مل رہی ہے اس لیے کہ اس میں ایسے خزائن ہیں جن کی بناء پر ہم ہی نہیں ہماری آنے والی نسلیں بھی مستفید ہوسکتی ہیں۔''

بناوہ کی اس گفتگو سے روجینا بھی خوشی محسوس کررہی تھی پھر روجینا نے کارلوس کو مخاطب کیا۔

''چلو بھائی خیرالدین کی مہربانی کہ وہ ہمیں ہماری حویلی لوٹا چکا ہے پر بھائی یہ جو محافظ ہمارے تحفظ کے لیے مقرر کیے گئے ہیں یہ کون ہیں ان کا تقرر کس نے کیا ہے۔''

جواب میں کارلوس مسکرایا کہنے لگا۔

''میری بہن جس وقت میں قسطنطنیہ گیا تھا خیرالدین سے ملا تھا تو یہ محافظ اسی نے میرے ساتھ ہماری حفاظت کے لیے روانہ کیے تھے ان کا قیام ہماری اس رہائش گاہ کے پشتی حصے میں ہے میری بہن تو نے دیکھا ہوگا وہ اپنی گردنوں میں صلیبیں ڈال کر رکھتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ نصرانی ہیں ایسا نہیں ہے وہ حقیقت میں پانچوں کے پانچوں مسلمان ہیں صرف یہاں ہماری حفاظت کے فرائض ادا کرنے کے لیے انہوں نے اپنے آپ کو نصرانی ظاہر کررکھا ہے۔''

کارلوس کے خاموش ہونے پر بناوہ بڑی ممونیت کے انداز میں کہنے لگی۔

''بیٹے یہ اس کی بڑی مہربانی اس کی بڑی

شرافت اور اعلیٰ کردار اور عمدہ اخلاق کی ایک مثال ہے کہ اس نے یوں جزیرہ لیس میں بھی ہماری حفاظت کا سامان کیا بیٹے مسلمانوں کے اندر رہتے ہوئے تم نے جوان کی گفتگو سنی ان کے جن کاموں سے تم متاثر ہوئے ان کی جن عبادتوں نے تمہیں اپنی طرف کھینچا ان کے جس کردار نے تمہارے اندر ایک انقلاب برپا کیا ان کے جس اخلاق نے تمہاری پہلی قوتوں کو مسمار کر کے تمہارے اندر ایک تبدیلی پیدا کردی بیٹے کسی دن بیٹھ کر وہ ساری باتیں مجھے اور روجینا سے بھی کہنا۔ یہاں تک کہنے کے بعد بناوہ رکی کچھ سوچا دوبارہ کسی قدر حیرت سے کارلوس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

بیٹے خیرالدین نے ہماری حفاظت پر جو اپنے پانچ محافظ مقرر کیے ہوئے ہیں بیٹے تمہاری گفتگو کے دوران میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ وہ پچھلے کچھ دنوں سے یہاں قیام کیے ہوئے ہیں اور ہم پر گہری نگاہ رکھے ہوئے ہوں گے پر یہ تو کہو بیٹے کہ ان کے کھانے پینے کا کیا اہتمام ہے۔''

کارلوس مسکرایا کہنے لگا۔

''اماں انہیں جیسے وقت خیرالدین نے انہیں تنبیہ کی تھی کہ کھانے پینے کے سلسلے میں وہ ہم پر بوجھ نہ بنیں لہٰذا وہ اپنے کھانے پینے کا اہتمام خود کرتے ہیں۔''

اس پر روجینا پہلی بار بولی کہنے لگی۔

''بھائی یہ تو بڑی بری بات ہے ان کا کھانا ہمارے ذمے ہونے چاہیے' وہ ہماری حفاظت پر مقرر ہوئے ہیں اور اگر ہم نے اپنی حفاظت کرنے والوں کی کوئی خدمت اور تواضع نہیں کرنی تو میرے خیال میں ہم اس قابل نہیں ہیں کہ وہ ہماری حفاظت کا سامان کریں' بھائی جس وقت اس موضوع پر خیرالدین سے آپ کی بات ہوئی تھی آپ کو اسی وقت کہنا چاہیے تھا کہ نہیں یہ اپنے کھانے پینے کا اہتمام خود نہیں کریں گے ان کے کھانے پینے کا اہتمام ہماری طرف سے ہوگا۔

میرے بھائی اب جو ہوا سو ہوا اس وقت کے بعد ان کے کھانے پینے کا سارا انتظام یہاں ہوگا اور میرے بھائی تم خود ان کو کھانا پہنچا کر آیا کروگے۔''

روجینا کے ان الفاظ سے کارلوس خوش ہوگیا تھا کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اسی لمحہ جس حویلی میں انہوں نے قیام کررکھا تھا اس کے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

اس دستک پر روجینا اور بناوہ چونکی تھیں کارلوس اپنی جگہ سے اٹھا اور کہنے لگا۔

''اماں آپ دونوں ماں بیٹی بیٹھیں میں دیکھتا ہوں کون ہے۔''

اس کے ساتھ ہی کارلوس اٹھ کر باہر گیا جب اس نے دروازہ کھولا تو دروازے پر بجائس کھڑا تھا وہی بجائس جسے جزیرہ سلانیک میں خیرالدین نے تیغ زنی کے مقابلے میں لہرایا تھا۔

بجائس کو وہاں دیکھتے ہوئے کارلوس تھوڑی دیر کے لیے حیرت زدہ سا ہوا پھر کہنے لگا۔

''بجائس تم یہاں.....'' اس پر بجائس کہنے لگا۔ ''ہم تو گزشتہ کئی دن سے یہاں ہیں بروشس بھی یہاں ہے ہم اپنے ان گنت ساتھیوں کے ساتھ یہاں یونانی سپہ سالار ڈیوک طارس کے لشکر میں شامل ہوچکے ہیں اور مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی تیاریوں کو آخری شکل دے چکے ہیں میرے بھائی کیا آپ مجھے باہر ہی کھڑا رکھیں گے اندر آنے کے لیے نہیں کہیں گے اس لیے کہ میں آپ اور آپ کی ماں سے ایک انتہائی اہم موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے آیا ہوں۔''

اس پر کارلوس نے سارا دروازہ کھول دیا بجائس اندر آیا کارلوس نے دروازہ بند کردیا بجائس کو لے کر وہ دیوان خانے میں گیا اسے ایک نشست پر بٹھایا پھر کہنے لگا۔

''اب بولو تم کس کام کے سلسلے میں آئے ہو

جس کا تم نے دروازے سے باہر کھڑے ہو کر ذکر کیا تھا۔" جواب میں بجانس کہنے لگا۔

"کارلوس اماں کو بھی یہاں بلا لو جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اس میں تم اکیلے کچھ نہیں کر سکتے اس لیے کہ سارا فیصلہ تو اماں نبارہ نے کرنا ہے۔"

اس پر کارلوس اپنی جگہ سے اٹھا اور کہنے لگا۔

"اچھا تم بیٹھو میں اماں کو لے کر آتا ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی کارلوس نکلا دوسرے کمرے میں داخل ہوا جس میں نبارہ اور روجینا بیٹھے ہوئے تھے اسے دیکھتے ہی روجینا نے پوچھ لیا۔ "بھائی کون آیا ہے۔" اس پر کارلوس کہنے لگا۔

"جزیرہ سلانیک کا بجانس آیا ہے جسے تیغ زنی کے مقابلے میں خیرالدین نے ہرایا تھا اس کا کہنا ہے کہ وہ کسی انتہائی اہم موضوع پر گفتگو کرنا چاہتا ہے اور اس گفتگو کا فیصلہ کیونکہ اماں کر سکتی ہے لہٰذا اماں اٹھو میرے ساتھ دیوان خانے میں چلو۔"

کارلوس کی اس گفتگو سے نبارہ فکر مند ہو گئی تھی کہنے لگی۔

"یہ بجانس کون سا وہ پیغام لے کر آیا ہے جس کا فیصلہ صرف میں کر سکتی ہوں اچھا روجینا تم یہیں بیٹھو میں دیکھتی ہوں وہ کیا کہتا ہے۔" اس کے ساتھ ہی نبارہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کارلوس کے ساتھ ہو لی تھی۔

کارلوس کے ساتھ نبارہ جب دیوان خانے میں داخل ہوئی تو بجانس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا دونوں ماں بیٹا بجانس کے سامنے بیٹھ گئے پھر گفتگو کا آغاز نبارہ نے کیا اور بجانس کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"کارلوس کہہ رہا تھا کہ تم کسی اہم معاملے پر گفتگو کرنا چاہتے ہو جس کا فیصلہ میں ہی کر سکتی ہوں اب بولو کیا معاملہ ہے۔"

جواب میں بجانس کہنے لگا۔

"اماں آپ مجھے بھی اچھی طرح جانتی ہیں اور بروشس کو بھی ہم دونوں نے اپنے سارے جنگجو ساتھیوں کے ساتھ ان دنوں جزیرہ لزبس میں ہی قیام کر رکھا ہے اور ہم یونانی سپہ سالار ڈیوک فوکارس کے لشکر میں شامل ہو چکے ہیں تاکہ مسلمانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے اور جزیرہ لزبس کو ان سے بچایا جائے ہم کسی بھی صورت اس جزیرے پر مسلمانوں کا قبضہ نہیں ہونے دیں گے۔

اماں بروشس نے مجھے آپ کی طرف بھجوایا ہے وہ آپ کی بیٹی روجینا کا رشتہ اپنے لیے مانگتا ہے اب آپ بولیں آپ کیا کہتی ہیں۔"

لمحہ بھر کے لیے ناپسندیدگی میں نبارہ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا لیکن جلد ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا کارلوس کی بھی عجیب سی حالت تھی اپنے آپ کو سنبھالنے کے بعد نبارہ کہنے لگی۔

"بجانس میرے بیٹے یہ فیصلے اتنی جلدی نہیں ہوتے تم نے بروشس کا پیغام مجھ تک اور میرے بیٹے تک پہنچا دیا ہے اب ہم اس سلسلے میں روجینا سے بات کریں گے پھر دیکھیں گے وہ کیا جواب دیتی ہے جو جوان وہ دے گی وہی آخری ہو گا۔"

نبارہ کی اس گفتگو کے جواب میں بجانس کہنے لگا۔

"اماں اس وقت آپ کارلوس اور آپ کی بیٹی کی وہ حالت نہیں ہے جو قسطنطنیہ میں ہوا کرتی تھی آپ کا سسر کارلوس اور روجینا کا دادا قسطنطین مارا جا چکا ہے لہٰذا اگر آپ بروشس کو اپنی بیٹی روجینا کا رشتہ دینے سے انکار کریں گی تو بروشس آپ کے لیے نقصان کا باعث بھی بن سکتا ہے میں آپ سے کوئی چیز چھپاؤں گا نہیں، اس سلسلے میں یونانی سپہ سالار ڈیوک فوطارس بھی اس کے ساتھ ہے قسطنطنیہ کا سپہ سالار جنجسا تو بھی اس معاملے میں اس کے حق میں ہے اور میں آپ پر یہ بھی واضح کر دوں کہ اگر آپ نے اس رشتے سے انکار کیا تو پھر بروشس زبردستی کرے گا آپ

دونوں ماں بیٹے کو اگر اسے کہیں اسیر کرنا پڑا اور روجینا پر زبردستی قبضہ کرنا پڑا تب بھی وہ کر گزرے گا۔ میں نے آپ سے گزارش کی کہ میں آپ سے کوئی چیز چھپاؤں گا نہیں حقیقت حال پوری طرح آپ پر واضح کروں گا آگے فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔"

بجانس کے ان الفاظ پر روجینا کی ماں نبارہ اور کارلوس دونوں پریشان اور فکر مند ہو گئے تھے یہاں تک کہ نبارہ بولی اور کہنے لگی۔

"بیٹے تو نے بروشس کا پیغام پہنچا دیا ہے اب ہمیں دو چار دن سوچنے کا موقع تو دو اس سلسلے میں ہم روجینا سے بات کریں گے اگر تو وہ اس رشتے پر آمادہ ہو گئی تو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے اگر وہ اس رشتے پر آمادہ نہ ہوئی تو بیٹے میں اور میرا بیٹا چند یوم تک اسے سمجھا بجھا کر اس رشتے پر قائل کر لیں گے اس کے بعد کوئی بڑا طوفان نہیں اٹھے گا۔"

نبارہ کی اس گفتگو سے بجانس مطمئن ہو گیا تھا اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا کہنے لگا۔

"اماں آپ کا جواب بڑا مطمئن کر دینے والا ہے بہرحال میں جاتا ہوں بروشش آپ کو چند دن ہی دے گا اس کے بعد وہ خود آپ کے ہاں آئے گا اور واپس خالی ہاتھ نہیں جائے گا روجینا کو ساتھ لے کر جائے گا۔" یہ الفاظ کہنے کے بعد بجانس دیوان خانے سے نکل گیا تھا۔

بجانس کے جانے کے بعد روجینا بھی دوسرے کمرے سے اٹھ کر دیوان خانے میں آ کر بیٹھ گئی تھی وہ اپنی ماں نبارہ کے پہلو میں بیٹھی تھی ماں اور کارلوس دونوں کو پریشان اور افسردہ دیکھتے ہوئے وہ جستجو میں پڑ گئی تھی پھر اپنی ماں کو اس نے مخاطب کیا۔

"اماں کیا بات ہے یہ بجانس کیا پیغام لے کر آیا تھا۔"

نبارہ نے ایک گہری محبت بھری نگاہ روجینا پر ڈالی پھر تھوڑی دیر پہلے بجانس کے ساتھ جو گفتگو ہوئی تھی اس کی تفصیل اس سے کہہ دی تھی۔

یہ گفتگو سن کر روجینا بیچاری بھی اداس اور پریشان ہو گئی تھی پھر اپنے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"بھائی اب کیا ہو گا یہ تو بحری قزاق ہے یہ تو ہمارے لیے نقصان کا باعث بھی بن سکتے ہیں۔"

کارلوس کی چھاتی تن گئی اور کہنے لگا۔

"ان بحری قزاقوں کی ایسی تیسی ہم نے اس سے چند دن کی مہلت مانگی ہے اس سے پہلے ہی مسلمانوں کا لشکر یہاں پہنچ جائے گا اس کے بعد یہاں جس قدر قوتیں ہیں وہ مسلمانوں کے ساتھ برسرپیکار ہو جائیں گی اور مجھے امید ہے مسلمان یہاں کی ساری قوتوں کو بدترین شکست دینے کے بعد جزیرہ لزبس پر قبضہ کر لیں گے، میری بہن میں اسلام قبول کر چکا ہوں جو لشکر یہاں آ رہا ہے ان کے ساتھ میرا اب صرف دینی نہیں خونی رشتہ بھی قائم ہو چکا ہے میں یہ سارا معاملہ خیرالدین کے سامنے پیش کروں گا اور پھر میری بہن تو دیکھنا خیرالدین بجانس اور بروشس کا کیا حشر نشر کرتا ہے تم دونوں ماں بیٹی کو بالکل اور قطعاً پریشان اور فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" کارلوس یہیں تک کہنے پایا تھا کہ حویلی کے دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی اس دستک پر نبارہ اور روجینا دونوں کے چہرے پیلے ہو گئے تھے پریشانی اور فکر مندی میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگی تھیں کارلوس اٹھا اور کہنے لگا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس کے ساتھ ہی وہ دیوان خانے سے نکل گیا تھا۔

کافی دیر تک کارلوس دروازے پر کھڑے ہو کر کسی سے گفتگو کرتا رہا پھر جب وہ واپس دیوان خانے میں آیا تو اس کی طرف دیکھتے ہوئے روجینا نے بڑی فکر مندی میں پوچھ لیا۔

''بھائی کون تھا' کیا بروشس آ گیا تھا اگر وہ تھا تو کیا کہتا ہے اب تو ہمیں اس سے لمحہ لمحہ خطرات کی امید ہے۔''

جواب میں کارلوس مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''سارا معاملہ ٹھیک ہوگیا ہے میری بہن خیرالدین نے جو محافظ ہمارے لیے مقرر کیے تھے ان میں سے ایک آیا تھا میں اسی سے گفتگو کرتا رہا ہوں اس نے انکشاف کیا ہے کہ مسلمانوں کا لشکر جزیرہ لزبس کے جنوبی ساحل پر پہنچ گیا ہے سمندر کے اندر مسلمانوں نے ایک لمبا کا وار کاٹا تھا اس لیے کہ لزبس کے اندر جو پہلے سے موجود عسکری قوتیں ہیں انہوں نے اپنا رجحان زیادہ تر شمال کی طرف رکھا ان کا خیال تھا کہ قسطنطنیہ کی طرف سے جو لشکر آئے گا وہ شمالی ساحل ہی کی طرف بڑھے گا لیکن مسلمانوں نے بڑا عمدہ طریقہ استعمال کیا سمندر کے اندر کاور کاٹتے ہوئے وہ جنوبی ساحل پر آئے اور اب ان کی کشتیاں اور کچھ درمیانے درجے کے جہاز جزیرہ لزبس کے جنوبی ساحل پر لنگر انداز ہو چکے ہیں اور ان کے لشکری ساحل پر اتر رہے ہیں۔''

یہ سب کچھ سن کر نبارہ اور روجینا کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی پھر نبارہ کہنے لگی۔

''بیٹے تو ابھی اسی وقت جنوبی ساحل کی طرف جا وہاں خیرالدین سے مل اور جو صورت حال ہمیں پیش آ رہی ہے اس کی تفصیل اس سے کہہ اس طرح ہم محفوظ بھی ہو جائیں گے اور بجانس اور بروشس کی زبردستیوں سے بھی بچ جائیں گے۔''

روجینا نے بھی اس سے اتفاق کیا تھا پھر کارلوس اپنی جگہ پر اٹھا اور روجینا کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''روجینا اٹھو میں جاتا ہوں تم بیرونی دروازے کو اندر سے زنجیر لگا لو دروازہ نہیں کھولنا اگر کوئی دستک دے تو دروازے کے اندر جو سوراخ ہے' اس میں سے دیکھنا اگر محافظوں میں سے کوئی آیا تو وہی آئے گا جو اس سے پہلے تم سے گفتگو کر چکا ہے اماں تم دونوں ماں بیٹی ان پر مکمل بھروسہ کر سکتی ہو ان کے ہوتے ہوئے تمہیں یہاں کوئی تکلیف اور دقت نہیں دے سکتا میں ان کے پاس سے ہو کے پھر خیرالدین کے پاس جاتا ہوں اور اس معاملے سے انہیں بھی آگاہ کر دیتا ہوں تاکہ وہ زیادہ محتاط رہیں۔''

نبارہ اور روجینا نے اس سے اتفاق کیا تھا پھر کارلوس وہاں سے نکل گیا تھا۔

☆☆

مسلمانوں کا لشکر سمندر کے اندر چکر اور کاور کاٹتا ہوا لزبس کے جنوبی ساحل کی طرف آیا تھا کشتیوں اور چھوٹے جہاز ساحل پر کھڑے کر دیے گئے تھے جبکہ پورے کا پورا لشکر ساحل پر اترنے میں کامیاب ہو گیا تھا اس وقت تک جزیرہ لزبس میں جو عسکری قوتیں تھیں انہیں مسلمانوں کی آمد کی خبر ہو گئی تھی لہٰذا وہ بھی حرکت میں آ چکی تھیں خصوصیت کے ساتھ تین عساکر بڑی تیزی سے حرکت میں آئے تھے پہلا قسطنطنیہ کا سابق سپہ سالار جسٹانی تھا اس کے تحت قسطنطنیہ سے بھاگ کر لزبس کی طرف آنے والے لشکری تھے اور جزیرہ روڈس کے کمپلرز اور ہاسپلٹر بھی اس کے لشکر میں آن شامل ہوئے تھے اس کے علاوہ کچھ ایسے قزاق بھی تھے جنہوں نے جزیرہ روڈس کو اپنا مسکن بنا رکھا تھا وہ بھی جسٹانی کے لشکر میں آن شامل ہوئے تھے دوسری قوت جنیوا کے سپہ سالار جان عطیاس کی تھی تیسری قوت یونانی سپہ سالار ڈیوک فوکارس کی تھی اور ڈیوک فوکارس کے لشکر میں جزیرہ سلائیک کے بحری قذاق بروشس اور بجانس کی کمانداری میں شامل ہو چکے تھے چوتھی قوت فرانس کا امیر البحر لوریڈانو تھا جو اپنے بحری بیڑے کے ساتھ حرکت میں آیا تھا۔

اس طرح یہ چاروں قوتیں اپنے جہازوں پر سوار ہو کر جزیرہ لزبس کے جنوبی ساحل کے اس حصے کی طرف بڑھیں جہاں مسلمانوں نے اپنے بحری بیڑے کو لنگر انداز کیا تھا اور جہاں مسلمان ساحل پر اترے تھے ساحل کے جس حصے پر مسلمان اترے تھے اس کا انتخاب بڑی دانشمندی اور عقلمندی سے کیا گیا تھا اس لیے کہ ساحل کا وہ حصہ اونچے نیچے ٹیلوں پر مشتمل تھا جو دفاعی لحاظ سے بڑا کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔

چنانچہ جسٹانی جان عطیاس ڈیوک فوکارس اور لوریڈانو کے جہاز اپنے لشکریوں کو لے کر جب جنوبی ساحل کی طرف آئے تو پہلے تو وہ بڑے خوش تھے کہ ان کے پاس چار متحدہ قوتوں کی طاقت ہے جس کے بل بوتے پر وہ مسلمانوں کے قسطنطنیہ سے آنے والے مختصر سے لشکر کا خاتمہ کر کے رکھ دیں گے چنانچہ وہ بڑی تیزی سے جنوبی ساحل کی طرف بڑھے تھے جس وقت وہ جنوبی ساحل کے قریب گئے تو اس وقت چاروں طرف خاموشی اور ویرانی تھی جب وہ مزید ساحل کی طرف بڑھے تو ان کے حوصلے مزید پختہ ہو گئے اس لیے کہ ان کی اس پیش قدمی کے جواب میں کسی ردعمل کا اظہار نہیں ہوا تھا مسلمان خاموش پڑے رہے تھے لیکن ان کی بدقسمتی کہ جونہی وہ مزید ساحل کی طرف بڑھے اچانک ساحل پر جو چھوٹے موٹے ٹیلے تھے ان کی اوٹ سے ان پر روغن قطف لگے جلتے تیر پھینکے گئے' یہ جلتے تیروں کی ایک بارش تھی جو مسلمانوں نے مخالف قوتوں پر کی تھی ان جلتے تیروں نے اپنا رنگ دکھایا آنے والی چاروں قوتوں کے کچھ جہازوں کو آگ لگ گئی اور وہ ڈوبنے لگے یہ صورت حال ان کے لیے حوصلہ شکن تھی لہٰذا ڈوبنے والے جہازوں کے لشکریوں کو دوسرے جہازوں میں منتقل کیا گیا اور اس طرح یہ چاروں کی چاروں قوتیں واپس چلی گئیں اب انہوں نے اپنے متحدہ لشکر کو خشکی پر استوار کر کے مسلمانوں پر ضرب لگانے کا تہیہ کر لیا تھا۔

جس وقت یہ چاروں قوتیں پیچھے ہٹ گئیں اور شمالی ساحل کی طرف چلی گئیں تب مسلمان لشکری اپنے سالاروں کے گرد جمع ہو گئے تھے اس موقع پر لشکر کا سالار اعلیٰ کدک احمد تھا خیرالدین عمر باشا سعدالدین اور اسماعیل بے اس کے نائب کی حیثیت سے کام کر رہے تھے چنانچہ سارے سالاروں نے مشورہ کر کے لشکر کا ایک حصہ پہرہ دینے پر مستعد کر دیا باقی لشکریوں کو آرام کرنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔

جس وقت دوسرے سالاروں کے ساتھ خیرالدین یہ سارے انتظامات کرنے میں مصروف تھا ایک طرف سے کارلوس اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا آیا کارلوس کو آتے دیکھ کر خیرالدین کچھ پریشان ہوا باقی سالار بھی جانتے تھے کہ کارلوس صرف خیرالدین کا جاننے والا نہیں بلکہ وہ قسطنطین کا پوتا اور اسلام قبول کر چکا ہے۔

قریب آ کر کارلوس نے سب سے برجوش مصافحہ کیا تھا پھر وہ خیرالدین کو مخاطب کر کے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ خیرالدین نے اسے مخاطب کرنے میں پہل کر دی۔

''کارلوس میرے بھائی خیریت تو ہے تمہارا چہرہ بتاتا ہے کہ تم اس وقت کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آئے ہو دیکھو تمہارے ساتھ میں نے جو پانچ محافظ مقرر کیے تھے کیا وہ اپنا کام احسن طریقے سے سرانجام دے رہے ہیں۔''

کارلوس مزید خیرالدین کے نزدیک ہوا اور بڑی بے دردی میں کہنے لگا۔

''وہ پانچوں تو میرے بھائی ہیں بہترین انداز میں کام کر رہے ہیں لیکن ہمارے خلاف ایک حادثہ سر ابھار رہا ہے۔'' کارلوس کے ان الفاظ پر خیرالدین پریشان ہو گیا کہنے لگا۔ ''کون سا حادثہ.....'' جواب میں کارلوس نے بجانس کے آنے بروشس کے لیے روجینا کا رشتہ مانگنے اور انکار کی صورت میں روجینا زبردستی لیجانے کی

تفصیل کہہ دی تھی۔

یہ سب کچھ سننے کے بعد خیرالدین کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا کارلوس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''اس بروشس کی قضا اسے پکار رہی ہے پہلے یہ بتاؤ ہماری دشمن قوتوں نے شمال میں قیام کر رکھا ہے ہم اب جنوب میں ہیں جہاں تمہاری رہائش ہے وہ ہم سے قریب ہے۔'' اس پر کارلوس کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔

''نہیں وہ آپ کے لشکر سے زیادہ قریب ہے۔'' کارلوس کے ان الفاظ پر خیرالدین نے اطمینان کا اظہار کیا کہنے لگا۔

''اگر یہ بات ہے تو سنو میں نے جو اپنے پانچ ساتھی تم لوگوں کی حفاظت پر مقرر کیے ہوئے ہیں وہ بروشس اور بجانس کے معاملے میں تم لوگوں کی خوب حفاظت کریں گے بجانس سے ویسے بھی تم لوگوں نے کچھ دنوں کی مہلت مانگی ہے اگر وہ اس مہلت سے پہلے آجائے تو جو محافظ میں نے تمہارے ساتھ کیے ہوئے ہیں ان میں سے کسی کو میری طرف بھیجنا میں خود ہی بجانس اور بروشس سے نبٹ لوں گا۔''

جواب میں دکھ بھرے انداز میں کارلوس کہنے لگا۔

''لیکن میرے بھائی اتنی مہلت کہاں ملے گی اگر بروشس غصے اور انتقامی حالت میں زیادہ مسلح جوان لے کر آجاتا ہے تو وہ پانچ محافظ تو دفاع نہیں کر پائیں گے اور جب تک ان میں سے کوئی تمہارے پاس پہنچے گا اس وقت تک بروشس اور بجانس اور ان کے ساتھی تو زبردستی میری بہن روجینا کو اٹھا کر لے جائیں گے۔''

کارلوس کے ان الفاظ پر خیرالدین بھی کچھ فکرمند ہوگیا تھا کچھ سوچا پھر اس کے بعد کارلوس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہنے لگا۔

''کارلوس اس وقت جو لشکر ہم لے کر آئے ہیں اس میں کوئی عورت نہیں ہے اگر تم بروشس اور بجانس سے اپنی بہن کے لیے زیادہ خطرہ محسوس کرتے ہو تو ابھی اسی وقت فی الفور واپس جاؤ اپنی ماں اور بہن کو لے کر یہاں آجاؤ محافظوں کو بھی ساتھ لے آنا اپنے مکان کو باہر سے قفل لگا آنا یہاں تمہارے آنے تک کچھ خیمے نصب ہوں گے ایک خیمہ تمہارے لیے مختص کر دیا جائے گا اس میں رات بسر کرنا اگلے روز ویسے ہی ہم نے دشمن سے ٹکرانا ہے اور مجھے امید ہے کہ ہم دشمن کی کسی بھی قوت کو جزیرہ لزبس میں نہیں رہنے دیں گے میرا دل کہتا ہے آج اگر دشمن قوتیں جزیرہ لزبس پر قابض ہیں تو آنے والی شب کے بعد جب سورج طلوع ہوگا تو سورج لزبس پر ہمارا قبضہ دیکھے گا۔''

خیرالدین کی اس تجویز سے کارلوس نے اتفاق کیا تھا لہٰذا خیرالدین سے اجازت لے کر وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور لمحے سرپٹ دوڑاتا ہوا واپس جا رہا تھا۔

سورج غروب ہونے کے لیے جھک رہا تھا نبارہ اور روجینا دونوں ماں بیٹی اپنے دیوان خانے میں بیٹھی گفتگو کر رہی تھیں ساتھ ہی بڑی بے چینی سے کارلوس کی واپسی کا بھی انتظار کر رہی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی تھی یہ دستک سن کر دونوں ماں بیٹی چونک پڑی تھیں دھیمے سے لہجے میں نبارہ روجینا کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''بیٹی تو یہیں بیٹھ میں دیکھتی ہوں کون ہے۔'' اس کے ساتھ ہی نبارہ اٹھ کر صدر دروازے کی طرف ہولی تھی دروازے کے اندر جو بڑا سوراخ تھا اس میں سے نبارہ نے جب دیکھا تو دنگ رہ گئی چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں اس لیے کہ باہر بجانس کھڑا تھا اس کے ساتھ کچھ مسلح آدمی بھی تھے پھر اپنے آپ کو کچھ سنبھالتے ہوئے نبارہ نے دروازہ کھولے بغیر پوچھ لیا۔

''کون ہے۔'' جواب میں بجانس دھیمے سے لہجے میں کہنے لگا۔ ''نبارہ خاتون دروازہ کھولو میں بجانس ہوں۔''

''کیا کام ہے۔'' نبارہ نے پھر پوچھا تھا۔

''وہی کام ہے جس کے سلسلے میں پہلے ہو کر گیا تھا ہم روجینا کو لینے کے لیے آئے ہیں یہ بروشس کا حکم ہے۔'' بجانس نے ایک ہی سانس میں کہہ دیا تھا۔

بجانس جب خاموش ہوا نبارہ اس کے ان الفاظ کا جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ بجانس کے دو مسلح جوان آہ زاری کرنے لگے اس لیے کہ چھت کی طرف سے ان پر کسی نے تیر اندازی کی تھی ساتھ ہی کسی کی کھولتی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

''اس گھر میں سب نہتے نہیں رہتے' ان گھر والوں کی حفاظت کے لیے ایک مسلح دستہ موجود ہے میں نے ابھی تم لوگوں کے صرف دو ساتھیوں کو زخمی کیا ہے ابھی اور اسی وقت اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر یہاں سے دفع ہو جاؤ اگر ایسا نہیں کرو گے یا دیر لگاؤ گے تو پھر تم میں سے کسی کو بھی سلامتی کے ساتھ واپس جانا نصیب نہیں ہوگا۔''

اس کے ساتھ ہی تیروں کی ایک اور تیز کافی بڑی بوچھاڑ آئی اور سامنے والی دیوار پر کئی تیر پیوست ہوگئے تھے۔

یہ صورت حال بجانس کے لیے واقعی تشویش ناک تھی لہٰذا وہ خود بھی اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا سوار ہوا اس کے ساتھی بھی سوار ہوگئے تھے جو زخمی تھے وہ بھی کراہتے سسکتے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے پھر وہ اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے تھے۔

نبارہ نے سکھ کا سانس لیا دروازے سے ہٹ کر جب حویلی کے صحن میں آئی تو چھت کے اوپر سے کسی نے نبارہ کو مخاطب کیا۔ ''اماں پریشان اور فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے اس وقت یہاں آپ کی حویلی کے چھت اور پشتی حصے میں آپ کے پانچ مسلح بیٹے بالکل تیار اور مستعد ہیں کسی نے حویلی کا دروازہ توڑنے کی کوشش کی یا دیوار پھاندنا چاہی تو ایسا کوئی شخص بچ کر نہیں جائے گا ہاں اگر کوئی تم لوگوں کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہوا تو وہ ہم پانچوں کی لاشوں سے گزر کر جائے گا۔''

یہ الفاظ روجینا نے بھی سن لیے تھے اس لیے کہ وہ بھی دیوان خانے سے باہر نکل آئی تھی اس موقع پر جب نبارہ روجینا کے قریب گئی تب روجینا بڑی پریشانی میں اپنی ماں کو مخاطب کر کے کہنے لگی اماں کون تھا۔

جواب میں نبارہ کہنے لگی۔

''بیٹی بجانس آیا تھا اس کے ساتھ اس کے کافی مسلح جوان تھے اور وہ زبردستی تمہیں لیجانا چاہتا تھا خیرالدین نے جو پانچ محافظ مقرر کیے ہوئے تھے انہوں نے چھت کے اوپر سے ایسی تیز تیر اندازی کی ان میں سے کچھ کو زخمی کیا جس کے بعد ان کے دھمکی دینے پر وہ سب یہاں سے بھاگ گئے ہیں۔''

نبارہ کے ان الفاظ پر روجینا پیلی پڑ گئی تھی دکھ بھرے انداز میں کہنے لگی۔

''اماں اس کا مطلب ہے ہم یہاں خطرات میں گھرے ہوئے ہیں اور ہماری زندگیاں خطرے میں ہیں بھائی کارلوس بھی یہاں نہیں ہے پتا نہیں اس کی ملاقات خیرالدین سے ہوئی بھی ہے کہ نہیں اور پھر اماں بجانس واپس چلا گیا ہے اگر وہ اور بروشس زیادہ مسلح جوان لے کر آگئے تو اماں یہ پانچ محافظ بیچارے جو اپنے آپ کو آپ کے بیٹے اور میرے بھائی کہتے ہیں یہ ہمارا دفاع تو نہیں کر پائیں گے۔''

روجینا جب خاموش ہوئی اور نبارہ اس کے ان خدشات کا جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ حویلی کے دروازے پر پھر دستک ہوئی تھی روجینا بیچاری پیلی ہوگئی تھی روئے والی ہوگئی تھی نبارہ پھر

دروازے کی طرف بڑھی اتنی دیر تک انہوں نے محسوس کیا کہ چھت کے اوپر پھر وہ پانچ جوان حرکت میں آئے تھے اس لیے ان کے چلنے کی آوازیں سنائی دی تھیں نبارہ جب بیرونی دروازے پر آئی سوراخ میں سے دیکھا تو کسی قدر پرسکون ہوگئی اس لیے کہ دروازے پر کارلوس اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے کھڑا تھا۔

نبارہ نے دروازہ کھول دیا کارلوس اندر داخل ہوا اسے دیکھتے ہی روجینا نے بھی اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا کارلوس نے گھوڑے کو صحن ہی میں کھڑے رہنے دیا اصطبل میں نہیں باندھا اپنی ماں کے ساتھ جب وہ روجینا کے قریب آیا تب روجینا نے اس کی غیر موجودگی میں جو واقعات پیش آئے تھے وہ سب کہہ دیے تھے۔

سب کچھ سن کر کارلوس بھی پریشان اور فکر مند ہوگیا تھا پھر اپنی ماں اور بہن کو کہنے لگا۔

''اماں تم اور روجینا فی الفور تیار ہو جاؤ میں خیرالدین سے مل کر آرہا ہوں وہ ہماری حفاظت کے لیے بڑا بے چین ہے اماں اگر میری غیر موجودگی میں بجائس مسلح جوان لے کر آیا تھا اور واپس چلا گیا ہے اور اس کے کچھ ساتھی زخمی بھی ہوئے ہیں تو پھر ہمارے لیے خطرات بڑھ گئے ہیں اس بار بروشس زیادہ مسلح جوان لے کر آئے گا اور ہمارے لیے خطرہ بن جائے گا آپ اور روجینا فی الفور اپنا ضروری سامان لیں اپنے کپڑے سنبھالیں اور گٹھڑیاں بنائیں یا خرجینوں میں ڈالیں فالتو سامان لینے کی ضرورت نہیں اتنی دیر تک میں تم دونوں کے گھوڑوں پر زینیں ڈالتا ہوں پھر یہاں سے چلتے ہیں اماں آنے والی شب ہم خیرالدین کے لشکر میں خیمے میں گزاریں گے اس کا انتظام میرے جانے تک خیرالدین کر دے گا اگلے روز مسلمان اس جزیرے میں موجود عسکری قوتوں سے ٹکرائیں گے اور جہاں تک مجھے خیرالدین نے یقین دلایا ہے کہ وہ اس جزیرے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے ایسی صورت میں اماں ہم بالکل محفوظ ہو جائیں گے اب جلدی کرو وقت ضائع نہ کرو اس کے بعد اپنا منہ چھت کی طرف لیجاتے ہوئے کارلوس نے محافظوں کو آواز دی اور انہیں بھی اس نے کہا کہ وہ اپنے گھوڑوں کو تیار کریں ابھی اور اسی وقت لشکر گاہ کی طرف جائیں گے۔''

نبارہ اور روجینا تقریباً بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی تھیں اور اپنا سامان سمیٹنے لگی تھیں۔ کارلوس کی ضروری چیزیں اور اس کے لباس بھی خرجینوں میں ڈالنے لگی تھیں۔ کارلوس نے اپنی ماں اور بہن دونوں کے لیے گھوڑوں کو تیار کر دیا پھر جب وہ سامان سمیٹ کر باہر آئیں تو سارا سامان گھوڑوں کی زینوں سے باندھ دیا گیا۔ تینوں حویلی سے باہر نکلے اتنی دیر تک دوسری طرف سے وہ پانچوں محافظ بھی ان کے پاس آن کھڑے ہوئے تھے کارلوس نے حویلی کو باہر سے قفل لگایا تینوں اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے پھر تینوں اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر جنوب کی طرف بڑھ رہے تھے پانچوں محافظ جو پوری طرح مسلح تھے ان کے پیچھے پیچھے اپنے گھوڑوں کو دوڑا رہے تھے۔

جب وہ جنوبی ساحل پر مسلمانوں کی لشکر گاہ کے باہر پہنچے تو خیرالدین نے ان کا استقبال کیا اس وقت تک سورج غروب ہو چکا تھا چاروں طرف گہری تاریکیاں پھیلی ہوئی تھیں لیکن لشکر گاہ میں جگہ جگہ کیونکہ مشعلیں روشن تھیں جنہوں نے ماحول کو روشن کر دیا تھا خیرالدین کے پاس آ کر سب اپنے گھوڑوں سے اتر گئے سب سے پہلے نبارہ خیرالدین کے پاس گئی پہلے اس کے شانے پر ہاتھ پھیرا پھر کہنے لگی۔

''بیٹے میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں تمہارا شکریہ ادا کروں۔'' نبارہ اس سے آگے بھی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اسے خاموش ہو جانا پڑا کیونکہ خیرالدین اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''اماں یہ عجیب سی بات ہے آپ مجھے بیٹا بھی کہہ کر پکارتی ہیں اور ساتھ ہی میرا شکریہ بھی ادا کرنا چاہتی ہیں کیا کوئی بیٹا اپنی ماں پر بھی احسان کر سکتا ہے اور اگر کوئی بیٹا اپنی ماں کی بہتری کے لیے کام کرتا ہے تو اس کے لیے ماں کو اس کا شکریہ تو ادا نہیں کرنا چاہیے یوں جانیں میں جو کچھ آپ تینوں کے لیے کیا ہے یہ میرا فرض تھا بلکہ میرا منصب بھی اس کا تقاضا کرتا ہے۔''

یہاں تک کہتے کہتے خیرالدین کو بھی رک جانا پڑا اس لیے کہ نبارہ بول اٹھی۔ ''کیسا منصب بیٹے۔'' خیرالدین مسکرایا اور کہنے لگا۔

''آپ جانتی ہیں جزیرہ سلانیک میں آپ کی بیٹی نے مجھ کو اپنا محافظ مقرر کیا تھا اس کے لیے مجھے ایک رقم بھی دی تھی چنانچہ میرا منصب اس وقت آپ لوگوں کے محافظ کا تھا جس وقت میں وہاں سے نکلا اس وقت تک میں اس منصب پر قائم تھا اس کے بعد آپ تینوں میں سے کسی نے بھی مجھے اس منصب سے معزول نہیں کیا تھا اس بناء پر میرا منصب بھی اس بات کا تقاضا کرتا تھا کہ میں ہر موقع پر آپ لوگوں کی مدد کروں۔''

روجینا جو ابھی تک چپ اور خاموش کھڑی تھی شاید انتظار میں تھی کہ اس کی ماں گفتگو کا سلسلہ ختم کرے تو وہ خیرالدین کو مخاطب کرے چنانچہ خیرالدین جب خاموش ہوا تو روجینا جھٹ سے بولی اور کہنے لگی۔

''میں بھی آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں بلکہ آپ سے معذرت خواہ بھی ہوں اس لیے کہ جس وقت ہم واپس قسطنطنیہ جانے کے لیے ساحل پر کھڑے تھے اور آپ ہمیں الوداع کہنے کے لیے آئے تھے تو میں پیٹھ پھیر کر آپ سے ملے بغیر جہاز پر سوار ہوگئی تھی وہ میری بہت بڑی غلطی تھی اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں اور مجھے ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا میں اس بات کو بھی تسلیم کرتی ہوں کہ جزیرہ سلانیک میں جن مسلمانوں کو قیدی کی حیثیت سے رکھا تھا وہ بروشس اور بجائس کی بہت بڑی غلطی تھی اور اس غلطی میں ہمارا دادا قسطنطین بھی شامل تھا شاید میرے دادا کو اسی کی سزا مل گئی ہے اور وہ قسطنطنیہ کی حکومت سے محروم کر دیا گیا ہے جبکہ اب تو وہ اس دنیا ہی میں نہیں رہا میں اس لحاظ سے بھی آپ کی بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے بروشس اور بجائس کے مقابلے میں ہمیں تحفظ دیا ورنہ ہم تینوں کو ان وحشیوں سے نہیں بچایا جا سکتا تھا۔''

یہاں تک کہنے بعد روجینا رکی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہنے لگی۔

''جب تک ہم قسطنطنیہ میں تھے ان دونوں کو اس موضوع پر گفتگو کرنے کی جرات اور جسارت نہیں ہوئی تھی جب انہوں نے دیکھا کہ قسطنطنیہ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں رہا اور ہم نے جزیرہ لزبس میں قیام کر لیا ہے تب انہوں نے پر پرزے نکالے اور بروشس نے میرا رشتہ مانگ لیا شاید وہ پہلے سے مجھے پسند کرتا ہوگا لیکن قسطنطنیہ میں میری حیثیت کو دیکھتے ہوئے اسے ایسا سوال کرنے کی جرات اور جسارت نہ رہی ہوگی بہرحال حالات کچھ بھی رہے ہوں میں آپ کا شکریہ بھی ادا کرتی ہوں اور اپنے پرانے رویے پر معذرت خواہ بھی ہوں۔''

روجینا جب خاموش ہوئی تب خیرالدین مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''اس کا مطلب ہے میرے ساتھ جو آپ لوگوں کا ایک رابطہ اور تعلق تھا اسے آپ نے ختم کر دیا کیسے رابطے اور تعلق کو ختم کر دیا۔'' روجینا نے سوالیہ سے انداز میں خیرالدین کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ لیا تھا۔

''رابطہ اور تعلق یہ تھا کہ میں محافظ تھا اب جبکہ آپ اپنے رویے پر معذرت کر رہی ہیں میرا شکریہ بھی ادا کر رہی ہیں تو اس کا مطلب آپ نے اس تعلق اور رشتے کو ختم کر دیا۔'' اس کے

ساتھ ہی اپنے لباس کے اندر سے نقدی کی ایک تھیلی خیرالدین نے نکالی وہ تھیلی اپنے دائیں ہاتھ میں تولتے ہوئے ایک دم اس نے کارلوس کا ہاتھ پکڑا اور نقدی کی تھیلی اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''کارلوس جس طرح میں نے تمہارا ہاتھ پکڑ کر نقدی کی یہ تھیلی تمہارے ہاتھ پر رکھی ہے اسی طرح کبھی جزیرہ سلانیک میں تمہاری بہن روجینا نے میرا ہاتھ پکڑ کر یہ نقدی کی تھیلی میرے ہاتھ پر رکھی تھی اب میری نسبت نقدی کی اس تھیلی کی آپ کو زیادہ ضرورت ہے میرے بھائی اسے اپنے پاس رکھو۔''

خیرالدین کے ان الفاظ کے جواب میں کارلوس کسی ردعمل کا اظہار کرنا ہی چاہتا تھا کہ نبارہ بول اٹھی۔

''بیٹے یہ تھیلی تم اپنے پاس رکھو اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے بچے ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔'' خیرالدین بات کو ٹال گیا اور کہنے لگا۔

''آپ تینوں ہمارے ساتھ آئیں آپ کو آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔'' اس کے ساتھ ہی وہ ایک طرف ہو لیا نبارہ روجینا اور کارلوس چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیے جب وہ ایک خیمے کے پاس گیا تو کچھ لشکری بھاگتے ہوئے آئے اور ان تینوں کے گھوڑوں کو پکڑ کر ایک طرف لے گئے تھے پھر خیرالدین ایک خیمے کے دروازے پر کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

''اب آپ تینوں اس خیمے کے اندر جائیں آج کی شب آپ تینوں اسی میں بسر کریں گے کل صبح ہمارا لشکر جزیرے کے اندرونی حصوں کی طرف پیش قدمی کرے گا اور جزیرے کے اندر جو لشکر ہے اس سے ٹکرائے گا پھر دیکھیں گے کہ کیا بنتا ہے۔''

اس موقع پر روجینا نے خیرالدین کی طرف دیکھا پھر اندیشوں بھری آواز میں کہنے لگی۔

''اگر اس جزیرے میں مسلمانوں کو پسپائی اختیار کرنی پڑ گئی تو پھر کیا بنے گا۔'' خیرالدین مسکرا دیا۔

''کچھ نہیں بنے گا ہم پسپائی کے لیے جزیرے میں داخل نہیں ہوئے کل کا دن فیصلے کا دن ہوگا اور دشمن کی جو بھی قوت جزیرے میں ہے اسے ہم کھنگال کر رکھ دیں گے ہم جانتے ہیں اس جزیرے میں اس وقت جنیوا کا سپہ سالار جان عطیاس یونانی سپہ سالار ڈیوک فوکارس قسطنطنیہ کا سپہ سالار جسٹنائی اس کے علاوہ جزیرہ روڈس اور سلانیک کے بحری قزاق بھی اپنی قوتوں کے ساتھ یہاں ڈیرے جمائے ہوئے ہیں خداوند قدوس نے چاہا تو ان ساری قوتوں کو ہم کھنگال اور نچوڑ کر رکھ دیں گے اب آپ تینوں خیمے کے اندر جائیں اندر آپ تینوں کے بستر لگے ہوئے ہیں آپ کو پریشان اور فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں اب جاتا ہوں تھوڑی دیر بعد ایک آدمی آپ کا کھانا کمرے میں لگا دے گا کھانا کھا کر برتن ایک طرف رکھ دیجیے گا وہ خالی برتن لے جائے گا اس کے بعد آرام کیجیے گا۔''

خیرالدین کے ان الفاظ کے جواب میں روجینا پھر کچھ کہنا چاہتی تھی کہ خیرالدین وہاں سے ہٹ گیا پھر تینوں خیموں میں داخل ہو گئے تھے۔

دوسری طرف بروشس اور بجانس دونوں اپنے کچھ مسلح ساتھیوں کے ساتھ اس جگہ پہنچے جہاں کارلوس نبارہ اور روجینا کی رہائش تھی وہ ایک عمدہ قسم کی دو منزلہ حویلی تھی کافی بڑی تھی اس کا صدر دروازہ بڑا مضبوط اور مستحکم تھا اس حویلی کے سامنے آ کر بروشس اور بجانس دونوں اپنے گھوڑوں سے اترے اور ان کے ساتھ جو مسلح آدمی تھے وہ بھی اپنے گھوڑوں سے اتر گئے بروشس اور بجانس دونوں آگے بڑھے دروازے کا تھرپ جا کر اداس اور افسردہ حالت

میں بروشس رک گیا اور بجانس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''بجانس اس حویلی کے صدر دروازے پر تو قفل لگا ہوا ہے اس کا مطلب ہے یہاں سے وہ کہیں اور چلے گئے ہیں۔''

بجانس کچھ دیر سوچتا رہا پھر بروشس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''یہ بھی تو ممکن ہے ہمیں دھوکے میں رکھنے کے لیے انہوں نے حویلی کو باہر سے قفل لگا دیا ہو تا کہ ہمیں یہی تاثر ملے کہ وہ یہاں سے جا چکے ہیں جب کہ وہ حویلی کے اندر ہی موجود ہوں۔''

بجانس کے اس مشورے پر بروشس نے کچھ سوچا اس کے چہرے پر طنزیہ سی مسکراہٹ بھی نمودار ہوئی پھر کہنے لگا۔

''بجانس تمہارا کہنا بھی بجا ہے روجینا کو حاصل کرنے کے لیے ہمارے پاس صرف آج کا موقع ہے کل یقیناً مسلمان ہم سے ٹکرا جائیں گے پھر دو کاموں میں سے ایک ہوگا یا ہم مسلمانوں پر حاوی ہو جائیں گے اور انہیں شکست دے کر جزیرے سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے یا مسلمان ہمیں نہس نہس کر کے رکھ دیں گے اور ہمیں یہاں سے بھاگنا پڑے گا دونوں صورتوں میں ہم روجینا کو حاصل نہیں کر سکیں گے اس لیے کہ اگر مسلمان غالب اور کامیاب رہے تو اس جزیرے پر ان کا قبضہ ہو جائے گا اور ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا ایسی صورت میں روجینا ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گی۔

اور اگر اس جزیرہ لزبس میں ہم کامیاب رہے مسلمانوں کو اگر ہم نے پسپا کر دیا تب بھی مسلمان ساحل پر جا کر پڑاؤ کریں گے بھاگیں گے نہیں اس لیے کہ وہاں ان کا بحری بیڑا کھڑا ہوا ہے اور تم جانتے ہو جس وقت ہمارا بحری بیڑہ ان کے قریب گیا تھا تو ان کی چھوٹی کشتیاں بڑی سرعت کے ساتھ حرکت میں آئی تھیں اور ان کے اندر سے نفت لگے تیر جلتے ہوئے ہمارے جہازوں کی طرف آئے تھے اگر ہمارا بحری بیڑہ کچھ دیر وہاں کھڑا رہتا تو یقیناً وہ جلتے تیروں کی تیر اندازی ہمارے بحری جہازوں کو جلا کر رکھ دیتی۔

ایسی صورت میں بھی ہم روجینا کو حاصل نہیں کر سکیں گے اس لیے کہ مسلمانوں کا پڑاؤ اس بستی سے نزدیک ہے اور پھر دوسرا اندیشہ یہ بھی ہے کہ تم جانتے ہو کہ یہ تو ہمیں پتا چل چکا ہے کہ فرانزا جس نے جزیرہ سلانیک میں داخل ہو کر تم سے تیغ زنی کا مقابلہ جیتا تھا اور یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ عیسائی ریاست طرابزون سے تعلق رکھتا ہے حقیقت میں وہ مسلمانوں کا سالار خیرالدین ہے جو سلطان کے بہترین اور عمدہ سالاروں میں شمار کیا جاتا ہے اور ہمیں یہ بھی پتا چل چکا ہے کہ مسلمانوں کا جو لشکر اس جزیرے پر حملہ آور ہونے کے لیے آیا ہے اس لشکر میں سالار کی حیثیت سے خیرالدین بھی شامل ہے لہٰذا یہ بھی ممکن ہے کہ روجینا اس کی ماں نبارہ بھائی کارلوس تینوں بھاگ کر خیرالدین کے پاس چلے جائیں اس لیے کہ خیرالدین ان تینوں کو جانتا ہے اور خیرالدین ان سے خوب آشنا ہیں اس لیے کہ جزیرہ سلانیک میں روجینا نے اسی خیرالدین کو اپنا محافظ مقرر کیا تھا اور لگاتار پچیس دن تک اسے اپنے ساتھ رکھا تھا ایسی صورت میں بھی ہم روجینا کو حاصل نہیں کر سکیں گے۔

بجانس تم جانتے ہو میں ایک عرصہ سے روجینا کو پسند کرتا رہا ہوں جب وہ اپنے شباب میں داخل نہ ہوئی تھی تب بھی وہ میری پسند تھی اور جب بھی وہ جزیرہ سلانیک میں جاتی تھی میں سمجھتا تھا میرے لیے خوشیوں کی بہار آ گئی ہے جب تک اس کا دادا قسطنطنیہ کا بادشاہ تھا مجھے اس کے حاصل کرنے کی کوئی آمید نہ تھی اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اسے اپنانے کے لیے میں مایوس بھی تھا

لیکن جب مسلمانوں نے حملہ آور ہو کر قسطنطین کا ہی کام تمام کر دیا تو پھر مجھے امید ہوئی کہ روجینا کو حاصل کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ اب میرے لیے راستہ صاف تھا وہ شاہی خاندان جس کی وجہ سے میں دبتا تھا روجینا کو اپنا نہیں سکتا تھا اس کا خاتمہ ہو چکا ہے لہٰذا اب میں روجینا کو حاصل کر سکتا ہوں۔''

یہاں تک کہنے کے بعد بروشس رکا دوبارہ بجانس کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''بجانس میرے بھائی اپنے کسی مسلح جوان کو حویلی کے اندر اتارو دیوار پھاند کر اندر جائے اور دیکھے کہ اندر کوئی ہے کہ نہیں۔''

بجانس نے اس سے اتفاق کیا تھا لہٰذا بجانس کے کہنے پر ان کے دو مسلح ساتھی دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے کچھ دیر تک بروشس بجانس اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ باہر کھڑے ہو کر انتظار کرتے رہے یہاں تک کہ ان کے دو ساتھی اندر گئے تھے وہ دیوار پھاند کر باہر آئے اور مایوس اور افسردہ تھے ان کے چہرے بتاتے تھے کہ ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے بروشس اور بجانس کے پاس آ کر ان میں سے ایک ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''یہ حویلی بالکل خالی پڑی ہوئی ہے اندر کوئی بھی نہیں ہے۔'' اس کے ان الفاظ پر بروشس اداس اور افسردہ ہو گیا تھا اس کی یہ حالت دیکھتے ہوئے بجانس کا منہ بھی لٹک گیا تھا کچھ دیر خاموش رہ کر بروشس کچھ سوچتا رہا پھر بجانس کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''بجانس یہ ذرا سامنے والی حویلی پر دستک دو اور کسی کو باہر آنے کے لیے کہو۔''

بجانس مڑا اور سامنے جو حویلی تھی اس کے دروازے پر دستک دی تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان نے دروازہ کھولا بروشس خود اس کے پاس گیا اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''میرے عزیز شاید تم جانتے ہو گے کہ سامنے والی حویلی میں کچھ نئے لوگوں نے رہائش اختیار کی تھی۔'' اس پر وہ نوجوان مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''آپ کا اندازہ درست ہے سامنے والی حویلی میں قسطنطنیہ کے شہنشاہ قسطنطین کی پوتی پوتے اور بہو نے یہاں آ کر قیام کیا تھا۔''

اس نوجوان کے اس جواب پر بروشس خوش ہو گیا تھا دوبارہ اسے مخاطب کیا کہنے لگا۔

''کیا تم جانتے ہو وہ اس وقت کہاں ہیں۔'' اس پر وہ نوجوان پھر بولا اور کہنے لگا۔

''شام کے بعد جب اندھیرا گہرا ہو گیا تو وہ تینوں یہاں سے نکلے ان کے ساتھ کچھ مسلح جوان بھی تھے حویلی کو انہوں نے باہر سے قفل لگایا اور گھوڑوں پر بیٹھ کر کہیں چلے گئے کہاں گئے اس کا کچھ پتا نہیں ہے۔''

بروشس نے کچھ سوچا دوبارہ اس نوجوان کو مخاطب کیا۔ ''وہ مسلح جوان جن کے ساتھ گئے کب اور کس طرف سے یہاں آئے تھے۔''

اس پر وہ نوجوان پھر بولا اور کہنے لگا۔

''وہ کہیں سے نہیں آئے آپ جانتے ہیں یہ حویلی دو منزلہ ہے اوپر والی منزل پر چار پانچ مسلح نوجوان رہتے تھے جو ان کے محافظ تھے وہی انہیں لے کر کہیں چلے گئے ہیں۔''

یہ جواب سن کر بروشس اداس اور افسردہ ہو گیا تھا اس نوجوان نے دروازہ بند کر دیا بروشس پیچھے ہٹا بجانس اس کے پیچھے پیچھے تھا تھوڑا سا آگے جا کر بروشس رکا پھر بجانس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''بجانس تمہارا کیا خیال ہے نبارہ روجینا اور کارلوس کہاں گئے ہوں گے۔''

اس پر بجانس نے کچھ سوچا پھر کہنے لگا۔

''میرا اندازہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے لشکر کی طرف چلے گئے ہیں۔'' اس پر بروشس نے

دکھ بھرے انداز میں کہنا شروع کیا۔

''اگر ایسا ہے تو پھر میرے خیال میں اب روجینا کا ملنا محال ہے آؤ واپس چلتے ہیں پھر دیکھتے ہیں اگلا قدم ہم کیا اٹھا سکتے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی بروشس اور بجانس اپنے ساتھیوں کو لے کر وہاں سے واپس چلے گئے تھے۔

☆☆

اگلے روز صبح ہی صبح مسلمانوں کے لشکر کے سالار اعلیٰ کدک احمد نے اپنا پڑاؤ ختم کر کے ہر چیز سمیٹنے کا حکم دیا تھا لہٰذا لشکر آندھی اور طوفان کی طرح حرکت میں آیا اور خیمہ گاہ اکھیڑی جانے لگی تھی۔

جس وقت خیمے اکھیڑ کر تہہ کیے جا رہے تھے اور باربرداری کے جانوروں پر لادے جا رہے تھے نبارہ روجینا اور کارلوس تینوں اپنے خیمے سے باہر آن کھڑے ہوئے تھے اور جو سامان وہ اپنے ساتھ لائے تھے وہ اپنے پاس انہوں نے زمین پر رکھا ہوا تھا اتنے میں ایک طرف سے ایک مسلح جوان تین گھوڑوں کی باگیں پکڑے ان کے پاس آیا وہ ان تینوں کے گھوڑے تھے پھر گھوڑے لانے والا نوجوان کارلوس کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''تھوڑی دیر تک لشکر یہاں سے جزیرے کے اندرونی حصوں میں اس سمت پیش قدمی کرے گا جہاں ہم نے دشمن کی قوت سے ٹکرانا ہے آپ کے یہ تینوں گھوڑے ہیں میرے خیال میں آپ اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر کوچ کے لیے تیار رہیں۔''

اس نوجوان کو مخاطب کر کے کارلوس کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ ایک طرف سے اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا خیرالدین آیا ان کے پاس آتے ہوئے گھوڑے کی باگیں کھینچتے ہوئے اس نے گھوڑے کو روکا گھوڑا وحشیانہ انداز میں اگلی دونوں ٹانگیں اٹھاتا ہوا ہنہنایا اس موقع پر خیرالدین نے اپنے گھوڑے کی گردن تھپتھپائی پھر اپنے گھوڑے سے کودا اور کارلوس کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''لشکر ابھی تھوڑی دیر تک یہاں سے جزیرے کے وسطی حصے کی طرف کوچ کرے گا میرے خیال میں وہیں ہمیں دشمن سے ٹکرانا ہوگا آپ لوگوں کو فکرمند اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے دشمن کے سامنے پڑاؤ قائم کیا جائے گا اور آپ پڑاؤ میں رہیں گے پڑاؤ کی حفاظت کا خاطر خواہ اہتمام کیا جائے گا مجھے کچھ انتظامات کرنے ہیں میں جانتا ہوں جنگ کے بعد خداوند قدوس نے چاہا تو آپ سے ملاقات ہو گی میں صرف آپ لوگوں کو ڈھارس دینے آیا تھا کہ فکرمندی اور پریشانی کی کوئی بات نہیں۔'' اس کے ساتھ ہی خیرالدین نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہاں سے ہٹ گیا تھا تھوڑی دیر بعد پورا لشکر جزیرہ لزبس کے وسطی حصے کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔

دوسری طرف دشمن قوتوں کو بھی مسلمانوں کے لشکر کی پیش قدمی کا علم ہو گیا تھا لہٰذا مقابلہ کرنے کے لیے انہوں نے اپنے لشکر کو تیار اور مستعد کر کے صفیں درست کرنا شروع کر دی تھیں دوسری طرف مسلمانوں نے بھی ان کے سامنے آ کر اپنا پڑاؤ قائم کر لیا اس کے بعد وہ بھی لشکر کی صفیں درست کرنے لگے تھے۔

جزیرہ لزبس میں دشمن قوتوں کے لشکر کی تعداد کافی زیادہ تھی لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا وسطی حصے میں یونانی سپہ سالار ڈیوک فوطارس کو رکھا گیا بائیں حصے میں جنیوا کا سپہ سالار جان عطیاس تھا اور دائیں جانب کے حصے کی کمانداری قسطنطنیہ کا سابق سپہ سالار جسٹنانی کر رہا تھا جس کے تحت یورپ کے بہت سے ملکوں کے نائٹس اور ٹیمپلر بھی آ کر شامل ہو چکے تھے۔

دشمن کے لشکر کے مقابلے میں مسلمانوں نے اپنے لشکر کے تین بڑے حصے اور ایک چھوٹا حصہ

رکھا درمیان والے حصے میں سپہ سالار اعلیٰ کدک احمد خود رہا دائیں حصے کی سالاری خیرالدین کی کمانداری میں تھی اور سعدالدین اس کے نائب کی حیثیت سے کام کر رہا تھا لشکر کے بائیں پہلو کی کمانداری عمر پاشا کے پاس تھی اور اسماعیل بے نام کا دوسرا سالار اس کی نیابت کر رہا تھا جبکہ ایک اور چھوٹے سالار کو لشکر کا ایک چھوٹا حصہ دے کر پڑاؤ کی حفاظت پر مقرر کر دیا تھا۔

اجتماعی جنگ شروع کرنے سے پہلے شاید جان عطیاس ڈیوک فوطارس اور جسٹنانی نے انفرادی مقابلہ منعقد کرانے کا فیصلہ کیا تھا شاید ایسا کر کے وہ اپنے لشکریوں کے حوصلے بلند کرنا چاہتے تھے ان کا مقصد انفرادی مقابلہ جیتنا تھا اور اس جیت سے وہ چاہتے تھے ان کا لشکریوں کے حوصلے اور ولولے بلند ہوں گے اور وہ زیادہ جانفشانی اور خونخواری سے مسلمانوں کے مقابلے میں حرکت میں آئیں گے۔

چنانچہ انفرادی مقابلے کے لیے انہوں نے یورپ کا ایک مانا ہوا نائٹ میدان میں اتارا جو سر سے لے کر پاؤں تک لوہے میں غرق تھا سیاہ رنگ کے ایک وحشی گھوڑے پر سوار تھا اور اس کا گھوڑا کلیلیں کرتا بڑی تیزی سے کنوتیاں بدلتا ہنہناتا نتھنے پھڑپھڑاتا ہوا میدان کے وسطی حصے میں آیا اس کے بعد اس نائیٹ نے اپنی تلوار اور ڈھال دونوں فضا میں بلند کرتے ہوئے مسلمانوں کے لشکر کی طرف سند کر کے انفرادی مقابلے کے لیے اپنا مدمقابل مانگا۔

اس موقع پر خیرالدین اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا اس طرف آیا جہاں مسلمانوں کے لشکر کا سپہ سالار اعلیٰ کدک احمد اپنے گھوڑے پر سوار دشمن کے لشکر پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھا کدک احمد کے پاس رک کر خیرالدین کہنے لگا۔

''امیر دشمن نے انفرادی مقابلے کے لیے اپنے ایک نائیٹ کو میدان میں اتار دیا ہے مجھے اجازت دیں کہ میں انفرادی مقابلے کے لیے اتروں مجھے امید ہے کہ میں اسے زیر کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا شاید دشمن یہ چاہتا ہے کہ انفرادی مقابلہ جیت کر اپنے لشکریوں کے جذبوں کو جوان کریں پر ہم انہیں ایسا نہیں کرنے دیں گے۔''

اس موقع پر کدک احمد نے مسکراتے ہوئے خیرالدین کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا۔

''میرا رب جو اس کائنات کا مالک اور مدد اور حمایت کرنے والا ہے وہ تمہارا حامی اور ناصر ہو میرے عزیز میں تمہیں انفرادی مقابلے کے لیے اترنے کی اجازت دیتا ہوں۔''

کدک احمد کے ان الفاظ پر خیرالدین خوش ہو گیا تھا گھوڑے کو اس نے ایڑھ لگائی اور میدان کے وسطی حصے میں اس طرف بڑھا جہاں یورپ کا نائیٹ اپنے سیاہ رنگ کے گھوڑے پر سوار انفرادی مقابلے کے لیے منتظر کھڑا تھا۔

جب خیرالدین نے اس کے سامنے جا کر اپنے گھوڑے کو روکا تب نائیٹ نے ایک طنزیہ سی مسکراہٹ میں خیرالدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مقابلہ شروع کرنے سے پہلے ذرا اپنا نام تو کہو۔'' اس پر خیرالدین نے اس کی طرف دیکھا کہنے لگا۔ ''پہلے تم میدان میں اترے تھے اپنا نام کہو۔'' اس پر وہ ایک ہولناک قہقہہ لگاتے ہوئے کہنے لگا۔

''میرا نام تمہیں جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے میں نائیٹ ہوں اور یہ لفظ ہی مدمقابل پر وحشت طاری کرنے کے لیے کافی ہے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد وہ نائیٹ رکا پھر تیز نگاہوں سے خیرالدین کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا جائزہ لیا اور کہنے لگا۔

''میں دیکھتا ہوں تم نے نہ اپنے بازوؤں پر جوش پہن رکھے ہیں نہ تمہارے کندھوں تمہاری

رانوں اور ٹانگوں پر خول ہیں جو تمہیں میرے خوفناک حملوں سے بچا سکیں بس تم نے ایک ڈھال اور تلوار پکڑ لی ہے سر پر خود رکھ لیا ہے اور میرے ساتھ انفرادی مقابلہ کرنے کے لیے چلے آئے ہو کیا تمہیں اپنی زندگی عزیز نہیں ہے۔''

دھیمے سے انداز میں اس موقع پر خیرالدین مسکرایا اور کہنے لگا۔

''سن نائیٹ تو نجانے کہاں انفرادی مقابلے کرتا رہا ہے۔ یہ موت کا میدان ہے پھولوں کا نگر نہیں ہے یہاں جسموں کا آشوب اٹھتا ہے ہر پل قضا کے جگنو اڑتے ہیں اگر تجھے اپنی شجاعت کے نگارخانوں کے مضبوط اور مستحکم حصار ہونے کا اعتماد اور بھروسہ ہوتا تو تم یہ جوش اور فولاد کے خول اپنے جسم پر نہ ڈالے ہوتے تم نے یہ جو اپنے آپ کو فولاد میں ڈھانپ رکھا ہے تو یہ اس بات کی غمازی ہے کہ تم اپنے فن میں نام کار ہو نائیٹ یاد رکھنا یہ موت کے میدان کا مقابلہ ہے اور اس مقابلے میں تجھے میں زمانے بھر کی وحشتوں سا ہولناک کر بنا کر رکھ دوں گا۔''

جواب میں اس نائیٹ نے بھی ایک قہقہہ لگایا کہنے لگا۔

''ہم وہ لوگ ہیں جو کوہساروں کا وقار تک لہولہو کر کے اپنے مدمقابل پر وحموں کے ہجوم کا کاراتوں کی عصبیت اور خون میں نہائی شکستگی طاری کر دیتے ہیں۔''

جب وہ خاموش ہوا تب خیرالدین کہنے لگا۔

''تیرے کہنے سے تو کسی پر شکستگی طاری نہیں ہو جائے گی یہ تو دونوں کی تلواریں فیصلہ کریں گی کہ کون کسی پر سنگریزوں کی طرح بارش کرتا ہے اور کون کس پر جان کنی کے لمحات کی طرح نزول کرتا ہے سن نائیٹ یہ مقابلہ تقدیر اور تدبیر کی کشمکش ہو گا تم نے جو اپنے جسم پر آہنی خول چڑھا رکھے ہیں یہ تمہیں کوئی فائدہ نہیں دیں گے یہ تو تلوار ثابت کرے گی کہ کس کی حالت اس میدان میں نفرت کی میلی محرابوں درد کے بستروں عثمان حیات کی مشعلوں کی سی ہوتی ہے اور کون جلتے قہر کے اندر کس کے جسموں کی زنجیروں کو کاٹتا ہے۔''

''باتوں کو طول نہ دیں ایک دوسرے پر حملہ آور ہوں اور دونوں لشکروں پر یہ ثابت کریں کہ کون کس کو زیر کرتا ہے۔''

اس نائیٹ نے اس سے اتفاق کیا تھا لہٰذا اپنی تلوار اور ڈھال کو لہراتے ہوئے وہ صدیوں کی خاموشیوں میں ظلمتوں کے سیل زخم زخم کرتے حادثوں اور سانحوں کی طرح خیرالدین پر حملہ آور ہوا تھا۔

جوابی کارروائی کرتے ہوئے خیرالدین بھی زندگی کے حادثوں پر حکمرانی کرتی آندھیوں اور زلزلوں کی قہرمانیوں غارت گری اور ایذا رسانی طاری کرتے دہشت کے اندھیاؤ کی طرح ٹوٹ پڑا تھا۔

کچھ دیر تک دونوں اپنے گھوڑوں پر سوار جم کر ایک دوسرے پر ضربیں لگاتے رہے دفاع کرتے رہے یہاں تک کہ خیرالدین نے اسے ڈھال کا چکمہ دے کر اپنی تلوار بلند کر کے گرائی اور اس کے شانے کے ایک خول کو کاٹتے ہوئے اسے ہلکا سا زخم دیا تھا۔

زخمی ہونے پر نائیٹ کچھ مانند پڑ گیا تھا سسکارنے لگا تھا خیرالدین نے اپنے گھوڑے کو پیچھے ہٹایا اور کہنے لگا۔

''سن نائیٹ مقابلے شروع ہی میں میں نے تمہیں کہہ دیا تھا کہ تو نے اپنے آپ کو جو آہنی خولوں کے اندر چھپا ایک ہے یہ تیرے کسی کام نہیں آئیں گے دیکھ تیرے ایک خول کو تو میں نے کاٹ دیا ہے اور وہ خول کٹنے سے تیرے شانے پر زخم بھی آیا ہے اس لیے میں دیکھتا ہوں تیرے آہنی خول کے علاوہ تیری ذرہ پر بنی خون آنے لگا ہے نائیٹ سن میری اس ضرب سے یہ سمجھنا کہ میں نے تجھے عدم کی طرف روانہ کرنے کے لیے ایک

در کھول دیا ہے۔"

دونوں پھر ایک دوسرے پر وار کرتے ہوئے ٹوٹ پڑے تھے کچھ دیر تک جم کر مقابلہ کرتے رہے اس بار خیر الدین نے نائیٹ کو اپنی تلوار کا ایک اور چکمہ دیا اور اس پر یہ ظاہر کیا کہ جہاں اس نے پہلے ضرب لگائی تھی دوبارہ وہاں ضرب لگا کر وہ اس کا خاتمہ کرنے کے درپے ہے چنانچہ نائیٹ فوراً اپنی ڈھال اس طرف لے گیا اس کی تلوار پہلے ہی خیر الدین کی ڈال سے ٹکرا چکی تھی اس موقع پر برق کے کوندوں کی طرح خیر الدین حرکت میں آیا اور تلوار پہلے ہی بلند تھی وہ اس نے اس کے دوسرے شانے پر گرادی تھی اور دوسرے شانے پر چڑھا ہوا آہنی خول کٹ کر گھوڑے سے نیچے گر گیا تھا۔

اس موقع پر خیر الدین نے ایک قہقہہ لگایا کہنے لگا۔

"نائیٹ تو کہتا تھا کہ نائیٹ کا لفظ ہی دوسرے پر وحشت طاری کرنے کے لیے کافی ہے طنزیہ انداز میں تو نے مجھے مخاطب کر کے کہا تھا کہ میں نے نہ کوئی آہنی خول چڑھا رکھا ہے نہ بازوؤں پر جوش ہیں دیکھ تیرے بائیں کاندھے کا خول میں نے پہلے کاٹا تھا اب تیرے دائیں شانے کا خول پوری طرح کٹ کر علیحدہ ہو چکا ہے نائیٹ سن اب اگر میری تلوار گرل تو تیرے ایک شانے کو تیری پیٹھ تک کاٹتی چلی جائے گی۔"

خیر الدین کے ان الفاظ پر اس نائیٹ کا رنگ فق ہو گیا تھا چہرہ ہلدی ہو گیا تھا عجیب سی وحشت میں خیر الدین کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس موقع پر بروشس اور بجانس دونوں قسطنطنیہ کے سالار جسطانی کے لشکر کے اگلے حصے میں تھے بجانس اس موقع پر دکھ بھرے انداز میں بروشس کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"یہ یونانی سپہ سالار فوطارس نے انفرادی مقابلے کا فیصلہ کر کے انتہائی غلطی کی ہے پہلے میں نے مسلمانوں کی طرف سے آنے والے تیغ زن کو غور سے نہیں دیکھا تھا بروشس ذرا تو بھی غور سے اس کی طرف دیکھ ڈیوک فوطارس نے انفرادی مقابلے کے لیے جو اپنا نائیٹ اتارا تھا اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی طرف سے خیر الدین نکلا ہے جس نے جزیرہ سلانیک میں فرانزا کے نام سے مجھ سے تیغ زنی کا مقابلہ جیتا تھا تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ نائیٹ خیر الدین پر حاوی ہو جائے گا۔"

اس پر دکھ بھرے انداز میں بروشس کہنے لگا۔

"بجانس تمہارا کہنا درست ہے یہ ڈیوک فوطارس کی غلطی ہے وہ نائیٹ کسی بھی صورت خیر الدین کے مقابلے میں کامیاب اور کامران نہیں رہے گا بلکہ خیر الدین اسے کاٹ کر رکھ دے گا۔"

اس موقع پر دونوں چونک پڑے تھے اس لیے کہ عین اسی موقع پر خیر الدین نے اس نائیٹ کے کاندھے پر چڑھا آہنی خود کاٹ کر علیحدہ کر دیا تھا لہٰذا بجانس اور بروشس دونوں پریشان اور افسردہ ہو گئے تھے۔

اب خیر الدین نے اس نائیٹ پر حملہ آور ہونے کی رفتار پہلے سے تیز کر دی تھی اور وہ نائیٹ اب جارحیت ترک کر کے صرف اپنے دفاع پر اکتفا کر رہا تھا ایک موقع پر اچانک خیر الدین نے پوری طاقت اور قوت سے اپنی ڈھال اس نائیٹ کے خود پر دے ماری تھی جس کے نتیجے میں اس کا خود سر سے اتر گیا چونکہ ڈھال خود پر پڑنے سے اس نائیٹ کی آنکھوں کے آگے خیر الدین کی ڈھال آ گئی تھی ڈھال کے پیچھے ہی پیچھے خیر الدین نے اپنی تلوار بلند کر کے گرائی اور اس کی تلوار نائیٹ کو کاٹتی ہوئی نکل گئی تھی نائیٹ لاش کی صورت میں اپنے گھوڑے سے گر گیا تھا خیر الدین نیچے اترا اپنی تلوار صاف کی دوبارہ

گھوڑے پر سوار ہوا اس نائیٹ کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر وہ واپس اپنے لشکر کی طرف ہو لیا تھا۔

جب وہ کدک احمد کے پاس سے گزر کر اپنے حصے کے لشکر کے سامنے جانے لگا تب کدک احمد مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"خیر الدین میرے عزیز تیری شجاعت تیری جرات مندی تیغ زنی تیری ہنر مندی کی میں جتنی بھی تعریف کروں کم ہے میرے بھائی تیری اس کامیابی تیری اس شاندار فتح مندی پر میں تمہیں سلام پیش کرتا ہوں۔"

جواب میں خیر الدین مسکراتے ہوئے آگے نکل گیا ایک لشکری نائیٹ کے گھوڑے کو لے کر پڑاؤ کی طرف چلا گیا تھا جبکہ خیر الدین اپنے حصے کے لشکر کے سامنے بالکل تیار اور مستعد ہو گیا تھا۔

اس کے بعد اجتماعی جنگ کی ابتداء ہوئی اور یہ ابتداء دشمن کی طرف سے ہوئی تھی سب سے پہلے یونانی سپہ سالار ڈیوک فوطارس لشکر کے مرکزی حصے کے ساتھ سیاہ پوش راتوں میں ہولناک لمبی ساعتوں کی برفانی آندھیوں کی طرح آگے بڑھا اس کے بعد وہ مسلمانوں کے مرکزی حصے پر خون سمیٹتے اور قسمتوں کے حروف ارقام لہولہو کر کے ہر شے کو رعشہ بر اندام اور بخار زدہ کرتی نفرت کی کھولتی آگ کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

ڈیوک فوطارس کے بعد جنیوا کا سپہ سالار جان عطیاس حرکت میں آیا اور وہ بھی حیر کے موسموں میں ستم کی خونی برسات صحراؤں کی وحشت میں دل کی گہرائیوں تک اعصابی ہیجان برپا کرتی دریاؤں کی طغیانی اور قلب نگاری کی طرح ٹوٹ پڑا تھا۔

جان عطیاس کے بعد قسطنطنیہ کا سابق سپہ سالار اعلیٰ جسطانی اپنے کام کی ابتداء کر گیا اور وہ بھی دشت تحیر خیز کی شام غم کی پہنائیوں میں خونی لمحوں کی داستانوں مضطرب تشنگی کے نولے کھڑے کرتی ستم کی خونی برسات اور درد و کرب کی آہٹوں کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا تو مسلمانوں نے سب سے پہلے روشنی کی انوکھی نوید اجلی خواہشوں کے چراغوں طوفانی راتوں کے ٹھٹھرے سکوت میں لپکتے شعلوں کے انداز میں تکبیریں بلند کیں اس کے بعد دشمن ہی کے انداز میں انہوں نے باری باری اپنے حملوں کی ابتداء کی سب سے پہلے وسطی حصے سے کدک احمد اپنے کام کی ابتداء کر گیا اور وہ بھی دشمن پر کسی ویران صحرا سے اٹھتی غموں کی تلخیوں شب کے سایوں میں آسیب زدہ موت کی چاپ زیست کے سوگ اور زندگی کی نوحہ گری میں ہر شے کو ریزہ ریزہ کر دینے والی آندھیوں کی طرح ضربیں لگانے لگا تھا۔

کدک احمد کے بعد خیر الدین اور سعد الدین اپنے کام کی ابتداء کر گئے اور وہ بھی اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ دشمن کے بائیں پہلو پر صدیوں کی طرح گزرتی راتوں میں مرگ کی موجوں کے بجس منفی اعمال کی فطرت کے اندر گھس جانے والی بھڑکتے آتش فشاں کی حدت موت بن کر زیست کے دروازوں پر دستک دینے درد کے چڑھتے اندھیاؤ اور اجل گرفتوں کی طرح حملہ آور ہو گیا تھا۔

خیر الدین اور سعد الدین کے ساتھ ہی ساتھ لشکر کے بائیں حصے کے ساتھ عمر پاشا اور اسماعیل بے نے بھی اپنے کام کی ابتداء کی اور وہ دشمن کے دائیں حصے پر اجنبیت کی کالی فضاؤں میں جسموں کو پارہ پارہ کرتی طلب کی تڑپ لیے بے نام وحشت یاروں کے بادبانوں کو جھیر جھیر کرتی جوش مارتی موت کے مناظر اور تاریک شب میں موت کو بے نقاب کرتی بربادی کا عمل پھیلاتی فطرت کی طرح حملہ آور ہو گیا تھا۔

اس طرح جزیرہ لزبیں میں دونوں لشکروں کے ٹکرانے سے زیست کی علامتوں میں ان دیکھے طاغوتی ہاتھ ہر شے کو خون آلود کرنے لگے تھے لہو

میں ڈوبی خواہشیں انتقام کے آبشاروں کی صورت اختیار کرنے لگی تھیں تنظیم کو بکھیرتی مچلتی خون آلود حروف لکھنے لگی تھی آتے جاتے موسموں کے قافلوں میں میدان جنگ کے اندر منزلوں کا کرب داخل ہونا شروع ہو گیا تھا۔

جزیرہ لزبس میں دشمن قوتوں نے اپنی طرف سے انتہائی کوشش کی کہ مسلمانوں کو شکست دیں وہ چاہتے تھے کہ ایک بار وہ مسلمانوں کے قدم اکھیڑنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر انہیں کہیں بھی اپنے سامنے جمنے نہیں دینگے اسی بناء پر وہ اپنی پوری طاقت اور قوت کے ساتھ بدبختیوں سے لبریز کرب برسوں سے سلگتی بولا مکھی ذوق گناہ گاری اور درد پھیلاتی کہر کی طرح حملہ آور ہو رہے تھے۔

مسلمان لشکری بھی ان کے ارادوں کو جان اور سمجھ رہے تھے لہٰذا وہ بھی دن جگر سے نئی تقدیر رقم کرتے ہوئے مشیت کا خراج وصول کرتے مجاہدوں قوم کی آزادی اور تحفظ کا نعرہ بلند کرنے والے تیغ زنوں اور زندگی کے الہام سی تکبیریں بلند کر کے موت کی طرح تعاقب کرتے لمحوں کی طرح ضربیں لگا رہے تھے۔

کچھ دیر تک جزیرہ لزبس میں ہولناک جنگ ہوتی رہی یہاں تک کہ دشمن کے لشکر میں پسپائی اور شکست و ریخت کے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے پھر جب دشمن کے متحدہ لشکر نے اندازہ لگایا کہ مسلمانوں نے اب باقاعدہ طور پر اور انتہائی جوش اور جذبے کے ساتھ ان کے لشکر کے اندر گھس کر ان کا قتل عام شروع کر دیا ہے تب انہوں نے شکست قبول کی بھاگ کر وہ ساحل پر کھڑے اپنے بڑے بڑے جہازوں کشتیوں میں سوار ہوئے اور وہاں سے بھاگ گئے تھے اب دشمن کے اس سارے لشکر نے نئی تیاریوں اور نئی تدبیروں کے ساتھ مسلمانوں سے ٹکرانے کے لیے جزیرہ سلانیک کا رخ کر لیا تھا۔

جزیرہ لزبس میں دشمن قوتوں نے خوراک کے ذخائر کے علاوہ غلے اور دوسری اشیاء کے ڈھیر جمع کر رکھے تھے اور یہ ساری چیزیں مسلمانوں کے ہاتھ لگ گئی تھیں دشمن کو بدترین شکست دینے کے بعد کدک احمد خیرالدین اور عمر پاشا سعد الدین اسماعیل بے اور دوسرے سالار کافی دیر تک اپنے زخمیوں کی دیکھ بھال اور نگرانی کرتے رہے جو لشکری جنگ میں مارے گئے تھے ان کی تدفین کا وہیں اہتمام کیا گیا اس کے بعد دشمن کے پڑاؤ سے جو کچھ حاصل ہوا تھا ان کی فہرستیں بننی شروع ہو گئی تھیں جزیرہ لزبس میں پہلے سے جو آبادی تھی ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی تعرض نہ کیا گیا تھا لوگوں کے اندر منادی کرادی گئی تھی کہ وہ پہلے کی طرح اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف رہیں ان میں کسی کو کوئی گزند نہ پہنچایا جائے گا اور نہ ہی ان کے مال متاع اور ان کے املاک کو نقصان پہنچایا جائے گا۔

جزیرے پر اب کیونکہ مسلمانوں کا قبضہ تھا لہٰذا وہاں خیموں کا شہر آباد کر دیا گیا تھا اور لشکر نے وہاں قیام کر لیا تھا۔

دو دن تک خیرالدین اپنے ساتھی سالاروں کے ساتھ لشکر کے امور ہی میں مصروف رہا لہٰذا دوسرے روز شام کے قریب وہ کارلوس کے خیمے کے دروازے پر نمودار ہوا اس وقت کارلوس نبارہ اور روجینا تینوں بیٹھے کسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے دروازے پر رک کر خیرالدین نے کارلوس کو مخاطب کیا اور کہنے لگا۔

''کارلوس میرے خیال میں تم تینوں کسی اہم موضوع پر گفتگو کر رہے ہو میرے بھائی جب فارغ ہو جاؤ تو پھر میرے خیمے میں آنا میں ایک موضوع پر تم سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔''

کارلوس سے پہلے ہی روجینا بول پڑی اور خیرالدین کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''ہم کسی اہم موضوع پر گفتگو نہیں کر رہے

اگر کر بھی رہے ہوتے تو اس موضوع میں آپ کو شامل کرتے ہوئے ہم فخر محسوس کرتے یہ آپ خیمے سے باہر کھڑے ہو کر اجنبیوں کی طرح بھائی کو کیا پیغام دے رہے ہیں آپ اندر آئیں جو کچھ آپ کہنا چاہتے ہیں ہم سب کی موجودگی میں کہیں۔''

اس پر خیرالدین مسکراتے ہوئے خیمے میں داخل ہوا جب وہ کارلوس کے پہلو میں بیٹھ گیا تب نبارہ اسے مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''بیٹے اتنے بڑے محسن اتنے بڑے مربی ہونے کے باوجود تم اجنبیت اختیار کرتے ہو ہم اگر کسی موضوع پر گفتگو کر بھی رہے تھے تو بیٹے ہم کوئی بھی موضوع تم سے چھپا کر گفتگو کا عنوان نہیں بنانا چاہتے بہرحال کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو۔'' نبارہ جب رکی تب روجینا نے غور سے خیرالدین کی طرف دیکھا پھر کہنے لگی۔

''سب سے پہلے تو ہمیں آپ کے خلاف شکوہ یہ ہے کہ آپ لڑائی کے بعد دو دن ہمارے پاس آئے ہی نہیں یوں جیسے اس جزیرے میں ہمارا کوئی وجود ہی نہ ہو دوسری بات یہ کہ اس شاندار فتح پر میں آپ کو مبارک باد پیش کرتی ہوں میں اماں اور بھائی نے آپ کا اجتماعی جنگ سے پہلے انفرادی مقابلہ بھی دیکھا تھا اس مقابلے میں نائیٹ کے مقابلے میں آپ نے جس شاندار اور عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا اس پر میں اماں اور کارلوس نے آپ کی بے حد تعریف کی تھی۔''

روجینا کے بعد نبارہ اور کارلوس بھی اس شاندار فتح پر خیرالدین کو مبارک باد دینے لگے تھے۔

اس کے بعد کچھ دیر خاموش رہی یہاں تک کہ گفتگو کا آغاز خیرالدین نے کیا اور وہ کارلوس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

''کارلوس میرے بھائی ہماری دشمن قوتیں شکست اٹھا کر بھاگ گئی ہیں جہاں تک ہمارے مخبروں نے بتایا ہے ان کے مطابق ان سب نے جزیرہ سلانیک کا رخ کیا ہے اب وہ ہمارے خلاف جزیرہ سلانیک ہی کو اپنا مرکز اور اپنی طاقت اور قوت کا محور بنائیں گے بہرحال ہم وہاں بھی ان سے خوب نپٹیں گے میرے عزیز بھائی اب تم تینوں کو کوئی خطرہ نہیں ہے میں تم تینوں کی طرف اس لیے آیا ہوں کہ ابھی تھوڑی دیر تک یا اگلی صبح کو اگر تم یہاں سے قسطنطنیہ کی طرف جانا چاہو تو تمہاری روانگی کا اہتمام کیا جا سکتا ہے ایک خاصی بڑی کشتی تمہیں مہیا کر دی جائے گی اور وہ پانچ مسلح جوان جو یہاں رہ کر تمہاری حفاظت کا کام سرانجام دیتے رہے ہیں وہ تمہارے ساتھ جائیں گے اور قسطنطنیہ میں تم لوگوں کو تمہاری اپنی حویلی میں چھوڑ کر آئیں گے اب بولو میرے بھائی تم کیا کہتے ہو۔''

اس موقع پر روجینا نے جھٹ سے خیرالدین کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔ ''بھائی سے پہلے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

''امیر خیرالدین آپ جانتے ہیں بروشس اور بجانس میری وجہ سے ہم تینوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں ہمیں یہ بھی خبر ملی ہے کہ ہم جس وقت حویلی سے نکل کر آپ کے پاس لشکر میں آ گئے تھے تو ہماری غیر موجودگی میں بروشس اور بجانس اپنے کچھ مسلح جوانوں کو لے کر حویلی میں آئے تھے انہوں نے جب دیکھا کہ باہر قفل لگا ہوا ہے تو بتانے والوں نے بتایا کہ ان کے کچھ ساتھی دیوار پھاند کر اندر گئے تھے شاید ان کو یہ شک ہوا تھا کہ ہم اندر ہی ہیں اور باہر سے ہم نے یونہی تالا لگا لیا ہے اور جب ان کے ساتھیوں نے کہا اندر کوئی نہیں تو ساندے والوں سے انہوں نے پوچھا اور انہوں نے انہیں آگاہ کیا کہ تینوں کو پانچ مسلح جوان کہیں لے گئے ہیں کہاں گئے ہیں اس کی انہیں کوئی خبر نہیں اس کا مطلب ہے ابھی تک بروشس اور بجانس میرے پیچھے ہیں اور ان کی

وجہ سے ہم تینوں ماں بیٹی اور بیٹا خوف اور خطرہ محسوس کرتے ہیں جب تک وہ زندہ ہے ہمیں قسطنطنیہ میں بھی ان کی طرف سے خطرہ رہے گا وہ بڑے خطرناک اور دست دراز لوگ ہیں قسطنطنیہ میں بھی کسی نہ کسی طرح داخل ہو کر وہ یا تو مجھے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے یا ہم تینوں کو نقصان پہنچائیں گے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد وہ جینا رکی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

''اس بناء پر میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ہم فی الحال آپ کے مہیا کردہ مسلح جوانوں کے ساتھ قسطنطنیہ کا رخ نہیں کریں گے اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو مجھے خدشہ ہے کہ بروشس اور بجانس ہم پر نگاہ رکھیں گے اور وہ ہمیں راستے ہی میں جالیں گے اس لیے کہ وہ بحری قزاق ہیں اور سمندر کے اندر ان کے گماشتے گردش کرتے رہتے ہیں اور اگر ہم خیریت کے ساتھ کسی نہ کسی طرح قسطنطنیہ پہنچ بھی گئے تب بھی وہ قسطنطنیہ میں داخل ہو کر دو کام کریں گے یا تو مجھے اٹھا لے جائیں گے یا ہم تینوں کو نقصان پہنچائیں گے ان سارے امور کو سامنے رکھتے ہوئے میری آپ سے استدعا ہے کہ جس وقت آپ اپنے لشکر کے ساتھ یہاں سے نکل کر قسطنطنیہ کا رخ کریں گے تو ہم آپ کے ساتھ قسطنطنیہ جائیں گے۔

بات یہیں تک ختم نہیں ہو پائے گی بلکہ میں آپ سے یہ بھی استدعا کروں گی کہ قسطنطنیہ میں بھی آپ ہماری حفاظت کا اہتمام کیجیے گا اور اس وقت میں سب سے بڑی خبر آپ کو سنانا چاہتی ہوں وہ یہ کہ بھائی نے تو پہلے ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔'' روجینا جب خاموش ہوئی تو خیر الدین کہنے لگا۔

''روجینا تمہارے خدشات اپنی جگہ درست ہیں لیکن ہم تو کچھ دن تک اسی جزیرے میں قیام رکھیں گے ہم نے اپنے کچھ قاصد سلطان کی طرف بھجوا دیے ہیں سلطان کو اس فتح کی خبر بھی سنائی جائے گی ساتھ ہی جزیرے سے متعلق جو احکامات وہ دیں گے ان کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

اس بناء پر آپ لوگوں کو تو کئی روز تک یہاں قیام کرنا پڑے گا اس بناء پر میں آپ سے کہوں گا کہ خیموں میں قیام کرنے کے بجائے بہتر ہوگا کہ آپ تینوں محافظوں کے ساتھ اسی حویلی میں قیام کریں جس حویلی میں آپ نے اس سے پہلے قیام کر رکھا تھا وہی پانچ محافظ آپ لوگوں کی حفاظت کے لیے وہاں مقرر کر دیے جائیں گے۔''

روجینا پھر بولی اور کہنے لگی۔

''امیر میں نے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے اب اماں اور بھائی آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں جو کچھ یہ کہنا چاہتے ہیں کہہ لیں۔''

روجینا کے خاموش ہونے پر نبارہ بولی اور کہنے لگی۔

''بیٹے روجینا نے جو کچھ کہا ہے یہی ہمارے لیے آخری ہے اس کا کہنا درست ہے لہٰذا میں چاہتی ہوں اسی پر عمل کیا جائے۔''

خیر الدین نے اس بار کارلوس کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

''کارلوس میرے بھائی تم بھی کچھ کہو۔''

جواب میں کارلوس مسکرا دیا اور کہنے لگا۔

''جو کچھ اماں اور میری بہن نے کہا ہے یہی حرف آخر ہے۔''

اس پر خیر الدین اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

''اگر یہ بات ہے تو پھر تم تینوں آرام کرو میں نے کچھ لشکری امور نبٹانے ہیں اور جاتا ہوں۔''

خیر الدین جب کھڑا ہوا تب روجینا بھی اٹھ کھڑی ہوئی اس کی طرف دیکھتے ہوئے نبارہ اور کارلوس بھی کھڑے ہو گئے تھے پھر روجینا خیر الدین کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''امیر کیا ایسا ممکن نہیں کہ آج شام کا کھانا آپ ہمارے ساتھ اسی خیمے میں کھائیں اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو یہ ہمارے لیے ایک بہت بڑی سعادت ہوگی۔''

جواب میں خیر الدین نے کچھ سوچا پھر کہنے لگا۔

''اس وقت تو میں جاتا ہوں بہر حال شام کو میں آؤں گا اور کھانا تم لوگوں کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔'' خیر الدین کے اس جواب پر روجینا خوش ہو گئی تھی پھر خیر الدین مڑا اور خیمے سے نکل گیا تھا۔

چند دن بعد سلطان محمد کی طرف سے کچھ قاصد جزیرہ مقربس میں داخل ہوئے ان کے ساتھ سلطان محمد کا ایک معتمد سالار یعقوب بھی تھا اسی یعقوب کو سلطان محمد نے جزیرہ لزبس کا حاکم بنا کر بھیجا تھا اور کدک احمد خیر الدین اور دوسرے سالاروں کے نام یہ پیغام آیا تھا کہ لشکر کا ایک حصہ یعقوب کے سپرد کر کے باقی لشکر قسطنطنیہ واپس آ جائے اس لیے کہ جزیرہ لزبس کا حاکم وہی سالار یعقوب ہوگا۔

☆☆

جہاں تک جزیرہ لزبس کا تعلق ہے تو کہا جاتا ہے کہ محمد مجمع جزائر یونان میں یہ سب سے چھوٹا جزیرہ شمار کیا جاتا تھا ساتھ ہی مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ جزیرہ کی فتح کے بعد سلطان محمد نے اپنے سالار یعقوب کو اس جزیرے کا حاکم مقرر کیا اس یعقوب کے چار بیٹے تھے ایک کا نام اسحاق دوسرے کا نام الیاس تیسرے کا نام عروج اور جو تھے کا نام خضر تھا یہی وہ خضر تھا جو بعد کے دور میں خیر الدین باربروسہ کے نام سے عالم اسلام کا ایک نایاب سپہ سالار اور بحری جنگوں کا بے مثال بیڑ

بے

(امیر البحر

)بن

کر نمودار ہوا جس نے ایک طرف یورپ کی ساری بحری قوتوں کو اپنے سامنے کھنگال کر رکھ دیا اور بحر روم کو سارے یورپ کے لیے اس نے ممنوع علاقہ قرار دے دیا تھا دوسری طرف اس نے خشکی پر بھی اپنی فتح مندی کے ایسے نشانات چھوڑے جو صدیوں تک اس کی جرات مندی اور اس کی شجاعت کے گیت نشر کرتے رہے۔

نبارہ اور روبینا دونوں ماں بیٹی اپنے خیمے میں بیٹھی اپنے مستقبل کے متعلق گفتگو کر رہی تھیں کارلوس خیمے میں موجود نہیں تھا اتنی دیر تک باہر شور شرابہ اٹھ کھڑا ہوا لوگ بے پناہ خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے طرح طرح کے نعرے لگا رہے تھے یہ آوازیں سن کر نبارہ اور روجینا دونوں چونکی تھیں خیمے سے باہر نکل آئیں اتنی دیر تک ایک طرف سے کارلوس بھاگتا ہوا آیا اور ان کے سامنے آن کھڑا ہوا اسے دیکھتے ہی روجینا اسے مخاطب کر کے کسی قدر تعجب میں پوچھنے لگی۔

''بھائی یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے لگتا ہے جزیرے کے اندر بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی ہو۔''

اس پر کارلوس نے قہقہہ لگایا اور کہنے لگا۔

''نہیں میری بہن ایسا نہیں ہے جزیرے کے لوگ خوشی سے ناچ کود رہے ہیں اور لوگ گروہ در گروہ اور جوق در جوق لشکر گاہ میں شامل ہو رہے ہیں اور واپس جا رہے ہیں۔''

''وہ کیوں.....'' روجینا نے حیرت سے کارلوس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ لیا تھا۔ ''یہ کہ لشکر آج واپس جائے گا سلطان نے اپنے ایک سالار یعقوب کو جزیرہ لزبس کا حاکم مقرر کر کے بھیجا ہے وہ تھوڑی دیر پہلے جزیرے میں پہنچا ہے یہاں آتے ہی اس نے سلطان کی طرف سے اعلان کیا ہے کہ جزیرے کے سارے مکینوں کو امان دی جاتی ہے ان لوگوں کے اموال ان لوگوں کی جائیدادیں محفوظ رہیں گی اور جو لوگ

جنگ کے دوران متاثر ہوئے ہیں ان کے نا صرف نقصانات کا ازالہ کیا جائے گا بلکہ وہ لوگ جن کے پاس جزیرے میں جائیداد اور زمینیں نہیں ہیں انہیں بھی دوسرے لوگوں کی طرح زمینیں مکان مہیا کیے جائیں گے اس سے لوگ بے پناہ خوشی کا اظہار کر رہے ہیں جوق در جوق لشکر کی طرف جاتے ہیں وہاں لشکر کے اندر جو قاضی ہے اس کے پاس بیٹھ کر اسلام قبول کرتے ہیں اور واپس جا رہے ہیں میرا اندازہ ہے تھوڑی دیر تک اس جزیرے کے سارے ہی لوگ اسلام قبول کر لیں گے۔'' کارلوس جب رکا تب بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے روجینا کہنے لگی۔

''بھائی پہلے یہ بتائیں کہ لشکر یہاں سے واپسی کے لیے کب کوچ کرے گا۔''

اس پر کارلوس مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''میری عزیز بہن لشکر شام کے وقت یہاں سے کوچ کرے گا شام تک یہاں کے سارے انتظامات مکمل کر لیے جائیں گے جس لشکر نے یہاں جزیرہ لزبس میں ہی قیام کرنا ہے اسے علیحدہ کر کے یہاں اس کے قیام کا اہتمام کیا جائے گا باقی سالار اور لشکری یہاں سے واپس قسطنطنیہ کا رخ کریں گے۔''

کارلوس کے اس انکشاف پر روجینا کچھ پریشان اور فکر مند ہو گئی تھی گہری سوچوں میں کھو گئی تھی آخر اپنے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''بھائی سلطان کے حکم سے اگر امیر خیرالدین کو یہاں جزیرہ لزبس میں روک دیا گیا تو پھر ہم کیسے اور کس طرح اپنی حویلی میں محفل ہوں گے اور کس طرح پرسکون اور بے خطر زندگی بسر کریں گے۔'' جواب میں کارلوس مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''میری بہن تیرے اندیشے درست نہیں ہیں خیرالدین سلطان کے بڑے سالاروں میں شامل ہے یہاں حاکم تو یعقوب کو مقرر کر دیا گیا ہے وہ بھی ایک عمدہ سالار ہے اس کے تحت ایک لشکر رکھا جائے گا اور اس کی مدد کے لیے چھوٹے سالار مقرر کیے جائیں گے بڑے سارے سالار باقی لشکر کے ساتھ واپس قسطنطنیہ کا رخ کریں گے اس لیے تمہارے یہ اندیشے کہ خیرالدین کو یہاں روک لیا جائے گا درست نہیں ہے امیر خیرالدین واپس قسطنطنیہ جائیں گے اور ہم بھی ان کے ساتھ یہاں سے کوچ کریں گے۔''

اس موقع پر اپنے بھائی کارلوس کی طرف دیکھتے ہوئے روجینا کہنے لگی۔

''بھائی اگر میں بھی لشکر میں جا کر لوگوں کو دیکھوں کہ وہ کس طرح لشکر گاہ میں داخل ہو رہے ہیں کیسے اسلام قبول کر رہے ہیں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا ساتھ ہی مجھے وہاں بروشس بجالس یا ان کے آدمیوں سے تو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔''

اس پر کارلوس نے غور سے روجینا کی طرف دیکھا پھر بڑی ہمدردی میں کہنے لگا۔

''میری بہن تو بے شک جا لشکر گاہ کے اندر اس وقت بہت سی عورتیں جمع ہیں اور سب لوگ جوق در جوق اسلام قبول کر رہے ہیں وہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں کوئی اندیشہ نہیں بروشس اور بجالس اور ان کے آدمیوں کی جرات نہیں کہ یہاں آئیں اور تمہارے لیے تکلیف کا باعث بنیں میری بہن تم جاؤ۔''

کارلوس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی روجینا تقریباً بھاگتی ہوئی اس سمت ہو لی تھی آس پاس کی بستیوں اور رہائشی علاقوں کے لوگ گروہ در گروہ لشکر میں آ کر اسلام قبول کر رہے تھے۔

روجینا کے جانے کے بعد کچھ دیر تک نبارہ اور کارلوس دونوں ماں بیٹا اسے بھاگ کر لشکر گاہ کی طرف جاتے ہوئے دیکھتے رہے پھر کارلوس اپنی ماں نبارہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''اماں اگر تم برا نہ مانو تو اس موقع پر میں تم

سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔''

اس پر نبارہ نے گھورنے کے انداز میں اس کی طرف دیکھا کہنے لگی۔

''میرے بچے میں تیری بات کا برا کیوں مانوں کی کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو۔'' جواب میں کارلوس نے ہونٹوں پر زبان پھیری گلا صاف کیا پھر کہنے لگا۔

''اماں روجینا میری بہن ہے مجھے اپنی جان سے بھی عزیز ہے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس جیسی حسین اور خوب صورت اور پرکشش شخصیت کی لڑکیاں بہت کم ہوں گی اس بناء پر میں اس کے مستقبل کے سے متعلق بھی فکر مند رہتا ہوں لیکن اب ایک ایسا رجحان سامنے آ رہا ہے کہ میں سمجھتا ہوں میری بہن کا مستقبل خداوند نے چاہا تو بہت روشن ہوگا۔''

اس پر نبارہ کہنے لگی۔

''میرے بچے جو کچھ تو روجینا کے متعلق کہنا چاہتا ہے کھل کر کہہ۔'' اس پر کارلوس پھر بولا اور کہنے لگا۔

''اماں جہاں تک میں نے اپنی بہن کی نقل و حرکت اس کے تاثرات اس کے جذبات کا اندازہ لگایا ہے میرا دل کہتا ہے روجینا امیر خیرالدین کی طرف مائل ہے۔'' نبارہ نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگی۔

''میرے بچے تو نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔ میں خود کئی دن سے سوچ رہی تھی کہ روجینا یقیناً خیرالدین کی طرف مائل ہے۔''

نبارہ کے خاموش ہونے پر کارلوس مسکراتے ہوئے بول اٹھا۔

''اماں اگر روجینا کو امیر خیرالدین سے بیاہ دیا جائے تو آپ کو کوئی اعتراض ہوگا۔''

اس پر ڈانٹ دینے کی انداز میں نبارہ کہنے لگی۔

''بیوقوف کیسی احمقانہ باتیں کرتے ہو میں سمجھتی ہوں میری بیٹی روجینا کو خیرالدین سے بہتر زندگی کا کوئی ساتھی مل ہی نہیں سکتا اگر امیر خیرالدین روجینا کو اپنانے اور اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے لیے تیار ہو جائے تو میں سمجھوں گی ہماری زندگی کے سارے دکھ درد جاتے رہے ہیں اور میں یہ بھی جانوں گی کہ میری بیٹی کو اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک سنہری منزل مل گئی ہے۔''

کچھ دیر کے توقف کے بعد نبارہ پھر کارلوس کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''بیٹے فی الحال میں چپ ہوں خیرالدین کے جذبات اور تاثرات کا بھی جائزہ لوں گی پھر قسطنطنیہ واپس جا کر میں کسی مناسب موقع پر روجینا کو کریدوں گی اگر اس نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ وہ خیرالدین کو پسند کرتی ہے اس سے محبت کرتی ہے تو پھر اس موضوع پر خیرالدین سے بات کریں گے۔ مجھے امید ہے خیرالدین انکار نہیں کرے گا اس لیے کہ روجینا سے بڑھ کر اچھی شخصیت والی خوب صورت اور پرجمال لڑکی خیرالدین کو کہیں مل ہی نہیں سکتی۔'' نبارہ جب خاموش تب بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کارلوس کہنے لگا۔

''اماں یہ بات کر کے تو نے میرا دل خوش کر دیا ہے جس روز روجینا اور امیر خیرالدین کی شادی ہو جائے گی میں سمجھوں گا وہ میری زندگی کا سب سے اچھا اور خوش کن دن ہوگا اماں اب آؤ ہم بھی لشکر گاہ کی طرف جاتے ہیں۔''

نبارہ نے اس سے اتفاق کیا تھا چنانچہ دونوں ماں بیٹا لشکر گاہ کی طرف ہو لیے تھے۔

اس داستان کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔

زہرگر

احمد صغیر صدیقی

ہیری کی کہانی پر شک کی کوئی گنجائش نہ تھی اور کسی کریٹ کے لیے اس طرح کا عمل ناقابل قیاس بھی نہ تھا۔ یہ سانپ عموماً آدمیوں کے مکانوں میں رہتے ہیں انہیں گرم جگہوں کی تلاش ہوتی ہے۔ حیرت کی بات بس یہ تھی کہ ہیری کو ابھی تک اس نے کاٹا نہیں تھا۔ یہ سانپ خاصا مہلک ہوتا ہے بشرطیکہ بروقت اس کا تدارک نہ کر لیا جائے۔ بنگال میں ان کے کاٹے سے خاصی اموات ہوتی رہتی ہیں۔

اس شمارے کے لیے غیر ملکی کہانی

تقریباً آدھی رات گزر چکی تھی جب میں گھر پہنچا تھا۔ بنگلے کے گیٹ کے پاس پہنچ کر میں نے کار کی ہیڈ لائٹیں بجھا دیں تاکہ اس کی روشنی کھڑکی کے راستے اس کمرے میں نہ جا سکے جس میں ہیری پوپ سویا ہوا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ جاگ جائے۔ گھر میں فکر مندی فضول تھی ڈرائیو پر بڑھتے ہوئے میں نے دیکھا کہ اس کے کمرے کی بجلی جل رہی ہے اس کا مطلب تھا کہ جاگ رہا تھا بشرطیکہ وہ پڑھتے پڑھتے کرسی پر ہی نہ سو گیا ہو۔

میں نے کار پارک کی اور بالکونی تک پہنچنے کے لیے پانچ زینے طے کیے۔ احتیاط سے گنتی کرتے ہوئے کیونکہ اندھر سخت اندھیرا تھا میں اوپر پہنچنے کے لیے کسی چھٹے نا موجود زینے پر پیر نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے بالکونی پار کی میں نے اسکرین ڈور کو مکان میں داخل ہونے کے لیے دھکیلا اور ہال کی روشنی جلا دی۔ میں ہیری کے دروازے کی طرف گیا اسے خاموشی سے کھولا اور اندر دیکھا۔

وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ مگر اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ اس نے اپنے سر تک کو میری طرف نہیں گھمایا تاہم میں نے اس کی آواز سنی وہ کہہ رہا تھا۔ ''ٹمبر...... ٹمبر ادھر آنا۔''

وہ بہت آہستہ سے بولا تھا۔ ہر لفظ الگ الگ کر کے سرگوشی کے سے انداز میں۔ میں نے دروازہ پوری طرح کھول دیا اور کمرے میں عجلت سے بڑھنا چاہا۔

''ٹھہرو ایک منٹ ٹمبر۔'' وہ بہت ہی مدھم آواز سے بول رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے بولتے ہوئے وہ کسی زبردست دباؤ میں ہو۔

''ہیری کیا معاملہ ہے۔''

''ش شش۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''شش۔ خدا کے لیے شور مت کرو۔ قریب آنے سے پہلے اپنے جوتے اتار دو۔ پلیز جو میں کہہ رہا ہوں کرو۔''

وہ یوں بول رہا تھا جیسے اس کے پیٹ میں گولی ماردی گئی ہو اور وہ اپنے زخم کو دونوں ہاتھوں سے دبائے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''جلدی کرو۔ جوتے اتار دو۔''

یہ جوتے اتارنے والی بات میری سمجھ سے بالاتر تھی تاہم وہ جس انداز سے کہہ رہا تھا میں نے یہی بہتر سمجھا کہ جوتے اتار دوں۔ میں نے جوتوں کو وہیں کمرے کے وسط میں چھوڑا۔ پھر میں اس کے بستر کی سمت گیا۔

''بستر کو مت چھونا۔ خدا کے لیے بستر کو مت چھونا۔'' وہ اس وقت بھی اسی طرح بول رہا تھا جیسے اسے پیٹ میں گولی ماردی گئی۔ وہ اس وقت بستر پر چت لیٹا ہوا تھا۔ ایک چادر اس کو سینے تک ڈھانکے ہوئے تھی۔ اس کے جسم پر جو دھاری دار نائٹ سوٹ تھا۔ نیلی اور بھوری دھاریوں والا۔ وہ پسینے سے تر تھا۔ یہ ایک گرم رات تھی خود مجھے بھی کچھ پسینہ آرہا تھا۔ مگر ہیری اسمیں بھیگا ہوا تھا۔ اس کا پورا چہرہ بھیگا ہوا تھا اور سر تلے کا تکیہ بھی نم ہو رہا تھا۔

مجھے یہ ملیریا کا ایک بگڑا ہوا معاملہ محسوس ہو رہا تھا۔

''کیا ہوا...... ہیری۔ یہ کیا ہے۔''

''سانپ نے ایک کریٹ۔''

''سانپ۔ اوہ میرے خدا کہاں کاٹا ہے اس نے۔ کتنی دیر ہوئی۔''

''جیو۔'' اس نے سرگوشی کی۔

''سنو ہیری۔'' میں نے کہا اور جھک کر اس نے شائد چھوا۔

''ہمیں جلدی کرنی ہوگی۔ جلدی بتاؤ کہاں کاٹا ہے اس نے۔'' وہ یک دم سادھے شدید تناؤ کے عالم میں بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ جسے شدید درد کو روک رہا ہو۔

''اس نے کاٹا نہیں ہے۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''ابھی تک نہیں۔ وہ میرے پیٹ پر ہے۔ وہیں سویا ہوا ہے۔''

میں جلدی سے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور

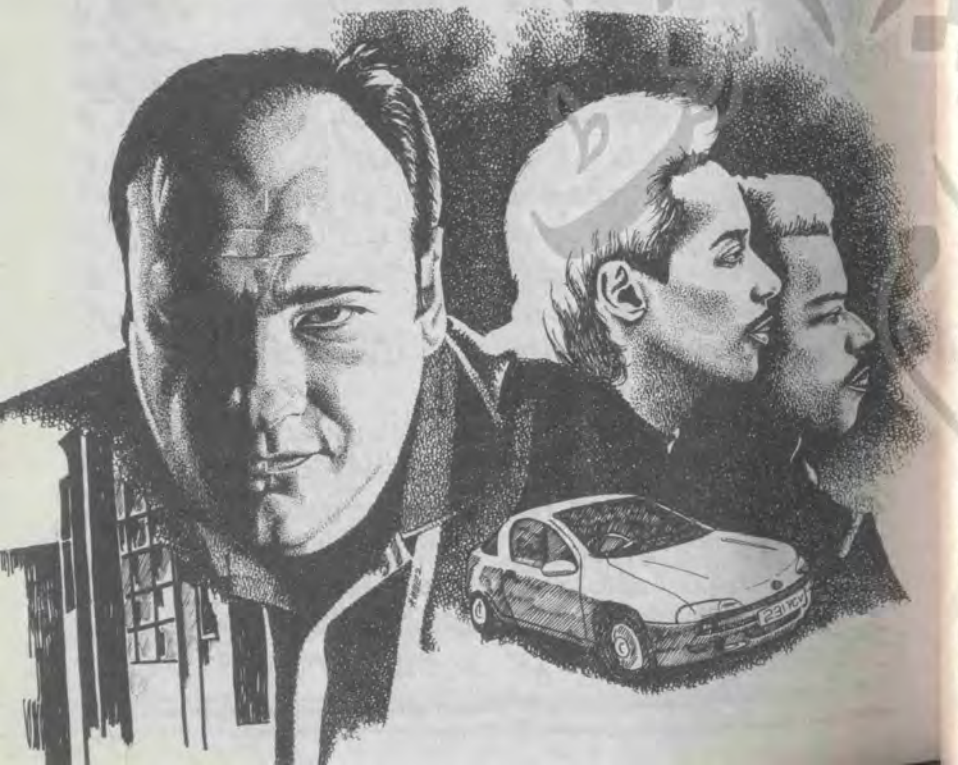

میں نے اس کے پیٹ کی طرف دیکھا جو چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ چادر جگہ جگہ سے اونچی نیچی ہو رہی تھی اور یہ بتانا بہت مشکل تھا کہ کس جگہ اس کے تلے کوئی چیز ہوگی۔

"کیا واقعی کوئی سانپ تمہارے پیٹ پر ہے۔"

"اور میں کیا کہہ رہا ہوں۔"

"یہ اس جگہ پہنچا کیسے۔" مجھے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ میں دیکھ رہا تھا وہ کوئی ڈراما نہیں کر رہا تھا۔

"میں پڑھنے میں لگا تھا۔" ہیری نے کہا۔ وہ بہت آہستگی سے رک رک کر بول رہا تھا۔ اس طرح کہ اس کا جسم ذرا سا بھی نہ ہلے۔ "میں چت لیٹا ہوا تھا۔ تبھی مجھے اپنے سینے پر کسی چیز کا احساس ہوا۔ کتاب کے پیچھے کچھ سرسراہٹ سی تھی۔ پھر مجھے پنکھیوں سے یہ چھوٹا سا سانپ اپنے پاجامے پر رینگتا نظر آیا۔ یہ چھوٹا ہے بس کوئی آٹھ نو انچ کا اور پھر میں نے حرکت موقوف کر دی تھی کیونکہ یہ خود ہی موقوف ہو گئی تھی۔ میں لیٹا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ خیال تھا کہ یہ چادر کے اوپر جائے گا۔" ہیری رکا اور چند لمحے چپ رہا اس کی آنکھوں نے اپنے جسم کو اس جگہ سے دیکھا جس پر چادر پڑی ہوئی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ وہ دراصل یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے بولنے کی وجہ سے وہ شے مضطرب تو نہیں ہوئی جو اس جگہ لیٹی ہوئی تھی۔

"چادر میں اس جگہ ایک شکن تھی۔" اس نے کہا۔

اس کی آواز پہلے سے مدھم تھی۔ اتنی کہ مجھے جھک کر اسے سننا پڑ رہا تھا۔ "دیکھو..... یہ ابھی وہیں ہے۔ یہ چادر کے اندر اسی شکن کے شگاف سے چلا گیا تھا۔ اور پھر یہ مجھے اپنے پیٹ پر متحرک محسوس ہوا تھا پھر اس کی حرکت رک گئی تھی اور اب یہ لیٹا ہوا ہے وہیں آرام سے غالباً سویا ہوا ہے میں تب سے تمہارا منتظر تھا۔" اس نے اپنی نظریں اٹھائیں اور مجھے دیکھا۔

"کتنا وقت ہوا۔"

"گھنٹے کہو۔" اس نے سرگوشی کی۔ "کئی گھنٹے ناختم گھنٹے۔ اب میری برداشت جواب دے چلی ہے۔ میرا جی کھانے کو چاہ رہا ہے۔"

ہیری کی کہانی پر شک کی کوئی گنجائش نہ تھی اور کسی کریٹ کے لیے اس طرح کا عمل ناقابل قیاس بھی نہ تھا۔ یہ سانپ عموماً آدمیوں کے مکانوں میں رہتے ہیں انہیں گرم جگہوں کی تلاش ہوتی ہے۔ حیرت کی بات بس یہ تھی کہ ہیری کو ابھی تک اس نے کاٹا نہیں تھا۔ یہ سانپ خاصا مہلک ہوتا ہے بشرطیکہ بروقت اس کا تدارک نہ کر لیا جائے۔ بنگال میں ان کے کاٹے سے خاصی اموات ہوتی رہتی ہیں۔

خصوصاً دیہی علاقوں میں۔

"اچھی بات ہے۔" میں نے ہیری سے کہا۔ میری اپنی آواز بھی سرگوشی بن گئی تھی۔ "اب بالکل حرکت مت کرنا اور بے ضرورت بولنا بھی نہیں تمہیں معلوم ہے یہ سانپ جب تک ڈرا ہوا نہ ہو نہیں کاٹتا۔ ہم جلد ہی اس کا مسئلہ حل کر دیں گے۔"

میں دبے قدموں کمرے سے باہر گیا۔ میرے پیروں پر موزے موجود تھے۔ میں نے کچن سے ایک چھوٹا مگر تیز چاقو اٹھایا۔ میں نے اسے پتلون کی جیب میں رکھ لیا تاکہ میں اسے فوری ضرورت پر استعمال کر سکوں۔ میں ہیری سے کسی پلان کے بارے میں بات کرنے والا تھا۔ اگر ہیری کھانستا یا تو اس کی کسی حرکت سے یہ سانپ جاگ کر اسے کاٹ لیتا تو میرا ارادہ تھا کہ میں فوراً ہی چاقو سے اس جگہ چیرا لگا کر زہر کو جسم سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔ میں دوبارا کمرے میں پلٹا۔ ہیری اسی طرح پڑا ہوا تھا۔ پسینے میں تر۔ اس کی نظروں نے مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ غالباً وہ چکر میں تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ میں اس کے نزدیک جا کر رک گیا اور سوچنے لگا کہ

آخر مجھے کیا کرنا چاہیے۔

"ہیری۔" میں نے اسے مخاطب کیا اور جھک کر اپنا منہ اس کے کان کے نزدیک کرتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں تو سب سے عمدہ کاروائی یہی ہو سکتی ہے کہ میں چادر کو بہت ہی دھیرے دھیرے کھولنے کی کوشش کروں۔ اس طرح ہم اسے دیکھ سکیں گے۔ میرا خیال ہے اسے چھیڑے بغیر یہ کام ہو سکتا ہے۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" اس نے کسی جذبات کے بغیر اسی طرح احتیاط سے کہا۔

"کیوں۔"

"روشنی۔ سانپ ڈر جائے گا چادر تلے اندھیرا ہے۔"

"تو پھر..... میں ایک دم سے چادر کیوں نہ الٹ دوں اور اسے تمہارے بدن سے صاف کر دوں اس سے پہلے کہ وہ کاٹ سکے۔"

"تم کسی ڈاکٹر کو کیوں نہیں بلاتے۔" ہیری نے کہا۔ اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میری عقل پر پتھر پڑے ہوں۔

"ڈاکٹر..... ہاں بالکل ٹھیک۔ میں گلابائی کو بلاتا ہوں۔"

میں دبے پیروں ہال تک گیا۔ میں نے فون کیا میں اس کا نمبر دیکھا اور فون اٹھا کر میں نے آپریٹر سے کہا کہ وہ یہ نمبر فوراً ملا دے۔

"ڈاکٹر گلابائی۔" میں نے کہا۔ "میں ٹمبروڈ بول رہا ہوں۔"

"ہیلو مسٹر وڈ ابھی تک سوئے نہیں۔"

"ڈاکٹر۔" میں نے عجلت سے کہا۔ "فوراً آجاؤ ساتھ میں سانپ کا سیرم (تریاق) بھی لیتے آنا KRAIT۔ سیرم۔"

"کسے کاٹا ہے۔"

"ابھی تک تو کسی کو نہیں۔" میں نے کہا۔ "مگر ہیرو پوپ بستر پر پڑا ہے اور سانپ اس کے پیٹ پر لیٹا سو رہا ہے۔ چادر تلے۔"

لائن ہر کوئی تین سیکنڈ تک خاموش رہی اور تب ڈاکٹر گلابائی نے آہستہ آواز میں کہا۔ "اس سے کہو حرکت نہ کرے بات بھی نہ کرے سمجھ گئے۔"

"ہاں۔"

"میں آرہا ہوں۔"

میں واپس بیڈ روم میں پہنچا تو ہیری نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"گلابائی آرہا ہے۔ اس نے کہا تم پرسکون ہو۔"

"تو کیا وہ سمجھ رہا ہے میں اچھل کود رہا ہوں۔"

"دیکھو ہیری اس نے بات کرنے سے منع کیا ہے۔ چپ رہو۔"

"تم بھی چپ رہو۔" اس نے کہا اور میں نے دیکھا کہ اس کے ہونٹ کا ایک گوشہ رہ رہ کر پھڑکنے لگا ہے میں نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور بہت احتیاط سے میں نے اس کی پیشانی اور چہرہ صاف کیا جو پسینے سے تر تھا۔

میں کچن میں گیا۔ وہاں سے میں نے تھوڑی سی برف حاصل کی۔ اسے میں نے رومال میں باندھا اور اسے توڑ کر باریک کر دیا۔ اس کے ہونٹوں کی یہ پھڑکن مجھے اچھی نہیں لگی تھی۔ مجھے اس کی بات کا انداز بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ میں یہ برف لے کر بیڈ روم میں گیا اور اسے ہیری کی پیشانی پر رکھ دیا۔

"تھوڑی ٹھنڈ تک ملے گی۔"

اس نے آنکھیں سکوڑیں اور عجلت سے بولا۔

"ساؤ اسے۔" اس نے سرگوشی کی۔ "مجھے کھانسی آنے لگے گی۔" ایک بار پھر اس کے ہونٹ کا گوشہ پھڑکنے لگا۔

کھڑکی سے کسی آنے والی کار کی روشنی کمرے میں جھلکی یہ ڈاکٹر گلابائی تھا۔

میں باہر گیا۔ میں نے آکس پیک کو دونوں

ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا۔

"کیسا ہے وہ۔" گلابائی نے پوچھا۔ مگر وہ رکا نہیں۔ بالکونی سے گزر کر ہال میں داخل ہوا اور بولا..... "کدھر ہے وہ۔"

اس نے اپنا تھیلا ہال میں ایک تپائی پر رکھ دیا اور میرے ساتھ ہیری کے کمرے میں گھسا۔ اس کے پیروں میں نرم سول والے جوتے تھے وہ بے آواز چلتا ہوا بڑھا۔ ہیری نے اسے تشکیوں سے دیکھا۔ ہیری کے نزدیک پہنچتے ہوئے وہ مسکرایا۔ اس میں اعتماد تھا اور یہ تسلی بھی تھی کہ وہ سارے معاملے کو آسانی سے حل کر دے گا۔ پھر وہ مڑا اور دوبارہ ہال میں گیا میں اس کے پیچھے تھا۔

"سب سے پہلے ہمیں اس کے جسم میں کچھ سیرم پہنچانا ہوگا۔" اس نے کہا۔ پھر اس نے بیگ کھولا اس نے انجکشن تیار کیا۔

"یہ اٹراوینس ہے۔ اسے بہت احتیاط سے لگانا ہوگا۔ اس میں کوئی پھڑکنی نہیں ہونی چاہیے۔"

ہم کچن میں گئے اس نے سوئی کو اسٹرالائز کیا۔ اس کے پاس ایک سرنج تھی دوسرے ہاتھ میں ایک شیشی تھی جس کا ڈھکن ربر کا تھا۔ اس نے ربر والے ڈھکن میں سوئی گھسا دی اور شیشی کے محلول کو سرنج پر بھر لیا۔ پھر اس نے یہ سرنج مجھے دے دی۔

"اسے لے لو۔ جب میں مانگوں گا مجھے دے دینا۔"

پھر ہم دونوں ہیری کے کمرے کی طرف چلے۔ ڈاکٹر نے اپنا بیگ اٹھا لیا تھا۔ ہیری کی آنکھیں اب چمک رہی تھیں۔ ڈاکٹر ہیری پر جھک گیا اس نے اس کے اوپر کا لباس کی آستین آہستہ سے اوپر چڑھائی اور اس کے بازو کو ہلائے بغیر اس نے گوشت کو ٹٹولا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے خود کو بستر سے ذرا دور کر رکھا تھا۔

اس نے سرگوشی کی۔ "میں تمہیں ایک انجکشن لگانے جا رہا ہوں۔ سیرم تھوڑی سی چبھن ہوئی مگر حرکت مت کرنا پیٹ کے مسلز کو سخت نہ کرنا۔ ڈھیلا رکھنا۔"

ہیری نے سرنج کی طرف دیکھا۔

گلابائی نے ایک ربڑ ٹیوب نکالا اور اسے ہیری کے بازو پر باندھ دیا۔ اس نے ہاتھ میں روئی سے الکوحل کو رگڑا۔ پھر اس نے مجھ سے سرنج لے لی اس نے اسے روشنی کی طرف کر کے ہنڈل پش کیا تھوڑی سی مقدار میں سیال نکال کر گرا۔ میں اس کے پاس ہی کھڑا دیکھ رہا تھا۔ ہیری بھی دیکھ رہا تھا۔ اس کے ماتھے اور چہرے پر پسینہ ابل ابل کر بہہ رہا تھا۔

ہیری کے ہاتھ پر کہنی کے قریب ایک پتلی لگ ابھری ہوئی تھی۔ پھر ڈاکٹر نے سرنج کی سوئی رگ پر رکھ دی۔ ہیری نے چھت کی سمت دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر نے سوئی کو ہلکی سی کوشش سے رگ میں چبھو دیا۔

جب انجکشن لگ گیا۔ ڈاکٹر نے جھک کر ہیری کے کان میں کہا۔ "اب اگر سانپ نے کاٹ بھی لیا تو کچھ نہیں ہوگا۔ مگر تم ہلنا مت۔ میں ابھی آیا۔"

اس نے اپنا تھیلا اٹھایا اور ہال کی طرف چل دیا۔ میں بھی اس کے ساتھ چلا۔

"کیا اب وہ محفوظ ہے۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"پھر۔"

مختصر سی قامت والے ہندوستانی ڈاکٹر نے مجھے دیکھا اور بولا۔

"اس سے اسے کچھ تحفظ مل جائے گا۔" پھر وہ مڑا اور اسکرین ڈور کی طرف دیکھا جو کہ مدے میں کھلتا تھا۔ میں سمجھا تھا وہ باہر جائے گا مگر وہ وہیں رک گیا اور باہر پھیلی رات کو دیکھنے لگا۔ وہ فکر مند ہو رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا یہ سیرم زیادہ اچھا نہیں ہے۔"

"بدقسمتی سے نہیں۔" اس نے مڑے بغیر کہا۔

"یہ اسے بچا بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ میں کچھ اور کرنے کے لیے سوچ رہا ہوں۔"

"کیوں نا ہم چادر کھینچ کر تیزی سے اسے جھاڑ دیں۔"

"نہیں..... یہ ایک بڑا خطرہ ہوگا۔" وہ عجلت سے بولا۔

"مگر ہم اسے اس طرح لیٹا کب تک چھوڑ سکتے ہیں وہ زبردست اعصابی کشیدگی میں مبتلا ہے پلیز۔" ڈاکٹر نے مڑ کر ہوا میں ہاتھ اٹھائے۔

"اس قدر جلد بازی ٹھیک نہیں۔" اس نے رومال سے اپنا ماتھا صاف کیا اور کچھ کھڑا سوچتا رہا۔

"دیکھو۔" بالآخر وہ بولا۔ "ایک طریقہ ہے ہمیں اس جگہ پر جہاں یہ سانپ بیٹھا ہوا ہے بے ہوشی کی دوا چھڑکنی چاہیے۔"

یہ عمدہ خیال تھا۔

"مگر....." ڈاکٹر نے اسی طرح سوچتے ہوئے کہا۔ "یہ محفوظ عمل نہیں۔ سانپ نہایت سرد خون ہوتے ہیں ان پر بے ہوشی کی دوا تیزی سے اثر انداز نہیں ہوتی۔ تاہم یہی سب سے بہتر طریقہ ہے..... ہم ایتھر..... یا کلوروفارم استعمال کر سکتے ہیں۔"

"کون سی چیز بہتر رہے گی۔"

"کلوروفارم..... اس نے کہا۔ "عام سا کلوروفارم یہی سب سے اچھا ہوتا ہے۔ چلو جلدی کرو۔" اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور چلا۔ "میرے گھر جاؤ۔ جب تک تم پہنچو گے میں فون کر کے لڑکے کو جگا دوں گا۔ تم کو میرے کپ بورڈ سے..... یہ ہے اس کی کنجی..... تمہیں کلوروفارم کی شیشی لانی ہے اس پر ایک تاریخی لیبل لگا ہے اس پر لکھا بھی ہے۔ میں ادھر رکوں گا۔ تم جلدی سے کار سنبھالو اور روانہ ہو جاؤ۔ نہیں جوتے کے چکر میں مت پڑو بس روانہ ہو جاؤ۔"

میں نے بہت تیز ڈرائیونگ کی اور پندرہ منٹ بعد میں شیشی کے ساتھ آ گیا۔ ڈاکٹر ہیری کے کمرے سے باہر لپکا اور مجھے ہال میں ملا۔

"لے آئے۔" اس نے پوچھا۔ "ٹھیک۔"

اس نے کہا۔ "میں نے اسے بتا دیا ہے کہ ہم اب کیا کرنے والے ہیں۔ جلدی کرو۔ مجھے ڈر ہے کہ اب وہ زیادہ دیر ساکت نہیں رہ سکے گا اس پر بہت دباؤ ہے۔"

وہ کمرے میں گیا۔ میں بھی ساتھ تھا شیشی میرے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ ہیری اسی طرح لیٹا ہوا تھا اور اس کے ماتھے پر پسینہ جھلملا رہا تھا۔ اس کا چہرہ سپید ہو رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا میں نے مسکرا کر اس کی ہمت بندھائی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

گلابائی اب بستر کے پاس پہنچ چکا تھا۔

اس نے بستر کی سائڈ پر لٹکتی چادر کے ایک سرے کو تھاما اور اسے بہ آہستگی اٹھایا۔ یہ کام بڑی احتیاط سے اس نے کیا تھا۔

اس نے ربر کے ایک ٹیوب کو شیشی کے منہ پر چھپایا جسے وہ مجھ سے پہلے ہی لے چکا تھا۔ پھر اس نے آہستہ سے مجھے قریب لایا اور کہا۔ "ہیری کے کان میں کہو کہ میں اب کلوروفارم کا چھڑکاؤ کرنے والا ہوں۔ یہ سیال خاصا ٹھنڈا ہوگا۔ وہ اس کے لیے تیار رہے اور جسم کو کسی قسم کا جھٹکا کم دے۔"

میں نے بڑھ کر ڈاکٹر کی بات ہیری کے کان میں کہہ دی۔

"سیال خاصا ٹھنڈا ہے۔ تم ذرا اس کے لیے تیار رہنا۔"

"ٹھیک ہے۔ خدا کے لیے جو کچھ کرنا ہے کرو۔" ہیری نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ گھبرا کر ڈاکٹر نے اس کی سمت دیکھا۔ پھر اس نے اپنے کام کی سمت توجہ کی۔

گلابائی نے کلوروفارم کے چند قطرے ایک سوختہ کا من پر گرائے پھر اس نے ٹیوب کے

ذریعے اسے چادر کے اندر چھڑکا۔ فوراً ہی کمرے میں اس کی بو پھیلنے لگی۔ گلابائی ٹیوب کے ذریعے دوا کا چھڑکاؤ کر رہا تھا۔ رک کر اس نے شیشی کو اٹھا کر دیکھا۔ پھر اس نے اسے مجھے دے دیا۔ آہستہ سے اس نے ربر ٹیوب کو چادر تلے سے باہر کھینچ لیا پھر وہ سیدھا ہوا۔

ٹیوب کو اندر پہنچانے اور دوا کے چھڑکاؤ کے عمل نے اسے خاصا تھکا دیا تھا۔ پھر وہ میری طرف گھوما اور بولا۔

''ہمیں کوئی دس منٹ انتظار کرنا ہوگا۔''

میں نے جھک کر ہیری کو بتایا۔

''احتیاط کے پیش نظر ہمیں کوئی دس منٹ انتظار کریں گے۔ ہوسکتا ہے دوا نے اثر بھی کیا ہو پھر بھی۔''

''تو پھر تم لوگ اب دیکھتے کیوں نہیں۔'' اس بار وہ پھر بلند آواز سے بولا تھا۔ ڈاکٹر گلابائی چونک گیا۔ اس کے چہرے سے غصہ ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں نے ہیری کو گھورا۔ جس کے ہونٹ کا ایک گوشہ پھر پھڑکنے لگا تھا۔ میں نے رومال سے اس کا بھیگا ہوا ماتھا صاف کیا۔ تاکہ اسے کچھ سکون ہو جائے۔

پھر ہم لوگ بستر کے پاس ہی رک کر انتظار کرنے لگے۔ گلابائی۔ مسلسل ہیری کے چہرے کے تاثرات کو دیکھے جا رہا تھا۔

وہ مختصر سا ہندوستانی ڈاکٹر اپنی سی تمام کوشش کر رہا تھا کہ ہیری کو پرسکون رکھے۔ اس کی آنکھیں خاموش زبانی میں مریض پر گرج برس رہی تھیں تمہیں پرسکون رہنا ہے۔ تھوڑا سا صبر کرو۔ معاملے کو خراب مت کرو۔ اور ہیری پڑا ہوا تھا۔ اس کے لبوں کا ایک کونا مسلسل پھڑکے جا رہا تھا۔

بالآخر گلابائی نے میری سمت دیکھا اور اشارہ کیا۔ مطلب تھا کہ اب وہ اپنا عمل کر سکتے ہیں۔

''تم بستر کے دوسرے کنارے کی طرف جاؤ۔'' اس نے مجھ سے کہا۔ ''تم دونوں چادر کا ایک ایک حصہ پکڑ کر اسے ایک ہاتھ ہٹائیں گے۔ مگر ہمیں یہ کام ایک احتیاط سے کرنا ہوگا۔''

''ہیری..... ذرا تیار رہو۔ حرکت مت کرنا۔'' میں نے کہا اور بستر کے دوسرے سرے کی طرف چلا گیا۔ میں نے چادر کو پکڑا گلابائی میرے سامنے کھڑا تھا پھر ہم نے مل کر چادر کو ہٹانے کی کوشش کی۔ ایک آہستگی سے بہت احتیاط سے ہم دونوں بستر سے ذرا پرے کھڑے تھے مگر ہم دونوں ہی جھک کر چادر تلے دیکھنے کے لیے کوشاں بھی تھے۔ کلورو فارم کی بو بہت بری تھی۔ میں نے اپنی سانس روکنے کی کوشش بھی کی تاکہ اس بو کی زیادہ مقدار میرے پھیپھڑوں کو متاثر نہ کر سکے۔

چادر اوپر اٹھ رہی تھی اور ہم کو اب ہیری کا پورا سینہ نظر آ رہا تھا..... اور پھر..... ہمیں اس کے پاجامے کا ازار بند نظر آیا۔ جسے عمدگی سے باندھا گیا تھا۔ اس سے ذرا اور آگے مجھے ایک بٹن نظر آیا۔ مجھے حیرت سی ہوگی میرے پاجامے میں ایسا کوئی بٹن نہیں تھا۔ یہ بھی غالباً ہیری کا کوئی خبط تھا۔

اس بٹن کے ماسوا اس کے پیٹ پر کوئی بھی چیز نہ تھی۔

ہم نے جلدی سے چادر ہٹا دی۔ ہم نے اس کے پیروں کا پائنچا بھی اونچا کر دیکھا۔

''ابھی مت ہلنا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''مسٹر پوپ۔'' پھر اس نے غور سے سارے بستر کو دیکھا اور ہیری کے جسم تلے بھی۔

''ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔'' اس نے کہا۔ ''وہ ادھر ہی کسی جگہ ہوگا۔''

ڈاکٹر کی آواز سن کر میری نے سر اونچا کیا اور اپنے پیروں کی طرف دیکھا اور..... وہ ایک دم سے اچھلا اور بستر پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جلدی سے اپنے پائنچے چڑھائے اور پیروں کو زور زور سے جھٹکا اس موقع پر ہم دونوں نے یہی سمجھا کہ اسے سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ گلابائی نے جھک کر پیک کھولنا شروع کر دیا تبھی ہمیں ہیری کی بلند آواز

سنائی دی۔

''نہیں..... وہ یہاں نہیں ہے۔'' گلابائی نے بیگ چھوڑ دیا اور سیدھا ہو گیا۔ اس نے میٹرس پر نگاہ ڈالی۔ پھر اس نے ہیری کو دیکھا۔ ہیری بالکل ٹھیک نظر آ رہا تھا۔ اسے سانپ نے نہیں کاٹا تھا۔ سارا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ مگر اس کے بعد بھی ہم میں سے کوئی پوری طرح مطمئن نہ تھا۔

''مسٹر پوپ ذرا اچھی طرح سوچ کر بتائیں کیا آپ نے واقعی سانپ کو دیکھا تھا۔'' گلابائی کے لہجے میں کچھ طنز کا عنصر چھپا ہوا تھا۔ عام طور سے وہ اس لہجے میں کبھی نہیں بولتا تھا۔

''ایسا تو نہیں کہ تمہیں وہم ہوا ہو یا تم نے سوتے میں کوئی خواب دیکھا ہو۔'' گلابائی بولتے ہوئے جن نظروں سے ہیری کو دیکھ رہا تھا اس نے تو یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نے یہ طنز سنجیدگی سے نہیں کیا تھا۔ وہ صرف صورت حال کو بہتر بنانے کا متمنی تھا۔ تاکہ دباؤ اور تناؤ ختم کیا جا سکے۔

''تو کیا تم مجھے جھوٹا سمجھتے ہو۔'' معاً ہیری چیخا۔

ہیری بستر پر اپنے دھاری دار سوٹ میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کی نظریں ڈاکٹر پر تھیں جن میں سے غصہ چھلک رہا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ بھی سرخ ہو رہا تھا۔

گلابائی اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ وہ بس ہیری کو تکے جا رہا تھا۔ ہیری نے بستر پر ایک قدم بڑھایا۔ اس کی آنکھیں ایک دم سے چمک اٹھی تھیں۔

''تم..... گندے کالے ہندوستانی۔ تم مجھے جھوٹا کہہ رہے ہو۔''

''شٹ اپ ہیری۔'' میں نے مداخلت کی۔

''تم کالے چوہے۔''

''ہیری۔'' میں چیخا۔ ''یہ تم کیا بک رہے ہو۔''

ہیری گالیاں بک رہا تھا۔

گلابائی کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس نے ہم دونوں کو اس طرح نظر انداز کر دیا جیسے ہم وہاں تھے ہی نہیں۔ میں جلدی سے اس کے پیچھے لپکا۔ میں نے ایک ہاتھ اس کے شانے پر رکھا۔ وہ بالکونی پر پہنچ چکا تھا۔

''ڈاکٹر..... تم ہیری کی باتوں کا برا نہ منانا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''اس واقعے نے اس کے دماغ کی چولیں ہلا دی ہیں۔ اسے کچھ اندازہ نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔''

پھر ہم دونوں نے زینے اترے اور ڈرائیو وے پر پہنچ گئے۔ جہاں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میں ڈاکٹر کے پرانی مورلیس کھڑی تھی۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا اور اندر جا بیٹھا۔

''تم نے بہترین کوشش کی۔'' میں نے کہا۔

''میں تمہارے آنے کا بے حد ممنون ہوں۔''

''اسے کچھ دنوں کے لیے آرام کی سخت ضرورت ہے۔'' گلابائی نے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔ اور میری طرف دیکھے بغیر اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور روانہ ہو گیا۔

سفر

حسب معمول صبح سات بجے جب اس کی آنکھ کھلی اس نے اوپر کی چادر پیروں سے اچھال کر ایک طرف کی اور اٹھنے کی کوشش کی اور..... اچانک اس کا ذہن زور سے سنسنایا۔ گھبرا کر اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی طرف دیکھا جو غائب ہو گیا تھا۔ ہاں اسے یہی محسوس ہوا تھا کہ اس کا بایاں ہاتھ شانے سے لے کر انگلیوں کی پوروں تک غائب ہو گیا اور وہ واقعی غائب ہو گیا تھا۔ آستین سمیت۔

میرے خدا..... اس کے منہ سے نکلا اس نے جلدی سے اسے داہنے ہاتھ سے ٹٹولا اور اسے نہ پا کر بوکھلاہٹ میں زور سے چیخا۔ ''ذریں.....

ذریں۔" اس نے اپنی بیوی کو پکارتے ہوئے کہا۔
"میرا..... میرا بایاں ہاتھ غائب ہوگیا ہے۔"
اس کی بیوی لاؤنج میں کچھ کر رہی تھی۔ وہ بڑھی اس نے بیڈروم میں جھانک کر اسے دیکھا اور پوچھا۔ "کیا کہہ رہے ہو۔"
"میرا بایاں ہاتھ..... غائب ہوگیا ہے۔" اس نے اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر لہراتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں شدید گھبراہٹ پنہاں تھی
بیوی نے اس کی سمت دیکھا۔ پہلے تو اس کے تیور چڑھے مگر دوسرے لمحے وہ مسکرانے لگی۔
"ہاتھ غائب ہوگیا۔" اس نے کہا۔ "اور لہرا بھی اسی کو رہے ہو۔"
"کیا۔" اس نے حیرت سے بیوی کو دیکھا پھر ہاتھ کی طرف دیکھا۔ "اچھا تو یہ ہے۔ میں سمجھ رہا تھا غائب ہوگیا۔" وہ بڑبڑایا۔
بیوی نے برا سا منہ بنایا اور بولی۔ "اچھا جلدی سے تیار ہو جاؤ ورنہ آفس میں دیر ہو جائے گی۔ یہ مذاق کا ٹائم نہیں ہے۔"
عزیز الدین ایک اکاؤنٹنگ فرم میں اسسٹنٹ تھا۔ اس کے دو بچے تھے سات اور آٹھ سال کے ایک لڑکی تھی اور ایک لڑکا۔ وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا تھا۔ آفس جاتے ہوئے اس نے بازار کے نزدیک راستے میں ہی فقیر کو کھڑے دیکھا جس سے کل اس کی مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ ہٹا کٹا آدمی تھا اور آواز لگا رہا تھا 'مجھ لاچار کی مدد کرو۔ اللہ کے نام پر' اس نے اپنا بایاں ہاتھ دائیں میں تھام رکھا تھا۔ اس طرح جیسے وہ ہاتھ مفلوج ہو۔ اس کی انگلیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ کل اس نے اسے ایک روپے کا سکہ دیا تھا اور ساتھ میں بولا تھا' اچھے خاصے آدمی ہو کوئی کام کیوں نہیں کرتے۔ فقیر نے کہا تھا کہ اس کا بایاں ہاتھ مفلوج ہے حالانکہ وہ مفلوج نہیں لگتا تھا۔ اس نے کہا تھا کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ اور تب اس فقیر نے اس کا دیا ہوا سکہ اسے واپس تھماتے ہوئے کہا تھا۔
"یہ لو اپنا روپیہ اور جاؤ۔" اسے اس فقیر پر بہت تاؤ آیا تھا۔ مگر وہ چلا گیا تھا۔ فقیر نے اس کیس مت سرسری انداز سے دیکھا اور منہ سے آواز نکالی۔ "اللہ کے نام"..... اور رک گیا۔ شاید اس نے اسے پہچان لیا تھا۔ عزیز الدین نظریں دوسری طرف کرتا ہوا تیزی سے اس کے پاس سے گزر گیا۔ 'حرام خور' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔
بس میں سوار ہوتے ہوئے اس نے احتیاطاً اپنا دایاں ہاتھ استعمال نہیں کیا کیونکہ وہ ابھی تک کچھ اسی طرح محسوس کر رہا تھا کہ اس کا یہ ہاتھ موجود نہیں۔

☆☆

آفس میں اس روز افسر اعلا کے کمرے میں انکوائری کمیٹی بیٹھی ہوئی تھی۔ ہفتہ بھر قبل آفس میں ایک ناخوشگوار واقعہ ہوا تھا۔ آفس سپرنٹنڈنٹ نے اس کے ایک کولیگ کو کسی بات پر برہم ہو کر ماں کی گالی دی تھی۔ اس کے کولیگ نے اپنی شکایت افسر اعلا کو پیش کر دی تھی۔ عزیز الدین اتفاق سے اس وقت کمرے میں موجود تھا۔ اس کے کولیگ نے اس کا نام بہ طور گواہ ڈال دیا تھا۔
عزیز الدین سے جب انکوائری افسر نے تصدیق چاہی تو خلاف توقع اس نے سچ ظاہر کرنے سے ہاتھ اٹھا لیا۔ وہ اس چکر میں پڑ کر اپنا مستقبل تاریک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ دروازے کے نزدیک تھا جب یہ تکرار ہو رہی تھی۔ تکرار تو اس نے سنی تھی مگر وہ نہیں یاد کر پایا ہے کہ کوئی گالی دی گئی تھی۔ حالانکہ گالی اس نے سنی تھی۔ جب وہ کمرے سے باہر آیا تو اسے اپنے کئی دوستوں کی ملامتی نظروں کا نشانہ بننا پڑا مگر وہ اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ اپنی اسی حرکت پر اسے ایک افسوس تھا مگر وہ اپنی مجبوری کو بھی سمجھتا تھا۔ شام تک وہ بری طرح ملول رہا۔ سوتے وقت بھی یہی خیال اس کے دماغ میں تھا۔
دوسری صبح کو وہ اٹھا۔ تو اسے احساس ہوا کہ

اس کی زبان سخت ہو رہی ہے۔ دانت صاف کر کے وہ ناشتے کے لیے بیٹھا تو اس نے کہا۔ "مجھے لگ رہا ہے میری زبان غائب ہوگئی ہے۔ میں بول نہیں سکتا۔" بیوی نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "بول تو رہے ہو..... اور کہہ رہی ہو بول نہیں سکتا۔"
عزیز الدین نے اسی بے چارگی سے دیکھا۔ "اچھا تو میں بول رہا ہوں۔"
بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ اسی وقت اس کی بچی نے آ کر اس سے کچھ کہا تھا اور وہ اس کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔
وہ دن اس کا دفتر میں اس طرح گزر گیا جیسے وقت بھاگ رہا ہو۔ ہوا یہ تھا کہ صبح کو ہی اس کے سپرنٹنڈنٹ نے بلایا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس نے وہاں ایک لڑکی کو بیٹھے دیکھا۔ عمر اس کی کوئی بیس اکیس سال ہوگی۔ قد زیادہ نہ تھا اور جسم بھی نہ دبلا تھا نہ موٹا۔ رنگ گورا تھا۔ اس نے بڑے سلیقے سے لباس پہن رکھا تھا۔ لڑکی بلاشبہ حسین تھی اور اسکی بات چیت کا انداز موہ لینے والا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ نے اس سے کہا۔ "یہ مس فرزین ہیں ہمارے آفس میں نئی نئی آئی ہیں۔ تم انہیں اپنے ساتھ بٹھا کر اپنے کام کے بارے میں سمجھاؤ۔ ہم تمہیں دوسرا کام دینے والے ہیں۔"
اس نے سر کے اشارے سے حامی بھر دی۔ بولتے ہوئے وہ کترا رہا تھا کیونکہ اسے برابر احساس ہو رہا تھا کہ اس کی زبان اور ہونٹ غائب ہو چکے ہیں۔
یہ بات تو اسے بعد میں معلوم ہوئی کہ اس کے اس کولیگ کو نوکری سے ہٹا دیا گیا ہے جس نے سوپر کے خلاف درخواست دی تھی اور اسے اب اسی کا کام لیا جانا تھا۔ اس خبر کے ساتھ اسے بالکل چپ لگ گئی تھی۔ اسے اس بات کی توقع نہ تھی۔
اسی روز وہ مس فرزین کو ساتھ بٹھا کر کام سمجھاتا رہا۔ اس دوران وہ بہت کم بولا البتہ ایک بات اس نے ضرور محسوس کی کہ مس فرزین اسے بری طرح اچھی لگ رہی ہے۔ اس کی عمر اس وقت پینتالیس سال کی تھی۔ فرزین کو دیکھ کر اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ شادی کر کے اس نے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ اس کی بیوی فرزین کے سامنے نہ صرف یہ کہ کچھ بھی نہ تھی بلکہ فرزین کو دیکھنے کے بعد اسے اپنی بیوی کا پھولتا ہوا جسم بہت ہی برا محسوس ہونے لگا تھا۔
شام کو وہ گھر لوٹا تو وہ بڑا سرشار تھا۔ فرزین نے اسے دوسرے روز ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دی تھی۔
آنے والی صبح بہت ہی پریشان کن تھی۔ جاگتے میں اسے احساس ہوا تھا کہ جیسے اس کی آنکھیں کہیں کھو گئی ہیں۔ اس نے کئی بار اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا تھا وہ اپنی جگہ تھیں مگر اسے یہی لگ رہا تھا کہ جیسی وہ موجود نہیں ہیں۔ ہاتھ اور ہونٹوں کی گمشدگی کے بعد یک بہ یک آنکھوں کا گم ہونا کوئی اچھی علامت نہ تھی مگر پچھلے تجربے کی روشنی میں اس نے یہی مناسب سمجھا کہ اس بات کو اپنے تک محدود رکھے۔
اس روز آفس میں اس نے مس فرزین کے ساتھ کھانا کھایا۔ وہ خصوصی طور پر اس کے لیے گھر سے پکا کر لائی تھی۔ بے شک اس کے اور فرزین کے درمیان کافی باتیں ہوئی تھیں مگر زیادہ تر لڑکی ہی بولتی رہی تھی۔ کیونکہ وہ بولتے میں بہت جھجک محسوس کر رہا تھا۔ اسے یہ احساس لپٹا ہوا تھا کہ اس کا منہ کھویا ہوا ہے۔ بس وہ اسے کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتا رہا تھا اور سوچتا رہا تھا آخر یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ فرزین اس کی زندگی میں شامل ہو جائے۔ اگر معاملہ صرف بیوی تک ہی ہوتا تو وہ اسے چھوڑ بھی سکتا تھا مگر اس کے بچے بھی تھے اور معاملہ یہ بھی تھا کہ یہ بات بھی کنفرم نہ تھی کہ یہ لڑکی واقعی اسے چاہتی ہے یا معاملہ صرف دوستی اور پسندیدگی تک ہی ہے تاہم اسے امید یہی تھی کہ لڑکی

اس سے متاثر ہے۔

وہ رات گزار کر جب وہ اٹھا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کا دل غائب ہوگیا ہے۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے محسوس کیا تو وہ غائب ہی لگا۔ اسے اس کی دھڑکنیں سینے کے بجائے دماغ میں ہوتی لگ رہی تھیں۔ اس نے خاموشی سے آفس جانے کی تیاری میں محسوس کیا کہ اسے اپنی بیوی ذرا بھی اچھی نہیں لگ رہی ہے حتیٰ کہ بچے بھی اسے ناگوار لگ رہے تھے۔ جب سے اس کا منہ غائب ہوا تھا اس نے بات چیت بہت کم کر رکھی تھی۔ اس صبح اس نے کسی سے بات ہی نہیں کی اور ہوں ہاں سے کام چلا کر آفس کے لیے نکل گیا۔

آفس میں پہنچ کر اس نے موقع موقع سے فرزین کو اچھی طرح دیکھا..... وہ اسے کسی ٹھنڈے پانی سے بھرے گلاس کی طرح لگ رہی تھی اور وہ خود کو پیاس سے نڈھال ہوتا پا رہا تھا۔ اس نے طے کیا کہ آج کی گفتگو میں وہ کوشش کر کے تصدیق کرے گا کہ فرزین بھی اسے اسی طرح چاہ رہی ہے کہ جس طرح وہ اس کی چاہ میں تھا۔

کینٹین کے ایک گوشے میں چائے کی چسکیوں کے دوران بالآخر وہ حرف مدعا زبان پر لے آیا۔ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے اس نے سرسری لہجے میں پوچھا۔ ''فرزین ایک بات پوچھوں۔ بتاؤ گی۔''

''کیا۔'' لڑکی نے تجسس سے اسے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کیا۔''

''یہ بتاؤ کیا میں تمہیں اچھا لگتا ہوں۔''

لڑکی کی مسکراہٹ وسیع ہوگئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔''

اس کا دل کھل اٹھا۔ تب قدرے محتاط لہجے میں اس نے کہا۔ ''فرزین میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔''

''کیا۔'' لڑکی نے اسے دیکھا۔

''دیکھو..... فرزین میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے مجھے لگتا ہے میری آنکھیں کھو گئی ہیں اور میرا دل گم ہوگیا ہے۔''

لڑکی اس کی سمت اسی طرح مسکراتی ہوئی دیکھتی رہی شاید وہ اس کے جملوں کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی۔ تب اس نے ضروری سمجھا کہ وضاحت کر دے۔ ''میں تمہیں بہت چاہنے لگا ہوں فرزین۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔''

پھر جو کچھ ہوا اس کے لیے وہ بالکل تیار نہ تھا۔ فرزین ایک دم سے چونک اٹھی تھی۔ لمحہ بھر تک وہ اسے تکتی رہی پھر بھنچے بھنچے سے لہجے میں بولی۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں عزیز صاحب..... مجھے آپ سے اس کی توقع نہ تھی میں نے تو..... میں نے تو آپ کے اندر اپنے ابو کا عکس محسوس کیا تھا جنہیں دنیا سے گئے کوئی ایک سال ہو چکا ہے۔''

پھر اس نے اپنی پیالی سرکائی تھی اور اٹھ کر تقریباً بھاگتی ہوئی۔ کینٹین سے باہر نکل گئی تھی۔

اس رات عزیز الدین ٹھیک سے سو نہ سکا۔ صبح کو وہ اٹھا تو اسے احساس ہوا جیسے اس کا دماغ غائب ہو چکا ہے بس ایک سناٹا سا تھا جو اس کے شانوں پر رکھا ہوا تھا۔

ہاتھ منہ آنکھیں دل اور دماغ کھو دینے کے بعد عزیز الدین بس چند ہی دنوں موجود رہا اور ایک صبح جب وہ بیدار ہوا تو اس پر انکشاف ہوا کہ وہ لاپتا ہو چکا ہے۔ اپنے پورے وجود کے ساتھ غائب ہو چکا ہے۔

وہ اب آفس میں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں ہوتا تھا گھر پر ہوتے ہوئے بھی گھر میں نہیں پایا جاتا تھا۔

یہ الگ بات ہے کہ کسی نے بھی اس کی تصدیق نہیں کی تھی۔

قصہ تمام

ایم الیاس

رمولی دو میل پر واقع تھا اور کشتی اس فاصلے کو ایک گھنٹے سے پہلے طے نہیں کر سکتی تھی۔
رمولی کمر چوڑا اور لمبوترا جزیرہ تھا۔
اس نے اپنے بزرگوں کی زبانی سن رکھا تھا کہ کبھی یہ جزیرہ بستی کی زمین سے ملا ہوا تھا اور.....!

اس شمارے کے لیے ایک دلچسپ تحریر

''آنند! اب وقت آ گیا ہے کہ ہم دونوں کے درمیان یہ قضیہ ہمیشہ کے لیے طے ہو جائے۔'' پرکاش نے زور دے کر کہا۔

آنند نے اس کے کسرتی جسم پر بھرپور نظر ڈالی۔ پرکاش کا قد آنند سے کچھ نکلتا ہی ہوا تھا اور وہ آنند ہی کی طرح وجیہہ بھی تھا۔ اس نے یہ جملہ اس قدر سنجیدہ لہجے میں کہا تھا کہ آنند بھونچکا رہ گیا۔

"ویسے بھی ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔" وہ پھر بولا۔

"تمہیں یاد ہے' بچپن میں ہم دونوں آزمائشی کشتیاں لڑا کرتے تھے لیکن اب میرے اور تمہارے درمیان حقیقی اور آخری لڑائی ہوگی۔"

"حقیقی لڑائی۔"

"ہاں لڑائی! کیوں کہ اس میں ہروار سچا ہوگا۔"

پرکاش' آنند کے بچپن کا دوست تھا۔ عمر میں وہ آنند سے چھ ماہ چھوٹا تھا۔ ان دونوں نے ایک ہی اسکول میں ابتدائی تعلیم پائی تھی لیکن دونوں زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔

"آخر تمہارا مقصد کیا ہے۔" آنند نے سوال کیا۔

"مقصد تم خوب سمجھتے ہو آنند! تم میری اور رتنا کی راہ کا پتھر بنے ہوئے ہو۔"

"رتنا کی راہ کا پتھر!" آنند نے پرخیال انداز میں کہا۔ وہ جانتا تھا کہ رتنا اس سے محبت کرتی ہے۔ درجنوں بار رتنا اس سے اپنی محبت کا اقرار بھی کر چکی تھی۔ رتنا اور وہ گھنٹوں سمندر کے کنارے کھیلتے رہتے اور موں گے جمع کرتے رہتے تھے۔ پرکاش بھی اکثر ان کے ساتھ ہوتا تھا لیکن رتنا کا جھکاؤ آنند کی طرف تھا۔ پھر بھلا وہ پرکاش کی راہ کا پتھر کس طرح ہوسکتا تھا۔ ہاں' آنند' پرکاش کو اپنی راہ کا پتھر سمجھ سکتا تھا۔ پرکاش اگر یہ سمجھتا تھا کہ رتنا اس سے محبت کرتی ہے تو آنند کے خیال میں یہ اس کی بھول ہی تھی۔

"ہاں۔" وہ پھر بولا۔ "اور اب وقت آ گیا ہے کہ اس پتھر کو راہ سے ہٹا دیا جائے۔"

"لیکن رتنا مجھ سے محبت کرتی ہے۔" آنند نے اسے بتایا۔

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ وہ تم سے نہیں' مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اگر تمہیں اپنی محبت پر اتنا ہی گھمنڈ ہے تو تمہیں میری لاش پر سے گزر کر اس تک پہنچنا ہوگا۔ اگر تم میں مجھ سے لڑنے کی ہمت نہیں ہے تو صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ بستی سے ہمیشہ کے لیے اپنا منہ کالا کر لو۔ کہیں بھی چلے جاؤ۔"

"تم مجھے بستی سے نکال دینے کی دھمکی دے رہے ہو!" آنند نے کہا۔ بستی سے نکل جانے کا مطلب فرار کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ وہ پرکاش کے مقابلے میں کمزور ضرور تھا لیکن بزدل ہرگز نہیں تھا اور پھر بستی چھوڑ کر چلے جانے کا مطلب رتنا سے دست برداری بھی تھا جسے وہ کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"یہ بات میں نے تمہاری بہتری کے لیے کہی تھی۔" وہ بولا۔

"کیا تم مجھے بزدل سمجھتے ہو۔" آنند نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اگر بزدل نہیں ہو تو میرا مقابلہ کرو۔"

"تم مجھ سے کس طرح لڑنا چاہتے ہو۔" آخر کار آنند نے پوچھا۔

پرکاش نے اپنی آنکھوں میں کمنچاؤ پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"کل صبح طلوع آفتاب کے وقت رمولی کے مغربی کنارے پر اتر جانا۔ تمہارے پاس صرف ایک چاقو ہونا چاہیے' ایک جوڑا کپڑوں کا بھی لے سکتے ہو۔ میں بھی یہی سامان لے کر رمولی کے مشرقی ساحل پر پہنچوں گا۔ واپسی ہم دونوں میں سے کسی ایک کی ہوگی۔"

پرکاش کا یہ سفاکانہ فیصلہ سن کر آنند سناٹے میں آ گیا۔ رمولی ایک سنسان جزیرہ تھا جو بستی کے ساحل کے سامنے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ جزیرہ سرسبز ضرور تھا لیکن سخت ٹہنیوں والی خاردار جھاڑیوں سے پٹا پڑا تھا۔ وہاں کچھ بڑے درخت بھی تھے لیکن وہ پھل پھول سے عاری تھے۔ میٹھے پانی کا کوئی چشمہ بھی وہاں نہیں تھا۔

سنگ و خشت کے سوا وہاں اور کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو کسی کی توجہ اپنی جانب مرکوز کرتی۔ یہی وجہ تھی کہ مچھیرے اور سیر و تفریح کرنے والی پارٹیاں بھی اس جزیرے کا رخ نہیں کرتی تھیں۔ بچپن سے جوان ہونے تک آنند اس جزیرے پر کئی مرتبہ جا چکا تھا لیکن یہ بات بہت پرانی ہو چکی تھی۔

آنند کو یقین نہیں تھا کہ وہ پرکاش سے جیت سکے گا۔ پرکاش ایک ماہر شکاری تھا اس لیے اسے جنگلات کا تجربہ تھا۔ ہر چند کہ وہ آنند سے زیادہ پھرتیلا نہیں تھا مگر بلا کی جان رکھتا تھا۔ بستی میں ہونے والی کشتیوں میں آنند نے اسے لڑتے دیکھا تھا۔ وہ اپنے حریف کو دیکھتے ہی دیکھتے پچھاڑ دیتا تھا۔

اور پھر یہاں تو صورت حال ہی کچھ اور تھی۔ یہاں تو ایک دوسرے کی جان لینے کا سوال تھا۔ آنند نے اپنی پوری زندگی میں کسی پر چاقو سے حملہ نہیں کیا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ کسی کی جان لینا جرم ہے!" آنند نے پرکاش سے کہا۔

"ضرور ہے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔ تم بھی رتنا کو چاہتے ہو اور میں بھی لیکن رتنا ہم دونوں کو ایک ساتھ نہیں چاہ سکتی ہم دونوں میں سے کسی ایک کو راستے سے ہٹنا پڑے گا تاکہ وہ بلا جھجک اور بغیر کسی پریشانی کے اپنے جیون ساتھی کو چن لے۔"

"لیکن پھر بھی کسی کو قتل کرنا ناقابل معافی جرم ہے۔" آنند نے پھر کہا۔

"قاتل اس وقت تک قاتل نہیں کہلایا جا سکتا جب تک کسی تیسرے کو اس قتل کے بارے میں علم نہ ہو۔ ہمارے اس مقابلے کے بارے میں بھی کوئی کچھ نہیں جانتا۔ ہم میں سے ایک زندہ بچے گا' دوسرے کا کیا بنا' یہ کبھی کسی کو معلوم نہیں ہو سکے گا۔"

"لیکن میں یہ کیسے یقین کر لوں کہ تم صرف چاقو لے کر ہی رمولی پہنچو گے!" آنند نے مستحکم لہجے میں کہا۔ اسے خوشی تھی کہ وہ اپنی آواز کی لرزش کو چھپانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ "ممکن ہے' تم نے جزیرے میں پہلے ہی سے کوئی پستول یا بندوق چھپا رکھی ہو یا میرے لیے کوئی پھندا پہلے ہی سے تیار کر لیا ہو۔ تمہارا کیا بھروسا۔"

یہ سن کر پرکاش نے پھر ہونٹ سکوڑے اور بولا۔ "رمولی کا انتخاب میں نے اس لیے کیا تھا کہ وہ سب سے قریب ترین ہے لیکن اگر تمہیں میری جانب سے کوئی خدشہ ہے تو تم خود اپنی پسند کے کسی بھی سنسان جزیرے کا انتخاب کر لو۔ رمولی سے آگے چار پانچ جزیرے اور بھی ہیں' ان سب میں تو میں نے توپیں اور تلواریں نہیں چھپا رکھی ہوں گی۔"

آنند سوچ میں پڑ گیا۔ ہوسکتا ہے' وہ درست کہہ رہا ہو اور ممکن ہے' ایسا نہ ہو۔ آنند کو اس پر بھروسا نہیں تھا۔

"اچھا تو رمولی ہی ٹھیک ہے۔" آنند نے فیصلہ سنا دیا۔

یہ سنتے ہی پرکاش کے ہونٹوں پر ایک پراسرار سی مسکراہٹ پھیل گئی جس میں خون کی پیاس جھلک رہی تھی۔ وہ بولا۔ "بے فکر رہو' میں تم پر چھپ کر حملہ نہیں کروں گا۔ ایسا کرنے سے مجھے تسلی بھی نہیں ہوگی۔" اتنا کہنے کے بعد وہ چلا گیا۔

☆☆

یہ گفتگو جنرل اسٹور کے کاؤنٹر پر ہوئی تھی جہاں آنند ملازم تھا۔ اس وقت سہ پہر کے تین بج رہے تھے اور دکان کا مالک آنند کو چھوڑ کر اپنے گھر کھانا کھانے گیا ہوا تھا۔ آنند بے چینی سے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

وہ پرکاش کی ضدی طبیعت سے واقف تھا۔ پرکاش جس چیز کو پسند کرتا تھا' ہر جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کر لیتا تھا۔ وہ اول درجے کا

کینہ پرور اور مکار شخص تھا۔ پرکاش ایک لوہار کی دکان پر کام کرتا تھا۔ اس کا چل چلن مشکوک ہونے کی وجہ سے اس کا خاندان اس سے متنفر تھا۔ بستی میں اس کی حیثیت اس سرکاری سانڈ کی سی تھی جو کسی کی کھیتی اجاڑ دے' کسی بھی پالتو بیل کے چارے میں حصہ بٹانے لگے' کوئی اسے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ بستی والے اس سے خائف رہتے تھے۔

دکان کے مالک کے آتے ہی آنند نے اپنی طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کیا اور چھٹی لے کر باہر آ گیا۔ سورج مغرب کی جانب جھکنے لگا تھا۔ آنند کے پاس وقت بہت کم تھا۔ اسے جو کچھ کرنا تھا' جلد ہی کرنا تھا۔

وہ سیدھا اپنے گھر پہنچا اور شام کی چائے پی۔ پھر اس نے اپنے صندوق کی تہہ سے دس انچ لمبے پھل والا خنجر نکالا۔ دہری دھار والا یہ خنجر اس کے والد کی یادگار تھا جسے آنند نے آج تک استعمال نہیں کیا تھا۔ آنند نے سلی پر بڑی احتیاط سے خنجر کو تیز کیا اور اس پر تیل لگانے کے بعد چھپا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد آنند نے اپنی پتلون کے لیے موٹے چمڑے کی ایک چوڑی بیلٹ منتخب کی۔ ایک قمیص اور زین کی ایک نئی پتلون بھی اس نے نکال لی۔ یہ تمام سامان اس نے ایک جگہ رکھ لیا۔ اسی سامان پر اب اس کے مستقبل کا دارومدار تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے آنے والی رات اس کے لیے بڑی طویل ثابت ہوگی۔

پھر اچانک اس نے رتنا سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ وہ رتنا کے گھر کی طرف چل دیا۔ سردی کافی تھی۔ رتنا کا گھر پانچ منٹ کی مسافت پر تھا۔

رتنا کے مکان کے دروازے پر بیٹھے ہوئے کتے نے اسے دیکھتے ہی 'بف' کی آواز نکالی لیکن پہچانتے ہی دم ہلا کر خاموش ہو گیا۔ اس نے مکان کا بھاری چوبی دروازہ کھٹکھٹایا۔ دستک کے جواب میں فوراً ہی اندر قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر دروازہ کھلا سامنے رتنا کھڑی تھی۔

پانچ فٹ کا ایک حسین بت آنند کے سامنے تھا۔ دمکتا ہوا گندمی رنگ' سڈول جسم جس کا ہر عضو نظروں کو اسیر کر لیتا تھا۔ گہرے سیاہ بال اس کے دونوں شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی پیشانی پر سرخ بندیا دمک رہی تھی۔ اس نے اپنی بڑی بڑی کجراری آنکھوں سے جیسے ہی آنند کو دیکھا تو مسکرائی "ارے آنند تم!" اس نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "آؤ اندر آ جاؤ۔"

"شکریہ!" آنند نے ڈیوڑھی پھلانگتے ہوئے کہا۔ آنند اندر چلا گیا تو رتنا نے کنڈی پھر لگا لی۔

رتنا کے بچپن ہی میں اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا اور اب گھر کا نظام اس کی بڑی بہن نے سنبھال رکھا تھا جو بیوہ تھی۔ بوڑھا باپ دالان میں ایک پیڑھی پر بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ اس نے گردن گھما کر کہا۔ "آؤ بیٹے آنند! بہت دن بعد آئے ہو۔ کیا مشغولیت بہت تھی۔" پھر وہ رتنا سے مخاطب ہوا۔ "رتنا بیٹی! آنند کو پیڑھی لا کر دو۔ باہر سے آ رہا ہے' ہاتھ تاپے گا۔ آج سردی بھی بہت ہے۔"

"اتنی سردی نہیں ہے چاچا کہ مجھ جیسے جوان آدمی ہاتھ تاپنے لگیں۔" آنند رتنا کے ہاتھ سے پیڑھی لے کر آگ کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو بیٹا! میری عمر کے بوڑھوں کو سردی کچھ زیادہ ہی لگتی ہے۔"

چند منٹ مزید گفتگو کرنے کے بعد رتنا کا باپ اٹھ کر سونے کے لیے چلا گیا۔ جاتے وقت وہ رتنا کو بھی جلدی سو جانے کی ہدایت کرتا گیا تھا۔ پیڑھی خالی ہو جانے پر رتنا آنند کے قریب ہی بیٹھ کر ہاتھ تاپنے لگی اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"آج واقعی سردی بہت ہے۔" آنند نے

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا! بابا کے سامنے تو بہت بہادر بن رہے تھے کہ تمہیں سردی لگتی ہی نہیں۔"

"میرے خیال میں بہادروں کو بھی سردی ضرور لگتی ہوگی۔" آنند بولا۔

"یہ بات تو کسی بہادر ہی سے پوچھی جا سکتی ہے۔" رتنا نے اٹھلا کر کہا۔

"تو کیا میں تمہاری نظر میں بہادر نہیں ہوں۔"

"بہادر اور تم!" رتنا ہنسی۔ "پچھلے بسنت پر ہونے والی کشتی میں تم پرکاش سے ہار نہیں گئے تھے۔"

"اوہ!" آنند کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ تو اسے ابھی تک یاد ہے۔ آنند نے سوچا اور رتنا کے چہرے کو بہ غور دیکھا۔ سامنے جلتے ہوئے کنڈوں کی سرخ آگ کی چمک میں اس کا چہرہ کسی دیوی کے مانند دمک رہا تھا۔

"اچھا اگر میرا اس سے دوبارہ مقابلہ ہوا تو کیا وہ پھر مجھ سے جیت سکے گا۔"

"یقیناً۔" رتنا نے کہا۔ "وہ تم سے زیادہ داؤ پیچ جانتا ہے۔"

"لیکن ضروری نہیں کہ میں پھر ہار جاؤں۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" رتنا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"وہ تم سے زیادہ بہادر ہے۔"

آنند کو رتنا کا یہ پراعتماد لہجہ ناگوار لگا۔ اس کی باتوں سے طرف داری کی بو آ رہی تھی۔ چند لمحے توقف کے بعد اس نے کہا۔

"اچھا ایک بات بتاؤ۔"

"پوچھو۔"

"کیا کسی سے محبت کرنے کے لیے بہادر ہونا ضروری ہے۔"

"نہیں۔" رتنا نے دھیمی آواز میں کہا۔ "لیکن قدرتی طور پر لڑکیاں بہادر شخص کو پسند کرتی ہیں۔"

آنند اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا مطلب تو صاف صاف یہی تھا کہ وہ پرکاش کو پسند کرتی ہے۔ آنند نے دل میں سوچا۔

"بس جا رہے ہو!" رتنا بولی۔

"ہاں' اب میں کل شام آؤں گا۔"

"کل شام! بہت مشکل ہے۔" رتنا ہنسی۔

"کیا مطلب۔" آنند نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

"مطلب یہ ہے کہ آج بھی تم کئی روز بعد آئے ہو۔"

"لیکن کل شام میں ضرور آؤں گا۔ میں تمہیں آ کر دکھا دوں گا۔" آنند نے مستحکم لہجے میں کہا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا رتنا کے مکان سے باہر نکل آیا۔ رتنا کے جوابات نے اسے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کا ذہن اس قدر الجھا ہوا تھا کہ وہ رتنا کی باتیں سن کر کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر تھا۔

☆☆

رات کو وہ بہ مشکل چند گھنٹے سو سکا۔ اس کی آنکھ کھلی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سورج طلوع ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ آج کی صبح دوسرے دنوں سے مختلف تھی۔ آج صبح کا سورج دو پیغام لے کر طلوع ہونے والا تھا۔ ایک پیغام میں زندگی تھی اور دوسرے میں موت! ان میں سے ایک پیغام آنند کے لیے تھا' دوسرا پرکاش کے لیے۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ کون سا پیغام اس کے لیے ہو سکتا تھا۔

اس نے ناشتا بھی نہیں کیا۔ ناشتا اسے یاد ہی نہیں آیا۔ اس نے صرف منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور اپنا ضروری سامان سمیٹ کر گھر سے نکلا اور بستی کے ساحل کی طرف چل دیا۔ سردی عروج پر تھی۔ سورج نکلنے میں ابھی چند منٹ باقی تھے۔ وہ

اس ملگجے اندھیرے میں ہی رمولی کی طرف روانہ ہو جانا چاہتا تھا تاکہ کسی کو اس کی روانگی کا علم نہ ہو سکے حالانکہ اگر کوئی اسے دیکھ بھی لیتا تو یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ وہ رمولی کی طرف جا رہا ہے۔

گودی پر پہنچ کر اس نے اپنے دوست رامو کی کشتی کھولی۔ کشتی میں سوار ہونے کے بعد آنند نے اس کا رخ رمولی کی طرف کیا اور چپوار چلانا شروع کر دیے۔

رمولی دو میل پر واقع تھا اور کشتی اس فاصلے کو ایک گھنٹے سے پہلے طے نہیں کر سکتی تھی۔ رمولی کم چوڑا اور لمبوترا جزیرہ تھا۔ اس کی لمبائی شرقاً غرباً تھی۔ اس نے اپنے بزرگوں کی زبانی سن رکھا تھا کہ کبھی یہ جزیرہ بستی کی زمین سے ملا ہوا تھا اور ایک پتلی خاکنائے کی شکل کا راستہ جزیرے تک جاتا تھا۔ اب سے پینتالیس برس قبل ایک زبردست زلزلہ آیا تھا جس کے بعد زور کی آندھی آئی اور ساتھ ہی موسلا دھار بارش ہوئی جو کئی گھنٹے جاری رہی۔ پوری بستی مسمار ہو چکی تھی اور بستی سے جزیرے تک جانے والی دو میل لمبی خاکنائے گہرے سمندر میں ڈوب کر غائب ہو چکی تھی، ساتھ ہی وسیع و عریض رمولی کے بھی کچھ حصے تہ آب ہو گئے تھے۔ اب یہ جزیرہ ڈیڑھ میل لمبا اور چوتھائی میل چوڑا رہ گیا تھا۔ اس واقعے کی یاد لوگوں کے دلوں میں کچھ اس طرح بیٹھی تھی کہ انہوں نے رمولی پر جانا تو کجا، اس کے قریب سے گزرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ یہ جزیرہ مکمل طور پر ویران پڑا تھا۔ جزیرے پر بانس اور جنگلی نیم کے درخت بھی تھے جنہوں نے رمولی کو سرسبز بنا رکھا تھا۔ صرف مشرقی اور مغربی کناروں پر ریت موجود تھی جس کی وجہ سے ان ہی دونوں کناروں پر مختصر سا ساحل نظر آتا تھا اور نہ شمالی اور جنوبی کنارے پتھریلی چٹانوں سے اٹے پڑے تھے جن کا سلسلہ سمندر کے اندر تک چلا گیا تھا۔ یہاں موجوں کے تھپیڑے تند ہوا سے مل کر پوری قوت کے ساتھ ان پتھریلی چٹانوں سے ٹکراتے رہتے تھے۔

ابھی آنند نے چوتھائی فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ رمولی کے اس پار صبح کے سورج کی پہلی کرنیں سمندر میں نمودار ہو گئیں۔ سمندر کے پانی کا رنگ بھی تبدیل ہونے لگا۔ رمولی پر بسیرا کرنے والے بگلوں اور مرغابیوں نے اپنے اپنے گھونسلوں سے نکل کر فضا میں تیرنا شروع کر دیا تھا۔

ایک گھنٹے سے کچھ قبل ہی آنند نے دو میل کا فاصلہ طے کر لیا اور اس کی کشتی رمولی کے مختصر سے مغربی ساحل سے ٹکرائی۔ وہ کشتی کو کچھ دور تک خشکی میں کھینچ لایا اور اسے ایک بڑے پتھر سے باندھ دیا۔ پھر وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر چت لیٹ گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ ایک گھنٹے تک مسلسل کشتی کھینے کی وجہ سے اس کے دونوں بازو شل ہو گئے تھے۔ اسے مختصر سے وقت میں آرام کر کے اس تھکن کو دور کرنا تھا۔

دس منٹ بعد ہی اس کے حواس بہ حال ہو چکے تھے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کپڑوں کا فاضل جوڑا اس نے کشتی میں ہی رہنے دیا اور خنجر کمر میں کھونسنے کے بعد سامنے پھیلے ہوئے بیکراں سمندر اور افق کے درمیان، دو میل دور بستی کی طرف دیکھا۔ دور سے مکانات ننھے ننھے سے دکھائی دے رہے تھے، انہی کے درمیان سنہرے کلس والا وہ اکلوتا مندر بھی نظر آ رہا تھا جہاں آنند اور رتنا پوجا کرنے جاتے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں بھگوان سے اپنے ناکردہ گناہوں تک کی معافی مانگ لی اور اپنا رخ رمولی کی خاموش فضا کی جانب پھیر لیا۔ اب ہر طرف دھوپ پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ سرسبز جھاڑیاں اور پودے خاموش تھے۔ انہیں تو ویسے بھی زندگی اور موت کے اس مقابلے کو خاموش تماشائی کی طرح دیکھنا تھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ آج اس

نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ لی ہے۔ دشمن سے کسی رعایت کی توقع رکھنا حماقت تھی حالانکہ وہ اپنے دل کے ایک گوشے میں پرکاش کے لیے ہمدردی کا جذبہ یقینی طور پر محسوس کر رہا تھا۔

حقیقت میں پرکاش نے اسے چیلنج کر کے صلح و آشتی کی راہوں کو مسدود کر دیا تھا۔ وہ رتنا کو جیتنے کی خاطر آنند کے خون کا پیاسا ہو چکا تھا۔ آنند کے سامنے نہ صرف رتنا کو جیتنے کا سوال تھا بلکہ اپنے رقیب سے کھلا مقابلہ کر کے اپنی جان بھی بچانا تھی۔

وہ رمولی کے مختصر سے ساحل کو عبور کر کے جھاڑیوں کے نزدیک پہنچ گیا۔ اچانک وہ گھوما۔ ساحل کی ریت پر قدموں کے نشانات بن گئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ پیروں کے ان نشانات کو مٹانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ پرکاش کو تو علم ہی تھا کہ وہ مغربی ساحل کی جانب سے جزیرے میں داخل ہوگا، البتہ جھاڑیوں کے درمیان خشک زمین پر اسے اپنے قدموں کے نشانات نہیں چھوڑنا تھے۔

طے شدہ پروگرام اور اپنے وعدے کے مطابق اگر پرکاش بھی طلوع آفتاب کے وقت جزیرے کے مشرقی ساحل پر اتر چکا تھا تو اس نے اب آنند کی جانب بڑھنا شروع کر دیا ہوگا۔ اب آنند، جھاڑیوں کے پہلے بڑے قطعے کے درمیان تقریباً سو گز آگے بڑھ کر رک گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ پرکاش کو جزیرے کی لمبائی عبور کر کے اس تک پہنچنے کے لیے پورا ایک گھنٹہ درکار ہوگا۔ ہر چند کہ پرکاش کو اپنی جسمانی قوت پر بڑا ناز تھا لیکن آنند کو یقین تھا کہ وہ اس کی طرف سے بے پروا نہیں ہوگا۔ وہ تو انتہائی محتاط ہو کر آگے پیچھے اور دائیں بائیں دیکھتا ہوا اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا آنند کی طرف بڑھ رہا ہوگا۔ ایسی صورت میں پرکاش، مشرقی ساحل سے مغربی ساحل تک پہنچنے میں ایک گھنٹے سے بھی زیادہ وقت لے سکتا تھا۔

خشک ریت عبور کر کے جھاڑیوں کے قطعے میں پہنچنے کے بعد آنند کو اپنے قدموں کے نشانات مٹانے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ جزیرے کی زمین ہر چند کہ سخت اور پتھریلی تھی لیکن پرکاش جیسا عقابی نظر رکھنے والا اس کے قدموں سے بننے والے نشانات سے اس کا سراغ لگا سکتا تھا۔

اس نے اپنی قمیص اتاری ہی تھی اور اپنے قدموں کے نشانات مٹانے کی غرض سے جھکا ہی تھا کہ کھٹکے کی ایک آواز سن کر چونک اٹھا۔ اس کے سامنے والے قریبی درخت کے تنے میں ابھی ابھی ایک تیر آ کر پیوست ہوا تھا۔

اس نے صورت حال کو سمجھنے میں دیر نہیں لگائی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے خرگوش کی طرح جست لگا کر خود کو ایک جھاڑی کی اوٹ میں چھپا لیا۔ اس کے ذہن نے بڑی تیزی سے صورت حال کا تجزیہ شروع کر دیا تھا۔ اس تیر کا مطلب تو یہی تھا پرکاش، مشرقی ساحل سے مغربی ساحل پر پہنچ چکا ہے، مگر جزیرے کی ڈیڑھ میل دشوار گزار مسافت کو طے کرنے کے لیے اس کے پاس وقت کہاں سے آیا۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ وقت مقررہ سے کئی گھنٹے قبل ہی جزیرے پر آ گیا تھا۔ یہ سراسر وعدہ خلافی تھی۔ پھر درخت کے تنے میں پیوست ہونے والا تیر اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ تیر کمان بھی ساتھ لایا تھا۔ آنند کو یاد آیا، پچھلے سال پرکاش نے ایک غیر ملکی سیاح کو مچھلی کا شکار کھلایا تھا جس کے صلے میں وہ سیاح اپنا تیر کمان، پرکاش کو بہ طور تحفہ دے گیا تھا۔ یہ وہی تیر کمان تھا جو وہ ساتھ لایا تھا، لیکن یہ زبانی معاہدے کی سراسر خلاف ورزی تھی، کھلا ہوا دھوکا تھا۔ اس نے آنند پر چھپ کر وار کیا تھا۔ اگر آنند اپنے قدموں کے نشانات مٹانے کے ارادے سے اس وقت اچانک جھک نہ گیا ہوتا تو بلاشبہ وہ تیر درخت کے تنے کی بجائے اس کی پشت میں پیوست ہو جاتا۔ گویا پرکاش نے بے ایمانی پر کمر

باندھ لی تھی۔

آنند نے جھاڑی کے عقب سے مشرقی ساحل کی سمت نظر دوڑائی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا' وار خالی جانے کے بعد شاید پرکاش نے بھی خود کو کسی جھاڑی کی اوٹ میں چھپا لیا تھا۔ مجھے اپنی جگہ اطمینان سے نہیں بیٹھا رہنا چاہیے۔ وہ یقینی طور پر میری جانب بڑھنے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ آنند نے سوچا اور گردن گھما کر اپنے عقب میں دیکھا۔ جھاڑیوں کے اس قطعے کے بعد تقریباً پچاس گز وسیع ریتیلا میدان تھا جس کے بعد پھر گھنی جھاڑیوں کا ایک بڑا قطعہ تھا۔

آنند اپنی موجودہ جگہ سے اٹھا اور بچھلی جانب والے ریتیلے میدان کی جانب دوڑ لگائی۔ فوراً ہی اس نے اپنے عقب میں ایسی آوازیں سنیں جیسے کوئی اس کے پیچھے جھپٹا ہو۔ اس نے اپنی رفتار مزید بڑھائی اور اس کے ساتھ ہی پیچھا کرتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔

کھلے میں پہنچتے ہی اس کے قدم ریت میں دھنسنے لگے اور رفتار سست پڑنے لگی' ساتھ ہی اس نے محسوس کیا کہ پیچھا کرنے والے کی آواز بھی معدوم ہوگئی ہے۔ اس نے دوڑتے رہنے کے دوران میں گردن گھما کر پھرتی سے جائزہ لیا۔ پرکاش' جھاڑیوں کے قطعے کے خاتمے پر اس سے پچاس فٹ کے فاصلے پر تیر کمان سنبھالے اس کا نشانہ لیے کھڑا تھا۔ کسی بھی لمحے اس کی کھنچی ہوئی کمان سے تیر نکل کر آنند کے جسم میں پیوست ہوسکتا تھا۔

صورت حال کو بھانپتے ہی آنند نے بڑی مہارت سے بھاگنا شروع کیا۔ وہ چیتے کے مانند چھلانگیں لگاتا' جھکائیاں دیتا' جھاڑیوں کے اگلے قطعے کی طرف لپکا۔ اس کا اندازہ درست ہی نکلا۔ پرکاش کا پھینکا ہوا تیر زن کی آواز کے ساتھ ریت میں اس جگہ پیوست ہوا' جہاں چند لمحے قبل آنند موجود تھا۔ وہ پھر بھاگا۔ اس کا دماغ اور پیر ایک ساتھ کام کر رہے تھے۔ چند ہی لمحے بعد ایک اور تیر اس کے آگے گرا اور وہ پینترا بدل کر پھر بھاگا۔

اب وہ جھاڑیوں کے قطعے کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ اپنی بائیں طرف بلی کی سی تیزی سے تڑپا اور زمین پر پیر لگانے کے بعد اس نے پہلی جھاڑی کے عقب میں چھلانگ لگائی لیکن اس سے قبل کہ اس کا وجود مکمل طور پر جھاڑی کی پناہ میں آتا' اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ پرکاش کا پھینکا ہوا چوتھا تیر زناٹے کی آواز کے ساتھ اس کے دائیں کولھے میں پیوست ہوگیا تھا۔ جھاڑی کی دوسری جانب زمین پر قدم ٹکانے سے پہلے ہی وہ توازن کھو بیٹھا اور منہ کے بل گرا۔

پرکاش اب عقاب کے مانند مجھ پر جھپٹے گا۔ جیسے ہی یہ جملہ آنند کے ذہن میں گونجا' وہ اچانک پھر اٹھ کر بھاگا۔ نہ معلوم کہاں سے اچانک اس کے جسم میں طاقت بھر گئی تھی۔ کولھے میں پیوست تیر' دوڑنے کی وجہ سے بری طرح چبھ رہا تھا اور آنند زخم میں درد کی تیز ٹیسیں محسوس کر رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ پرکاش کو بھی ریت کا قطعہ عبور کرنے میں وقت لگے گا۔ وہ اس عرصے میں پرکاش کی پہنچ سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ بھاگتے ہوئے ہی اس نے اپنا دایاں ہاتھ کولھے تک پہنچاتے ہوئے تیر کو کھینچنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ تیر کی دو طرفہ نوکیں اس کے باہر نکلنے میں حارج ہو رہی تھیں۔

اس نے اپنے عقب میں دیکھا' زخم میں تیر کی موجودگی کی وجہ سے خون بری طرح بہہ رہا تھا۔ زخم سے نکلنے والے خون کو فی الحال اس کی سوتی پتلون جذب کرتی جا رہی تھی۔ وہ جھاڑیوں کے عقب میں لیٹتا' بیٹھتا اس مقام سے کافی دور ہٹ چکا تھا جہاں اسے تیر لگا تھا۔ اب پرکاش اسے آسانی سے تلاش نہیں کرسکتا تھا۔ آنند کے اور اس کے درمیان درجنوں گھنی جھاڑیاں حائل تھیں۔

وہ جگہ جگہ رکتا اور بھاگتا تقریباً چوتھائی میل سے زیادہ فاصلہ طے کر گیا۔ اس کی قمیص اب بھی اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی جس سے وہ کئی مقامات پر اپنے قدموں کے نشانات مٹا چکا تھا۔ پھر ایک مقام پر اسے بلند جھاڑیوں کا ایک ایسا جھنڈ نظر آیا جسے بڑے پتوں والی بیلوں نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ اسی میں جا گھسا۔ سب سے پہلے اس نے اپنی پتلون کی بیلٹ سے خنجر نکالا اور اس کی نوک سے تیر لگے زخم کو مزید چیر دیا۔ یہ کام شاید وہ اپنی زندگی میں کبھی اپنے ہاتھوں سے نہیں کرسکتا تھا لیکن اس وقت اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ زخم سے اس تیر کو ہر حالت میں نکالنا تھا۔ اپنے خنجر کی نوک سے جو کچھ بھی تکلیف اس نے محسوس کی' وہ اس تیر کے زخم سے ہرگز زیادہ نہیں تھی۔ بس ایک مشکل یہ تھی کہ وہ پشت کی طرف نیچے گردن گھما کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ زخم کا منہ پھیلتے ہی خون تیزی سے بہنے لگا تھا لیکن اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ جس کے سر پر موت اپنے بھیانک پنجے پھیلائے کھڑی ہو' اسے بڑے سے بڑے زخم کی بھلا کیا پروا ہوسکتی تھی۔ اس نے وہ تیر بڑی آسانی سے زخم سے باہر کھینچ لیا۔

تیر نکلتے ہی زخم سے خون تیزی سے بہہ نکلا تھا۔ اس نے بڑی عجلت میں اپنی پتلون اتار ڈالی۔ اندر اس نے لنگوٹ کس رکھا تھا۔ پتلون کے ایک پائنچے کو پھاڑ کر اس نے کئی پٹیاں بنائیں اور انہیں زخم پر رکھنے کے لیے ایک گدی بنائی۔ گھروندے کا ایک چھوٹا پودا اس نے پہلے ہی سے اپنی نظر میں رکھ لیا تھا جو اس کی بائیں طرف ایک جھاڑی کی جڑ کے قریب اگا ہوا تھا۔ اس پودے کا رس خون کو روکنے اور زخم کو ٹھیک کرنے میں بڑا معاون ثابت ہوتا ہے۔ آنند نے اس کی کچھ پتیاں توڑ کر اپنی ہتھیلی پر مسلیں اور اس کی ٹکیا بنا کر زخم پر رکھی اور پٹیوں سے کس کر باندھ دیا۔

کمرشل تھیٹر

لارڈ بائرن نے کہا کہ مزاحیہ ڈرامے کا اختتام ٹریجڈی ہونا چاہیے۔ سو اس کے بعد وہاں کے ڈراموں کا اختتام اکثر مرکزی کرداروں کی شادیوں پر ہونے لگا لیکن جرمن ڈرامہ نگار بریخت نے شاید ہمارے تھیٹر میں ہنسی نہ آئے اس تھیٹر پر ہنسنا چاہیے۔ ہمارے سارے اداکار ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک اداکار نے کہا۔ ”یہ بات نہیں لوگ سنجیدہ اداکاری بھی پسند کرتے ہیں' میں نے مرنے کا ایک سین کر کے سب کو رلا دیا۔“ تو دوسرے نے کہا۔ ”وہ اس لیے روئے تھے کہ انہیں پتہ تھا تم صرف مرنے کی اداکاری کر رہے ہو۔“

(عکس برعکس ڈاکٹر محمد یونس بٹ)

زخم کی پٹی کرنے کے بعد اسے بڑا اطمینان محسوس ہوا۔ خون کا بہاؤ بند ہو چکا تھا۔ اس کے لیے یہ بات بڑی خوش آئند تھی۔ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس پر نقاہت سی طاری ہو رہی تھی اور اسے آرام کی سخت ضرورت تھی لیکن آرام کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ اسے احساس تھا کہ پرکاش اس کے بہت قریب پہنچ چکا ہوگا۔ بہت ممکن تھا کہ وہ آنند کی اس پناہ گاہ کے آس پاس ہی کہیں موجود ہو اور اس کی تلاش میں مصروف ہو۔

آنند نے اپنی پناہ گاہ سے نکل کر آس پاس کا جائزہ لیا اور ایک بار پھر محتاط ہو کر جزیرے کے مشرقی ساحل کی طرف چل پڑا۔ اس کے ایک ہاتھ میں خنجر تھا اور دوسرے میں پرکاش کا پھینکا ہوا وہ تیر جو اسے موت سے ہم کنار کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اس کے جسم میں بچا ہوا خون جوش کھا رہا تھا۔ کولھے کا زخم چلنے میں حارج ہو رہا تھا اس کے باوجود وہ پرکاش سے بھڑنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا لیکن حکمت عملی کے ساتھ پرکاش نے اسے دھوکا

دیا تھا لہٰذا وہ بھی اسے اس دھوکا دہی کا جواب دینا چاہتا تھا۔

اچانک ایک خیال بجلی کی طرح آنند کے ذہن میں کوندا' ممکن ہے کہ پرکاش نے اندازہ لگالیا ہو کہ اس کا حریف کسی جھاڑی میں بھی چھپ سکتا ہے۔ اس صورت میں وہ جزیرے کے ایک ایک کونے کھانچے کو شکاری کتے کے مانند سونگھتا پھر رہا ہوگا۔ وہ ایک ایک جھاڑی کھنگال رہا ہوگا۔ ایسی صورت میں اسے جزیرے کے مشرقی سرے تک پہنچنے میں ناقابل اندازہ وقت لگ سکتا تھا۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے آنند نے خود میں نئی قوت محسوس کی۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ پرکاش اور وہ یہ لڑائی محض ایک لڑکی کے حصول کی خاطر نہیں بلکہ اپنے مابین کسی پرانی دشمنی کی بناء پر لڑ رہے ہیں۔ وہ پرکاش کے متعلق ابھی تک غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ پرکاش اس کی امید کے خلاف کمینی فطرت کا شخص ثابت ہوا تھا۔ آنند کو اپنی اس غلط فہمی کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔

ایک گھنٹے کی انتھک کوشش کے نتیجے میں آنند جزیرے کے مشرقی ساحل کے بالکل قریب پہنچ گیا اور جھاڑیوں کے آخری قطعے میں پہنچ کر ستانے لگا۔ وہ تیر اب بھی اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ اس نے تیر کا معائنہ کیا۔ یہ جدید قسم کا تیر تھا جو بالخصوص ہرن وغیرہ کے شکار کے لیے غیر ممالک میں استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ خیال رہ رہ کر اسے بے کل کیے دے رہا تھا کہ اس کے دشمن کے پاس تیر کمان ہے' جس کو رکھنے کا اس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ پرکاش نے اس سے صرف ایک بڑا چاقو رکھنے کا وعدہ کیا تھا لہٰذا اس کے پاس بھی صرف چاقو ہونا چاہیے۔ انصاف کا تو یہی تقاضا تھا۔ آنند نے سوچا۔

کچھ دیر ستانے کے بعد آنند نے بھی فوری طور پر ایک کمان تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ آس پاس بانس کے درخت بہ کثرت تھے۔ اس نے پھرتی سے ایک نیم خشک' لچک دار مگر ٹھوس بانس کا پانچ فٹ لمبا ٹکڑا اپنے خنجر کی مدد سے کاٹا اور بڑی پھرتی سے دونوں سرے کمان کے مخصوص سروں کے مانند تراش لیے۔ پھر اس نے اپنی پتلون کی بیلٹ کھولی جو مضبوط چمڑے کی تھی۔ آنند نے بیلٹ کو خنجر سے تین حصوں میں چیر ڈالا۔ ان میں سے دو حصوں کو جوڑ کر اس نے مضبوط تسمہ بنالیا۔ تھوڑی ہی دیر میں کمان تیار ہو چکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کمان کی کارکردگی پرکاش کی کمان سے کسی طرح بھی کم نہیں ہوگی البتہ اس کے پاس تیر ایک ہی تھا جو سراسر ناکافی تھا۔ پھر یہ کہ وہ کوئی ماہر تیر انداز بھی نہیں تھا۔ جو پہلے ہی نشانے پر اپنے دشمن کو چھید ڈالتا۔ بہرحال اب اس کے پاس کمان اور ایک تیر تھا جو بڑی طمانیت کا باعث تھا۔

اس نے آزمائشی طور پر اس اکلوتے تیر کو کمان پر چڑھایا اور دس فٹ دور ایک درخت کے تنے کو نشانہ بنایا۔ ایک زناٹے کی آواز کے ساتھ تیر' درخت کے تنے میں پیوست ہوگیا' فرط مسرت سے اس کی باچھیں کھل اٹھیں۔ اس نے فوراً ہی اپنے خنجر کی نوک سے جگہ بنا کر اس تیر کو تنے سے نکالا اور قدرے پیچھے ہٹ کر کئی بار یہی عمل دہرایا تو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ اب وہ تیر کمان کی حد تک مکار پرکاش کا ہم پلہ ہو چکا تھا۔

اس تیاری میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا اور اب پرکاش کی آمد متوقع تھی۔ سورج اب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ ایک گھنٹہ مزید انتظار کے بعد اس نے پرکاش کو آتے دیکھا۔ وہ کسی باؤلے کتے کے مانند ایک ایک جھاڑی کو سونگھتا پھر رہا تھا۔ وہ اپنی کمان پر تیر چڑھائے پوری طرح چوکنا تھا۔ ابھی وہ آنند سے نصف فرلانگ دور تھا۔

اچانک آنند کے ذہن میں ایک خیال آیا۔

اس نے جلدی سے اپنے قریب ہی ریت میں سے ایک مونگا تلاش کرلیا۔ پرکاش' کمان پر تیر چڑھائے محتاط قدموں سے اسی طرف آرہا تھا۔ اس کی دائیں جانب بھی جھاڑیوں کا ایک قطعہ تھا۔ آنند مونگا ہاتھ میں دبائے منتظر رہا۔ پرکاش اپنی بائیں جانب والے قطعے کو چیک کرنے کے بعد دائیں جانب والے قطعے کی طرف گھوما۔ جیسے ہی اس کی پشت آنند کی طرف ہوئی' آنند اپنی جگہ پر کھڑا ہوا اور مونگا پوری قوت سے جھاڑیوں کے اس قطعے پر پھینک دیا جسے وہ چیک کر چکا تھا۔

مونگا جیسے ہی جھاڑیوں سے ٹکرایا' ایک ہلکا سا شور پیدا ہوا۔ پرکاش ادھر ہی گھوم گیا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ آنند اسی قطعے میں چھپا ہوگا۔ آنند نے پرکاش کو اثباتی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بھی دیکھا۔

اب آنند کو وہ موقع ملنے والا تھا جس کا وہ منتظر تھا۔ پھر وہی ہوا۔ پرکاش کی تمام تر توجہ اسی قطعے کی جانب مبذول ہوگئی تھی۔

پھر آنند نے اسے للکارتے سنا۔ ''باہر نکل آؤ آنند!'' وہ کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز میں ایسی مسرت آمیز لرزش تھی جیسے اسے اپنے دل کی مراد مل گئی ہو۔

پرکاش کو اپنی للکار کا کوئی جواب نہیں مل سکا۔ وہ اپنی کمان تانے قطعے کی چاروں طرف کسی چیتے کے مانند گھیراؤ کیے ہوئے تھا۔ جتنی بار اس کی پشت آنند کی طرف گھومی' اتنی ہی بار آنند اپنے قطعے میں اس کے قریب تر ہوتا گیا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب آنند اپنے قطعے کی سب سے آخری جھاڑی کی اوٹ میں پہنچ گیا۔ وہ آنند سے بیس فٹ دور' اس کی جانب پشت کیے کھڑا تھا اور للکار رہا تھا۔ اگر پرکاش اپنا چاقو ہاتھ میں لیے آنند کو للکارتا تو آنند اس کا چیلنج ضرور قبول کرلیتا مگر اس کے ہاتھ میں تو تیر کمال تھا۔ آنند اپنی جھاڑی کی اوٹ سے دبے قدموں باہر نکل آیا۔

پلک جھپکتے ہی آنند نے اپنی کمان کھینچی اور تیر چھوڑ دیا۔ اس نے پرکاش کی پشت کا نشانہ لیا تھا لیکن تیر بائیں کولھے میں لگا۔

منہ سے چیخ نکالنے کے ساتھ ہی پرکاش زمین سے کئی فٹ اچھلا۔ کمان اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی وہ گھوما اور اس کی نظر آنند پر پڑی۔

آنند کو دیکھتے ہی اس کے منہ سے گالیوں کا طوفان ابل پڑا۔ اس کی آواز جنگلی سور کی چنگھاڑ سے مشابہ تھی۔ اس نے سب سے پہلے بڑے کرب ناک انداز سے پہلو بدل کر اپنے کولھے تک ہاتھ بڑھایا اور تیر کو کھینچنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ آنند کی بنائی ہوئی کمان کا تیر اس کے کولھے میں ہڈی تک اتر گیا تھا۔ اس جھلاہٹ میں وہ اپنا لمبا چاقو نکال کر آنند کی طرف جھپٹا۔ آنند نے بھی اپنی کمان دور پھینک دی تھی۔ اس کے پاس ایک تیر تھا جو وہ پرکاش کے کولھے میں اتار چکا تھا لہٰذا اب یہ کمان اس کے کسی کام کی نہیں تھی۔

اب وہ دونوں درندوں کے مانند ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ پرکاش کا سانس پھول رہا تھا۔ کولھے میں لگے ہوئے تیر نے اس کے چہرے پر کرب کے آثار پیدا کر دیے تھے۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا' خشک دانت بھیڑیے کے مانند نکل آئے تھے۔ اس کی چال میں لنگڑاہٹ تھی اور اس کی پتلون کا پائنچا بڑی تیزی سے خون میں ڈوبتا جارہا تھا۔

''اب تمہیں مجھ سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔'' وہ غرایا۔ ''میں تمہاری لاش کو ایک بڑے پتھر سے باندھ کر سمندر میں پھینک دوں گا اور اس کے بعد یہ کہانی میرے سینے ہی میں دفن ہو جائے گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے چاقو والے ہاتھ کو برق رفتاری سے پچھلی جانب کھینچا اور اس سے زیادہ رفتار سے آنند کی جانب بڑھایا۔

اس نے آنند کو باتوں میں الجھا کر بڑی مہارت سے وار کیا تھا اور قریب قریب کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ آنند کے پاس اب اتنا وقت نہیں تھا کہ جھکائی دے کر خود کو بچا سکتا۔ چاقو کے چمک دار پھل کو پلک جھپکتے میں اس نے اپنے سینے کی طرف آتے دیکھا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت دی اور اسے اپنے سینے کے سامنے لے آیا۔ دوسرے ہی لمحے پرکاش کے چاقو کا پھل آنند کے بازو میں کہنی کے اوپر گوشت میں گھس کر ہڈی سے ٹکرایا۔ آنند کے منہ سے ایک کراہ نکلی' ساتھ ہی اس نے اپنے بازو میں آگ سی لگتی محسوس کی' لیکن اس کے ساتھ آنند کو یہ احساس بھی ہوا کہ پرکاش نے اس کی طرف اپنا چاقو پھینک کر ایک فاش غلطی کی تھی۔ جیسے ہی آنند کو پرکاش کی غلطی کا احساس ہوا' اس نے اپنے بازو سے چاقو کھینچا اور جھاڑیوں کے قطعے میں دور پھینک دیا۔ پرکاش کے لیے اب یہ ممکن نہیں تھا کہ فوری طور پر اپنے چاقو کو تلاش کر لیتا۔ وہ مکمل طور پر نہتا ہو چکا تھا۔

اس صورت حال پر' پرکاش اپنے حواس کھو بیٹھا اور دیوانہ وار آنند پر جھپٹا۔ اس کے دونوں ہاتھ سیدھے آنند کی گردن پر آئے تھے۔ وہ آنند کی گردن دبانا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی آنند کو اپنا سانس رکتا محسوس ہونے لگا۔

پھر اچانک جیسے پرکاش کو آنند کا خنجر یاد آ گیا۔ اس کی آنکھیں' حلقوں سے ابل پڑی تھیں' جھاگ اڑاتا ہوا منہ پھٹ گیا تھا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ آنند کا خنجر اس کے پیٹ کے پردے کو چیرتا ہوا دل میں اتر چکا تھا۔ آنند نے اپنے خنجر کو مزید جھٹکا دیا تو وہ بیل کے مانند ڈکرایا۔ آنند کی گردن پر اب اس کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی تھی۔ آنند نے پرکاش کے پیٹ سے خنجر کھینچ کر ایک دوسرے مقام پر گھسیڑا تو اس کے دونوں ہاتھ نیچے جھول گئے اور جسم آنند کے ناتواں وجود پر ہی ڈھیر ہو گیا۔

جب آنند کو ہوش آیا تو اس کا پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ وہ اپنی ٹانگوں کو جنبش نہیں دے سکتا تھا۔ ٹانگیں منوں وزنی محسوس ہو رہی تھیں۔ پھر جیسے ہی آنند کی نظر پرکاش کی لاش پر پڑی' اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ پرکاش کا مردہ جسم ابھی تک اس کے اوپر ہی پڑا ہوا تھا۔ اس نے پرکاش کی لاش کو ایک طرف الٹ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا پورا جسم پرکاش کے خون سے تر تھا۔ ان دونوں ہی کے جسموں کو موٹی موٹی چیونٹیوں نے نوچنا شروع کر دیا تھا۔ بڑی تعداد میں کھیاں بھی بھنبھنا رہی تھیں نہ معلوم کتنی دیر بعد آنند کو ہوش آیا تھا۔ سورج غروب ہونے میں کچھ ہی دیر باقی تھی۔ آنند کے بازو سے نہ جانے کب خون بہنا بند ہو چکا تھا۔ زخم پر خون کی تہ سوکھ کر سیاہ ہو گئی تھی' لیکن آنند' بازو کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے کولھے کا زخم بھی دکھ رہا تھا۔ بس وہ لنگڑا کر چل سکتا تھا۔

اس نے پرکاش کی لاش سے کپڑے اتار ڈالے' پھر اس کا چاقو اور کمان بھی قبضے میں کر لی۔ یہ سب چیزیں اسے واپسی میں گہرے سمندر میں پھینک دینا تھیں' باقی رہی لاش تو اسے امید تھی کہ دوسرے ہی دن گدھ اسے نوچ کھائیں گے اور وہ شناخت کے قابل نہیں رہے گی۔ جہاں تک اس کے زخموں کا تعلق تھا' اسے امید تھی کہ وہ ہفتے عشرے میں بھر جائیں گے۔ اسے بس بخار کے بہانے لحاف اوڑھ کر یہ دن بستر پر ہی گزارنا تھے۔

آنند بڑی تیزی سے مغربی ساحل پر پہنچا۔ سورج نصف غروب ہو چکا تھا اور ہر سو اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ خوش قسمتی سے یہ سمندر کے چڑھاؤ کا وقت تھا۔ اپنی کشتی جسے وہ جھنگی پر کھینچ کر ایک بڑے پتھر سے باندھ گیا تھا' اتھلے پانی میں تیر رہی تھی۔

اس نے سب سے پہلے اپنے زخموں کو بچاتے ہوئے پورا جسم دھویا' پھر اپنے وہ کپڑے پہنے جنہیں کشتی ہی میں چھوڑ گیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ اپنی کشتی میں سوار ہوا اور اس کا رخ بستی کے ساحل کی طرف کر دیا۔ ایک ہاتھ سے چوار کھینے میں اسے سخت دقت ہو رہی تھی لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور چار گھنٹے کے مسلسل جدوجہد کے بعد سمندر کے یہ دو میل طے کر لیے۔ اس وقت رات کے دس بج چکے تھے۔ پرکاش کا سامان وہ ایک بھاری پتھر سے باندھ کر سمندر میں پھینک آیا تھا۔

کشتی سے اترنے کے بعد وہ لنگڑاتا ہوا اپنے گھر کی طرف بڑھا لیکن پھر نہ جانے کیوں اس نے اپنا رخ رتنا کے گھر کی طرف پھیر لیا۔ آنند اس سے اسی وقت ملنا چاہتا تھا۔

اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ بڑی مشکل سے چل پا رہا تھا۔ بستی کے بازار کی اکا دکا دکانیں اب بھی کھلی ہوئی تھیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے اس حالت میں دیکھے۔ اس لیے اس نے بازار کو چھوڑ کر ایک دوسرا راستہ اختیار کیا جو رتنا کے گھر کے عقب سے ہو کر گزرتا تھا۔

رتنا کے گھر کی ایک عقبی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ آنند جب قریب سے گزرا تو اسے رتنا کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ وہ شاید دالان میں آگ کے سامنے بیٹھی تھی اور اپنی دیدی سے کچھ کہہ رہی تھی۔ آنند ادھ کھلی کھڑکی کے قریب آ گیا اور اندر جھانکا۔ اس کا خیال درست تھا۔ رتنا کا باپ شاید سونے کے لیے جا چکا تھا' رتنا اور اس کی دیدی پیڑھیوں پر بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے کھڑکی کی طرف نہیں تھے لیکن ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

"تو تم نے فیصلہ کر لیا ہے۔" دیدی' رتنا سے پوچھ رہی تھی۔

برجستگی

علامہ راشد الخیری برصغیر کے نامور ادیب تھے وہ نہایت صابر اور شاکر انسان تھے اور ہر حالت میں اپنے رب کے شکر گزار رہتے تھے مرض الموت میں گرفتار ہوئے تو یوں ظاہر کیا جیسے معمولی تکلیف ہے ان کے معالج نے ان کے عزیزوں کو بتایا کہ کچھ دنوں کے مہمان ہیں علامہ صاحب کو پتہ چلا تو بہت برا منایا اور کہنے لگے۔

"سب نے جانا ہے قبل از وقت عزیزان کو بتا کر انہیں کرب و اذیت میں مبتلا کرنا کیا ضروری تھا۔"

طبیعت میں ظرافت تھی اور بقول شاہد احمد دہلوی مرحوم آخر وقت تک یہ احساس ظرافت زندہ تھا۔

ان نے ایک بھانجے (حاجی محمد میاں بخاری) مزاج پرسی کے لیے آئے انہی دنوں چارج پنجم کا انتقال ہوا تھا وہ پوچھ بیٹھے! "بادشاہ کے تخت پر تو اب بادشاہ کا لڑکا ہی بیٹھے گا۔"

مولانا نے نحیف آواز میں کہا۔ "نہیں! تمہارے حق میں وحیت کر گئے ہیں۔"

"ہاں۔" رتنا بولی۔ "میں صرف پرکاش سے محبت کرتی ہوں اور اب میں اس سے شادی کر لوں گی کیوں کہ وہ بہادر ہے۔"

"اور آنند۔"

"وہ مجھے شروع ہی سے ناپسند تھا۔ مجھے اس سے کبھی محبت نہیں رہی۔"

"لیکن پھر بھی' تم آنند کو کیا جواب دو گی۔" اس کی دیدی نے پوچھا۔

"مردے کسی سے سوال جواب نہیں کیا کرتے دیدی۔"

دوسری قسط

سحرزادی

سبحان راشد

بعض اوقات انسان کی زندگی ایسے ایسے موڑ اختیار کرتی ہے کہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے۔ ایک ایسے نوجوان کا قصہ جو ابھی تعلیم حاصل کر کے اپنی اور اپنے لوگوں کے لیے کچھ بننے کے خواب دیکھ رہا تھا کہ اچانک ہی اس کے خواب مسمار کردئیے گئے...... اور خواب اس کے اپنوں نے ہی چکنا چور کیے تھے۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ خوابوں کی تعبیر کے لیے سخت جدوجہد کرے گا۔ اس نے جب عملی زندگی میں قدم رکھا تو حالات اس کے سامنے عجیب رخ اختیار کر گئے مگر اس نے اپنے حوصلوں کو جوان رکھا۔

زندگی کی جدوجہد کے لیے کوشاں ایک حوصلہ مند نوجوان کی داستان

"ہمیں ایسے تھیلے درکار ہیں جن میں ہم اپنے جسموں کو رات کے وقت محفوظ کر سکیں وجہ یہ ہے کہ رات کو یہاں ایک خاص قسم کی مکھی سفر کرتی ہے۔ اور یہ مکھی اگر کاٹ لے تو انسان شدید بخار میں مبتلا ہو کر گھنٹوں میں چٹ پٹ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ رات کو خصوصی طور پر سونے کے لیے ہمیں یہ تھیلے درکار ہوں گے۔"

"مگر ایسا کیسے ممکن ہے۔"

"ممکن ہے۔ ان لوگوں کے پاس خیموں کے لیے جو کینوس کے ٹکڑے پڑے ہیں یعنی خیمے اگر پھٹ جائیں تو وہ انہیں پیوند لگانے کے لیے استعمال کر سکیں۔ وہ ہمارے کام آسکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے لیکن کیا کبیرے کو اس سے آگاہ کر دینا مناسب نہیں ہوگا۔"

"یہ اس کا اعتماد حاصل کرنے کا ایک بہترین طریقہ ہوگا۔" آربونا نے جواب دیا اور جب یہ بات شیراز کے ذریعے کبیرے کو معلوم ہوئی تو اس نے خوفزدہ انداز میں کہا۔

"آہ..... یہ تو مشکل بات ہے چونکہ ہمیں اسی علاقے میں طویل قیام کرنا ہے لیکن اس لیے ہم نے یہ سوچا ہے کہ ایک بہتر جھونپڑی بنائی جائے۔ مکھی کا خطرہ تو رات ہی کو ہوتا ہے ناں۔"

"ہاں۔"

"تو ہم رات کو اپنا کام جلد ختم کر کے اپنے خیموں میں محفوظ ہو جایا کریں گے۔" سو ایسا ہی کیا گیا اور ان لوگوں نے دیکھا کہ افریقہ کے ان قبائلیوں نے جن کا تعلق سونا لوٹے سے تھا اپنے اپنے لیے اور ہی طریقہ اختیار کیا یعنی جنگل کی گھاس پھوس جمع کر کے انہوں نے اپنے اردگرد آگ کا حصار بنا لیا اور آگ کے حصار میں آرام کی نیند سو گئے۔ یہ بھی ایک اچھا طریقہ تھا۔ لیکن خیموں کو مضبوطی سے بند کر لیا جاتا تھا اور شیراز اور آربونا کو بھی ان خیموں ہی میں جگہ دے دی گئی تھی۔ جہاں وہ گومڑی بنائے پڑے ہوا کرتے تھے۔

لیکن پھر یوں ہوا کہ انہوں نے کھدائی شروع کر دی اور کچے سونے کی تھوڑی بہت مقدار انہیں حاصل ہو گئی۔ لیکن کبیرے نے مایوسی سے کہا کہ یہ مقدار اتنی نہیں ہے۔ جس سے وہ اطمینان کی زندگی بسر کر سکے اور وہ سوچیں کہ سونے کا بڑا ذخیرہ وہ یہاں سے لے جائیں گے اس کے لیے انہیں یہاں سے آگے بڑھنا پڑے گا۔ چونکہ ان کے پاس موجود نقشے کے مطابق پہاڑوں کا سلسلہ بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جن میں سونا پایا جاتا تھا۔ تو سب نے اس بات سے اتفاق کیا اور سونا لوٹے قبیلے کے لوگوں نے بھی اس سے انحراف نہیں کیا اور وہ آگے بڑھنے کی تیاریاں کرنے لگے۔

لیکن پھر اسی رات ایک حادثہ ہو گیا۔ وہ دو افراد جو کسی ضرورت کے تحت رات کے وقت خیمے سے باہر نکل گئے تھے۔ اور ان ہدایات کو یاد نہیں رکھ سکے تھے۔ جو کبیرے نے انہیں دی تھیں۔ ان زہریلی مکھیوں کا شکار ہو گئے زہریلی مکھیوں نے ان کی گردنوں پر کاٹا اور وہ چیختے ہوئے اندر واپس آ گئے اور اس کے بعد انہیں شدید بخار ہوا۔ اور دوسری صبح دیکھتے ہی دیکھتے وہ زندگی سے ہٹ کر موت سے ہم آغوش ہو گئے۔

کبیرے کے حواس جواب دے گئے تھے۔ ویسے بھی اپنی اس ناکامی سے وہ خاصا دلبرداشتہ نظر آنے لگا تھا۔ اور آگے بڑھنے کے تصور سے اسے کچھ خوف محسوس ہوتا تھا۔ وہ دن بڑے غم واندوہ کے عالم میں گزارہ گیا۔ جبکہ سونا لوٹے کے لوگ شکار کی تلاش میں نکل گئے تھے۔ اور پھر اس دن کے خاتمے کے بعد رات کو وقت گزرے گا۔ کبیرے اور اس کا ایک ساتھی جس کا نام شیلا تھا۔ بڑے مغموم ایک گوشے میں سر جھکائے بیٹھے رہے تھے پھر جب صبح کو وہ جاگے تو انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا یعنی کبیرے اور اس کے ساتھی دو خچروں

کے ہمراہ غائب تھے۔ اور خیمے وغیرہ وہ وہیں چھوڑ گئے تھے۔ یہ ناقابل یقین سی بات ہے۔ کبیرے نے اس خدشے کا اظہار کیا اور بولا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے آقا کہ سونا ان سونا لوٹے والوں نے غائب کر دیا ہو اور ان دونوں کو بھی ان کے ساتھیوں کے قریب کسی قبر میں سلا دیا ہو۔ تم دیکھ رہے ہو آگے کی پہاڑیوں میں کچھ غار بھی نظر آ رہے ہیں ہو سکتا ہے۔ انہیں مرنے کے بعد اسی غار میں منتقل کر دیا گیا ہو۔"

"بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انہیں ہم دونوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے تھا اور کیا انہیں یہاں سے فرار نہیں ہونا چاہیے تھا۔" آربونا اس بارے میں غور کرنے لگا پھر بولا۔

"تمہاری بات وزن دار ہے ہاں اگر ایسا ہوتا تو ان لوگوں کا یہاں رکنا مناسب نہیں تھا اور اگر یہ یہاں رکے ہی تھے تو پھر جس طرح انہوں نے کبیرے اور اس کے ساتھی کو موت کے گھاٹ اتار دیا اسی طرح ہمیں بھی ختم کر دینا چاہیے تھا لیکن آقا' ان لوگوں کے تیور خطرناک دکھائی دیتے ہیں اور چونکہ اب مسٹر کبیرے تو فرار ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ان کی باقیات پر ہمارا قبضہ ہے۔ ہم کیوں نہ ان لوگوں کے ساتھ سختی سے پیش آئیں اور انہیں اپنے آپ سے جدا کر دیں تاکہ ہم آسانی سے اپنا آگے کا کام سرانجام دے سکیں۔" شیراز خاندانی نے حسرت بھری نگاہوں سے آربونا کو دیکھا اور کہا۔

"آربونا سونے کا حصول تو میرا بھی مقصد ہے۔ اور ہم دونوں بھائی اسی غرض سے یہاں پہنچے تھے۔ تم نے آج تک کبھی ہم سے ہماری کہانی نہیں سنی۔"

"مناسب موقع ملنے ہی پر میں تمہیں اپنی کہانی سناؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ دوست! لیکن اس سے پہلے ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہمیں آگے کیا کرنا چاہیے۔" اور پھر دونوں نے آپس میں مشورہ کیا اور آربونا نے ہیرش سے کہا۔

"میرے ساتھی اب چونکہ ان چاروں میں سے دو مر چکے ہیں جو یہاں ایک خاص مقصد لے کر آئے تھے اور دو فرار ہو گئے ہیں۔ غالباً زہریلی مکھیوں سے خوفزدہ ہو کر انہوں نے وہ سونا لے جانے پر اکتفا کیا ہے۔ جو انہوں نے اب تک حاصل کیا تھا۔ لیکن ہمارا مقصد سونے کا حصول نہیں ہے اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ تم لوگ بھی ہم سے جدا ہو جاؤ اور ہم اب تنہا رہنا چاہتے ہیں۔" تو ہیرش نے کہا۔

"لیکن تم یہاں تنہا رہ کر کیا کرو گے۔"

"یہ معلوم کرنا تمہارا کام نہیں ہے۔ تو حد سے زیادہ چالاک بننے کی کوشش کرتا ہے کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تو اپنی زبان بند رکھ۔"

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ حقیقت پر مبنی ہے اور تمہارے لیے اس میں برا ماننے کی کوئی بات نہیں ہے۔ کیا تم یہ بہتر نہ سمجھو گے کہ اب اپنے اپنے کام سے لگو۔"

"لیکن ہمارا معاوضہ کون ادا کرے گا۔ سونا تو وہ لوگ لے جا چکے ہیں۔"

"اس کی ذمہ ہم نے قبول نہیں کی اور نہ ہی جیسا کہ تم جانتے ہو۔ ہم ان کے ساتھیوں میں سے تھے ہم تو وہ تھے جو سمندر کی لہروں کے ساتھ بہتے ہوئے یہاں آ نکلے تھے۔ لیکن تمہیں وہ کام کرنا پڑے گا۔ جو ہمارا سفید آقا کرنا چاہتا تھا یعنی سونے کا حصول اتنا سونا حاصل کر کے تمہیں دو کہ ہمارا اتنے دن اتنے دن گزارہ ممکن ہو جائے۔"

"نہیں ہم یہ نہیں کر سکتے۔"

"تو پھر تمہیں موت سے ہمکنار ہونا پڑے گا۔" ہیرش نے اپنے لمبے چوڑے بدن کو دیکھتے ہوئے کہا اور اس وقت شیراز کا بھی یہ ارادہ نہیں تھا۔ جو واقعہ پیش آیا یعنی' شیراز یہ نہیں چاہتا تھا۔

کہ ان میں سے کسی کی زندگی کا خاتمہ ہو لیکن آربونا' ہیرش کا یہ لہجہ برداشت نہیں کر سکا تھا۔ اس نے کسی ارنے بھینسے کی طرح گردن جھکائی اور سر کی زوردار ٹکر ہیرش کے سینے پر ماری اور اسے دھکیلتا ہوا اس چٹان تک لے گیا۔ جو ہیرش کے عقب میں تھی اور پھر ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا اور شاید شیراز کو بھی اس بات کی امید نہیں تھی کہ آربونا اس قدر طاقتور آدمی ہو سکتا تھا۔ زوردار آواز کے ساتھ ہیرش کا پیٹ پھٹ گیا اور پیچھے سے چٹان کے دباؤ نے اس کی پسلیاں توڑ دیں۔ ہیرش کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور وہ سب خوف سے اچھل پڑے ہیرش کے منہ سے خون کا فوارہ بلند ہو رہا تھا۔ غالباً اس کے اندرونی اعضاء بالکل ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ پھر وہ اوندھے منہ زمین پر آ رہا تھا۔ لیکن ایسے وقت میں شیراز کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ آربونا کی جان بچانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ اس نے جلدی سے رائفل نکالی اور اس کے دو فائر فضاء میں کیے۔

جس کے نتیجے میں سونا لوٹے قبیلے کے تمام افراد سرپٹ دوڑ گئے تھے اور ان کا دور دور تک نام و نشان نہیں ملا تھا۔ اس طرح شیراز نے آربونا کی جان بچالی کیونکہ وہ لوگ ذہن میں بیشمار خیالات آ رہے تھے۔ ان میں پہلا خیال یہ تھا کہ اس کا ساتھی آربونا ایک مضبوط اور لوہے کا سر رکھنے والا آدمی ہے اور ضرورت کے وقت وہ اس قدر خونخوار بھی ہو سکتا ہے کہ سادگی اور آسانی سے کسی کی جان لے لے۔ اس کے علاوہ وہ اس لیے انتہائی اہم ہے۔ کیونکہ اس کا ساتھ کیسے بھی حاصل ہوا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت تھی کہ مہذب دنیا سے یہی اس کے ساتھ آیا تھا۔ اور بھائی کی جدائی کے بعد یہ اس کے لیے بہت اہمیت کا حامل تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بڑی جسامت والا بڑے ذہن سے نہ سوچ سکتا ہو اور اس کے دل میں یہ بات بالکل نہ آئی ہو کہ جس شخص کو اس نے قتل کر دیا۔ وہ بہر طور ایک قبیلے کا آدمی تھا اور اس بات کے امکانات تھے کہ قبیلے والے اس سے انتقام لینے پر تل جائیں۔ ایسی جگہ دو افراد کتنی دیر تک انہیں روک سکتے حالانکہ بندوق کے دھماکے ان کے لیے انتہائی خوفزدہ کرنے کا باعث بنے تھے اور اس سے شیراز خانانی کو یہ بھی اندازہ ہوا تھا کہ وہ آتشیں ہتھیاروں سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ لیکن اب پچھلے تمام احساسات کو بھلا کر اسے اپنے اور آربونا کے تحفظ کا بندوبست کرنا تھا۔ اس ذہانت کے ساتھ جو مہذب دنیا کا عطیہ تھی اور اس کے بھائی کی ہدایت تھی کہ وہ ہمت نہ ہارے۔ مرنے والا اپنا وجود اس کے وجود میں ضم کر کے اس دنیا سے چلا گیا تھا اور اب سے وہ سب کچھ کرنا تھا۔ چنانچہ وہ نئے فیصلے کرنے لگے۔

بات صرف یہ نہ رہی تھی کہ شیراز کو اپنی قسم پوری کرنے کے لیے خزانے کی تلاش تھی بلکہ اب یہ مکمل اس کے لیے ایک مقدس تحریک بن کر رہ گیا تھا۔ اس کے دل میں بہت سے خیالات تھے۔ روبینہ جس کی آنکھیں اب بھی اس کا راستہ تک رہی ہوں گیں۔ حالانکہ اتنا وقت گزر گیا وہ سوچ سکتا تھا کہ کمزور روبینہ اپنے ظالم باپ اور بھائی کا مقابلہ نہیں کر سکی ہوگی دو ہی باتیں تھیں۔ یا تو وہ اپنی زندگی موت کے حوالے کر دے۔ یا پھر باپ کے حکم کے مطابق اس کی مرضی کے کسی شخص سے شادی کرے۔ اگر اس نے ایسا کر بھی لیا تو یہ بات برداشت کی جا سکے گی۔ کیونکہ وہ کمزور لڑکی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ دوسری بات اس حویلی کے در و دیوار تھے۔ جن کے بارے میں جب بھی تصور کیا جاتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے کھلے دروازے شیراز کا انتظار کر رہے ہوں۔ اس کے علاوہ فاروق خانانی کی وصیت' جب بھی کبھی ان باتوں کے بارے میں سوچتا دل ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو جاتا اندر سے ایک قوت ابھرتی جو اسے مجبور کرتی کہ جتنا بھی بن پڑے وہ سب

کچھ حاصل کرے۔ جس کے لیے اس نے اس کے بھائی نے ان ویرانوں کا سفر شروع کیا تھا۔

اور جس کے بعد یہ تباہی ان پر نازل ہوئی۔

ادھر سب سے بہترین دوست آربونا یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے زندگی کے آخری سانس تک اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری بات جو تھی وہ یہ کہ اپنی اور آربونا کی حفاظت کی جائے یہ احساس اس کے دل میں اس قدر جڑ پکڑ چکا تھا کہ اب وہ ان راستوں کو مکمل طور پر تبدیل کر دینا چاہتا تھا اور اس نے اپنے دل سے خوف و ہراس کے اور غم و یاس کی کیفیت کو ختم کر دینے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔

چنانچہ ذہانت کے ساتھ یہ فیصلہ کیا گیا کہ غیر ضروری ساز و سامان سے نجات حاصل کر لی جائے خیموں کی ان کو ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ آسمان کی چھت اور زمین ہی سب سے مناسب پناہ گاہ ہوتی ہے۔ اگر یہ خیمے خچروں پر لاد لادے پھریں گے تو شاید اپنا مقصد پانے میں انہیں دقت ہو آربونا سے مشورے کے بعد یہ بھی طے کیا گیا تھا کہ سونے کے یہ پہاڑ جس سے کچا سونا برآمد ہوتا ہے۔ بہت سخت ہیں اور انہیں کاٹنے کے لیے آلات کی ضرورت بھی تھی۔ چنانچہ جو آلات وہ لوگ اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان میں صرف تھوڑے سے آلات اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ خاص توجہ ان ہتھیاروں پر تھی۔ جو اب ان کے پاس محفوظ رہ گئے تھے اور یہ ہی ان کے لیے بہت بڑا سہارا تھے اور طے کر لیا گیا تھا کہ ان کو انتہائی ضرورت کے وقت استعمال کیا جائے۔ اس کے علاوہ شیراز نے آربونا کو یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ غیر ضروری طور پر کسی شخص کو ہلاک نہ کیا جائے۔ بہر حال یہ اس کے اہل وطن ہیں۔ ہاں اگر بہت ہی ضروری بات درپیش ہو۔ تو پھر مجبوری ہے۔

یوں انہوں نے سفر کا راستہ کاٹ کر ایک سمت اختیار کی تھی۔ پھر ایک دن ایک رات سفر کر کے اس جگہ سے کافی دور نکل آئے تھے آربونا ایک بہترین ساتھی ثابت ہو رہا تھا وہ خدمتگاروں کی طرح شیراز کا ہر کام کیا کرتا تھا۔ اس سے شیراز کو شرمندگی ہوتی تھی۔ اس نے کہا۔

''آربونا! میں تمہیں اس طرح کام کرتے نہیں دیکھ سکتا۔ بہتر تو یہ ہوگا کہ تم صرف میرے ساتھی کی حیثیت اختیار کرو۔'' آربونا نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''اور میرے دوست! میرے لیے اب اس دنیا میں تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ زندگی کی آخری سانس بھی۔ تمہارے قدموں میں ختم ہو۔ چنانچہ مجھے اپنی خدمت کرنے دو۔ جہاں میں کہیں تھکن محسوس کروں گا تم سے کہہ دوں گا کہ میری مدد کرو۔ اس وقت اگر تم میرا ساتھ دو گے تو مجھے خوشی ہوگی۔'' آربونا نے شیراز کی زبان بند کر دی تھی۔

اور ان دونوں کا یہ سفر جاری رہا۔ صحرا جنگل دریا پہاڑ دلدلیں اس کے راستے میں آتے رہے۔ اور وہ انہیں بڑی خوش اسلوبی سے عبور کرتے رہے۔ ایک عجیب سی کیفیت ایک عجیب سا تصور ان کے ذہنوں پر سوار تھا۔ وہ اپنی منزل کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ بس سفر جاری تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ کس رخ کی جانب ہے۔ اس دوران انہیں چھوٹی چھوٹی آبادیاں بھی نظر آئیں تھیں۔ لیکن انہوں نے ان آبادیوں میں داخل ہونے سے گریز کیا تھا اور جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا۔ وہ ان سے بچنے کی کوشش میں سرگرداں تھے۔ بس ایک لگن ایک احساس جو زمین کے کسی پراسرار گوشے میں چھپا ہوا تھا۔ نادر کو آگے لے جا رہا تھا۔

نجانے کیوں اسے یقین تھا کہ منزل اسے ملے گی اور ضرور ملے گی حالانکہ کبھی کبھی مایوسیوں کا حملہ ہوتا تھا اور وہ یہ بھی سوچتا تھا کہ اب اس دنیا میں بالکل تنہا رہ گیا ہے۔ ایک بھائی تھا۔ جس نے

ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ جبکہ دونوں اس ادارے سے نکلے تھے کہ دنیا کو تسخیر کریں گے اور اپنے لیے وہ سب کچھ حاصل کرلیں گے جو ان کے باپ کی وجہ سے ان سے چھن گیا ہے۔ غرض یہ سفر جاری رہا اور اس رات وہ ایک ایسے پراسرار علاقے میں پہنچے جو چاروں طرف چٹانوں سے گھرا ہوا تھا۔ پر ہیبت چٹانیں ہر سمت بکھری ہوئی تھیں۔ اور ان میں غاروں کے دہانے نظر آرہے تھے۔ لیکن اس تمام تر سفر کے دوران انہوں نے ایسے بہت سے مناظر دیکھے تھے۔ جو انسانی دل کی حرکت بند کر دینے کے لیے کافی ہوں۔ قرب و جوار سے خوفناک درندے اس طرح گزر جاتے تھے کہ عام شہری زندگی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن تقدیر ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ موت ان سے بہت دور تھی اور وہ ان خوفناک حالات سے بھی بچ کر آگے نکل جاتے تھے۔ جن پر انہیں خود بھی حیرت ہوتی تھی۔ اب تھوڑی سی مزاج میں شگفتگی بھی آگئی تھی۔ کیونکہ گزرا ہوا وقت بھلا دینا ہی زندگی کی علامت ہوتی ہے۔ سو وہ ایسا ہی کر رہے تھے اور اس رات انہوں نے جس جگہ قیام کیا۔ وہ ایک غار کے سامنے پھیلی ہوئی چٹان تھی۔ جو پلیٹ فارم کی مانند محسوس ہوتی تھی۔ اور تھوڑی سی بلندی پر تھی۔ لیکن یہ جگہ اس لحاظ سے بہت بہتر تھی کہ اگر بارش ہو جائے۔ تو تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر وہ غار کے سائے میں پہنچ جائیں۔

جگہ اتنی پسند آئی کہ آربونا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''معزز دوست! اگر ہم اس جگہ کو اپنا مستقل مسکن بنالیں۔ تو کیسا رہے۔''

''ہم مستقل تو کہیں بھی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جب تک ہمیں ہماری منزل نظر نہ آجائے۔''

''میں نے تو ازراہ مذاق کیا' ویسے اگر تمہاری اجازت ہو تو میں اس سائبان کے نیچے گہری نیند لے لوں۔ بہت عرصہ ہوا کھلے آسمان کے نیچے سوتے ہوئے۔''

''میں تمہیں اس کی اجازت دیتا ہوں.....'' شیراز نے کہا اور آربونا غار کے سائے میں جا کر سو گیا۔ جبکہ شیراز اس کی دیوار سے پشت لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی نگاہیں اندھیرے میں اپنا ماضی تلاش کر رہی تھیں۔

اس ماضی میں سب کچھ موجود تھا۔ اس کا گھر وہ خوب صورت حویلی جس کی شان ہی نرالی تھی۔ اور جس کے بارے میں جب بھی سوچتا دل' تو ایک عجیب سا احساس ہوتا۔

بچپن کے دن بھی کتنے سہانے ہوتے ہیں۔ ہر مشکل سے بے نیاز ہر احساس کے عادی نجانے کیا کیا ہوتا ہے۔ ان دنوں میں..... اور ماضی کو اتنی حسین چیز ہے کہ جب بھی اسے تصور میں بساؤ۔ زندگی کی خوشیاں حاصل ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور اس ماضی میں روبینہ بھی تھی۔

روبینہ اس کی بچپن دوست' اس کی معصوم راز دار..... اس کا سارا بچپن اس کے ساتھ گزرا تھا۔ معصوم کھیل کھیلتے ہوئے اور اس کے بعد جوانی کا احساس جو گالوں پر شفق پھیلا رہتا ہے وہ اقرار جو زندگی کے آخری سانس تک زمین کی گہرائیوں میں پوشیدہ رہتا ہے۔

بہت دیر تک وہ ان تمام باتوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ چشم تصور میں اس کے روبینہ کو دیکھا جو اپنے گھر میں اپنے بستر پر لیٹی اس کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ یہ احساس تھا جس نے اس متحرک شے پر توجہ دی۔ جو کافی فاصلے پر ایک سیاہ چٹان کے قریب نظر آرہی تھی اور یہ نظر کا واہمہ نہیں تھا۔ کوئی ہستی تھی جو وہاں موجود تھی۔ کوئی جانور' کوئی درندہ..... کون ہو سکتا ہے..... لیکن پھر اس نے اسے اپنی نظر کا وہم ہی سمجھا..... نہ جانے کیا خیال آیا۔ اسے کہ اس نے آربونا کو آواز دی اور طاقتور افریقی میں بہت سی خصوصیات تھیں۔ جن میں سے سب سے بڑی خاصیت یہ تھی کہ وہ کتنی ہی

گہری نیند سو رہا ہو۔ ایک آواز پر جاگ اٹھتا تھا۔ آربونا چونک کر اٹھ گیا اور اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابھی صبح تو نہیں ہوئی۔''

''ہاں صبح نہیں ہوئی۔''

''تو پھر مجھے آواز دینے کی کوئی خاص وجہ تھی۔''

''ہاں۔''

''کیا۔''

''اگر تیری نیند خراب نہیں ہوئی۔ آربونا تو ذرا اٹھ کر بیٹھ جا۔'' شیراز نے کہا۔

''آہ..... میری نیند تو خراب نہیں ہوئی۔ لیکن..... لیکن۔''

''ہاں..... کیا..... لیکن.....۔''

''آہ..... اس وقت میں جو خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑا خوب صورت تھا میرے لیے۔''

''کیا خواب دیکھ رہا تھا۔'' شیراز نے اس چٹان پر نگاہیں جمائے ہوئے دیکھا جہاں وہ کسی شے کو متحرک دیکھ چکا تھا۔

''اپنی بونا میری ماں۔''

''تو اپنی ماں کو خواب میں دیکھ رہا تھا۔''

''ہاں۔''

''خیر یہ تو اچھی بات ہے۔ کم از تیرے دل کو سکون تو ہوا ہوگا۔ مجھے دیکھے آربونا میں تو اپنی ماں کو خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔''

''چونکہ اس کے خدوخال میرے ذہن میں موجود نہیں ہیں۔''

''کیا وہ تیرے شعور میں آنے سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں میرے دوست۔''

''ہاں۔''

''آہ..... بڑے بدنصیب ہوتے ہیں وہ..... میں تو پھر بھی خوش ہوں کہ مجھے طویل عرصے تک اپنی ماں کے ساتھ رہنے کا موقع ملا اور تو نے خود بھی دیکھا وہ ماں ہی تو تھی۔ جس نے تیری اور میری قربت کو دوستی میں بدل دیا۔''

''ہاں..... ماں عظیم چیز ہوتی ہے۔''

''کیا کہہ رہی تھی۔ تیری ماں۔''

''مجھے میری مشکل کا حل بتا رہی تھی۔''

''وہ کیا۔ تو کسی مشکل میں گرفتار ہے۔''

''میرے دوست! تیری مشکل میری مشکل ہے۔ یہ بات تو تو بھی جانتا ہے۔ میرے آقائے عظیم آقا۔''

''ہاں..... یہ تو ہے۔ لیکن ماں کہہ رہی تھی۔''

''وہ کہہ رہی تھی کہ تیرے آقا کو وہ سب کچھ حاصل ہوگا۔ جو اس کی خواہش ہے۔ لیکن اس کے لیے وقت درکار ہے۔''

شیراز نے محبت بھری نگاہوں سے اس پرنور دل والے کالے آدمی کو دیکھا۔ جس کے اندر اجالا ہی اجالا تھا۔ سفیدی ہی سفیدی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ آربونا یہ بات اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہہ دیا تھا اور بہرحال آربونا ایسے ہی خوب صورت دل اور ذہن کا مالک تھا..... وہ بولا۔

''اور کیا کہا تیری ماں نے۔''

''کہنے لگی کہ اسے اس کی منزل ایک عورت کی وجہ سے ملے گی۔''

''اوہ..... اور وہ عورت کہاں ہے۔''

''اسے تلاش کرنا پڑے گا۔ اگر تو مجھے کچھ اور وقت دیتا تو شاید میں اپنی ماں سے اس کا پتہ بھی پوچھ لیتا۔'' آربونا نے جواب دیا۔

''فی الحال میں تیری توجہ ایک طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں۔''

''خیریت' اوہو میں تو بھول ہی گیا کہ تو نے مجھے آواز دی تھی اور تو مجھے بلاوجہ سوتے سے نہ جگاتا..... بتا کیا بات ہے۔ کون سی ایسی بات ہے۔ جس نے تجھے مجھے آواز دینے پر مجبور کر دیا۔''

''وہ اس چٹان کی طرف کوئی شے مجھے

متحرک نظر آرہی ہے۔"

"یہ جنگل ہی ویرانہ ہے اور یہاں لاتعداد درندے ہوتے ہیں۔"

"ہاں اسی لیے میں نے تجھے آواز دی کہ کہیں یوں نہ ہو کہ میں اسے دیکھنے کے لیے وہاں چل پڑوں اور یہاں تو میری تلاش کرتا رہ جائے۔"

"مگر کس طرف۔"

"وہ اس طرف۔" شیراز نے ایک طرف اشارہ کیا اور آربونا کی نگاہیں اس جانب اٹھ گئیں۔ پھر وہ آہستہ سے بولا۔

"آسمان والے کی قسم یہ تو واقعی کچھ ہے اور جو کچھ بھی ہے۔ وہ کم از کم کوئی جانور نہیں ہے۔ دیکھو اس کے جسم میں ہلکی ہلکی لرزشیں ہو رہی ہیں۔"

"کیا چلیں۔"

"اگر تو سمجھتا ہے کہ آربونا بزدل ہے تو یہ تیری خوش خیالی ہے۔ ایسی بات ہے۔ میں تجھ سے دس قدم آگے چلوں گا۔ لیکن ذرا ہتھیاروں کے ساتھ۔"

اور اس دوران آربونا نے ایک اور کام بھی کیا تھا۔ اس نے ایک انتہائی مضبوط لکڑی کو توڑ کر اس کا ہالا بنا لیا تھا اور آربونا نے اپنے اس بھالے سے بڑے بڑے قوی ہیکل جانور شکار کر ڈالے تھے اور خود شیراز نے اعتراف کیا تھا کہ یہ بے آواز ہتھیار بندوق سے کہیں بہتر ہے۔ کیونکہ بندوق کارتوس کی محتاج ہوتی ہے۔

سو وہ لوگ تیار ہوئے اور وہاں سے نیچے اتر آئے۔ ایک طرف آربونا نے اپنے ہاتھ میں لکڑی کا بھالا سنبھال لیا تھا اور دوسری طرف شیراز نے بھی بندوق لوڈ کر لی تھی تاکہ ضرورت پڑنے پر کوئی مشکل پیش نہ آئے اور وہ آہستہ آہستہ اس طرف بڑھ رہے تھے۔ جدھر وہ چٹان موجود تھی۔

پھر کچھ وقت کے بعد وہ چٹان کے قریب پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ کوئی عورت اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ تاروں کی مدھم چھاؤں میں وہ اس کا ہیولا دیکھ سکتے تھے اور شاید قریب سے اس کے نقوش بھی۔ کیونکہ روشنی اس قدر کم بھی نہیں تھی کہ اس کے نقوش نظر نہ آسکیں۔

عورت کو انہوں نے خوفزدہ دیکھا اور جب عورت نے آربونا پر نگاہ ڈالی تو اس کا بدن بری طرح کانپنے لگا۔ پھر وہ گھٹنوں کے بل جھکی اور آربونا کے سامنے دوزانو ہو گئی۔

"ارے واہ..... زندگی میں پہلی بار مجھے ایسی عظیم شخصیت ملی ہے۔ جو مجھے سجدہ کرے۔" آربونا نے انگریزی زبان میں کہا۔ اس نے جان بوجھ کر انگریزی زبان استعمال کی تھی کیونکہ وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ عورت جس لباس میں ملبوس ہے۔ وہ قبائلی لباس ہے اور یہ کوئی مہذب دنیا کی عورت معلوم نہیں ہوتی۔ وہ دونوں آگے بڑھے اور عورت کے قریب پہنچ گئے۔ تب آربونا نے اس سے کہا۔

"اے عورت! سیدھی ہو کر بیٹھ میں تجھ سے کہتا ہوں۔" اور عورت سیدھی ہو گئی اور اس نے پہلے آربونا کو دیکھا اور پھر شیراز کو اور اس کے بعد آہستہ سے بولی۔

"رب عظیم کی قسم جو میری نگاہوں کے سامنے آنے والا تھا۔ آ گیا ہے۔ آہ آسمان سے اترنے والے تیری آمد میرے لیے خوشی کا باعث ہے۔"

"بڑی بی! ہم تو زمین ہی کے باشندے ہیں۔" آربونا نے کہا۔

"جھوٹ بولتا ہے تو۔ تیرا حلیہ تیری جسامت اور میں اس قدر احمق بھی نہیں ہوں بچپن میں میں نے تیرے بارے میں سنا تھا تو دیوتاؤں کا دیوتا ہے۔ میں اس بات کو نہیں مانتی۔"

"اگر تو مجھے دیوتا کہتی ہے تو یہ میری خوش قسمتی ہے اور سن رہے ہو دوست اس عورت کی بات میرا خیال ہے۔ میرا مرتبہ بڑھنے والا ہے۔" شیراز مسکرا کر اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"مگر تو کون ہے۔"

"میں' میں' میرے بارے میں جاننے کی کوشش مت کرو۔ میں شدید غم کا شکار ہوں اور بری حالت ہے۔ میری' مقدس دیوتا اگر تو اس وقت میری بھوک دور کر سکے تو میں ہمیشہ تیرے گن گاؤں گی۔"

"کیا تو بھوکی ہے۔"

"ہاں..... شاید مجھے بھوک سے چوتھا روز ہے۔"

"تب تو ہمارے ساتھ آ۔" آربونا نے کہا۔ شیراز اس دوران خاموش ہی رہا تھا۔ ویسے وہ اس دوران آربونا سے کافی حد تک مقامی زبان سیکھ چکا تھا اور اب وہ یہ زبان باآسانی بول اور سمجھ سکتا تھا۔ چنانچہ عورت کے اور آربونا کے درمیان میں ہونے والی گفتگو کو اس نے بخوبی سنا اور سمجھا تھا۔ بہرحال ایک انسان کا معاملہ تھا۔ ان کے پاس کھانے پینے کی بے شمار اشیاء موجود تھیں۔ جن سے بھوک پیاس مٹائی جا سکتی تھی۔ آربونا نے اس طرح کے بے شمار انتظامات کر ڈالے تھے اور ان سب چیزوں کا خیال وہ خود ہی رکھا کرتا تھا۔ چنانچہ عورت کو لیے ہوئے وہ اپنی جگہ پہنچ گئے۔ پھر تھوڑی سی بلندی پر پہنچنے میں انہوں نے عورت کو سہارا دیا۔ اب انہوں نے روشنی میں عورت کی شکل و صورت دیکھی تھی۔

وہ مقامی لوگوں کی طرح گہری سیاہ رنگ کی نہیں تھی بلکہ اس کا رنگ کچھ گندمی مائل تھا اور بالوں کی رنگت بھی کچھ ایسی تھی جبکہ آنکھوں کی سیاہ رنگت مقامی لوگوں کی طرح تھی اور اس کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں۔ اس کی عمر بھی بہت زیادہ نہیں تھی۔ لیکن بہرطور جوانی کے دور سے گزر چکی تھی۔

وہ لوگ اسے سائبان نما چٹان پر لائے۔ وہاں بٹھایا اور اس کے بعد کھانے پینے کے لیے جو کچھ تھا اس کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا۔

"لے اسے کھا اور اس سے زیادہ بہتر چیز تجھے اور کوئی نہیں ملے گی۔"

"ہاں وہ شے سب سے قیمتی ہوتی ہے۔ جو بھوک کے وقت حاصل ہو جائے کیا پانی مل سکے گا۔"

"وہ بھی ہے۔"

"تو براہ کرم پہلے مجھے پانی کا ایک گھونٹ دو۔" اور پھر وہ پتھر کا پیالہ جسے آربونا نے اپنے لیے تیار کیا تھا۔ پانی سے بھر کر عورت کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ عورت نے کھانے پینے کی تمام اشیاء چند ہی لمحات میں چٹ کر لیں اور اس کے بعد پانی کے پیالے کو ہونٹوں سے لگا کر گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگی۔ اس کے انداز میں کچھ سکون پایا جاتا تھا۔ لیکن آربونا محسوس کر رہا تھا کہ جب بھی اس کی نگاہ آربونا کی جانب اٹھتی ہے تو اس کی آنکھوں میں عقیدت و احترام کے جذبات پیدا ہو جاتے تھے۔ اور اس کی وجہ وہ خود بتا چکی تھی۔

ان وادیوں میں توہم پرستی بہت زیادہ تھی اور انہوں نے ہر چیز کو اپنا دیوتا بنا لیا تھا۔ جو ان کی عقل و فہم سے باہر ہو۔ شاید اسی لیے آربونا اس عورت کا دیوتا بن گیا تھا۔

جبکہ دل ہی دل میں آربونا ہنس رہا تھا۔ شرما رہا تھا اور خوش بھی ہو رہا تھا کہ اس دنیا کے بے وقوفوں میں ایک ایسی بے وقوف عورت موجود ہے جو آربونا جیسی کالی' بدنما شخصیت کے مالک کو اپنا دیوتا تسلیم کرتی ہے اور کیا ہی اچھا دیوتا ہوگا۔ وہ جس نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن بدصورت شکل

والوں کو دیوتا بننے کا موقع فراہم کیا اور آربونا کی یہ کیفیت شیراز بھی محسوس کر رہا تھا اور دل ہی دل میں مسکرا دیا تھا۔ آربونا کو دیکھ کر اسے ہنسی بھی آرہی تھی۔

عورت شکم سیر ہونے کے بعد دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی اور شیراز نے اس سے کہا۔

"ہر چند کہ تو نے ہمیں اپنا نام نہیں بتایا۔ لیکن ہم تجھے اس کے لیے مجبور نہیں کریں گے۔ اگر تو آرام کرنا چاہتی ہے تو آرام کر کہیں جانا چاہتی ہے تو ہماری طرف سے تجھے اس کی اجازت ہے۔ جو تیرا دل چاہے کر اور بہتر یہ ہوگا کہ تو اس کا اظہار کر دے کہ تو کیا کرنا چاہتی ہے۔"

عورت نے آنکھیں کھولیں دونوں کو دیکھا اور پھر آربونا کی طرف رخ کر کے بولی۔

"مقدس دیوتا میں تیرے حکم کی منتظر ہوں۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ عورت میں دیوتا نہیں ہوں۔ تجھے غلط فہمی ہوئی ہے یہ بات معلوم کرنے کو میرا دل تو چاہتا ہے کہ تو مجھے دیوتا تسلیم کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہے۔ لیکن جیسا کہ میرے دوست میرے آقا نے کہا۔ ہم تجھے ایسی کسی بات کے لیے مجبور نہیں کریں گے۔ جو تیرے لیے ناپسندیدہ ہو۔ ہماری طرف سے تجھے کوئی حکم نہیں دیا جائے گا۔ جا چاہتی ہے تو ہم تجھے سہارا دے کر نیچے اتار دیں اور تو جنگلوں میں گم ہو جا۔ ہمارے پاس رکنا چاہتی ہے تو ہمارے پاس بیٹھ' آرام کرنا چاہتی ہے تو چٹان کے اس طرف جا کر آرام کر سکتی ہے۔ تیری عزت تیرے احترام کی تجھے ضمانت دی جاتی ہے اور اگر یہ سب کچھ نہ کرنا چاہے تو آرام سے بیٹھ' ہم سے باتیں کر۔"

"اصل میں صرف یہ معلوم کرنا ہے مجھے کہ کیا تم رات کے اس حصے میں آرام کرنے کے خواہشمند ہو۔ جبکہ میں پرسکون ہوں اور جس طرح تم نے میری پذیرائی کی ہے۔ اس سے میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ لیکن اگر تمہیں نیند نہیں آرہی ہو تو تم آرام سے سو جاؤ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارے کھانے پینے کی اشیاء یا دیگر سامان لے کر یہاں سے فرار نہیں ہوں گی۔"

آربونا نے میری طرف دیکھا اور میں ہنس دیا۔ پھر میں نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

"محترم عورت اگر تو اس میں سے کچھ اشیاء چاہتی ہے۔ یا یہ سب جو اس میں سے تیری ضرورت ہو تو ہم تجھے اجازت دیتے ہیں کہ یہ سب کچھ سمیٹ اور یہاں سے چلی جا۔ ہم تیرا راستہ نہیں روکیں گے۔ کیونکہ بہرحال ہم دوبارہ یہ سب کچھ کسی نہ کسی شکل میں حاصل کر لیں گے۔ مگر تو عورت ہے اور تیری ضرورت ہم سے زیادہ ہے۔"

"تو تم مجھے اتنا ناسپاس نہ سمجھو' خوب صورت نوجوان کہ جن لوگوں نے میری اس برے حال میں مدد کی انہیں نقصان پہنچاؤں..... اور جہاں تک تمہارے آرام کا مسئلہ ہے۔ جو تم مناسب سمجھو۔"

"نہیں ہماری نیند اچٹ چکی ہے اور اب ہم دونوں میں کوئی سونا نہیں چاہتا۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ ویسے میں نے تم لوگوں کو اپنا نام نہیں بتایا' میرا نام کاشالہ ہے اور مقدس دیوتا جانتا ہے کہ دور کے پہاڑوں کے دامن میں قبیلہ سونالیہ آباد ہے اور مقدس دیوتا کا وہیں پہاڑوں کے دامن میں ہے جہاں اس کا پتھر کا مجسمہ موجود ہے اور ہم اس کی عبادت کرتے ہیں اور اس کی کہانی بھی مقدس دیوتا کو ہی معلوم ہوگی کہ وہ پتھر سے انسان کیسے بنایا انسان سے پتھر۔"

آربونا نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ "سب سے پہلے اپنے دل سے یہ خیال نکال دے کہ ہالہ

کہ میرا تعلق تیرے قبیلے سونالیہ سے ہے یا میں آسمان سے اترا ہوا دیوتا ہوں میں تو اس زمین میں اگا ہوں اور بہت فاصلے طے کر کے یہاں تک پہنچا ہوں اور بالکل تیرے جیسا..... ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ جو کچھ تو نے کہا اس میں یقینی صداقت ہو۔ یعنی چہرے اور جسامت کبھی کبھی مل بھی جاتی ہے کہ اس سے زیادہ نہ جان۔"

"آہ اگر ایسا ہے تو میں سخت حیران ہوں۔ کیونکہ تجھے دیکھ کر مجھے اپنا ماضی یاد آ گیا اور یہ تو بہت پرانی بات ہے۔ جب میں سونالیہ میں رہتی تھی۔ اور وہاں میرا گھر تھا۔ لیکن اے شخص تو سچ کہتا ہے۔ تو پھر تجھے کس نام سے پکارا جاتا ہے۔"

"جو تیرا دل چاہے کہہ سکتی تھی۔ میری دنیا کے لوگ مجھے آربونا کہتے ہیں۔"

"لیکن سونالیہ کے دیوتا کو لوگ چھوٹا ہاتھی کہتے ہیں یعنی طاقت کا دیوتا۔ جو ہاتھیوں کی طرح طاقتور ہے۔"

"یعنی کیا مطلب ہے تیرا....."

"مطلب یہ چھوٹے ہاتھی کہ ہم تیری ہی تو عبادت کرتے ہیں۔"

"عظیم آقا لگتا ہے کہ وقت مجھے دیوتا بنانے پر تلا ہوا ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا کیا میں خود کو قبیلہ سونالیہ کا دیوتا سمجھ لوں۔" آربونا نے کچھ اس انداز سے کہا کہ شیراز کو ہنسی آ گئی اور بہت عرصے کے بعد شیراز کی ہنسی کی آواز سنی گئی تھی۔ آربونا نے اس کا اظہار تو نہ کیا لیکن دل ہی دل میں اس نے خوشی محسوس کی تھی کہ اب اس کا دوست غم و اندوہ کی گہرائیوں سے نکلتا چلا آرہا ہے اور بالآخر ایک دن وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹیں بکھیر دے گا اور یہ آربونا کی دلی خواہش تھی اور اس کے ذریعے یہ عورت بنی تھی۔ جسے آربونا اب دلچسپ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اس نے کہا۔

"یہ میرا دوست ہے۔ میرا آقا۔ میرا بھائی میرا سب کچھ اور نام اس کا شیراز ہے۔"

"تم دونوں بہت اچھے انسان ہو۔ اگر تم دیوتا نہیں۔"

"میں تجھ سے آخری بار کہہ رہا ہوں کہ یہ خیال اپنے دل سے نکال دے۔"

"ٹھیک ہے۔ چھوٹے ہاتھی میں تیری بات کو تسلیم کرتی ہوں اور میں اسے روشنی والا کہہ سکتی ہوں۔"

"کیا مطلب۔"

"اس کا خوب صورت چہرہ اس کی روشن آنکھیں اور اس کا بلند و بالا قد دل کو یہ ہی احساس دلاتا ہے کہ اس کا تعلق روشنی سے ہے۔ میں کوئی پیش گو نہیں ہوں سنا ہی مجھے مقدس علم آتے ہیں۔ لیکن دل میں کبھی کبھی کچھ ایسے خیالات آجاتے ہیں۔ جو زبان پر لفظ بن کر آجاتے ہیں اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں اسے روشنی والا کہوں۔"

"وہ تیری مرضی ہے۔ لیکن اب کیا تو اپنے بارے میں بتانا پسند کرے گی۔" آربونا نے کہا۔

"آہ میری یہ کہانی بہت عجیب ہے اور تم دونوں اس بات کے حقدار ہو کہ میں تمہیں اپنے بارے میں بتاؤں۔ اگر تم پسند کرو کیونکہ کبھی کبھی انسان اپنے دل کی بھڑاس اپنی زبان سے نکالنا چاہتا ہے لیکن مدمقابل کو یہ سب کچھ پسند نہیں آتا اور وہ سوچتا ہے کہ کیا مصیبت مول لے لی۔"

"نہیں ایسا نہیں ہے۔ ہم تیرے بارے میں جاننا پسند کریں گے۔" شیراز نے کہا۔

عورت گہری سوچ میں ڈوب گئی پھر بولی۔

"غور کر رہی ہوں کہ اپنے بارے میں تجھے کہاں سے بتانا شروع کروں۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ جتنی رات باقی ہے اور جس طرح تو سونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تو اتنی رات میں میں اپنی کہانی یقینی طور پر ختم کر لوں گی اور اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ میں شروع ہی سے تجھے ساری تفصیل بتاؤں۔ لیکن یہ تفصیل زیادہ طویل بھی نہیں ہے۔"

"تو بتا..... ہم تیری کہانی سن رہے ہیں۔"

"تو سن جیسا کہ میں نے تجھے کہا تھا کہ میرا تعلق قبیلہ سونالیہ سے ہے۔ میں وہیں پیدا ہوئی۔ پھر سونالیہ سے رسم و رواج کے مطابق گوریٹا نے مجھے جیت لیا۔"

"جیت لینے سے تیری کیا مراد ہے۔" شیراز نے دلچسپی سے پوچھا اور عورت نے ایک بار پھر آربونا کی طرف دیکھا اور بولی۔

"بار بار بھول جاتی ہوں کہ تو وہ نہیں ہے جو میں سمجھ رہی ہوں۔ ورنہ میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ میں تجھ سے کہوں کہ چھوٹے ہاتھی جیتنے کا مطلب بتا۔"

"اور بہتر ہوگا کہ بار بار تو اس کا تذکرہ نہ کر جبکہ میں نے تجھ سے کہہ دیا ہے کہ نہ تو میں نے زندگی میں کبھی سونالیہ قبیلہ دیکھا ہے اور نہ ہی میری اوقات دیوتا کہلانے کی ہے۔"

"آہ..... کیسی عجیب بات ہے۔"

"نہیں کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ بہر حال میں اسی تاریک براعظم کا باشندہ ہوں اور میری شکل و صورت یا جسامت کسی سے مل جاتی ہے۔ تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔"

"تعجب کی بات صرف یہ ہے کہ تو ایک دیوتا کا ہمشکل ہے۔"

"بس..... اب ہم اس موضوع پر بات نہیں کریں گے اور میں نے یہ طے کرلیا کہ میں دیوتا نہیں ہوں۔ تو پھر ایک ہی بات کرنے کے کیا معنی ہیں۔"

"اچھا ناراض مت ہو۔ چھوٹے ہاتھی۔ میں اپنی کہانی شروع کرتی ہوں۔ سونالیہ میں جوان ہوئی اور گوریٹا نے مجھے اس طرح جیتا کہ سونالیہ میں ہر پسند حاصل کرنے کے لیے کچھ کرنا ہوتا ہے۔ یعنی اگر کوئی لڑکی کسی نوجوان کو پسند کرے تو سردار کے حکم کے مطابق اسے وہ کرنا ہوتا ہے۔ جو سردار کہے اور نہیں کر پاتی تو اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہتی ہے اور یہ شرط مردوں کے لیے بھی ہے۔ سو گوریٹا نے مجھے چاہا اور نوجوانی کی عمر میں لوگ کہتے تھے کہ میں خوب صورت ہوں۔ کیونکہ میرا رنگ عام لوگوں کے رنگوں سے مختلف ہے جبکہ سونالیہ کے رہنے والے گہری کالی رنگت یا پھر مٹیالی رنگت کے مالک ہوتے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ ہمیں تو یہ محسوس ہوا تھا جیسے تیرا تعلق کسی دوغلی نسل سے ہے۔"

"نہیں میں دوغلی نسل کی نہیں ہوں۔ میرے ماں باپ دونوں ایک جیسے تھے۔ تو میں تجھے سونالیہ کے بارے میں بتا رہی تھی۔ گوریٹا نے مجھے پسند کیا۔ میری خواہش کی اور جو ذمہ دار مرد اپنے اسے سونپی اسے پورا کر دکھایا۔ یعنی مست ہاتھی کا شکار۔ جسے گوریٹا نے آنکھوں میں بھالے مار کر گرالیا تھا اور پھر کلہاڑے سے اس کی گردن الگ کرلی تھی اور سونڈ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا۔ سردار کے قدموں تک لے گیا تھا۔ سو مجھے گوریٹا کی بیوی بنا دیا گیا اور ہم دونوں خوش و خرم رہ رہے تھے۔ لیکن آسمان والے یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہماری نسل آگے بڑھے اور چھوٹے ہاتھی دیوتاؤں کا خیال تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی ذات ہی میں رہیں۔ جبکہ گوریٹا اولاد کا خواہش مند تھا اور میں بھی بچے تو مجھے پہلے ہی پسند تھے۔ لیکن افسوس میں اپنی گود میں اپنا بچہ نہیں کھلا سکی اور اس سے محروم رہی۔"

"لیکن اس کے باوجود ہم خوش رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ پرانی بات ہے لیکن بہت زیادہ پرانی بھی نہیں کہ ایک مرتبہ ہم یعنی میں اور گوریٹا یوں ہی آبادی سے دور نکل گئے۔ یعنی اس جگہ جہاں بانسوں کے جنگل ابھرے ہوئے ہیں اور نم زمین پر پانی شرل شرل کر کے بہتا ہے۔ اس جگہ ہم نے زندگی پائی۔ یعنی ایک ایسی عورت جو تکلیف میں مبتلا تھی اور اس کا پریشان مرد اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ دونوں روشنی جیسی رنگت کے مالک تھے۔ یعنی گوری چمڑی والے اور ہم انہیں

دیکھ کر حیران رہ گئے جبکہ گوری چمڑی والا شخص خوفزدہ ہوگیا تھا۔ لیکن میں بھی نرم مزاج تھی اور گوریٹا بھی اور گوریٹا نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اس سے کہا۔

"تو پریشان نہ ہو۔ اے شخص۔ ہمارے ہاتھوں تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"اگر ایسی بات ہے۔ تو مجھے تیری مدد کی فوری ضرورت ہے۔ خاص طور سے اس لیے کہ تیری عورت بھی تیرے ساتھ ہے۔"

گوریٹا نے پوچھا۔

"بتا تو کیا چاہتا ہے اور یہ عورت یوں لگتا ہے۔ جیسے یہ بیمار ہے۔"

"ہاں..... یہ بیمار ہے اور یہ ماں بننے والی ہے۔"

"اور اگر ایسا ہے تو بے شک میری بیوی اس کی مدد کرے گی۔" گوریٹا نے کہا پھر چھوٹے ہاتھی اور روشنی والے میں نے یوں کہا کہ عورت کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر نرسلوں کی آڑ میں لے گئی۔ جہاں زمین خشک تھی اور پھر میں اس کی تیمارداری کرنے لگی۔ واہ کیا خوب صورت عورت تھی اور اس کا نام جولیا تھا جو بڑی مشکل سے مجھے یاد ہوا اور پھر جولیا نے ایک حسین بچی کو جنم دیا اور یہ بچی اس قدر خوب صورت تھی کہ اس پر آنکھیں نہ جما پائیں تھیں۔ بس یوں محسوس ہوتا تھا جیسے چاند درمیان سے ٹکڑے ہوا اور ایک ٹکڑا زمین پر آگیا لیکن چاند تو پورا ہی ہوتا ہے اور اس میں سے شاید ایک ننھا سا قطرہ ہوتا ہے۔ جو کبھی کبھی زمین پر آجاتا ہے۔ سو میں نے چاند کی طرح خوب صورت بچی کو اپنی گود میں لے لیا۔

اور محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

میرے دل میں یہ احساس ابھرا کہ ایسی نہ سہی میری جیسی رنگت کی سہی لیکن اتنی ہی ننھی سی اتنی ہی خوب صورت کوئی بچی کاش میرے وجود میں نمودار ہوتی۔ لیکن میں نے اپنے دل میں بچی کے لیے ایک شدید محبت محسوس کی اور اس لیے جیسے بھی ہو سکا گھاس پھوس سے لپیٹ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور وہ عورت فراخدل تھی اور محبت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور آنکھوں میں شکر کے جذبات تھے۔ مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ ہماری زبان کیسے جانتے ہیں۔ تب عورت نے مجھ سے کہا۔

"اے عورت تیرا شکریہ تو نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ تو نے مجھے بڑی مشکل سے نکال لیا۔"

"صحرائے اعظم کی رہنے والی! یہاں کے لوگوں کے بارے میں ہمارے تجربات بڑے تلخ ہیں اور ہمیں ان کی وجہ سے بڑے خوف کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ تو پہلی نرم عورت ہے جس نے مجھے اس انداز میں نا صرف مخاطب کیا بلکہ میری مدد بھی کی۔"

"ہم تمہاری ہر طرح کی مدد کر سکتے ہیں۔ تم اس کے لیے فکر نہ کرو۔"

"لیکن تیرے قبیلے کے لوگ۔"

"نہیں وہ بھی اس قدر سخت دل اور سخت جان نہیں ہیں۔ بس یوں کروں گی کہ گوریٹا سردار کو اطلاع دے دے گا کہ اس طرح دو افراد اسے حاصل ہوئے ہیں اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ادھر گوریٹا نے اس شخص سے دوستی کرلی تھی اور ایڈگر بذات خود اس کا شکر گزار تھا۔ ایڈگر یعنی اس عورت کا شوہر۔ جس کی بیٹی میری تھی۔"

"میری۔" شیراز نے درمیان میں لقمہ دیا۔

"وہاں ان لوگوں نے اپنی پیدا ہونے والی لڑکی کا نام میری رکھا تھا اور یہ نام بہت آسان تھا ہمیں بھی اس کی ادائیگی میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ہوا یوں کہ جب ہم دونوں کو اپنی آبادی میں لے آئے اور ان کے لیے ایک جگہ منتخب کر دی۔ یعنی اپنے جھونپڑے کا ایک حصہ تو جولیا نے میری کو میری آغوش میں دے دیا اور کہا کہ اگر یہ بچی مجھے پسند ہے تو میں اسے جس طرح چاہوں

اپنے ساتھ رکھوں۔ لیکن ایڈگر اس بات سے مطمئن نہیں تھا۔ یعنی اس بات سے نہیں کہ بچی میری آغوش میں ہے۔ بلکہ وہ ہمارے قبیلے میں ساری زندگی نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ بعد میں میں نے گوریٹا کو اپنی کہانی سنائی اور تم بھی کیا سنو گے روشنی والے کہ کہانی در کہانی سنائی جارہی ہے۔"

"لیکن جب تم نے کہا کہ میں تمہیں اپنے بارے میں بتاؤں تو پھر یہ تمام باتیں جو اس بات سے متعلق ہیں۔ تمہیں بتانا ضروری ہے۔"

"تو ہمیں اپنی کہانی سنائی رہ۔ ہمیں تیری کہانی کے کسی حصے پر اعتراض نہیں ہے اور ہم اسے دلچسپی سے سن رہے ہیں۔"

"تم بہت اچھے معلوم ہوتے ہو اور یہ شخص بھی جو دیوتاؤں کا ہمشکل ہے۔ پھر یوں ہوا کہ ہم لوگ خوب گھل مل گئے اور وہ بچی تو میری زندگی بن گئی تھی۔ میں اسے بڑے پیار سے میری کہتی تو وہ مسکراتی آنکھوں سے مجھے دیکھتی تھی۔ بعد میں جبکہ میں نے تم سے کہا۔ ایڈگر نے گوریٹا کو اپنی کہانی سنائی۔

اس نے بتایا کہ وہ تہذیب یافتہ دنیا کا ایک فرد ہے اور اس کا گھر یہاں سے بہت دور ایک ایسی جگہ آباد ہے۔ جہاں بڑے بڑے پتھروں کے امکانات بنے ہوئے ہیں اور ان کے درمیان لوہے کے گھوڑے دوڑتے ہیں۔ لیکن ہمیں تو ان مکانات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی لوہے کے ان گھوڑوں سے جو انسانوں کو اپنی پشت پر سوار کر کے سفر کرتے ہیں۔ میں تو بس اس بچی کو پیار کرتی تھی۔ لیکن گوریٹا کو جو کچھ اس نے بتایا وہ کچھ یوں تھا کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے اور مریضوں کا علاج کرتا ہے۔

وہ ایک نیک دل اور نیک فطرت انسان ہے اور اس کی بیوی جولیا اس کی محبوبہ یعنی شادی سے پہلے وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور شادی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یوں ہوا کہ شادی کے چند ہی سال کے بعد ڈاکٹر ایڈگر کے ہاتھوں ایک ایسے بڑے آدمی کی موت واقع ہوگئی جو بیمار تھا اور جس کے لواحقین یہ چاہتے تھے کہ ڈاکٹر ایڈگر اسے زندگی دے دے۔ لیکن ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ زندگی اور موت تو آسمان والے کے ہاتھ میں ہے۔

ہاں بیماریوں کا علاج دواؤں اور جڑی بوٹیوں سے کیا جاتا ہے اور وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔ لیکن یہ اس کا اصول نہیں۔ تاہم جو شخص ہلاک ہوا تھا۔ اس کے لواحقین ایڈگر کی زندگی کے دشمن بن گئے اور اس پر حملے کیے جانے لگے اور اسے یہ محسوس ہوگیا کہ اب اس کے لیے اس شہر میں پناہ نہیں ہے۔ اس نے وہاں سے اپنی سکونت ترک کی اور اپنی بیوی کو لے کر چل پڑا لیکن اس کے دشمن اس کے پیچھے لگے رہے اور ایڈگر کو انہوں نے اس قدر مفلوج کر دیا کہ اب اسے موت اپنے اردگرد ناچتی محسوس ہونے لگی۔ وہ گھومتا پھرتا ہوا بالآخر یہاں تک پہنچ گیا۔ اور اس نے اپنی دنیا کے لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر صحرائے اعظم میں داخل ہونے کے بعد بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جن میں ایسے قبیلے والوں سے دشمنی بھی تھی۔ جو سفید چمڑی والے لوگوں کو اپنے درمیان پسند نہیں کرتے تھے۔

ایڈگر عام سفید چمڑی والوں سے ایک مختلف شخص تھا اور جب اس کی بیوی حاملہ ہوگئی تو وہ زیادہ پریشانی کا شکار ہوگیا اور چونکہ سیاہ لوگ اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ اپنی جان بچاتا پھر رہا تھا اور بالآخر بانسوں کے اس جھنڈ تک پہنچ چکا تھا۔ جہاں ہم اسے ملے پھر یوں ہوا کہ سونالیہ والے اسے پناہ دینے پر آمادہ ہوگئے۔ اور سردار کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ بیماروں کا علاج کرنے لگا۔ اسے وچ ڈاکٹر کہا جاتا تھا۔ لیکن وہ تسلیم نہیں کرتا تھا۔

سوکالو کا یہ مسیحا وہاں خاصے عرصے تک قیام کیے رہا اور پھر اس نے خواہش کی کہ وہ یہیں کہیں

بہتر جگہ آباد ہوجائے اور سونالیہ میں چونکہ ان دنوں ذرا اختلافات چل رہے تھے اور آپس کے اختلافات بے پناہ بڑھ گئے تھے۔ چنانچہ سردار نے بہتر یہی سمجھا کہ اسے وہاں سے ہٹا دیا جائے۔ ایسے کچھ جانثار جنہیں وہ موت سے زندگی کی جانب لایا تھا۔ اس کے ہمراہ چل رہے تھے اور گوریٹا اور میں بھی ساتھ تھے اور ہم تو بھلا روشنی والے انہیں چھوڑ ہی نہیں سکتے تھے۔ چونکہ میری میری زندگی بن چکی تھی اور میری آقا زادی بھی مجھے اتنا ہی چاہتی تھی۔ کیونکہ اس نے میری آغوش میں پرورش پائی تھی ہم نے ایک طویل فاصلہ طے کیا اور بالآخر دریائے۔ فردوسی کے کنارے ایک جگہ پسند کی گئی اور وہاں کالوں کے مسیحا نے یعنی میرے آقا یا پھر ہمارے وچ ڈاکٹر نے اپنے لیے مسکن بنائے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ یہاں بھی قرب و جوار میں چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد تھیں اور یہ وہ لوگ نہیں تھے۔ جنہوں نے اسے نقصان پہنچایا تھا۔

اور پھر جب اس نے ان لوگوں کے جڑی بوٹیوں سے علاج کیے اور انہیں شفا دی تو وہ اس کے معتقد ہوگئے۔ دور دور کی بستیوں سے لوگ آئے اور انہوں نے کالوں کے مسیحا کا کرال تیار کیا جو مضبوط بانسوں سے بنایا گیا تھا اور شیکائیہ کے کنارے ایک بہت بڑا جھونپڑا نظر آنے لگا تھا۔ اور اس میں ہم سب رہتے تھے۔ یعنی وہ بھی جو پہلے تو معتقد تھے اور پھر یہاں آکر ان کے جانثار بن گئے۔ تھے یعنی ایڈگر اور جولیا کے میاں بیوی اپنی بچی سمیت سکون کی زندگی بسر کر رہے تھے اور باپ کو یہ احساس پیدا ہوگیا کہ بچی تہذیب کی دنیا سے دور اس غیر مہذب دنیا میں پرورش پائے گی۔ وہ فکر میں سرگرداں ہوگیا اور اس نے سوچا کچھ کہا جانا چاہیے۔ کیونکہ کھانے پینے کی تو اسے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ لیکن وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ کوئی ایسا عمل جس سے اس کی بچے کا مستقبل تعمیر ہوسکے۔ وہاں یعنی تہذیب کی دنیا میں اس کے رشتے ناطے کے لوگ موجود تھے۔ اس نے گوریٹا نے مل کر ایک فیصلہ کیا۔ اس نے ہاتھی دانت کی تجارت شروع کردی۔

یہ ہاتھی دانت وہ جنگلوں سے حاصل کرتے تھے اور گوریٹا اس سلسلے میں اس کا معاون کار تھا۔ یعنی گوریٹا نے ہی بھورے دانے سے وہ شراب بنائی۔ جسے بڑے بڑے ناندوں میں بھر کر رکھ دیا جاتا ہاتھی آتے اس شراب کو پی کر بدمست ہو جاتے۔ ایک دوسرے کو ٹکریں مارتے اور ان کے دانت جھڑ جاتے۔ پھر ہوش میں آکر وہ بھاگ جاتے تو گوریٹا اپنے ساتھی کے ہمراہ وہ ہاتھی دانت سمیٹ لیتا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ دریائے فردوسی سے بھی فائدہ اٹھایا گیا۔ جو بہتا ہوا شاید مہذب آبادیوں تک جاتا تھا۔ بڑی بڑی کشتیاں بنائی گئیں اور اس طرح اس نے تجارت شروع کردی اور اس طرح اس کا بیرونی دنیا سے بھی رابطہ قائم ہوگیا۔

پھر یوں ہوا کہ میری کو ایک طویل عرصے کے لیے مہذب دنیا میں بھیج دیا گیا اور میرے آقا اور چھوٹے ہاتھی میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن میں اس مشکل سے یوں نکلی کہ اس نے مجھے بھی اس کے ساتھ بھیج دیا اور میں نے تمہاری آبادیاں دیکھیں۔ وہاں کا انداز بھی واقعی عجیب تھا۔ جسے دیکھ کر پہلے تو مجھ پر خوف طاری ہوا تھا۔ جو ناقابل بیان ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ میں اس کی عادی ہوگئی اور وہاں یہ بات بالکل ظاہر نہ کی گئی کہ میری ایڈگر کی بیٹی ہے۔ لیکن اس کے رشتے داروں نے اس کی خوب پذیرائی کی اور ایک طویل عرصے تک اسے تعلیم دی۔ جبکہ میں اس کی خادمہ کی حیثیت سے اس کے ساتھ ہی تھی اور گوریٹا جس سے میں بیحد محبت کرتی تھی۔ میرے لیے مضطرب تھا۔ اکثر میری مہذب آبادیوں میں چلی جاتی تھی۔ مگر میں اس کا ساتھ چھوڑنے والی کہاں تھی۔

ادھر ڈاکٹر ایڈگر یعنی کالوں کا مسیحا اور گوریٹا اپنے کاموں میں مصروف رہتے انہوں نے تمام ذرائع تیار کر لیے تھے۔ لیکن پھر یوں ہوا چھوٹے ہاتھی کی بچاری جولیا ایک حادثے کا شکار ہوگئی۔ اسے ایک زہریلے سانپ نے ڈس لیا اور ڈاکٹر ایڈگر بروقت نہ پہنچنے کی وجہ سے اس کی مدد نہ کر سکا اور اس حسین عورت نے میری ہی آغوش میں دم توڑ دیا کہ میں اس کے لیے کچھ بھی نہ کر سکی۔ ایک تو میری غمگین ہوگئی دوسری طرف ڈاکٹر ایڈگر واپس آیا اور اپنی بیوی کو اس نے زندگی کی بجائے موت کی طرف پایا تو وہ ایک دم سے شمع کی طرح بجھ گیا۔

اس نے اپنی زندگی محدود کر لی اور غمزدہ رہنے لگا۔ ہر چند کہ اس کی دلجوئی کرنے کے لیے بے شمار افراد موجود تھے۔

گوریٹا اسے زندگی کی جانب لانے کے لیے مسلسل کوششیں کر رہا تھا۔ لیکن طویل عرصے تک وہ انہی کوششوں کا شکار رہا۔ اس نے بھورے دانے کی شراب پینا شروع کر دی۔ اس کے بارے میں گوریٹا کا خیال تھا کہ وہ اسے صحت مند نہ رہنے دے گی۔ لیکن وہ اس سے باز نہ آیا۔ بیوی کا غم بھلانے کے لیے اسے شراب بے حد ضروری محسوس ہوئی۔ تو روشنی والے پھر یوں ہوا کہ اب سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے۔ یعنی وہ پرانی داستان ختم ہوئی میری اب جوان ہے اور دیوتا آسمان کے رہنے والے اس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ سلامت رکھیں وہ اس قدر حسین ہے کہ اگر تم نے کبھی اس کو دیکھ لیا تو اپنے ذہنوں پر قابو نہ پا سکو گے۔ جیسا کہ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ وہ چاند کا ٹکڑا ہے اور جب وہ تاریکیوں میں ہوتی ہے تو اس طرح روشن ہو جاتی ہے کہ دیکھنے والا قرب و جوار کی چیزیں بھی دیکھ سکے اور اس کے سبک نقوش اور اس کے سرخ ہونٹ اور روشن آنکھیں اور اس کی کشادہ پیشانی اور اس کا حسین وجود یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے وہ آسمان سے اتری ہوئی کوئی دیوی ہو..... اور آہ..... وہ اپنے حسن کا ہی شکار ہوگئی۔"

"کیسے....." آربونا نے بے اختیار پوچھا۔

"وہی تو بتانے جا رہی ہوں اور اب سے خاصے دن پہلے کی بات ہے کہ میرے آقا یعنی ڈاکٹر ایڈگر گوریٹا کے ساتھ اور اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ اپنے کام سے کہیں گئے ہوئے تھے۔ یعنی امی کام کے سلسلے میں ہاتھی دانت لانے کے۔ میں اور میری اپنے وفاداروں کے ساتھ اپنے کرال میں موجود تھے اور کچھ عرصے سے ہم نے ایک شخص کی کہانی سنی تھی۔ جو ہمارے کرال پر رہنے والے ہمیں سنایا کرتے تھے اور یہ بدباطن شخص فورنا کہلاتا تھا پتہ نہیں کون سی دنیا کا باشندہ تھا اور میں حیران ہوں کہ پتہ نہیں بھیڑیے انسانی شکل کیسے اختیار کر لیتے ہیں۔ فورنا نے سیاہ فاموں کی بستیوں میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ اس کا پورا گروہ کہیں کسی ایسی جگہ رہتا تھا جہاں وہ عام نگاہوں سے محفوظ رہے۔ وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر بستیوں پر حملہ آور ہوتا اور بستیوں کی نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کو اٹھا لیتا جو با آسانی بازار میں فروخت ہو جاتے ہیں۔ یعنی تمہاری مہذب دنیا کے لوگ انہیں خرید لیتے ہیں اور وہ یہ ہی تجارت کیا کرتا تھا۔ بستیوں سے اس کی خبریں ملتی تھیں اور وہ لوگ جو ہمارے کرال میں رہتے تھے۔ اکثر اس بارے میں بتاتے رہتے تھے اور کہتے رہتے تھے کہ وہ انسانی شکل میں بھیڑیا ہے اور جدھر وہ نکل جاتا ہے ادھر تباہی پھیل جاتی ہے میرے آقا کالوں کے مسیحا نے یوں کہا تھا کہ کچھ دھماکے کرنے والے ہتھیار جمع کر لیے تھے اور کچھ لوگوں کو ان کی تربیت دے دی تھی۔ تاکہ اگر کبھی کوئی خطرہ پیش آئے۔ تو وہ اس سے نمٹ سکیں۔ لیکن ہم نے اپنے اطراف یا اس کے علاقوں میں کبھی فورنا کی آمد کا حال نہیں سنا

تھا۔ یعنی وہ انسانی بھیڑیا۔ ڈاکٹر ایڈگر، گوریٹا اور چھ افراد ہاتھی دانت کے حصول کے لیے نکلے ہوئے تھے اور میری اور میں..... آہ..... فیری۔"

وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ اس کا لہجہ آنسوؤں میں ڈوب گیا۔ اور شیراز اور آربونا۔ اس کی کہانی دلچسپی سے سن رہے تھے۔ اس طرح جیسے جو واقعات عورت نے سنائے تھے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزر رہے ہوں یا تو یہ اس کا انداز بیان تھا۔ یا اس کی اپنی دلچسپی کہ وہ تصور کی آنکھ سے وہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ جو عورت سنا رہی تھی۔

اور شیراز کی نگاہوں میں اس لڑکی یعنی میری کا ہیولہ گردش کر رہا تھا۔ لیکن وہ اس کے لیے بے مقصد تھا۔ جب بھی وہ حسن کی تکمیل کو پاتا تو اس کی نگاہوں میں روبینہ کی صورت ابھر آتی کہ جسے دل سے چاہا جائے پوری دنیا میں سب سے حسین ہوتا ہے۔ عورت کچھ لمحے غم واندوہ میں ڈوبی رہی پھر اس نے کہا۔

"اور آقا زادی فیری تاریکیوں کا چراغ میرے پاس تھی اور ماں سے محروم ہونے کے بعد وہ مجھے ماں کا درجہ ہی دینے لگی تھی اور میرے دل میں بھی اس کے لیے ویسا ہی پیار تھا۔ ہم اپنے بڑے کرال میں رہنے لگے تھے اور کرال کے اندر ہم نے بڑے خوب صورت باغ لگائے تھے۔ جن میں کیلوں کے جھنڈ اور ناریل بڑی بہتات سے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ہی اس کے اطراف میں دریائے۔ شیکائیہ کی نمی سے تیار زمین پر بہت سے کھیت بو دیے گئے تھے۔ جن سے ضرورت کا اناج حاصل ہوتا تھا۔

وہ دن ایک منحوس دن کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب دور سے آنے والے ہمارے کرال کے ایک افریقی شخص بونا نے بتایا کہ اس نے کوئی پراسرار نقل و حرکت قرب و جوار میں دیکھی ہے اور وہ گھوڑے سوار ہیں۔ جن کی تعداد اچھی خاصی ہے اور بونا کا خیال تھا کہ ممکن ہے کہ وہ سفید بھیڑیا ہو۔ یعنی فورنا۔ جو اس طرف آ نکلا ہو اور اس اطلاع سے بڑا خوف پھیل گیا کیونکہ بونا نے باقی افراد کو بھی اس کے بارے میں بتا دیا تھا اور یہاں جو تھے وہ بزدل تھے کہ انہوں نے کوئی انتظام نہیں کیا اور صرف اپنے بچاؤ کی ترکیبیں کرنے لگے۔

رات گئے تک میں اور میری بیٹھے سفید بھیڑیے کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور میری رات کو سوتے میں کئی بار چونکی تھی کہ اسے نجانے کیوں پہلے سے احساس ہوگیا تھا کہ کوئی انوکھی بات ہونے والی ہے۔ پھر اس جگہ جہاں سے باہر کے مناظر دیکھے جاتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے گھوڑے چکدار سورج کے نیچے دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ اور ان پر بیٹھے ہوئے لوگ شور مچا رہے ہیں اور یہ اندازہ ہوگیا کہ ان کا رخ کرال ہی کی جانب ہے۔

سو میں کچھ لمحے کے لیے ساکت رہ گئی تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی اور میں نے دیکھا کہ کالے گھوڑے پر جو شخص سوار تھا۔ اس کا چہرہ خونخوار بھیڑیے کی ہی مانند تھا۔ بس یوں محسوس ہوتا تھا جیسے انسان کے بدن پر بھیڑیے کا سر لگا دیا گیا ہو۔ بھیانک شکل کا مالک یہ بھوری چمڑی والا تھا اور اس کے ساتھ دوسرے بہت سے لوگ جن میں سفید چمڑی اور کچھ ملی جلی نسل کے افریقی بھی تھے۔ لیکن وہ بڑی وحشت خیزی کے ساتھ اس طرف آ رہے تھے۔ اور تھوڑا ہی فاصلہ باقی رہ گیا تھا کہ انہوں نے دھماکے والے ہتھیاروں سے دھماکے کرنا شروع کر دیے۔ اور کیا ہی خوف بھری آوازیں تھیں کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ بادل گرج رہے ہوں اور بجلی بار بار گر رہی ہو۔ کرال کے افریقی مکین اپنی جانیں بچانے کے لیے دھماکوں سے خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر بھاگ پڑے اور دھماکے کے ہتھیار جوان کے پاس ہی موجود تھے۔ نہ سنبھال سکے اور دیکھتے

ہی دیکھتے ان میں سے بہت سے زمین پر گرنے اور تڑپنے لگے اور بقیہ سفید بھیڑیے کے ساتھ آنے والوں کے ہاتھوں میں پڑ گئے۔

اور چڑے کے ہنٹر مار مار کے انہیں ایک جگہ جمع کرنے لگا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو وہیں سے فرار ہو گئے تھے اور میں خوف سے پتھرا گئی تھی کہ میں نے نیچے خوف سے اپنی آقازادی کو بھاگتے ہوئے دیکھا وہ خوفزدہ بھی اور ادھر ادھر بھاگ رہی تھی۔ آقازادی کے چہرے کی کیفیت۔ آہ..... میرے دل کو اس وقت بھی ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہے اور میں بددعائیں دیتی ہوں اپنے آپ کو اس کا بدن پتھرا گیا تھا۔ اور لمحوں میں طاری ہونے والے خوف نے میرے اعصاب شل کر دیے تھے۔ میں نہ بول پا رہی تھی اور نہ ہل پا رہی تھی۔ آہ، تم یقین کرو چھوٹے ہاتھی اور روشنی والے میں بھاگ کر اس کے نزدیک پہنچنا چاہتی تھی۔ لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے میں صرف ایک سوچ ہوں ایک خیال ہوں اور جس بدن میں داخل ہوں وہ کسی اور کا ہے۔

وہ منظر میری نگاہوں کے سامنے محفوظ تھا۔ سفید بھڑیا بدشکل بدروح جسے میں نے اس کے حلیے سے فوراً پہچان لیا تھا کہ یہ حلیہ بارہا میرے سامنے بیان کیا گیا تھا۔ مقامی آبادیاں اس کے نام سے لرزتی تھیں۔ نجانے کتنے عرصے سے یہ انسانوں کے لیے موت بنا ہوا تھا اور مقامی باشندے اس کے سامنے کانپتے تھے اور پتہ نہیں کیا تو یہ ہی جانا تھا اور پتہ نہیں کہا تو یہی جاتا تھا کہ اس نے دریائے شکائیہ کے ایک ایسے علاقے میں اپنا مسکن بنا رکھا ہے۔ جہاں تک پہنچنا مشکل ہے اور پھر وہیں سے وہ ان لوگوں کو شہری آبادیوں میں پہنچتا ہے۔ جنہیں وہ گرفتار کرتا ہے اور شہری آبادیوں سے ان غلاموں کے خریدار آتے ہیں اور انہیں بھر بھر کر وہاں سے لے جاتے ہیں کہ لڑکیاں برے لوگ لے جاتے ہیں اور وہ جو انسانوں کو جانوروں کی جگہ استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ نوجوان اور طاقتور سیاہ روح لڑکوں کو وہ سفید بھیڑیا اپنے گھوڑوں پر سوار آگے برادر اس نے آقازادی کو دیکھا۔ جو کھیلوں کے جھنڈ کے پاس خوفزدہ کھڑی۔ اسے دیکھ رہی تھی۔

قریب آ کر وہ گھوڑے سے اتر گیا۔ آہ! میں کس طرح اپنی زندگی کھودوں میں اس وقت بھی اپنی آقازادی کی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ دوسروں کو کیا کہوں خوف نے میرا بدن بھی خشک کر دیا تھا۔ پھر اس نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا اور ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنے کچھ ساتھیوں کو قریب بلایا اور کہنے لگا۔

''دیکھو دیکھو جو سنا تھا وہی پایا کیا یہ جاتا تھا کہ چاند کو زمین پر اتار کر انسانی شکل میں تراش دیا گیا ہے اور چاند کی تراشی ہوئی دیکھو جو درحقیقت سونے کا ڈھیر ہے۔ بالآخر بہت بڑا خزانہ ہمیں مل گیا۔ آج تک ہم کالے پرندے بیچتے رہے ہیں لیکن آج یہ سنہری سرخاب جس کا شاید اس کائنات میں کوئی جواب نہیں ایک ایسا نایاب پرندہ جس کے اندر ہیرے چمک رہے ہوں۔ بھلا اس کے لیے جان کی بازی کیوں نہ لگا دی جائے کہ یہ تو دولت کا ڈھیر ہے۔ واہ لڑکی! قدرت نے تجھے بڑی فراخدلی سے حسن بخشا ہے اور دیکھنے والے تجھے دیکھیں گے تو اپنی گردنیں کاٹ لیں گے۔

اور اس وقت مجھے جو خزانہ حاصل ہوا ہے وہ میرے تصور سے بہت دور کی چیز تھی۔ لیکن اور اس وقت مجھے جو خزانہ حاصل ہوا ہے وہ میرے تصور سے بہت دور کی چیز تھی۔ لیکن گھبراؤ نہیں ہم تمہیں کسی ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کریں گے جو تمہارا اصل قدردان ہے۔''

آہ..... روشنی والے سفید بھیڑیے کی بھیانک آواز فضا میں گونج رہی تھی اور میری آقازادی خوف سے سمٹ گئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی

آنکھوں سے اس بھیڑیے کو دیکھ رہی تھی اور اس شیطان کی باتیں سن کر اس کے ساتھی قہقہے لگانے لگے۔ لیکن مجھ سے تو وہ بہتر تھی جو معصوم تھی اور نازک تھی اور جس کے بدن میں بہت ننھی سی جان تھی لیکن اس نے عقیلے انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور پھر قریب پڑا ہوا نوکدار پتھر اٹھا لیا اور غرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''سن اے شخص تو میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ میرا باپ ہاتھی دانت کا تاجر ہے اور اپنے لیے رزق تلاش کرنے گیا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ تو مجھے اس کی غیر موجودگی میں کوئی نقصان پہنچا لے گا۔ یہ نوکدار پتھر تیرا تو کچھ نہیں بگاڑے گا۔ لیکن میں اسے اتنے زور سے اپنے سر میں ماروں گی کہ میرا سر کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ سمجھ رہا ہے نا تو تیری حسرتیں یونہی رہ جائیں گی۔'' اور آقازادی کے یہ الفاظ سن کر سفید بھیڑیے کے چہرے پر عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور سنجیدگی سے کہنے لگا۔

''نہیں اے حسین لڑکی بھلا یہ عمر تیری موت کی عمر ہے۔ میں تو تجھے کسی اسے قدردان کے پاس لے جانا چاہتا ہوں جو تیری قدر کرے۔ تجھ سے محبت کرے اور بھلا دولت کیا حیثیت رکھتی ہے کہ تجھ جیسی حسین لڑکی کے عوض بن سکے۔ ناممکن..... ناممکن دوستو! اگر یہ ہمارے ہاتھ نہیں جانا چاہتی تو ہم اسے مجبور نہیں کریں گے۔ بھلا ایسا بھی کسی طرح ممکن ہے۔''

''نہیں..... لڑکی مجھے معاف کر دے ایسا نہ ہوگا اور اس کے یہ الفاظ سن کر میں خود بھی دنگ رہ گئی تھی۔ لیکن میں نے سوچا تھا کہ انسانیت کسی بھی دل میں ہو سکتی ہے اور شاید یہ اس کی موت سے خوفزدہ ہو گیا ہے۔'' اس نے آقازادی کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''نہیں..... لڑکی نہیں۔ تو ایسا نہ کرنا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر آقازادی کے ہاتھ سے پتھر لیا اور ایک طرف اچھال دیا۔ لیکن پھر وہ مکار شیطان برق کی طرح پلٹا اور اس نے میری آقازادی کے دونوں ہاتھ موڑ کر پشت کر لیے۔ آقازادی کے ساتھ میری چیخ بھی بلند ہوئی تھی۔ اس شخص نے دھوکا دیا تھا۔ وہ مکار تھا اور مکار شیطان نے آواز دی کو اس طرح اٹھا لیا کہ جیسے کسی سفید پھول کو اٹھا لیا جاتا ہے۔ وہ اسے قہقہے میں کر کے قہقہے لگانے لگا اور اس کے ساتھ پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسنے لگے۔

پھر سفید بھیڑیا کہنے لگا۔

''اے حسین لڑکی تیرے لیے اس عمر میں مرنا میری زندگی کا سب سے بڑا نقصان ہوگا اور پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں یہ نقصان برداشت کر سکوں۔ لیکن جب تو میرے ساتھ جائے گی تو میں تیرا مستقبل سنواروں گا۔ تو تجھے احساس ہوگا کہ اپنے باپ کے پاس رہ کر تو اپنی اس حسین جوانی اور زندگی کو ضائع کر رہی تھی۔ حسن اگر کسی ایسے جھونپڑے میں پڑا ہو۔ جہاں اسے دیکھنے والا کوئی نہ ہو تو بے کار ہوتا ہے۔ حسن کے اصل قدر دان یہاں نہیں ہو سکتے۔ تو اب تجھے میرے ساتھ چلنا ہے۔''

''اے شخص تو نے دھوکے سے مجھ پر قبضہ ضرور جما لیا ہے۔ لیکن میں تجھ سے ڈرتی نہیں۔ میں بالآخر ایک دن تجھ سے آزادی حاصل کر لوں گی اور تو نے جو ان لوگوں کو زندگی سے محروم کیا ہے۔ انہیں تو اس طرح نظر انداز نہ کر کیونکہ وقت تجھ سے اس کا انتقام ضرور لے گا۔ سمجھ رہا ہے نا تو۔''

''اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' سفید شیطان نے قہقہہ لگایا اور اپنے ساتھیوں کی طرف رخ کر کے بولا۔

''واہ..... یہ حسن کی دیوی تو شاید اپسرا ہے اور آکاش سے اتری ہے اور آکاش سے اترنے والی ہمارے بارے میں پیش گوئی کر رہی ہے۔ چلو ٹھیک ہے اچھا ہے۔ اس کی یہ صفت بھی لوگوں کو

بتائی جائے گی۔ تو وہ خوش ہوں گے۔''

اور پھر وہ آقازادی کو گھسیٹتا ہوا گھوڑے تک لے گیا۔ اس طاقتور شخص نے آقازادی کو گھوڑے پر بٹھایا اور اس کے بعد ایک بار پھر گولی چلائی گئی۔ اور کچھ ایسے جوان پکڑ لیے گئے جو ان کے لیے کارآمد تھے۔ چنانچہ وہ انہیں ریوڑ کی طرح ہانکتے ہوئے کرال سے باہر نکل گئے اور ان کا رخ دریائے۔ شکائیہ کی طرف ہو گیا۔

اس کے بعد ہی میرے بدن میں زندگی کی لہر دوڑ گئی اور تم یہ نہ سمجھنا کہ میں جھوٹ سے کام لے رہی ہوں۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ جبکہ اپنی آقا زادی کے لیے میں ہزار بار زندگی قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن بہتر ہی ہوا۔ وہ مجھ بوڑھی عورت کو فوراً ہلاک کر دیتے۔ کیونکہ میں ان کے ساتھ جانے کے قابل نہیں تھی اور یہ تو بہت اچھا ہوا کہ میں زندہ بچ گئی تاکہ آگے چل کر اپنی آقا زادی کے لیے کچھ کام کر سکوں اور پھر میں نے انہیں تلاش کیا۔ جو زندہ بچ گئے تھے اور اپنی جانیں بچانے کے لیے چھپے ہوئے تھے میں نے انہیں للکارا اور کہا کہ آقا نے اس لیے انہیں دھماکے کرنے والے ہتھیار نہیں دیے تھے کہ وہ کونوں اور دیواروں کے پیچھے چھپ جائیں۔ وہ اپنے ہتھیار اٹھائیں اور ان کا پیچھا کریں اور دھماکے کر کے اس سے آقازادی کو چھین لائیں۔ لیکن میں نے سب کے چہروں پر خوف کے آثار دیکھے۔

وہ اس قابل نظر نہیں آرہے تھے کہ اس دلیری کا مظاہرہ کریں۔ بلکہ وہ جن کے اپنے مر گئے تھے ان کے لیے رو پیٹ رہے تھے۔ میں نے انہیں بزدلی کے بہت سے طعنے دیے اور کہا۔

''نمک حراموں..... بزدلو جس ڈاکٹر نے تمہارے عزیز و اقارب کی زندگیاں بچائیں اور جس نے تمہیں اپنے درمیان اعتماد کر کے جگہ دی تم اس سے منحرف ہو رہے ہو اور لعنت ہے تم پر تھیک ہے۔ تم نہ جاؤ۔ لیکن میں اپنا فرض ادا کروں گی۔ میں اکیلی چلی جاؤں گی اور سنو..... میں اب رکنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ہاں اگر تمہاری بزدلی تمہیں اجازت دے تو جس طرح بھی بن پڑے جاؤ اور عظیم آقا کو تلاش کرو۔ اسے یہ بتاؤ کہ یہاں کیا سانحہ ہو گیا ہے۔ کیا تم اتنا بھی نہیں کرو گے۔''

وہ اتنے بے غیرت بھی نہیں تھے۔ انہوں کو وہ بے شک رو رہے تھے لیکن انہیں اندازہ تھا کہ جس کے وہ عقیدت مند ہیں اور جو ان کے بھروسے پر اپنا کرال چھوڑ کر نکل جاتا ہے۔ اس کے لیے یہ کام سرانجام دینا ان کی ذمہ داری ہے۔ میں نے تو انتظار نہ کیا اور روتی ہوئی بے یارومددگار روتی ہوئی کرال سے باہر نکل آئی اور ان راستوں پر روانہ ہو گئی۔ جدھر سفید بھیڑیا میری میری کو لے کر روانہ ہوا تھا۔ میں گھوڑے کی ٹاپوں کے نشانوں پر دوڑتی چلی گئی۔

پھر ایک بلند و بالا جگہ پر پہنچ کر میں نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر دیکھا تو بہت دور وہ لوگ مجھے جاتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ لیکن میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ میری نگاہوں سے غائب ہو گئے۔ آہ! میں اپنی زندگی کھو بیٹھی تھی۔ میری جس کے لیے میں نے اپنا قبیلہ چھوڑ دیا تھا اور جو اب میری اپنی اولاد کی طرح تھی۔ میرے لیے میری نگاہوں سے دور ہو گئی تھی اور وہ بھی اس طرح کہ ناقدر اس چاند کے ٹکڑے کو نجانے کیسے کیسے مشکل حالات سے گزارے گا۔ آہ..... میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ کیا کروں۔

وہ ذریعہ نہیں تھا میرے پاس کاش میں جادو جانتی۔ جادو کے عمل سے میں اپنی میری کو اس سے چھڑا لیتی۔ میں نے دور سے دیکھ لیا تھا کہ وہ آقازاد کو لیے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور اب وہ میری نگاہوں سے گم ہو گئے تھے۔ میں چلتی رہی اور بہت فاصلہ میں نے طے کیا اور نجانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

میں دن رات کا سفر کر رہی تھی اور کھانے پینے کو میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ بھوک پیاس سے دیوانی ہوئی جا رہی تھی میں لیکن مجھے کہیں بھی میری آقازادی نظر نہیں آرہی تھی اور یوں عظیم آقا میں بالآخر یہاں تک پہنچی اب بھوک اور پیاس میں قدم روک رہی تھی میں اپنی تمام تر جسمانی قوتیں کھو چکی تھی اور کئی دن اور کئی راتوں سے سرگرداں ہوں۔ میری..... میری۔'' اس کی آواز گلوگیر ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔ چھوٹا ہاتھی شیراز کی طرف دیکھنے لگا۔ شیراز بھی بوڑھے عورت کے اس انداز سے متاثر نظر آرہا تھا۔ اس نے آنسو بھری نگاہیں اٹھائیں اور بولی۔

''وقت نے سب کو مجھ سے دور کر دیا ہے۔ کوئی ایسا ذریعہ نظر نہیں آتا جس کی مدد سے میں اپنی آقازادی کو حاصل کر لوں۔ راستے میں جو افراد مجھے ملے میں نے ان سے معلومات حاصل کیں اور پوچھا۔ تو انہوں نے بتایا کہ یہاں تو سب ہی سفید بھیڑیے سے خوفزدہ ہیں اور اس کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھانے کو تیار نہیں۔ لیکن اب نجانے کیوں میرے دل کو ایک احساس ہو رہا ہے۔ دیکھو روشنی والے اور چھوٹے ہاتھی میری بات کا برا نہ ماننا میں تم سے اپنا مطلب بیان نہیں کر رہی۔ بلکہ ساری کہانی سنانے کے بعد تم سے بھی وہی آرزو کر رہی ہوں۔ بے شک تم مجھے ٹھکرا دینا۔ دھتکار دینا اور کہہ دینا کہ اے بوڑھی بھلا ہمیں کیا پڑی ہے کہ تیری میری کے لیے سرگرداں ہوں۔

لیکن جو میرے دل میں ہے۔ میں وہ تم سے کہنا چاہتی ہوں۔ میری مدد کرو۔ میری آقازادی کو سفید بھیڑیے کے چنگل سے رہائی دلا دو۔ دیکھو میں مفلس اور قلاش ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تمہاری دنیا کے لوگ جیسا کہ میں نے ان کے درمیان رہ کر دیکھا ہے کہ چمکدار پتھروں اور پیلی دھات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اگر تم نے میری آقازادی کو چھڑا لیا تو میں ایسا انعام دوں گی کہ تم زندگی بھر خوش رہو گے۔ میں تمہیں وہ راز بتا دوں گی جو میں نے اپنے آقا ڈاکٹر ایڈگر کو بھی نہیں بتایا۔ تم جانتے ہو۔ آہ! کاش یہ چھوٹا ہاتھی ہمارا دیوتا ہی ہوتا۔ وہ جس کا مجسمہ ہماری عبادت گاہ میں نصب ہے۔ تو میری تصدیق کرتا۔ میری قوم سونالیہ والوں کا ایک ایسا راز پوشیدہ ہے جو میں تمہیں بتا دوں گی اور یہ راز ایسا ہے کہ تصور بھی نہیں کرو گے۔ یعنی دوسرے طبق والے جن کے پاس بڑا خزانہ ہے کہ تمہاری دنیا میں ایک شہر نہیں بلکہ پورا ملک آباد ہو سکے۔ ہاں نہ میں تمہیں غلط لالچ دے رہی ہوں نہ مجھے اس کی ضرورت ہے کہ سچائیاں ہی تو کامیابی کی ضمانت ہوتی ہیں۔ لیکن درحقیقت میں دوسرے طبق کا وہ راز جانتی ہوں اور کیسے جانتی ہوں اس بارے میں نہ پوچھنا۔

یوں سمجھ لو کہ یہ سینہ بہ سینہ مجھ تک منتقل ہوا ہے۔ یعنی میرا باپ کا باپ جو ایک نیم دیوانہ آدمی تھا۔ جسے سونالیہ کے لوگ پاگل کہا کرتے تھے اس راز کو جانتا تھا۔ اس نے مجھے اس کے بارے میں اتنی تفصیل بتائی تھی۔'' شیراز اور آربونا چونک پڑے۔

آربونا کو اب اچھی طرح شیراز کا مقصد معلوم ہو گیا۔ اور یہ بھی جانتا تھا وہ کہ جن لوگوں نے اس کی زندگی بچائی یعنی شیراز خانانی۔ فاروق خانانی۔ وہ درحقیقت اپنی کھوئی ہوئی دنیا حاصل کرنے کے لیے سرگرداں تھے اور آج بھی شیراز کے دل میں ایک ہی آرزو ہے کہ اگر ممکن ہو سکے تو صحرائے اعظم سے کسی خزانے کا راز معلوم کرنے کے بعد وہ خزانہ حاصل کر سکے لیکن یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ عورت! شدت غم سے دیوانی ہو گئی ہو۔

بھلا ایسا کوئی خزانہ اور پھر کوئی دوسرا طبق دونوں باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ لیکن اس عورت کے چہرے پر وحشت اور دیوانگی کے

آثار تھے۔ اس کے برعکس اس کے چہرے پر سچائیاں جھلکتی تھیں۔ لیکن شیراز نے بڑبڑائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو اب آپ غلط راستے پر جا رہی ہیں۔ اگر ہمیں اس طرح اپنے مقصد کے لیے آمادہ کرنا تھا تو کم از کم ایسی کوئی بات تو نہ کہتی۔ ہم تو ویسے بھی انسانی رشتوں سے تیری مدد کر سکتے تھے اور سن! ہم تو صرف دو افراد ہیں اور بھلا ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں لیکن خزانے کی بات کر کے تو تو نے ہمارے ذہن خراب کر دیے ہیں اور ایسا نہ کرتا کہ ہماری ہمدردیاں تجھ سے ختم نہ ہو جائیں۔"

"تم دونوں اگر کسی خزانے سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ تو میں تم سے اس کا تذکرہ نہیں کرتی۔ لیکن حقیقت یہ ہی ہے کہ مقدس! گہرائیوں میں ایک عظیم خزانہ چھپا ہوا ہے اور گہرائیوں والے اس کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں اور میں تجھے اس کا پتہ بتا سکتی ہوں۔ لیکن ایسا نہیں تو جس حوالے سے بھی تم مناسب سمجھو میری مدد کرو۔"

"ہم صرف دو افراد ہیں اور تو کہتی ہے کہ سفید بھیڑیے کے ساتھ پورا گروہ ہے اور کیا تمہیں یہ بات معلوم ہے کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ بتا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔"

"دیکھو نہ تو میں پاگل ہوں۔ نہ دیوانی اور جو کچھ میں نے کہا وہ جھوٹ نہیں ہے اور مجھے یہ بھی احساس ہے کہ میں ایک ایسے کام کے لیے تم سے کہہ رہی ہوں جو بہت سے لوگ مل کر بھی آسانی سے نہیں کر سکتے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اگر کسی کام کا صلہ خواہش کے مطابق ملے تو انسان وہ کام اپنی قوت سے زیادہ بڑھ کر کرتا ہے۔ چنانچہ میری مدد کرو۔ اس کا صلہ میں تم کو دوں گی۔ اگر تم نے کوشش کی اور کامیاب نہ بھی ہوئے تب بھی تمہیں تمہارا انعام مل جائے گا۔"

"میں تمہیں اس جگہ کا پتہ ضرور بتا دوں گی اور وہ اتنا کچھ ہے کہ تم دس زندگیاں حاصل کرو۔ تب بھی نہیں حاصل کر سکتے۔"

عورت بہت آگے بڑھ کر بات کر رہی تھی۔

"انعام اور صلے کی بات چھوڑ کر ہم لوگ بذات خود بھی ایک تکلیف کا شکار ہیں سنو! میں بہت کچھ سیکھ چکی ہوں اور اس دوران شاید تمہیں دوران گفتگو یہ بات میں نے نہیں بتائی۔ میرے آقا ڈاکٹر ایڈگر ہمارا رچ ڈاکٹر کالوں کا مسیحا مجھے بڑی اہمیت دیتا رہا ہے اور میرے شوہر گوریا کو بھی۔ اس نے ہمیں جڑی بوٹیوں کے ایسے راز بتائے ہیں کہ ہم بہت سی بیماریوں کا علاج خود بھی کر سکتے ہیں۔"

"ہر طرح کا لالچ دے رہی ہے یہ عورت عظیم آقا! لیکن ذرا اس کی بات سن تو لو۔ ذرا اس سے پوچھو تو سہی اگر ہم فرض کرو۔ اس کی آقا زادی کی تلاش میں نکل بھی پڑیں تو اسے کہاں پا سکتے ہیں۔" آربونا نے کسی خاص خیال کے تحت کہا۔

خزانے کی بات سن کر اس کے دل میں یہ تصور ابھرا تھا کہ ممکن ہے بوڑھی سچ ہی کہہ رہی ہو اور کوئی ایسا کام ہو ہی جائے تو عورت نے کہا۔

"اور وہ جگہ جو دریائے شکائیہ کے کسی پراسرار گوشے میں واقع ہے۔ تلاش کرنے سے مل سکتی ہے۔ کیونکہ حوالہ شکائیہ کا ہے اور جہاں تک یہ دریا جاتا ہے۔ ہم اس سمت میں سفر کر سکتے ہیں کہ کہیں نہ کہیں اسے پا ہی لیں گے اور تو کیا وہ سمت جانتی ہے۔ جدھر یعنی دریا دورخ کا ہوتا ہے ناں ہم اس کے چڑھاؤ پر بھی جا سکتے ہیں۔ اور جدھر سے وہ آتا ہے۔ ادھر بھی تو تیرا خیال کس طرف ہے۔"

"چڑھائی کی طرف کیونکہ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ عظیم آقا یعنی کالوں کا مسیحا کا گھونسلا اسی جانب ہے۔ یعنی وہ کرال دریا کے ساتھ ساتھ میں نے سفید بھیڑیے کو دریا کے

چڑھاؤ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے۔" گویا اپنے گھر کی طرف اور بات وزن دار تھی اور سمجھ میں آنی تھی اور یہ بھی حقیقت تھی کہ بوڑھی عورت کی باتوں سے شیراز کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی تھی۔

اور جس طرح دن کا اجالا آہستہ آہستہ۔ آسمان کی بلندیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ اسی طرح ایک روشنی شیراز کے ذہن میں بھی پھیل رہی تھی۔

بظاہر اس کا تجربہ کہتا تھا کہ بوڑھی عورت کے الفاظ غلط نہیں ہے اور اس نے جن گہرائیوں والوں کا تذکرہ کیا تھا۔ اگر واقعی وہاں تک رسائی حاصل ہو سکے تو ہو سکتا ہے کہ کچھ کام بن جائے۔

پھر اسے یاد آیا جو شاید آربونا کو یاد نہ رہا تھا۔

آربونا نے اپنی ماں ایلی بونا کا تذکرہ کیا تھا۔ جس نے خواب میں اسے بتایا تھا کہ ان کی آرزو پوری ہونے کا ذریعہ کوئی عورت بنے گی۔ تو کیا واقعی آربونا کا خواب سچا تھا اس کی ماں ایلی بونا نے صبح نشاندہی کی تھی اور یہ بھی بات ذرا سوچنے والی تھی کہ صبح ناشتے کے لیے اشیاء مہیا کرتے ہوئے آربونا کو بھی یہ ہی یاد آ گیا اور اس نے حیرانی سے کہا۔

"عظیم آقا! تمہیں کچھ یاد آ رہا ہے۔"

"کیا....." شیراز نے سوال کیا۔

"وہ جو تم نے مجھے جگایا تھا اور میں نے تم سے کیا تھا۔"

"اپنی ماں ایلی بونا کے خواب کے بارے میں۔"

"اور کیا میں نے تمہیں یہ نہیں بتا دیا تھا کہ میری ماں نے کہا ہے کہ تمہارے مقصد کی تکمیل ایک عورت کے ذریعے ہو گی۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔"

"اور کیا ایسی عورت ہمارے درمیان نہیں آ گئی جس نے ہمیں کچھ امیدیں دلائی ہیں۔"

"ہاں کہا جا سکتا ہے۔"

"کہا نہیں جا سکتا۔ بلکہ یہ تو ایک سچائی ہے۔ آہ! اب تو میرا دل بڑا مضبوط ہو رہا ہے۔ تم خود سوچو میری ماں نے زندگی میں کبھی بھی مجھ سے جھوٹ نہیں بولا اور سچائیوں سے دور نہیں رکھا۔ کیا موت کے بعد وہ اپنے بیٹے کو کوئی غلط بات بتائے گی۔"

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے آربونا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

"میں بتاؤں عظیم آقا بہتر تو یہ ہو گا کہ ہم اس عورت کے مقصد کے حصول کی کوشش کریں۔ ویسے بھی ایک ایسی لڑکی کی زندگی بچانا ضروری ہے۔ جو برے لوگوں کے چنگل میں پھنس گئی ہے اور شاید برائیوں کی طرف دھکیلی جا رہی ہے۔" شیراز سوچنے لگا۔ فطرتاً وہ بہت پرعزم نوجوان تھا اور کوئی شک نہیں کہ حالات کے زخم سے مضطرب کرتے رہا کرتے تھے۔

پھر اس سے بڑی بات فاروق خانانی کی جدائی تھی۔ جو اس کا جسم' اس کا بازو تھا اور فاروق خانانی نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے وجود کو اس کے وجود میں ضم کر رہا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اب اس کی ذمہ داریاں بھی اس کو ہی سنبھالنا پڑیں گی۔ اگر کوشش کر لی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ جبکہ عورت ایک گوشے میں بیٹھی ہوئی اونگھ رہی تھی۔

نجانے وہ کتنی راتوں کی جاگی ہوئی تھی۔ شیراز نے آربونا سے کہا۔

"اور اپنا سامان میں سمیٹ رہا ہوں۔ کیا تو اپنا بھلا لے کر شکار تلاش کرے گا۔ اب تو ہم لوگوں کو تین آدمیوں کی خوراک درکار ہو گی۔"

"اس کے لیے تم فکر ہی نہ کرو۔ دوست! میں نے ہرنوں کی ایک ڈار دیکھی تھی جو ہماری اس کمین گاہ کے عقب سے قلانچیں بھرتی ہوئی نکل گئی تھی۔"

"نجانے وہ کتنی راتوں کی جاگی ہوئی تھی۔" شیراز نے آربونا سے کہا۔

''اور اپنا سامان میں سمیٹ رہا ہوں۔ کیا تو اپنا بھالا لے کر شکار تلاش کرے گا۔ اب تو ہم لوگوں کو تین آدمیوں کی خوراک درکار ہوگی۔''

''اس کے لیے تم فکر ہی نہ کرو۔ دوست! میں نے ہرنوں کی ایک ڈار دیکھی تھی جو ہماری اس کمین گاہ کے عقب سے قلانچیں بھرتی ہوئی نکل گئی تھی۔''

''تو پھر کوشش کر اور کیا۔ میں ہرن بھوننے کی تیاری کروں۔'' دفعتاً ہی آربونا مسکرا دیا اور بولا۔

''ہرن بہت تیز رفتار ہوتے ہیں۔ عظیم آقا! لیکن آؤ ایک جادو کا کھیل کھیلتے ہیں۔''

''کیا۔''

''اگر میں ہرن لے آتا ہوں تو سمجھ کہ ہمارا مقصد پورا ہو جائے گا اور اگر کوئی ہرن میرے ہاتھ میں نہیں آتا۔ تو ہم اس مسئلے کو ہم اپنی زندگی کا ایک ناکام مرحلہ قرار دیں گے۔''

''نہیں ایسا نہ کہہ اربونا کیونکہ بہرطور ہم اس عورت کو مایوس نہیں کر سکتے۔''

''وہ ایک الگ بات ہے۔ لیکن اپنے دل میں ہم یہ تصور کیے لیتے ہیں۔''

''ہاں مجھے اس پر اعتراض نہیں ہے۔'' شیراز نے جواب دیا۔

عورت اب بھی گھٹنوں میں سر دیے سو رہی تھی۔ بیچاری عورت اگر وہ جھوٹ نہیں بول رہی لیکن پھر وہی بات سامنے آ جاتی ہے کہ تجربہ بھی کوئی چیز ہوتا ہے۔ عورت کے چہرے پر جس طرح غم اندوہ کے آثار نظر آتے تھے۔ وہ یہ ظاہر کرتے تھے کہ اس بات میں جھوٹ نہیں ہے۔ شیراز تو سامان سمیٹنے لگا اور آربونا اپنا بھالا لے کر نکل گیا اور تھوڑی دیر کے بعد شیراز نے اس کی چیخیں سنیں۔ جنہیں سنکر عورت بھی جاگ اٹھی تھی۔

شیراز نے دلچسپ نگاہوں سے دیکھا کہ آربونا اپنے بھالے کو کندھے پر رکھے ہوئے ہے اور ایک وزنی ہرن اس میں لٹکا ہوا ہے۔ جس کو آلہ سونا نے ختم کرنے کے بعد ہاتھوں اور ٹانگوں سے باندھ کر بھالے میں لٹکایا تھا اور عجیب سے انداز میں اسے اپنی کمر پر لادے اور بھالے کو اپنی بغل میں دبائے چلا آ رہا تھا۔ لیکن یہ تو واقعی حیرت کی بات تھی کہ آربونا کو گئے ہوئے ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی عورت بھی دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ آربونا خوشی سے چیختا ہوا آ گیا۔

''ہمیں ہمارے مستقبل کا اندازہ ہو گیا۔ عظیم آقا ہمیں ہمارے مستقبل کا اندازہ ہو گیا اور مجھے اب خوشیاں منانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

''لیکن اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اس ہرن کو بھوننے کی تیاریاں کر لیں اور کیا تو نے اس کی گردن پر وہ چھری پھیر دی ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ جو میں نے تجھ سے کہے تھے۔''

''ہاں ...... عظیم آقا! وہ تو مجھے زبانی یاد ہو گیا ہے۔ اور اب تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں وہ الفاظ ادا کر کے اپنے گردن پر بھی چھری پھیر لوں۔ بڑا ہی لطف آتا ہے۔'' آربونا خوشگوار لہجے میں بولا اور چند لمحوں کے لیے ایک پرمسرت فضاء پیدا ہو گئی۔

لیکن عورت کو انہوں نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ ہاں تازہ گوشت تیار کرنے کے بعد جب انہوں نے اپنے معدے پر کر لیے۔ تو شیراز نے عورت سے کہا۔

''اور اب تو یہ بتا کہ ہم کون سا راستہ عبور کر کے اس ندی تک پہنچیں گے۔ جس کا نام شکائیہ بتایا ہے۔''

''میں تمہاری وہاں سے رہنمائی کروں گی اور جدھر دریا کا چڑھاؤ ہے۔ ہمیں اس سمت چلنا ہے اور تم اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کر لو۔'' سامان کے گٹھر باندھے گئے اور ان میں سے ایک گٹھری آربونا بے اپنے بھالے میں لٹکالی اور آگے بڑھ گیا۔ عورت بھی ساتھ تھی۔ تینوں احتیاط سے سفر کر رہے تھے۔ شیراز نے اپنی بندوق سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ کیونکہ وقت پر کام آنے کے لیے اس سے بہتر چیز اور کوئی نہیں تھی کہ درندے اس کی آواز سن کر بھاگ جائیں۔ اور مقامی لوگ بھی لیکن اس کا استعمال بڑی احتیاط سے کیا جا رہا تھا۔ کیونکہ یہ ہی ایک ایسا ساتھی تھی۔ جو ابھی کافی عرصے تک انہیں حوادثات سے محفوظ رکھ سکتا تھا اور آربونا بھی یہ سمجھ رہا تھا کہ شیراز کے دل میں امید کی شمع روشن ہو گئی ہے اور وہ بھی خوش تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ عورت اپنے دل میں ایک لگن رکھتی تھی۔ کیونکہ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود اس نے کسی بھی قسم کی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اور سارے دن کا سفر طے کر کے وہ بالآخر دور سے اس تیز بہاؤ والے دریا کو دیکھنے میں کامیاب ہو گئے جس کا نام شکائیہ تھا۔ جس کا بہاؤ چڑھائی کی سمت سے آ رہا تھا۔ چونکہ شام کے جھٹپٹے فضاؤں میں اتر آئے تھے اور سردی پھیل رہی تھی اور کوئی ایسی جگہ درکار تھی۔ جہاں وہ پناہ کے لیے اپنا ٹھکانہ تلاش کر سکیں اور دریاؤں کے کنارے چوڑے اور پھیلے ہوئے درخت ان کے لیے ایک بہتر پناہ گاہ تھے۔

انہوں نے ادھر ہی کا رخ کیا اور درختوں کے نیچے ایک ایسی جگہ بنالی۔ جہاں وہ آرام کر سکتے تھے اور اپنا سامان یعنی بھنا ہوا گوشت جو صبح کو تیار کیا گیا تھا اور پانی ایک جگہ رکھنے کے بعد آربونا نے خشک لکڑیاں تلاش کرنا شروع کر دیں اور وہ دور تک نکل گیا اور ایسے کاموں کے لیے وہ کبھی شیراز کو تکلیف نہیں دیا کرتا تھا۔ بلکہ خود ہی بھاگ بھاگ کر سارے کام کر لیا کرتا تھا اور چقماق بھی اس نے اپنے پاس محفوظ کر لیے تھے تاکہ آگ جلانے میں بھی کوئی دقت پیش نہ آئے۔ ویسے سامان میں انہیں بہت سی ایسی چیزیں حاصل ہو گئیں تھیں یعنی سامان میں جو ان لوگوں کا تھا۔ جو فرار ہو گئے تھے۔ تب اپنے ٹھکانوں کے گرد ایک بڑا الاؤ روشن کر لیا تھا۔ تاکہ سردی اور مچھروں سے نجات ملے اور ایسی زہریلی مکھیوں سے بھی جو کہیں سے بھی پرواز کرتی ہوئی آ سکتی ہیں اور جن کا خاص خیال رکھا جانا ضروری تھا۔

پھر انہوں نے تمام انتظامات کیے اور جب رات کی تاریکی فضاؤں میں اتر آئی تو کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا۔ تب بوڑھی عورت نے کہا۔

''یہ درخت جو ہمارے سروں پر ہے ایک بڑی اچھی حیثیت کا حامل ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم مجھ پر اعتبار کرو۔''

''کیا مطلب۔''

''اس کے ٹہنیوں کے نچلے حصے توڑ لاؤ۔ یعنی وہ جہاں سے پتے نکلتے ہیں۔''

''تو اس سے کیا ہوگا۔''

''میں تمہیں ایک ایسی چیز پلاؤں گی۔ جسے پی کر تم مجھ سے اپنا حال بیان کرنا۔''

''آں ...... کیا اس میں نشہ ہوگا۔''

''نہیں۔''

''عظیم آقا تم مجھے حکم دیتے ہو کہ میں ایسا کروں۔''

''دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' شیراز نے کہا اور بڑے سائز کا بندر درختوں کے تنے سے چڑھتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ اور اس نے بوڑھی عورت کی ہدایت کے مطابق وہ ٹہنیاں توڑ لیں اور ان کی ایک اچھی خاصی مقدار نیچے لے کر آ گیا۔ ادھر بوڑھی نے آگ پر برتن رکھ دیا تھا۔ پانی اس میں ڈال دیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ برتن نکال لیے تھے۔ جن میں سیال ڈال کر پیا جا سکے۔ پھر وہ ٹہنیاں اس میں ڈال دیں گئیں اور بوڑھی انہیں جوش دینے لگی۔

پھر جب یہ سب کچھ خوب گرم ہو گیا تو اس

نے انہیں پیالوں میں انڈیل دیا اور جب آربونا نے اس کا مزہ چکھا تو خوشی سے اچھل پڑا۔

''آہ...... عظیم آقا یوں لگتا ہے۔ جیسے یہ عورت ہمارے لیے بہت بڑی شے ہے یعنی وہ جو آسمانوں سے اترتے ہیں اور برکتیں نازل کرتے ہیں۔ ذرا تم اس کا ایک گھونٹ پی کر تو دیکھو۔'' اور شیراز نے محسوس کیا کہ کیا کمال کی چیز تھی یعنی وہ درخت جس کی ٹہنیا ابالی گئی تھیں۔ ان میں بہت ہی دلکش ذائقہ تھا اور ایک ایسی فطرت ایسی کیفیت کا حاصل جو بدن میں چستی پیدا کر دے۔ یوں محسوس ہوا تھا۔ جیسے ساری تھکن دور ہوگئی ہو۔ تو شیراز نے عورت سے پوچھا۔

''کیا ایسے درخت یہاں جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔''

''یہ میں نہیں کہہ سکتی۔ لیکن یہ ایک نایاب اور نادر شے ہے۔ اسے میرے آقا یعنی ڈاکٹر ایڈگر نے مجھے روشناس کرایا ہے۔''

''یعنی بدن میں خون کی روانی تیز کر دینے والی چیز اور جسم کے لیے انتہائی طاقتور اور یہ چیز ایسے کمزور غلاموں پر استعمال کرتا تھا۔ جو بیماری سے لاغر ہو جاتے تھے اور یہ تو صرف اتفاق ہے کہ یہ درخت مجھے نظر آ گیا۔'' شیراز نے کہا۔

''بزرگ عورت! ہم تیری عزت کرتے ہیں۔ تیرا احترام کرتے ہیں اور تیرے اس جذبے اور لگن کی تعریف بھی۔ جو تیرے دل میں اپنی آقا زادی کے لیے ہے اور جسے تو چاند کا ٹکڑا کہتی ہے اور جسے حاصل کرنے کے لیے تو نے ہمیں آمادہ کیا ہے۔ لیکن تو نے کچھ اور بھی کہا تھا۔''

''کیا۔''

''تو نے کہا تھا۔ کہ اگر ہم اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یا ناکام بھی رہے تو۔ ہمیں اس جگہ کے بارے میں بتائے گی۔ جہاں سے ہمیں ایک عظیم خزانہ حاصل ہو سکتا ہے اور یہ بھی کیا تو نے کہ خزانے کی کہانیاں تجھے تیرے دادا نے سنائی اور کیا تو بتا سکے گی کہ وہ کہانیاں کیا تھیں۔''

''آہ...... اگر تم نے مجھ سے پوچھا ہے۔ تو بھلا تمہیں نہ بتانے کا کیا سوال ہے۔ میری تو دلی آرزو ہے کہ تمہیں کچھ حاصل ہو۔ کیونکہ تم خود بھی مخلص ہو۔ بڑے خلوص سے تم نے میری مدد پر آمادہ ہونے کا اظہار کیا ہے اور باقی بہت سی باتیں تو ہم تقدیر پر چھوڑ دیتے ہیں اور جو کچھ بھی تقدیر فیصلہ کرتی ہے وہی ہوتا ہے۔ لیکن وہ جو نمک حلال تھے اور جنہوں نے ڈاکٹر ایڈگر کی عنایتوں سے فائدہ اٹھایا۔ منہ موڑ گئے۔ لیکن تم...... تم نے ایسا نہ کیا۔ جبکہ تم پر اس کا کوئی احسان بھی نہیں تھا۔ میں تم سے بے حد متاثر ہوں اور ضروری ہے کہ تمہیں ان کے بارے میں بتاؤں۔''

وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی جیسے فیصلہ کر رہی ہو کہ اسے کہاں سے گفتگو کا آغاز کرنا چاہیے اور یہ لوگ بھی منتظر تھے۔ اس بات کو جاننے کے لیے کہ خزانہ کیا بوڑھا دادا اپنے پوتے یا نانا اپنی نواسیوں کو سنا سکتا ہے۔

عورت نے کچھ لمحوں بعد گردن اٹھائی اور بولی۔

''میں نے اپنی تمام تر یادداشت مجتمع کر لی ہیں اور اسی یادداشت کے سہارے میں تمہیں ان کی یادداشت سنا رہی ہوں اور جب تم اس سمت سفر کرو گے۔ جہاں تین سروں والی پہاڑیوں نظر آتی ہیں۔''

اس سنسنی خیز داستان کے
بقیہ واقعات کے لیے
آئندہ ماہ کا شمارہ ملاحظہ کریں۔

انجان

محمد صدیق طاہر

کچی کلیاں توڑ کے رکھ دیں پانی میں کھل جانے کو کھیل تو ایسے لاکھوں کھیلے، کھیل کے پر پچھتائے بہت...... محبت کی نرم کونپلیں پتھر ایسے دلوں میں بھی پھوٹ پڑتی ہیں، ایک سخت گیر شخص کی تصویر کشی جو خود اپنے حال دل سے ناواقف تھا۔

عام ڈگر سے ہٹی ہوئی منفرد کہانی

ڈاشاکی پرانی عمارت سے بے سروسامانی کے آثار ہویدا تھے۔ تقریباً سارے افسران جا چکے تھے۔ ان میں سے کچھ تو فوجی ملازمت سے سبک دوش ہو گئے تھے، کچھ نئے عہدے یا ترقی کے سلسلے میں دارالحکومت کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ صرف محکمہ ڈرافٹسمین کے سابق سربراہ انجینئرز کے میجر برنیٹ اور اس کے محکمے کی ڈرافٹسمین سینئر سارجنٹ نینا پرکنس اس عمارت کے بڑے کمرے میں اب بھی موجود تھے جہاں آرمی روڈ ڈپارٹمنٹ کے تکنیکی عملے نے پچھلے دو

سال سے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔

روانگی کی تیاریاں ایک ہفتے قبل ہی سے شروع ہو گئی تھیں۔ محکمے کی ساری فائلوں، اہم و غیر اہم نقشے، دستاویزات کے پلندے اور دیگر سامان باندھا جا چکا تھا لیکن ہیڈ کوارٹرز سے بروقت ٹرک نہ پہنچنے کی بنا پر سامان کی منتقلی ہنوز رکی ہوئی تھی۔ کمرے میں جا بہ جا مختلف بکسوں اور پلندوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

میجر برنیٹ جو افسران کی روانگی کی نگرانی اور ان کے پیچھے سامان کی بہ حفاظت منتقلی کے لیے رک گیا تھا، اس وقت ٹرک کے انتظار میں کھلی کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا پر امید نظروں سے گاہے گاہے باہر باغ کی جانب دیکھنے لگتا تھا۔

پت جھڑ کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ فضا میں عجیب بے کیفی اور اداسی رچی ہوئی تھی۔ اس وقت تیز بارش ہو رہی تھی اور بھیگی بھیگی سی بے کیف فضا میں خنکی کا احساس جاگنے لگا تھا۔ درختوں کے بالائی حصے سے سرمئی دھواں سا اٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔ آہنی پھاٹک پر متعین سنتری کوفت اور بے بسی کے عالم میں اپنے شانے اچکاتا ہوا ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہل ٹہل کر پہرا دے رہا تھا۔

اچانک کمرے کی پر سکون فضا میں نینا کی نرم اور شیریں آواز ابھری۔ ”کیا میں اسٹیشن کا ایک چکر لگا آؤں۔ ممکن ہے اب ہمارا ٹرک آ گیا ہو۔“

”ہاں جاؤ۔“ میجر نے جواب دیا۔ نینا اپنے جسم پر رین کوٹ ڈال کر باہر نکل گئی۔ وہ اسے بھیگی ہوئی پگڈنڈی کے پیچ و خم کے ساتھ ساتھ تیزی سے لہراتے بل کھاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ بارش کی تیز بوندیں اس کے جسم پر تواتر سے برس رہی تھیں۔ اس کی دل کش مخروطی انگلیوں نے رین کوٹ کو ٹھوڑی کے نیچے سے جکڑ رکھا تھا اور اس کے قدموں میں بارش کا پانی تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا۔

چند ثانیے کے بعد میجر نے اٹھ کر صحن کی جانب کھلنے والا دروازہ بہ آہستگی بند کر دیا اور ایک کاغذ تلاش کر کے دوبارہ اپنی نشست پر آ بیٹھا، پھر اپنی جیب سے قلم نکالا لیکن دفعتہً کچھ سوچ کر رک گیا۔ کچھ لمحے دبے پاؤں گزر گئے۔ میجر کے سنجیدہ، متین اور باوقار چہرے سے اندرونی کشمکش کا اظہار ہو رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ معاً اس نے اپنے سر کی ایک ہلکی سی جنبش سے دماغ میں در آنے والے خیالات کو جھٹک کر ایک طویل سانس لی گویا کسی فیصلے پر پہنچ گیا ہو اور پھر اس کا قلم محتاط انداز میں دھیرے دھیرے کاغذ کی نرم سطح پر پھسلنے لگا۔

”پیاری نینا!“ اس نے لکھنا شروع کیا۔ ”آج میں جس بات کا اقرار کرنا چاہتا ہوں، اس کے لیے قلم کا سہارا لینا نہیں چاہتا تھا بلکہ اس کا اظہار تمہارے روبہ رو کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں ایسا نہ کر سکا۔ شاید دل کی بات زبان تک لانے کی جرات مجھ میں نہیں لہٰذا مجبوراً قلم کا سہارا لے رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم میری یہ تحریر پڑھ کر مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کرو گی۔“

اتنا لکھ کر میجر نے کاغذ کو اپنی آنکھوں کے قریب کیا اور گردن ترچھی کر کے اپنی تحریر کو شروع سے آخر تک بہ غور پڑھنے لگا۔ لفظ ’پیاری‘ پڑھ کر وہ ٹھٹکا۔ اسے یہ لفظ کچھ پسند نہیں آیا لہٰذا اس لفظ کو حذف کر کے وہ مزید لکھنے لگا۔

”دوران جنگ میں میری بیوی اور اکلوتا بیٹا مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے اور اب میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔

اتنا تحریر کر کے وہ سوچنے لگا کہ کیا یہ جملہ اس نے نینا کے جذبہ ترحم کو ابھارنے کی غرض سے تحریر کیا ہے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن اسے نینا کی ہمدردی کی ضرورت نہیں تھی چنانچہ یہ جملہ بھی اس نے حذف کر دیا اور آگے لکھنے لگا۔

”ہم دونوں ایک عرصے سے ایک ہی چھت

کے نیچے کام کرتے چلے آ رہے ہیں۔ میں اس عرصے میں تمہارا اس قدر عادی ہو چکا ہوں کہ اب جدائی کے تصور سے ہی میری روح کانپ اٹھتی ہے۔“

میجر یہ تحریر کرتے ہوئے ہچکچایا۔ حقیقت یہ تھی کہ اتنے عرصے کی رفاقت کے باوجود شب و روز کی بے پناہ مصروفیات نے میجر کو اس قابل ہی نہیں چھوڑا تھا کہ وہ کبھی بھولے سے بھی نینا کی ذات کو اہمیت دیتا یا اس کے متعلق سوچتا لیکن اب جو وہ مصروفیات سے فارغ ہوا تو گویا پہلی بار اس نے نینا کو دیکھا اور گویا اچانک ہی اسے نینا کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس احساس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں چاندنی سی پھیلتی چلی گئی اور اس چاندنی میں ہر شے نکھرتی چلی گئی۔ اس نے ماضی کی جو تصویر بھی اٹھائی اس میں نینا مسکراتی ہوئی نظر آئی۔ وہ اس کا کس قدر خیال رکھا کرتی تھی! کتنی سہولتیں فراہم کیا کرتی تھی! ہر ہر قدم پر اس کا بھرپور تعاون شامل حال تھا۔ اس کی کتنی ساری پریشانیاں غیر محسوس طریقے سے نینا رفع کر دیا کرتی تھی۔ نینا اس کے بے شمار چھوٹے چھوٹے مسائل کس خوبی سے نمٹایا کرتی تھی، اس کے ہر کام میں کتنا سلیقہ اور کتنا قرینہ ہوتا تھا، کتنی نفاست ہوتی تھی۔

جنگ کے دوران میں ان دونوں کے تعلقات کچھ عجیب نوعیت کے تھے۔ نینا ہر چند کہ بہت اچھی ڈرافٹسمین تھی تاہم ان دونوں میں آئے دن کسی نہ کسی بات پر نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ نینا کے بے باک جواب اور پر سکون لب و لہجہ میجر کو سخت مشتعل کر دیتا تھا۔ نینا کو اپنے چیمبر میں طلب کرتے ہوئے وہ اپنے سنجیدہ اور بارعب چہرے پر مزید رعب اور افسرانہ تمکنت طاری کر لیتا اور جب وہ آتی تو اپنی گونجتی ہوئی آواز میں اسے مخاطب کرتا۔

”سینئر سارجنٹ! کیا کھڑے ہونے کا یہی طریقہ ہے۔“

جواب میں وہ بے حد اطمینان سے ذرا سا جھکا کر اپنے چمک دار فوجی بوٹوں پر نظر ڈالتی اور ہمیشہ کے مانند انتہائی پر سکون لہجے میں کہتی۔ ”کیوں۔ مجھ سے کون سی غلطی سرزد ہو گئی۔ فوجی قواعد کی رو سے میرے کھڑے ہونے کا طریقہ بالکل درست ہے۔“ وہ بڑے سکون سے اصرار کرتی۔ اس کا یہی اطمینان اور نرم و پر سکون لہجہ میجر کے دماغ میں چنگاریاں بھر دیتا۔

”میرا خیال ہے کہ تم نے فوجی قواعد و قوانین میں سوائے لفظ ’عہدہ‘ کے کچھ اور نہیں پڑھا ہے۔“ وہ اپنی میز پر رکھے ہوئے قلم دان کو ترچھی نظروں سے گھورتے ہوئے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کرتا۔ نہ جانے کیوں ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ قلم دان کو ترچھی نظروں سے گھورنے لگتا تھا گویا سارا قصور اسی قلم دان کا ہو۔

”کیا یہ ڈھیر سارے رومال تمھی نے بنائے ہیں۔“ اس کا دوسرا سوال ہوتا۔

مشرقیت

بس یا ٹیکسی کے لیے قطار لگانے کا جنون انگلستان میں تو ایسا ہے کہ ایک آدمی ہو تو بھی قطار بناتا ہے۔ ٹوکیو میں بھی قطار بنتی ہے ہم نے دیکھا لوگ کھڑے ہیں لمبی قطاریں بنی ہیں جونہی بس آئی سلیقہ بھول قطار توڑ اس پر سوار ہوتے چل پڑتے ہیں ہم نے اطمینان کا سانس لیا کہ کچھ مشرقیت کی روح ان لوگوں میں باقی ہے بالکل کرستان نہیں۔

(ابن انشاء)

''جی ہاں!'' نینا اسی لہجے میں اعتراف کرتی۔

''کیا میں نے اس سے قبل بھی تمہیں یہ ہدایت نہیں کی تھی کہ میری اجازت کے بغیر کپڑا ہر گز استعمال نہ کرنا۔'' اس کی آواز بلند ہونے لگتی۔

''جی ہاں آپ نے ہدایت کی تھی۔''

''لیکن اس کے باوجود تم اپنی من مانی کرتی رہیں۔''

''جی ہاں۔''

پھر یک لخت خاموشی چھا جاتی۔ میجر اندر ہی اندر سخت پیچ و تاب کھاتا ہوا سوچنے لگتا کہ سرزنش کے اس سلسلے کو کس طرح دراز کیا جائے۔

''لیکن میں نے یہ رومال آپ ہی کے لیے بنائے تھے کیوں کہ آپ نے سارے رومال گم کر دیے ہیں۔'' نینا گہری سانس کھینچ کر بے حد نرمی سے کہتی۔

''میں پوچھتا ہوں تمہارے ارادے کیا ہیں۔ کیا اس جگہ کو درزی کی دکان میں تبدیل کرنا چاہتی ہو۔'' وہ اپنی پینسل زور سے میز پر پھینکتا۔ ''بس بہت ہو چکا' میں تم سے تنگ آ چکا ہوں۔ تم کل ہی اپنی کمپنی کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ سنا تم نے! کل ہی! بس!'' وہ ہاتھ اٹھا کر اعلان کرتا لیکن شام کے وقت وہ پھر اس کے سامنے موجود ہوتی۔

''کیوں اب کیا ہو گیا۔'' وہ اس پر نگاہ پڑتے ہی بول اٹھتا۔

''میرا خیال ہے کہ تم اپنی کمپنی میں واپس جانے کے لیے بالکل تیار ہو۔''

''جی ہاں میں بالکل تیار ہوں۔''

''تو پھر اب مجھ سے کیا چاہتی ہو۔''

''کچھ بھی نہیں۔ بس...... وہ...... دراصل میں نے سہولت کے لیے آپ کی چھوٹی موٹی چیزوں کی ایک فہرست تیار کر لی ہے اور صرف یہ بتانے حاضر ہوئی تھی کہ یہ چیزیں کہاں کہاں رکھی ہوئی ہیں ورنہ آپ حشر تک انہیں تلاش نہ کر سکیں گے۔ آپ کے شیو کا پیالہ اور برش میز کی دراز میں ہیں۔ انڈر ویئر بکس میں ہے' اسی بکس میں رانفلیں بھی ہیں اور آپ کی کتاب مادام بواری ڈرائنگ بورڈ کے......''

''اچھا اچھا' اب تم دفع ہو جاؤ۔ میں ساری چیزیں خود تلاش کر لوں گا۔''

لیکن اسی اثناء میں اچانک ہی کوئی نامہ بر ہیڈ کوارٹرز سے نئے احکامات کی طویل فہرست لیے آ دھمکتا۔ فلاں فلاں پلان کی تفصیلات فوری مہیا کی جائیں' فلاں فلاں نقشے فوراً بنا کر ارسال کیے جائیں' فلاں منصوبہ جلد از جلد پایہ تکمیل کو پہنچایا جائے وغیرہ وغیرہ۔ محکمے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھلبلی مچ جاتی۔ ہر شخص مصروف کار ہو جاتا اور اس طرح نینا کی روانگی التوا میں پڑ جاتی۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہمیں کسی شخص کی خوبیوں کی بہ نسبت خامیاں جلد نظر آ جاتی ہیں۔ میجر نے ماضی سے حال کی جانب زقند لگاتے ہوئے تاسف سے سوچا اور دوبارہ قلم سنبھال لیا۔

''اگر تم مستقبل میں مجھ سے جدا نہ ہونے کا وعدہ کرو اور میری شریک حیات بننا قبول کر لو تو میں تمہارا شکر گزار ہوں گا۔''

خط مکمل کر کے اس نے ذیل میں انجینئرز کا میجر تحریر کرنا چاہا لیکن معاً رک گیا۔ یہ کوئی شادی کا حکم نامہ تو نہیں کہ جس پر وہ بہ حیثیت میجر دستخط کرنے جا رہا ہے۔ اس نے سوچا ہیرالڈ تحریر کرنا زیادہ مناسب ہوگا' لیکن نہیں' اس نام سے بزرگی ٹپکتی ہے۔ دوسرے ہی لمحے اس نے یہ خیال بھی رد کر دیا۔ کیا صرف برنیٹ تحریر کرنا کافی ہوگا۔ ہاں شاید! لیکن یہ تو بالکل خشک نام ہے۔ اس نے اپنے نام کا دوسرا حصہ لکھنے سے بھی گریز کیا۔ وہ عجیب مخمصے میں گرفتار ہو گیا۔ آخر کار کافی غور و خوض کے بعد اس نے نام تحریر نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے محبت نامے کو ایک دوسرے صاف ستھرے کاغذ پر

نقل کیا اور دھڑکتے دل سے اسے تہ کر کے بستر کے پاس پڑی ہوئی تپائی پر کنگھے کے قریب ہی رکھ دیا لیکن اسے اس طرح تپائی پر رکھ کر وہ اپنے اندر ایک عجیب نوعیت کی بے چینی سی محسوس کرنے لگا' گویا میز پر کوئی کاغذ نہیں بلکہ بم رکھا ہو جو کسی بھی لمحہ پھٹ سکتا ہے۔ وہ عالم اضطراب میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس دوران میں وہ دزدیدہ نظروں سے گاہے گاہے اس تہ شدہ کاغذ کو دیکھنے لگتا۔ اچانک وہ کمرے کے وسط میں رک کر سیٹی بجانے لگا لیکن بے چینی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ صحن میں نکل آیا۔ بارش تھم چکی تھی اور پگڈنڈی پر جابجا بیضوی شکل کے چھوٹے بڑے جوہڑ بن گئے تھے۔ نیلا آسمان اور اودے اودے بادل ان بیضوی آئینوں میں اپنا عکس دیکھ رہے تھے۔ ایک بلی خاردار جنگلے کے ساتھ ساتھ بڑی نزاکت سے چلی جا رہی تھی اور ایک جگہ رسیوں کا ایک سایہ ڈھیر عجیب بے ڈھنگے انداز میں جنگلے سے جھول رہا تھا۔

ناگاہ پھاٹک ایک دھماکے سے کھلا اور نینا تقریباً دوڑتی ہوئی اس کی جانب بڑھی۔

''آخر کار......'' وہ دور ہی سے پرمسرت لہجے میں چیخی۔ ''ان لوگوں نے کل ٹرک بھیجنے کا وعدہ کر ہی لیا۔''

میجر' صحن کی کھڑکی میں لگے ہوئے رنگین شیشے کے چوکور فریم میں سے گہرے نیلے رنگ کے فریم سے باغ کو دیکھنے لگا۔ اسے سارا باغ تاریکی میں ڈوبا ہوا نظر آیا۔ پھر اس نے سرخ شیشے کے فریم سے دیکھا تو سارے باغ میں گویا آگ سی لگی ہوئی تھی۔ وہ اسی عالم میں کھڑا باغ کے سرخ مناظر کو گھورتا رہا لیکن ساتھ ہی اس کی آنکھیں نینا کا تعاقب بھی کر رہی تھیں۔ وہ کمرے میں جا چکی تھی۔ میجر اسے کن انکھیوں سے تیزی کے ساتھ اپنا رین کوٹ اتارتے ہوئے اور پھر ایک پیر پر اچھل کر اسے کھونٹی سے ٹانگتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر وہ اپنے بالوں کو درست کرنے کی غرض سے کنگھا

یادیں

کچھ لمحے، کچھ یادیں، کچھ گھڑیاں، کچھ باتیں، ہمیشہ کے لیے دلوں میں نقش ہو جاتی ہیں۔ کچھ چہرے وقت کی دھوپ میں کبھی نہیں چھپتے، کچھ یادیں ذہن سے کبھی فراموش نہیں ہوتیں کیونکہ یہ زندگی کا سرمایہ ہیں۔ کچھ لمحے ایسے ہوتے جن کو یاد کر کے ہم روتے ہیں اور کچھ لمحے ایسے ہوتے ہیں جن کو یاد کر کے دل خوش ہوتا ہے۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے ہم سبق حاصل کر کے اپنی زندگی سنوار لیتے ہیں' کچھ گھڑیاں ایسی ہوتی ہیں جن کو بھلانا ممکن نہیں جن کو سوچ کر دل کہتا ہے کاش! یہ لمحے...... یہ یادیں...... یہ گھڑیاں...... یہ باتیں لوٹ آئیں تو میں ان کو مٹھی میں قید کر لوں پھر کبھی نہ جانے کے لیے۔

اٹھانے کے لیے اس تپائی کی جانب بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ دفعتہً اس کی نگاہ تہ شدہ کاغذ پر پڑی۔ وہ ایک لحہ کے لیے ٹھٹک کر رک گئی' پھر بڑھ کر اسے اٹھا لیا اور وہیں کھول کر پڑھنے لگی۔ میجر کے دل کی دھڑکنیں بے ربط سی ہو گئیں۔ اس نے جلدی سے اپنی نگاہوں کا رخ موڑ لیا۔

''ہیرالڈ!'' اچانک اس کی شیریں آواز میجر کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''کیا اس دوران میں یہاں کوئی آیا تھا۔'' میجر کے کانوں میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

''تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو۔'' اس کی آواز حلق میں گولے کے مانند پھنس گئی۔ اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

''بس یونہی۔ کہیں موٹر ٹرانسپورٹ سے واسیا تو نہیں آیا تھا۔ کیا وہ آیا تھا۔''

وہ خنجر کی ظالم نوک ہی تھی جو میجر کے سینے میں بڑے آرام سے اترتی چلی گئی۔ پھر کچھ لمحے بیت گئے' نہ جانے کتنے! میجر کو محسوس ہوا صدیاں

بیت گئیں۔

''نہیں، لیکن میں نہیں جانتا...... میں پانچ منٹ کے لیے کمرے سے باہر گیا تھا۔ ممکن ہے۔'' اس کا لہجہ تھکن سے چور تھا۔ ناگاہ اسے اپنی پیشانی پر ہلکی ہلکی سی نمی کا احساس ہوا۔ اس نے الٹے ہاتھ سے نم آلود پیشانی صاف کی۔ عین اسی لمحے نینا کی آواز ابھری۔ ''ہیر اللہ! کیا میں ایک منٹ کے لیے موٹر ٹرانسپورٹ تک جا سکتی ہوں۔ ایک اشد ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ صرف ایک منٹ کے لیے! بس گئی نہیں کہ آ گئی۔''

''ہاں ہاں شوق سے جاؤ۔'' میجر کو اپنی آواز اجنبی سی لگی۔ اس نے گھبرا کر سرخ شیشے کے چوکور فریم میں سے جھانکا۔ باغ میں ایک بار پھر آگ لگ گئی تھی۔

اب تک میجر کے خیال میں اس کی پینتالیس سالہ زندگی کا مطلب یہ تھا کہ زمین نے سورج کے گرد پینتالیس چکر لگا لیے تھے لیکن آج پہلی دفعہ اسے شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ زمین کی یہ گردش کچھ اور مفہوم بھی رکھتی ہے اور یہ مفہوم آج اس پر پوری طرح واضح ہو چکا تھا۔

نینا، موٹر ٹرانسپورٹ محکمے کے نوجوان اور خوب رو ٹیکنیشن واسیا سے ملنے چلی گئی تھی اور وہ جو کہ انجینئرز کا میجر تھا، اپنے صحن میں تنہا رہ گیا تھا۔ ہر چند کہ بارش تھم چکی تھی لیکن چھت کے سوراخوں میں سے بارش کے قطرے اب بھی ٹپک رہے تھے اور خزاں رسیدہ زرد سوکھے پتے، شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر صحن میں ادھر ادھر بکھر رہے تھے۔ دور اور نزدیک ایستادہ بلند و بالا درختوں کی شاخوں پر بیٹھے ہوئے کوے اپنے ہم جنسوں کو پکار پکار کر گرم ممالک کی سمت کوچ کرنے کے لیے اکٹھا کر رہے تھے۔

نینا وہاں سے واپسی پر کچھ افسردہ سی نظر آ رہی تھی۔

''کیا بات ہے۔'' میجر نے پوچھا۔ ''تم کچھ فکر مند اور پریشان سی نظر آ رہی ہو۔''

''نہیں تو۔'' وہ ایک لمحہ کے لیے حیران سی رہ گئی۔ ''قطعی نہیں۔'' پھر وہ جلدی سے کمرے میں چلی گئی۔ ''آج تو میں بے حد خوش ہوں، بے انتہا خوش!'' اسے نینا کی پرمسرت چہکار سنائی دی۔ وہ اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔

نینا! کیا میں اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ اتنا احمق ہو چلا ہوں کہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود کچھ بھی نہ سمجھ سکوں۔ اگر واسیا تمہارے جذبات و احساسات کو نہیں سمجھتا تو اس میں ملول اور افسردہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ذرا صبر و تحمل سے کام لو۔ تم نوخیز ہو، خوش جمال ہو اور پرشباب ہو۔ جلد ہی وہ مبارک گھڑی آئے گی جب کوئی دوسرا نوجوان اور خوب رو واسیا خود بہ خود تمہاری جانب کھنچا چلا آئے گا اور تمہارے دل کش و نرم و نازک ہاتھوں کے کنول کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر تمہارے کانوں میں پیار بھری سرگوشیاں کرے گا۔ ان سرگوشیوں میں وہ سب کچھ بڑی آسانی سے کہا جائے گا جسے سننے کے لیے تمہارے جسم کا رواں رواں بے تاب ہے۔

وہ یہ سب کچھ کہنا چاہتا تھا اور اس کے علاوہ بھی نہ جانے کیا کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کچھ نہ کہہ سکا۔ کچھ بھی تو نہیں! الفاظ لبوں تک پہنچنے سے قبل ہی مصلوب ہو چکے تھے۔ وہ مہر بہ لب خالی خالی نظروں سے نینا کو تکتا رہا جو بستر پر بیٹھی ہوئی اپنی گلابی تھوڑی نازک سی ہتھیلی پر ٹکائے اس کی جانب دیکھے جا رہی تھی۔

میجر کچھ دیر الجھا الجھا سا کھڑا رہا، پھر آہستہ سے پلٹا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

نینا یک لخت مسکرانے لگی۔ کتنا سادہ لوح ہے یہ میجر! اس نے اپنی دل کش مسکراہٹ کے دوران میں سوچا۔ کیا میں اس کی تحریر نہیں پہچانتی۔

♦......♦......♦

آخری وار

طارق حفیظ

یہ سنتے ہی خاموش فضا میں یہ یک وقت
دو گولیاں چلنے کی آواز گونجی۔
دونوں بوڑھوں نے ایک ساتھ فائر کیا تھا۔
بین ہیرس دونوں بوڑھوں کو رائفلیں اٹھاتے دیکھ کر
تیزی سے تنے کے پیچھے لیٹ گیا تھا۔
چند لمحے بعد جب اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو جیسن میز کے نیچے
پڑا تھا اور اس کے ارد گرد خون پھیلا ہوا تھا۔

اس شمارے کے لیے ایک دلچسپ تحریر

عمر کے اعتبار سے وہ دونوں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ اگر جیسن اسی برس کا تھا تو میکلے کی عمر بیاسی سے کم نہیں تھی، لیکن ان کی ساری زندگی پہاڑوں پر گزری تھی اس لیے ان کے جسم مضبوط اور چہروں پر عزم پایا جاتا تھا، یعنی زندگی کی نویں دہائی میں قدم رکھنے کے باوجود وہ درماندہ نہیں ہوئے تھے۔ ان کے چہروں پر نہ تو بڑھاپے کی تھکن کے آثار تھے اور نہ ہی مایوسی کی لکیریں۔

اس وقت وہ لکڑی اور پتھروں کی بنی ہوئی ایک عمارت کے سامنے سیدھی پشت والی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے لکڑی کی میز پر شطرنج رکھی تھی۔ ان کی رائفلیں میز کے ساتھ ٹکی ہوئی تھیں۔ صبح

کا وقت تھا اور موسم خاصا خوشگوار تھا۔ درختوں کے اس جھنڈ میں چند اور مکانات بھی بنے ہوئے تھے لیکن وہ سب کے سب ویران اور غیر آباد تھے۔

"مجھے شطرنج کھیلنے میں قطعاً مزہ نہیں آتا۔" میکلے چال چلتے ہوئے بولا۔ "اس میں کوئی ہنگامہ اور جوش نہیں ہے۔"

"شطرنج ایک شاہی کھیل ہے۔" حیسن نے کہا۔ "پرانے بادشاہ دو ہی مشغلے پسند کرتے تھے' جنگ یا پھر شطرنج۔"

"دونوں ہی احمقانہ کھیل ہیں۔" میکلے نے کہا۔ "اگر ہمارے خاندان' خاندانی دشمنی کے باعث قتل و غارت گری نہ کرتے تو آج اس وادی میں ہر طرف چہل پہل ہوتی۔"

حیسن نے ہلکا سا قہقہہ لگایا' پھر بولا۔ "وہ بھی خوب زمانہ تھا۔ زندگی بامقصد معلوم ہوتی تھی۔ اب بیزاری کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ کھایا پیا' شکار کیا' شطرنج کھیلی اور سو گئے۔"

میکلے نے چٹکی بجائی اور بولا۔ "میرے ذہن میں ایک تجویز ہے' ہم دونوں شادی کر لیتے ہیں اور پچیس سال تک ایک دوسرے کو کچھ نہ کہنے کا عہد کر لیتے ہیں۔ اس دوران میں ہم کم از کم ایک درجن بچے ضرور پیدا کر لیں گے۔ اس کے بعد ہم دوبارہ ہنگامہ شروع کر دیں گے۔"

"ہونہہ! پچیس سال بعد اگر میں زندہ رہا تو میری عمر ایک سو سات سال ہو جائے گی۔ ذرا سوچو' اس عمر میں کیا ولولہ باقی رہے گا۔"

"کوئی وجہ نہیں کہ ولولہ باقی نہ رہے۔" میکلے نے کہا۔ "ہم روزانہ دس میل گھڑ سواری کریں گے' پانچ میل کی دوڑ لگائیں گے' دو گھنٹے شکار کھیلیں گے' ایک گھنٹہ پیراکی کریں گے اور ایک بھنا ہوا ہرن کھائیں گے۔ کوئی وجہ نہیں ہم دوبارہ جوان ہو جائیں۔"

"بڑی اچھی تجویز ہے' لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے لیے بیویاں کہاں سے آئیں گی۔"

"کوئی مشکل نہیں ہے کسی قریبی آبادی سے عورتیں اغوا کرا لاتے ہیں۔"

"اچھا' زیادہ بکواس نہ کرو۔" حیسن چال چلتا ہوا بولا۔ "چیک بچو۔"

لیکن میکلے چال چلنے کی بجائے اس کچی سڑک کی طرف دیکھنے لگا جو بل کھاتی ہوئی' درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو جاتی تھی۔ اس کا ہاتھ خود بہ خود رائفل پر جا پڑا۔

"غالباً کوئی شخص اس طرف آ رہا ہے۔" اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ میں نے سڑک پر کسی کو حرکت کرتے دیکھا ہے۔"

حیسن بھنویں سکیڑ کر سڑک کی سمت دیکھنے لگا۔ "مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔" اس نے کہا۔

"میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ ہمیں سڑک کے آس پاس والے درخت کاٹ دینا چاہئیں۔ ان درختوں کی وجہ سے دیکھنے میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔" پھر وہ چونک پڑا۔ "وہ دیکھو' ان درختوں کے نیچے۔"

"کوئی اجنبی معلوم ہوتا ہے۔" حیسن نے کہا۔ "کم از کم ایک میل دور ہوگا۔ تمہاری نظر بہت تیز ہے۔"

"اسی طرف آ رہا ہے ممکن ہے' کوئی اخباری نمائندہ ہو۔"

"یا شاید کوئی پھیری والا ہو۔"

"پھیری والا نہیں ہو سکتا۔" میکلے بہ غور دیکھتا ہوا بولا۔ "اس کے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔ یا تو کوئی اخباری نمائندہ ہے یا پھر کوئی حشرات الارض کا ماہر ہے' لیکن نہیں' یہ کوئی اخباری نمائندہ ہی لگتا ہے' گلے میں نہ تو دوربین لٹک رہی ہے اور نہ ہی کوئی کیمرہ ہے۔"

حیسن نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "ہونہہ! اب اخباری نمائندوں کو بتانے کے لیے ہمارے پاس کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہم اپنی خاندانی دشمنی ختم کر چکے ہیں اور اس بارے میں سب کچھ بتا چکے

ہیں۔"

حیسن اور میکلے دو مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ تیس سال قبل دونوں خاندانوں میں ایک معمولی تنازع کی بنا پر دشمنی ہو گئی تھی جو رفتہ رفتہ قتل و غارت گری میں تبدیل ہو گئی۔ دونوں خاندان ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے تھے۔ کبھی آگ لگا دی' کبھی کسی عورت کو اغوا کر لیا یا اکا دکا افراد کو قتل کر دیا۔ اگر ایک خاندان ایک آدمی قتل کرتا تو دوسرا خاندان اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا تھا جب تک مخالف خاندان کے دو آدمی قتل نہیں کر لیتا تھا۔ بالآخر ایک بڑے معرکے میں دونوں خاندانوں کے تمام افراد ہلاک ہو گئے۔ حیسن اور میکلے کچھ عرصے تک ایک دوسرے کے خلاف مورچہ بند رہے لیکن پھر انہوں نے یہ سوچ کر صلح کر لی کہ جب خاندان ہی باقی نہیں رہے تو پھر دشمنی کیسی! صلح کے بعد دونوں بہت اچھے دوست بن گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ دوستی بہت گہری ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی بن گئے تھے اور پرانی دشمنی کو یاد کر کے ہنستے تھے۔

اب اجنبی خاصا قریب پہنچ گیا تھا۔

"کوئی نوجوان ہے۔" حیسن اپنی رائفل پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"بہت عرصے بعد کوئی نوجوان اس طرف آ رہا ہے۔" میکلے نے کہا۔ پھر اسے اپنی جوانی کا زمانہ یاد آ گیا۔ "آہ' جوانی کے دن بھی کیا خوب تھے' اچھے دن تھے۔"

"ابھی ہماری بازی ختم نہیں ہوئی۔" حیسن نے کہا۔ "چال تمہاری ہے۔"

میکلے نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اجنبی نوجوان کو گھور رہا تھا جو خاصا قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ صحت مند اور خوش شکل نوجوان تھا۔ اس کے کندھے چوڑے اور جسم مضبوط تھا' عمر چوبیس پچیس برس کے لگ بھگ تھی۔

"اچھی شکل و صورت کا مالک ہے۔" میکلے نے کہا۔ "شکلیں دھوکا بھی دے جاتی ہیں۔"

نوجوان نے قریب پہنچ کر سلام کیا اور ایک کٹے ہوئے تنے پر پیر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ میں سے مسٹر میکلے کون ہیں۔"

"یہ ہے میکلے۔" حیسن نے انگوٹھے سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور مجھے حیسن کہتے ہیں۔ کیا تم کوئی اخباری نمائندے ہو۔"

نوجوان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ وہ حیسن کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "میرا نام بن ہیرس ہے۔ میں اوہائیو سے آیا ہوں۔"

"اوہ' بہت دور سے آئے ہو۔" حیسن نے کہا۔ "غالباً تمہیں ہماری خاندانی دشمنی کے واقعات نے متاثر کیا ہے۔"

"آں ہاں' میں ان واقعات کو اکٹھا کر رہا ہوں۔" ہیرس نے کہا۔ "میں نے اخبار میں ایک مضمون پڑھا تھا جس میں لکھا تھا کہ میکلے اور حیسن خاندان کی دشمنی ختم ہو چکی ہے۔"

"دشمنی کیا خاندان ہی ختم ہو چکے ہیں۔" میکلے نے کہا۔ "ہمارے سوا دونوں خاندانوں کا ایک بھی فرد زندہ نہیں بچا۔"

"اسی مضمون میں' میں نے پڑھا تھا کہ میکلے خاندان کا ایک فرد جان میکلے پچیس سال قبل یہ جگہ چھوڑ کر شہر چلا گیا تھا۔"

"وہ میرا بیٹا تھا۔" میکلے نے کہا۔ "خاندانی دشمنی کے ہنگامے سے گھبرا کر وہ شہر چلا گیا تھا۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا تھا کہ وہ دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو میکلے خاندان کا نام باقی رہتا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہ شادی کیے بغیر اور کوئی اولاد چھوڑے بغیر مر گیا۔"

نوجوان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ وہ بولا۔ "لیکن جناب' اس نے شادی کی تھی۔"

دونوں بوڑھے یہ سن کر چونک اٹھے۔ ان کے

ہاتھ سختی سے رائفلوں پر جم گئے تھے۔

"اس نے اپنی موت سے چھ ماہ قبل شادی کی تھی۔" ہیرس نے مزید کہا۔

"یہ ناممکن ہے۔" جیسن نے کہا۔ "ہم نے تو ایسی کوئی بات نہیں سنی۔"

"جان میکلے نے اپنے بیوی کو خاندانی دشمنی کے بارے میں سب کچھ بتادیا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو یہ تاکید بھی کی تھی کہ وہ اس بارے میں نہ تو کسی سے ذکر کرے اور نہ ہی کبھی اس کے خاندان والوں سے رابطہ قائم کرے۔"

"یہ تو واقعی بڑی حیرت انگیز بات ہے۔" میکلے نے گہری دلچسپی سے کہا "کیا جان کی کوئی اولاد بھی ہے۔"

"ہاں ایک بیٹا ہے۔"

یہ سنتے ہی جیسن کے چہرے پر زبردست تناؤ پیدا ہوگیا۔ اسے یہ بات سخت ناگوار گزری تھی کہ اس کے حریف خاندان کا نام باقی رہے گا' البتہ میکلے کو یہ خبر سن کر بے پناہ خوشی ہوئی تھی۔

"تمہیں یہ سب کچھ کہاں سے معلوم ہوا ہے۔" اس نے پوچھا۔

"کیا تم میری بہو سے مل چکے ہو۔"

"ہاں' یہ سب مجھے اسی نے بتایا تھا۔ چھ ہفتے قبل اس کا انتقال ہوگیا تھا۔ اپنی موت سے چند روز پہلے اس نے ساری باتیں مجھے بتائی تھیں۔"

"اور جان کا بیٹا کہاں ہے۔"

"میں جان میکلے کا بیٹا ہوں۔"

یہ سنتے ہی خاموش فضا میں بہ یک وقت دو گولیاں چلنے کی آواز گونجی۔ دونوں بوڑھوں نے ایک ساتھ فائر کیا تھا۔ بین ہیرس دونوں بوڑھوں کو رائفلیں اٹھاتے دیکھ کر تیزی سے تنے کے پیچھے لیٹ گیا تھا۔ چند لمحے بعد جب اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو جیسن میز کے نیچے پڑا تھا اور اس کے اردگرد خون پھیلا ہوا تھا۔

"اوہ' میرے خدا!" اس نے کہا۔ "آپ نے اسے قتل کردیا۔"

"اس نے مجھے قتل کرنا چاہا تھا اس لیے میں نے اسے مار ڈالا۔"

"اس نے مجھے قتل کرنا چاہا تھا۔"

"ہاں' اگر تم فوراً آوٹ میں نہ چلے جاتے تو یہاں تمہاری لاش پڑی ہوتی۔"

"لیکن..... آپ دونوں نے ایک ساتھ رائفلیں اٹھائی تھیں۔"

بوڑھے میکلے کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ وہ بولا۔ "ہم نے فیصلہ کرنے میں اور دوسرے کا فیصلہ سمجھنے میں کبھی دیر نہیں لگائی۔"

بین ہیرس دونوں بوڑھوں کی قوت فیصلہ اور قوت عمل پر دنگ رہ گیا۔

"بالفرض اگر میں نشانہ بن جاتا اور جیسن بچ جاتا تو آپ کیا کرتے۔"

"کچھ بھی نہیں۔"

"کیا آپ میرے قتل کا انتقام نہ لیتے۔"

"نہیں' ہم دوبارہ دوست بن جاتے کیوں کہ ہم ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ آدمی تنہا کیسے زندہ رہ سکتا ہے! خیر چھوڑو ان باتوں کو! آج میں بہت خوش ہوں۔ میں نے ایک طویل جنگ جیتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میری نسل اور میرا نام باقی رہے گا۔" پھر وہ میز پر رکھی ہوئی شطرنج کو گھورتا ہوا بولا۔ "افسوس کہ ہماری شطرنج کی بازی مکمل نہ ہوسکی۔"

"مجھے یہ بات پسند نہیں آئی جناب۔"

"میرے بیٹے! شہروں کی فضا نے تمہیں بزدل بنادیا ہے اور ہاں تم مجھے انکل میکلے کہہ کر مخاطب کرو۔ اگرچہ میں تمہارا دادا ہوں لیکن دادا کہلوانا اچھا نہیں لگتا کیوں کہ ابھی میرے ہاتھوں میں دم ہے اور میں اپنے دشمن پر وار کرسکتا ہوں۔ آؤ شطرنج کی ایک بازی ہوجائے۔"

سایہ

عابد علی سید

خالہ جین اپنا شان دار لباس پہنے مہمانوں کا انتظار کرتی رہیں۔ رات کے گیارہ بج گئے' پھر بارہ اور ساڑھے بارہ! آخر تھک کر وہ ہینڈ کی طرف مڑیں اور ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کردیا۔ "مہربانی کر کے آپ لوگ جائیں اور کھانا کھالیں۔" وہ بولیں۔ ان کے لہجے میں بڑی شائستگی تھی "اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

عمر ملکی ادب سے ایک دلچسپ تحریر

خالہ جین کا تعلق امرا کے طبقے سے تھا۔ ان کے مزاج میں شاہانہ رنگ بسا ہوا تھا۔ وقت کے ساتھ ان کے رہن سہن اور طور طریقوں میں ذرا فرق نہیں آیا بلکہ ہوا یہ کہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کے غرور و تمکنت میں اضافہ ہوگیا۔ وہ اپنے شان دار اور قدیم حویلی نما مکان میں تنہا رہتی تھیں جو کاؤنٹی پیٹری میں واقع تھا۔ انہیں وہ نو دولتیے ذرا پسند نہ تھے جنہوں نے ان کے قرب و جوار میں بڑی شان دار کوٹھیاں بنالی تھیں۔ خاندانی فخر و مباہات کی وجہ سے وہ انہیں کبھی منہ نہ لگاتیں اور نہ انھیں کبھی اپنے یہاں مدعو کرتیں۔ اگر کبھی کوئی خاندان محض پڑوسی ہونے کے ناتے ان کے ہاں آجاتا تو انہیں ذرا خوشی نہ ہوتی۔ خالہ جین آنے والوں کی کچھ اس

انداز میں پذیرائی کرتیں کہ وہ دوبارہ نہ آنے کی قسم کھا کر ہی جاتے۔

انہیں اپنے گھر پر بن بلائی مہمان خواتین کے رنگ برنگے لباس اور نت نئے جدید فیشن سے نفرت تھی۔ بڑھاپے نے ان کا سراحسن اور زیبائش چھین لی تھی۔ انہیں اب اس علاقے میں پہلے سا اقتدار اور تکریم بھی حاصل نہیں تھی۔ بس وہ ایک تنہا بوڑھی عورت تھیں جو زمانے سے بہت پیچھے اپنی تنہائی' خود ساختہ غرور اور وقار کی دنیا میں مگن تھیں۔ مدتوں سے وہ اپنے وسیع اور قدیم گھر میں دنیا سے بالکل کٹی ہوئی زندگی گزار رہی تھیں۔ انہیں ذرا بھی علم نہیں تھا کہ گھر سے باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا تھا' زمانہ کس تیزی سے ترقی کر گیا تھا۔ نہ انہیں یہ سب کچھ جاننے کی ضرورت تھی۔

سردیوں کی ایک شام خالہ جین یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکیں کہ ان کے پڑوس میں بڑا جوش و خروش اور گہما گہمی کا سا عالم تھا۔ قریب کی پہاڑی پر بنے ہوئے نئے اور شاندار مکان میں ایک نیا خاندان آبسا تھا اور اب وہ اپنے نئے گھر میں ایک عظیم الشان دعوت کا اہتمام کر رہا تھا' ایک ایسی دعوت جو یقیناً اس علاقے میں پہلے کبھی نہیں دی گئی تھی۔ دعوت میں موسیقی اور رقص و سرور کا بھی انتظام کیا گیا تھا اور درجنوں کے حساب سے باوردی ملازم ادھر سے ادھر بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ یہ ریانس خاندان تھا جو بے حد مالدار تھا۔

''ریانس۔'' خالہ جین نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کون ہیں یہ لوگ۔ میں تو انہیں بالکل نہیں جانتی۔ کہاں سے آئے ہیں یہ لوگ۔''

خالہ جین کا شک صحیح نکلا نہ جانے وہ کون لوگ تھے اور کہاں سے آئے تھے۔ بڑا گم نام سا خاندان تھا' مگر کاروباری اور بے حد مالدار۔

''لیکن.....!'' خالہ جین بولیں۔ ''اب بے چاروں نے کیا سوچ کر اتنا زبردست اہتمام کیا ہے۔ ان کی دعوت میں آخر کون آئے گا۔''

''سب لوگ آئیں گے۔'' انہیں بتایا گیا۔ ''ہر ایک نے ان کا دعوت نامہ قبول کر لیا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک یادگار دعوت ہوگی۔''

جب خالہ جین نے اس عظیم الشان دعوت کو انتہائی کامیاب دیکھا تو ان کی نفرت انتہا کو پہنچ گئی۔ ان کے پڑوس میں ایک گم نام اور تھرڈ کلاس کاروباری لوگوں نے یہ ہنگامہ بپا کیا تھا۔ سارے علاقے میں ان کی دھوم مچ گئی تھی اور یہ محض خالہ جین کی غلطی کی وجہ سے ہوا تھا۔ ایسی قابل تقلید مثال تو انہیں قائم کرنا چاہیے تھی۔ یہ محض ان کا حق تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ ان کے سے اعلیٰ خاندان کی موجودگی میں ایک گم نام اور نو دولتیا خاندان سبقت لے جاتا اور علاقے بھر میں شہرت حاصل کر لیتا۔ کئی دن تک خالہ جین تنہائی میں سوتے جاگتے خود سے جھگڑتی رہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ شہرت صرف ان کا حق تھی۔ صرف انہیں اس علاقے میں مشہور و معروف ہونا چاہیے۔ وہ ریانس خاندان سے کسی طور بھی کم نہیں تھیں' پھر بھلا ان سے یہ شکست کیسے برداشت کر سکتی تھیں۔ ان کی خاندانی حمکنت اور غرور انہیں رات دن بے چین کیے ہوئے تھا۔ ان کے دل و دماغ میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ وہ چپ نہیں کر سکی تھیں' لیکن اب خاموش بھی نہیں رہ سکتی تھیں۔

آخر انہوں نے ایک فیصلہ کر ہی لیا' اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ! جس کے بعد وہ اس علاقے میں اپنے اعلیٰ خاندان کی کھوئی ہوئی عزت بہ حال کر سکتی تھیں۔ وہ ریانس خاندان سے بھی زیادہ بڑی اور عظیم الشان دعوت دیں گی۔ وہ سوسائٹی میں پھر سے داخل ہوں گی اور دنیا کو دکھا دیں گی کہ اعلیٰ خاندان کی ایک عزت خاتون عمر رسیدہ ہونے کے باوجود بھی لوگوں کو

کس طرح محظوظ کر سکتی ہیں اور کس انداز میں جدید تہذیب کے تقاضے پورے کر سکتی ہیں۔ اگر یہ علاقہ ان کے خاندان کی عظمت پارینہ کو بھلا چکا ہے تو وہ اسے پھر سے یاد دلا دیں گی کہ وہ کیا تھیں اور لوگ چاہے کتنے ہی دولت مند کیوں نہ ہو جائیں' ان کے اعلیٰ خاندان کی برابری ہرگز نہیں کر سکتے تھے پھر فوراً ہی انہوں نے اپنے اس منصوبے پر عمل شروع کر دیا تھا۔

قدیم حویلی نما مکان پر دوبارہ رنگ و روغن شروع ہو گیا۔ اس کے ہر کمرے کو جدید ترین فرنیچر سے آراستہ کیا جانے لگا۔ مکان کی چاروں طرف بکھری ہوئی زمین پر رنگ برنگے پھولوں کی کیاریاں سجائی جانے لگیں اور سبز مخملیں دوب کی قالین کا اہتمام ہونے لگا۔ کھانے اور بینڈ کے لیے لندن کے سب سے بڑے ہوٹل کو آرڈر دے دیا گیا اور باوردی ویٹروں کی ایک فوج کی فوج کرائے پر حاصل کر لی گئی۔ وہ اپنے جمع شدہ خزانے کو پانی کی طرح بہا رہی تھیں۔ ہر چیز انتہائی شاندار اور بیش قیمت ہونا چاہیے' خرچہ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ یہ ان کے خاندان کی عزت کا سوال تھا' ان کے اعلیٰ وقار کی بحالی کا معاملہ تھا۔ دولت اگر ان کی آن بان دوبارہ اس علاقے میں قائم نہ کر سکی تو کس کام کی! انہوں نے ہر چیز کی ادائیگی کر دی تھی' پھر بھی ایک بڑی رقم رہ گئی جس کے لیے انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اسے پابندی سے زندگی بھر ادا کرتی رہیں گی مگر دعوت میں کمی کسی چیز کی نہ رہے اور نہ ہی کوئی چیز ذرا بھی کم تر درجے کی ہو۔

آخر کار وہ تاریخی رات آ گئی جو خالہ جین کی زندگی کی اہم ترین رات تھی۔ ڈرائیوے کو دو میل تک رنگین قمقموں سے سجایا گیا تھا۔ ہال اور سیڑھیاں رنگ برنگے گل دستوں اور گملوں سے مزین تھے جن کی خوشبو سے فضا مہک رہی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل کو آئینے کی طرح چمکنا اور چمک دار ہو رہا تھا۔

خالہ جین شاہانہ لباس میں بیش قیمت خاندانی جڑاؤ زیورات سے لدی پھندی بڑے وقار اور غرور سے سیڑھیاں اتر کر بال روم کے دروازے پر پہنچیں تو لندن کے مشہور ترین بینڈ نے تعظیماً سر جھکایا اور افتتاحی دھن چھیڑ دی۔

خالہ جین بال روم کے دروازے پر کھڑی ہوئی مہمانوں کا انتظار کرتی رہیں وقت گزرتا رہا۔ ملازم ایک دوسرے کی طرف کن انکھیوں سے دیکھنے لگے۔ موسیقاروں نے تین مرتبہ دھنیں بدلیں اور بڑے جوش و خروش سے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہے۔ خالہ جین اپنا شان دار لباس پہنے مہمانوں کا انتظار کرتی رہیں۔ رات کے گیارہ بج گئے' پھر بارہ اور ساڑھے بارہ! آخر تھک کر وہ بینڈ کی طرف مڑیں اور ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر دیا۔ ''مہربانی کر کے آپ لوگ جائیں اور کھانا کھا لیں۔'' وہ بولیں۔ ان کے لہجے میں بڑی شائستگی تھی ''اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔''

پھر وہ اسی وقار سے سیڑھیاں چڑھ کر اپنی خواب گاہ میں پہنچیں اور اپنے اسی شان دار لباس میں بستر پر لیٹ گئیں۔ پھر تین دن تک ان کے منہ سے کسی نے ایک لفظ بھی نہیں سنا۔ وہ ایک چلتی پھرتی لاش کی طرح تھیں۔ آخر چوتھے روز وہ بڑی خاموشی کے ساتھ اس جہان فانی سے سدھار گئیں۔

پھر ان کی موت کے چند دنوں بعد یہ راز کھلا کہ وہ دعوت کے اہتمام اور اسے انتہائی شاندار اور تاریخی بنانے میں اس قدر کھوئی ہوئی تھیں کہ لوگوں کو دعوت نامے بھیجنا بالکل بھول گئی تھیں۔

تعارف

حسن علی خان

وہ ابھی گفتگو کر رہی تھیں کہ ایک مردانہ آواز نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تمہارے کولہے کی ہڈی ٹوٹنے پر بہت افسوس ہے مسز ہینڈرسن! تمہارے فلو کے بارے میں سن کر بھی میرا دل ڈوبا جا رہا ہے مسز پیٹرا مگر کیا ہی بہتر ہوتا کہ اب تم دونوں خاموش ہو جاتیں اور مجھے گفتگو کرنے دیتیں۔ میں رنگ کرتا ہوں تو تمہاری لائن مل جاتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے چھکنا بند کر دوں۔“

غیر ملکی ادب سے ایک دلچسپ تحریر

مسز ہینڈرسن نے ٹیلی ویژن کا سوئچ آف کر دیا اور کتاب کھول لی۔ ان کے کولھوں کی تکلیف بعض اوقات اتنی بڑھ جاتی تھی کہ وہ رات کو سو نہیں پاتی تھیں‘ تاہم رات کو دیر تک جاگنا اب ان کا معمول بن گیا تھا۔ پھر بھی وہ صبح اٹھنے پر کسل مندی کا شکار نہیں ہوتی تھیں۔ رات میں جب ہر طرف خاموشی چھا جاتی تھی تو وہ کیڑے مکوڑوں کی ہلکی ہلکی آوازوں سے لطف اندوز ہوتی رہتی تھیں۔

خواتین عموماً رات کو خوف زدہ ہو جاتی ہیں مگر مسز ہینڈرسن کو تاریکی سے بالکل خوف نہیں معلوم ہوتا تھا۔ مسز پیٹر ان کی ہاں صفائی ستھرائی کا کام کرنے آتی تھی۔ سرِشام جب مسز ہینڈرسن اپنی خواب گاہ میں چلی جاتی تھیں تو وہ اپنے گھر روانہ ہو جاتی تھی۔

مسز ہینڈرسن جب تنہائی محسوس کرتی تھیں تو ٹیلی فون پر اپنی بیٹی نٹالی یا بیٹے جیمس سے گفتگو کرنے لگتی تھیں۔

آج جب کہ وہ کتاب کے اوراق پلٹ رہی تھیں تو ان کا دھیان ٹیلی فون کی طرف لگا ہوا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ فون کی گھنٹی بجے اور وہ فوراً ریسیور اٹھا لیں تاکہ اس جوڑے کی گفتگو سن سکیں جو گزشتہ ایک ہفتے سے عشق کے آزار میں مبتلا تھا۔ ایک ہفتہ پیشتر ان کے فون کی گھنٹی اتفاقاً بج اٹھی تھی۔ مسز ہینڈرسن نے ریسیور اٹھایا تو معلوم ہوا کہ ایک جوڑا رومانی گفتگو میں مصروف ہے اور انکا فون غلطی سے مل گیا ہے۔ اخلاقی طور پر یہ معیوب سی بات تھی مگر مسز ہینڈرسن تنہائی کا شکار تھیں اس لیے ان کی گفتگو بجتی تھی‘ وہ کوئی آواز پیدا کیے بغیر ریسیور اٹھا لیتی تھیں۔ اس جوڑے کی گفتگو سننا اب ان کا معمول بن گیا تھا۔

پہلی رات ریسیور اٹھانے پر انہیں عورت کہتی ہوئی سنائی دی تھی۔ ”پال! وہ اوپری منزل پر سو رہا ہے۔ میں اس وقت تنہائی محسوس کر رہی تھی اس لیے میں نے تمہیں فون کیا تھا۔“

”مگر میں تمہیں تاکید کر چکا ہوں کہ جب تمہارا شوہر گھر پر موجود ہوا کرے تو فون نہ کیا کرو۔“ پال نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے‘ وہ تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لے اور معاملہ بگڑ جائے۔“

وہ باتیں اتنی اہم نہیں تھیں کہ مسز ہینڈرسن ان میں دلچسپی لیتیں۔ وہی عام سی باتیں تھیں۔ میاں بیوی کی ناآسودہ زندگی اور بیوی کا دوسرے آدمی کی طرف مائل ہو جانا‘ ساتھ رہنے کی قسمیں کھانا اور زندگی بھر نہ بچھڑنے کا وعدہ کرنا وغیرہ! لیکن مسز ہینڈرسن کو وقت گزاری کا ایک اچھا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ جب بھی فون کی گھنٹی آہستہ سے بجتی‘ وہ ریسیور اٹھا لیتیں۔

مسز ہینڈرسن کی زندگی بہت سپاٹ اور سادہ گزری تھی۔ کم سنی میں ان کی شادی ہو گئی اور انہوں نے گھریلو ذمے داریاں سنبھال لیں۔ محبت کے نام پر شوہر کا ہلکا سا التفات ملا۔ پھر وہ بچوں میں مصروف ہو گئیں۔ شوہر کی موت کے بعد زندگی ایک لگے بندھے ڈھرے پر چلنے لگی اور انہوں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا۔ اس رومان سے انہیں کبھی واسطہ نہیں پڑا جو ناولوں اور فلموں میں ہوتا ہے اس لیے اس جوڑے کی گفتگو انہیں بہت سنسنی خیز اور دلچسپ معلوم ہوئی۔ جیسے جیسے پال اور ملی کا رومان زور پکڑتا گیا‘ ان کی دلچسپی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

ملی کو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ وہ اپنے شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی دولت پر بھی قبضہ کرنا چاہتی تھی۔ ایک روز اس نے پال سے کہا۔ ”ابھی تو دور تک اس کا امکان نہیں ہے کہ وہ مجھے طلاق دے اور اگر میں اس سے طلاق لوں گی تو مجھے اس دولت میں سے ایک ڈائم بھی نہیں ملے گا۔ پھر یہ کہ وہ بہت صاف ستھری زندگی بسر کر رہا ہے‘ میں اس کے کردار کی طرف انگلی بھی نہیں اٹھا سکتی۔“

”تب پھر ہمیں اس کا کوئی دوسرا حل تلاش کرنا ہوگا۔“ پال نے گمبھیر آواز میں کہا۔

ان کی گفتگو ختم ہوئی تو مسز ہینڈرسن کا دل عجب انداز میں دھڑکنے لگا۔ وہ ننھی بچی نہیں تھیں کہ دوسرے حل کا مطلب نہ سمجھ پاتیں۔

☆☆

پیر کے روز وہ مسز پیٹر سے گفتگو کر رہی تھیں تو ایک عجیب بات ہوئی۔

مسز پیٹر بیمار تھی اور صفائی کرنے نہیں آ رہی تھی اسی لیے وہ فون پر معذرت کر رہی تھی۔

''کوئی بات نہیں۔'' مسز ہینڈرسن خوش دلی سے بولیں۔ ''میں اتنی معذور نہیں ہوں کہ اپنی جگہ سے ہل جل بھی نہ سکوں۔ میں کھانا وغیرہ تو پکا لیتی ہوں۔ رہا صفائی کا مسئلہ تو ایک دو روز اگر صفائی نہ بھی ہو تو کوئی حرج نہیں۔ تم پریشان نہ ہو۔''

''کم از کم رات میں آپ ضرور کسی کو اپنے ساتھ ٹھہرالیں۔'' مسز پیٹر بولی ''آپ ہنگامی ضرورت کے تحت اپنے بستر سے نہیں اٹھ سکتیں اس لیے کہ آپ کے کولھے کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے۔''

''گھر کا تمام کام ختم ہونے کے بعد ہی میں اوپر خواب گاہ میں جاتی ہوں اور یہاں بھی ضرورت کی تمام چیزیں موجود رہتی ہیں اس لیے میں نہیں چاہتی کہ کسی اور کو ساتھ ٹھہرنے کی زحمت دی جائے۔''

''پھر بھی کسی کا ساتھ رہنا بہتر ہے۔'' مسز پیٹر نے اصرار کیا۔

''میں اپنے پوتے کو آپ کے گھر کی چابی دے کر مسز ٹیکر کے پاس بھیج رہی ہوں۔ مسز ٹیکر آپ کے مکان کی عقبی گلی میں رہتی ہیں اور میری سہیلی ہیں۔ اگر کبھی کسی چیز کی ضرورت پڑے تو آپ بے دریغ انہیں فون کر لیجیے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' مسز ہینڈرسن بولیں۔ ''ضرورت پڑنے پر میں انہیں بلالوں گی۔ میرا خیال ہے کہ ایک بار پہلے میں ان سے ملاقات کر چکی ہوں۔''

وہ ابھی گفتگو کر رہی تھیں کہ ایک مردانہ آواز نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تمہارے کولھے کی ہڈی ٹوٹنے پر بہت افسوس ہے مسز ہینڈرسن! تمہارے فلو کے بارے میں سن کر بھی میرا دل ڈوبا جا رہا ہے مسز پیٹر! مگر کیا ہی بہتر ہوتا کہ اب تم دونوں خاموش ہو جاتیں اور مجھے گفتگو کرنے دیتیں۔ میں رنگ کرتا ہوں تو تمہاری لائن مل جاتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے چہکنا بند کر دو۔''

مسز ہینڈرسن کا دل اچھل کر حلق میں آ رہا۔ وہ پال کی آواز تھی۔ انہوں نے معذرت کر کے ریسیور رکھ دیا۔ یہ چیز ان کے لیے سوہان روح بن گئی کہ پال بھی ان سے متعارف ہو گیا تھا۔ اس کے علم میں بھی یہ بات آ گئی تھی کہ جب وہ فون کرتا ہے تو مسز ہینڈرسن کے فون سے بھی لائن مل جاتی ہے۔ اس روز مسز ہینڈرسن بہت مضطرب رہیں اور چیزوں کو خوامخواہ الٹتی پلٹتی رہیں۔

اس رات جب فون کی گھنٹی بجی تو مسز ہینڈرسن نے نہ چاہتے ہوئے بھی ریسیور اٹھالیا۔ ملی کہہ رہی تھی۔ ''پال! مجھے ڈر لگ رہا ہے' کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔''

''تمہیں وہی کرنا پڑے گا ملی جو میں نے تم سے ملاقات ہونے پر کہا تھا۔'' پال نے ٹھوس آواز میں کہا۔ ''مگر اس بات کا تذکرہ فون پر نہ کرو۔''

''ٹھیک ہے مگر تم اس موضوع پر بات نہیں کرو گے تو میں کوئی منصوبہ نہیں بنا سکوں گی۔'' ملی نے جواب دیا۔

پال نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ''اس موضوع پر سوچتی رہو اور صرف ملاقات ہونے پر گفتگو کرو۔ فون پر یہ موضوع چھیڑنا مناسب نہیں ہے۔''

پھر وہ اپنی رومان انگیز باتوں میں محو ہو گئے۔ مسز ہینڈرسن اضطراب میں مبتلا ہو گئیں۔ پال اور ملی کا منصوبہ واضح تھا کہ وہ اپنے راستے کی دیوار گرا دینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بے چینی سے سوچا کہ کاش وہ کسی طرح ملی کے شوہر کو خبردار کر سکتیں۔

یہ ناممکن تھا اور اب ایک ہی صورت رہ جاتی تھی کہ وہ پولس کو مطلع کر دیتیں۔ وہ انتظار کرنے لگیں کہ پال اور ملی کا رابطہ ختم ہو تو وہ پولس اسٹیشن کے نمبر ڈائل کریں۔

ریسیور کان سے لگائے ہوئے انہوں نے تکیے سے ٹیک لگانا چاہی تو پانی کا فلاسک ہاتھ لگنے سے زمین پر گر پڑا۔ ہلکا سا دھماکا ہوا اور فلاسک چکنا چور ہو گیا۔

مسز ہینڈرسن کا ہاتھ ریسیور پر منجمد ہو گیا۔ انہیں یقین تھا کہ اس جوڑے نے بھی فلاسک ٹوٹنے کی آواز سنی ہو گی اور اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگائی ہو گی کہ کوئی تیسری ہستی بھی ان کی آواز سن رہی ہے۔

وہ دونوں خاموش ہو گئے تھے۔ پانچ منٹ تک لائن بے جان رہی' پھر پال نے بھاری آواز میں کہا۔ ''مسز ہینڈرسن! میں جانتا ہوں کہ تم ہماری گفتگو سن رہی تھیں۔ بہتر ہو گا کہ اب ریسیور رکھ دو اور آنکھیں بند کر کے سو جاؤ۔''

مسز ہینڈرسن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کی بجائے ملی نے کانپتی ہوئی آواز میں اپنے محبوب سے پوچھا۔ ''تت..... تمہیں اس کا نام کیسے معلوم ہوا پال۔''

''میں نے صبح اسے مسز پیٹر سے گفتگو کرتے سنا تھا۔'' پال نے جواب دیا۔ ''میری لائن اس کی لائن سے مل جاتی ہے۔''

مسز ہینڈرسن خود پر قابو نہ رکھ سکیں اور دہاڑتی ہوئی بولیں۔ ''میں جانتی ہوں کہ تم دونوں کیا منصوبہ بنا رہے ہو! بہتر ہو گا کہ یہ خیال چھوڑ دو ورنہ میں پولس کو مطلع کر دوں گی۔''

''اوہ مسز ہینڈرسن! تمہارے کولھے کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے اور تمہارا دماغ بھی کم زور ہو چکا ہے۔ تم اوڑھ لپیٹ کر سو جاؤ۔ ہم کوئی غلط منصوبہ نہیں بنا رہے ہیں۔ تمہیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔''

انداز فکر

☆ قدرت کو زبان کی سختی پسند نہیں اسی لیے زبان میں ہڈی پیدا نہیں کی گئی۔

☆ دوست سے اس وقت بچو جب وہ تمہاری تعریف کرنے لگے۔

☆ عورت سب سے اچھا اور آخری آسمانی تحفہ ہے۔ تحریر ایک خاموش زباں اور قلم اس کی زباں ہے۔

☆ بے کار ہے وہ وعدہ جو پورا نہ کیا جائے۔

☆ کتنا حسین ہے وہ تخیل جو انسان کے دل سے تنہائی کا احساس مٹا دے۔

مسز ہینڈرسن نے سوچا کہ وہ کوئی جواب نہ دیں۔ دونوں پر یہ تاثر پڑے گا کہ وہ ان کی گفتگو نہیں سن رہیں۔

مسز ہینڈرسن' ریسیور کان سے لگائے ان کی گفتگو سنتی رہیں۔ وہ اب بے پروائی سے متبادلہ خیال کر رہے تھے اور انہیں ان کی پروا نہیں تھی۔

''ملی!'' پال کہہ رہا تھا۔ ''جاؤ اور یہ چھوٹا سا کام کر ڈالو' مگر اس سے پہلے ریسیور کو میز پر رکھنا بھولنا ورنہ وہ عورت پولس سے رابطہ قائم کر لے گی۔''

''میں کیا کروں۔'' ملی نے کانپتی آواز میں سوال کیا۔

مسز ہینڈرسن نے ریسیور' کریڈل پر ڈال دیا۔ اب ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ رینگتی ہوئی پڑوس میں جائیں اور ان کا دروازہ کھٹکھٹا کر درخواست کریں کہ وہ پولس کو فون کرنا چاہتی ہیں۔

آہستہ آہستہ وہ ہمت کر کے بستر سے

اٹھیں۔ کولھے کی ہڈی ابھی صحیح طور پر اپنی جگہ نہیں بیٹھی تھی اور تھوڑی سی بے احتیاطی سے کھسک سکتی تھی۔

کولھے کی چوٹ کی بنا پر ٹانگیں کم زور ہو چکی تھیں اس لیے جب انہوں نے مجروح ٹانگ پر زور ڈالا تو ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ گھٹتی ہوئی گئیں اور الماری کھول کر اپنا کوٹ، ہینگر پر سے اتارنے لگیں۔ ابھی وہ اس کوٹ کی آستینوں میں ہاتھ ڈال رہی تھیں کہ انہوں نے نچلے ہال میں ایک آہٹ سنی۔ یہ کسی چوہے یا کیڑے کی آواز نہیں ہو سکتی تھی۔

ان کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ یقیناً کوئی شخص ہال میں داخل ہوا تھا۔ انہوں نے قدموں کی چاپ محسوس کر لی تھی۔

کوئی تختہ چرچرایا اور ہال اس کی آواز سے گونج اٹھا۔ شاید وہ شخص دروازے سے ڈائننگ روم تک آ گیا تھا۔ مسز ہینڈرسن نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس بے ساختہ چیخ کو روکا جو خواب گاہ میں زلزلہ پیدا کرنے والی تھی۔

اس شخص سے بچنے کی کوئی راہ نہیں تھی۔ اگر وہ خواب گاہ سے نکلنے کی کوشش کرتیں تو وہ آدمی فوراً ان پر حملہ آور ہو جاتا۔ یقیناً وہ پال تھا اور ان کی زندگی کا چراغ گل کرنے آیا تھا۔ انہوں نے سوچا۔

وہ لنگڑاتی ہوئی اپنے بستر کے قریب پہنچ گئیں۔ آئینے پر نگاہ پڑی تو محسوس ہوا کہ ان کے شانوں پر کسی اور کا سر رکھا ہوا ہے، منہ کھلا ہوا اور آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئیں! انہوں نے بستر کے سرہانے سے اپنی بیساکھی اٹھالی اور اسے یوں اٹھالیا جیسے خطرے کے وقت اسے حملہ آور پر دے ماریں گی۔

انہوں نے اس لمحے کو کوسا جب انہوں نے ٹیلی فون پر ان دونوں کی گفتگو سن لی تھی۔ پھر وہ اس جوڑے کے ایک ناپاک منصوبے سے آگاہ ہو گئیں اور پال ان کی جان کا لاگو ہو گیا۔ اب وہ انہیں ٹھکانے لگانے آ پہنچا تھا۔

انہوں نے جھپٹ کر ریسیور اٹھایا اور ڈائل پر انگلیاں گھمائیں مگر پولیس اسٹیشن سے رابطہ قائم نہ ہوا۔ لائن ہر بار کٹ جاتی تھی۔

دفعتہً خواب گاہ کے دروازے پر دستک ہوئی اور مسز ہینڈرسن کا جسم ساکت ہو گیا۔ پال اگر نوجوان اور طاقت ور تھا تو خواب گاہ کا دروازہ بہ آسانی توڑ سکتا تھا۔

ایک بار پھر دستک ہوئی اور آواز آئی۔

''مسز ہینڈرسن! خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں مسز ٹیکر ہوں۔ آپ کی خواب گاہ میں روشنی دیکھ کر میں ادھر آ گئی تھی۔ اس خیال سے کہ شاید آپ کو میری ضرورت ہو۔ مسز پیٹر نے مجھے آپ کے گھر کی چابی بھجوادی ہے۔''

''اوہ خدا کا شکر ہے۔'' مسز ہینڈرسن نے سرگوشی کی اور دروازے کے قریب جا کر اس کا بولٹ گرا دیا۔ انہوں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''مسز ٹیکر! ایک آدمی میری جان کا لاگو ہو رہا ہے۔ وہ کسی بھی لمحے میرے مکان میں داخل ہو سکتا ہے۔ بہر حال اب تم آ گئی ہو تو کوئی خطرہ نہیں۔ ہم مل کر اس کا مقابلہ کر لیں گے۔''

دروازہ کھلا اور مسز ٹیکر اپنے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ سجائے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی مسکراہٹ مسز ہینڈرسن کو بے حد عجیب لگی اس لیے کہ اس کے ہاتھ میں ریوالور بھی دبا ہوا تھا جس کا رخ انھی کی طرف تھا۔

''مسز ٹیکر تم!'' مسز ہینڈرسن حیرت سے بولیں۔

''ہاں میں!'' بھورے بالوں والی عورت نے ریوالور کے ٹریگر پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی خادمہ، ملی ٹیکر۔''

داؤ

کبیر احمد صدیقی

وہ رونالڈ کے ساتھ ہو کر کھیلنے بیٹھا تو اس کا ذہن
انہی پانچ ہزار ڈالروں میں الجھا ہوا تھا۔
رونالڈ نے جب یہ محسوس کیا کہ
اس کی توجہ کھیل پر نہیں ہے تو اس نے چونک کر پوچھا۔
''اے چارلی! کیا بات ہے۔ تم کچھ کھوئے کھوئے سے لگ رہے ہو۔''

عیر ملکی ادب سے ایک دلچسپ تحریر

گھنٹی کی کرخت آواز سنتے ہی چارلی بیدار ہو گیا۔ بستر سے پاؤں لٹکا کر اس نے سر کے بالوں کو پیچھے کیا اور آنکھیں ملنے لگا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی دوسری بار بجی تو وہ اس کی طرف لپکا۔

اس روز بدھ تھا اور رونالڈ اس کے ساتھ باغ میں پوکر کی ایک بازی لگانے والا تھا۔ پوکر کی ایسی بازیاں لگانا رونالڈ کا معمول تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی نہ بجتی تو چارلی ایک معقول رقم جیتنے سے محروم رہ جاتا۔

اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ ''ہیلو..... ہیلو۔''

''پاپا! میں رتھ بول رہی ہوں۔''

''اوہ رتھ!'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔ وہ اس کی واحد اولاد تھی۔ ''کہو کیا بات ہے۔''

''جیکسن نے آج مجھے مختلف یونیورسٹیوں کا لٹریچر دکھایا ہے۔ وہ ان میں سے کسی ایک میں داخلہ لینا چاہتا ہے اور اس کا انتخاب اس نے مجھ پر چھوڑا ہے۔''

''پھر۔''

''پاپا! تمہیں تو علم ہی ہے کہ میں اسے پسند کرتی ہوں' مگر وہ ایک گودام میں ملازمت کرتا ہے اور اس کی آمدنی زیادہ نہیں ہے۔ اگر وہ مزید تعلیم حاصل کرلے گا تو اسے کوئی مناسب ملازمت مل جائے گی۔'' اس نے چند لمحوں کے توقف کے بعد دوبارہ کہا۔ ''پاپا! کیا تم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اسے یونیورسٹی میں داخلہ دلوا دو گے۔''

''میں نے۔''

''ہاں۔ وہ کہہ رہا ہے' جب اس نے گریجویشن کرلیا تھا اور تم اس سے ملاقات کرنے گزشتہ سال آئے تھے تو تم نے اسے یونیورسٹی میں داخلہ دلانے کا وعدہ کیا تھا۔''

چارلی نے اپنے ذہن پر زور دیا تو اسے یاد آیا کہ اس نے گزشتہ سال جیکسن سے اس کے مستقبل کے بارے میں پوچھا تھا کیونکہ رتھ اور وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ جیکسن نے اس سے یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا خیال ظاہر کیا تھا تو اس نے سرسری کہہ دیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں اس کی ہر ممکن مدد کرے گا۔

''اچھا اچھا' میں سوچوں گا۔'' چارلی نے اکتاتے ہوئے جواب دیا۔ ''مگر دیکھو' اسے ابھی کچھ نہ بتانا ورنہ وہ میرے متعلق اچھی رائے قائم نہیں کرے گا۔''

''لیکن یونیورسٹی کی چھ ماہ کی فیس اور داخلے وغیرہ کے لیے کم از کم پانچ ہزار ڈالروں کی ضرورت پڑے گی بابا! اتنی رقم کا تم کہاں سے بندوبست کرو گے۔''

''کہیں نہ کہیں سے کرلوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔'' چارلی نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

رہ رہ کر یہ خیال اسے کچوکے لگانے لگا کہ وہ پانچ ہزار ڈالر کا کہاں سے بندوبست کرے گا۔ وہ پشن پر زندگی گزار رہا تھا اور قصابوں کی کالونی میں ایک بدبودار فلیٹ میں رہ رہا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ جیکسن سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے میں ناکام رہے گا' تاہم اسے اپنی پوری کوشش کرنا تھی کیوں کہ اس میں رتھ کے مستقبل کا سوال تھا۔ دنیا میں دولت کی کمی نہیں تھی' اسے صرف پانچ ہزار ڈالر کا بندوبست کرنا تھا۔

وہ رونالڈ کے ساتھ پوکر کھیلنے بیٹھا تو اس کا ذہن انہی پانچ ہزار ڈالروں میں الجھا ہوا تھا۔ رونالڈ نے جب یہ محسوس کیا کہ اس کی توجہ کھیل پر نہیں ہے تو اس نے چونک کر پوچھا۔ ''اے چارلی! کیا بات ہے۔ تم کچھ کھوئے کھوئے سے لگ رہے ہو۔''

''میں ایک الجھن کا شکار ہوں۔'' چارلی نے گوٹ پھینکتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا میں تمہاری کوئی مدد کرسکتا ہوں۔''

''یقیناً مجھے پانچ ہزار ڈالر بہ طور قرض دے دو۔''

''کیا تم سنجیدہ ہو۔'' رونالڈ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔''

''میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں' مگر اس میں ایک قباحت ہے۔ کسی دوست کو قرض نہیں دینا چاہیے۔ ہم گزشتہ دو سال سے دوست ہیں۔ میں ہر بدھ کو تم سے پوکر کھیلنے آتا ہوں لیکن تمہیں اتنی بڑی رقم دے دوں گا تو تم ادا نہیں کرسکو گے اور نتیجتاً منہ چھپاتے پھرو گے۔''

چارلی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''چلو اس قصے کو چھوڑو۔ میں بھی دوستی ختم کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے صرف یہ بتا دو کہ تمہاری زندگی اتنے ٹھاٹ سے کیسے گزر رہی

ہو۔''

رونالڈ کی آنکھوں سے حیرت ظاہر ہوئی۔

چارلی نے زہریلی ہنسی میں کہا۔ ''اس طرح نہ دیکھو رونالڈ! تم ایک شراب خانے میں معمولی سے بارٹینڈر ہو۔ تمہیں قلیل سی آمدنی ہوتی ہے' پھر اتنی پرتکلف زندگی کیسے بسر کرتے ہو۔''

''یہ کوئی راز کی بات نہیں ہے۔'' رونالڈ نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''لوگ مجھے اپنا ہمدرد جان کر اپنے دل کی بات مجھ سے کہہ دیتے ہیں۔''

''معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو!'' چارلی نے بے زاری کا مظاہرہ کیا۔

''اچھا اس موضوع کو ختم کرو اور پوکر کھیلو۔''

''جہنم میں گیا کھیل!'' چارلی نے ساری گوٹیں ایک طرف لڑھکا دیں۔ ''میں کسی بھی صورت میں پانچ ہزار ڈالر چاہتا ہوں اور صرف تمہی وہ طریقہ بتا سکتے ہو جس سے میں اتنی رقم حاصل کرسکتا ہوں۔''

''سنو۔'' رونالڈ بولا۔ ''میں اطلاعات خریدتا اور فروخت کرتا ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' چارلی بولا۔

''میں بارٹینڈر ہوں۔ لوگ میرے قریب کھڑے ہوکر شراب پیتے ہیں اور نشے میں کچھ نہ کچھ بک دیتے ہیں۔ میں ان کی اطلاعات سے فائدہ اٹھاتا ہوں اور متعلقہ آدمیوں تک وہ اطلاع پہنچا کر چھوٹی سی رقم حاصل کرلیتا ہوں۔ اس میں میاں بیوی کے جھگڑے بھی ہوتے ہیں اور پولیس کے معاملات بھی۔''

''اس لین دین سے تمہیں بڑی رقم ہاتھ آتی ہے۔'' چارلی نے سوال کیا۔

''نہیں تو' مگر ایسی بہت سی اطلاعات جمع ہوجاتی ہیں تو ان کو فروخت کرنے سے معقول رقم بن جاتی ہے۔'' اس نے توقف سے کہا۔ ''اب لوگوں نے اسے اپنے لیے بھی آمدنی کا وسیلہ بنا لیا ہے۔ اگر کسی کے پاس کوئی مفید اطلاع ہوتی ہے تو وہ مجھ سے سودے بازی کرلیتا ہے۔''

''میں اب بھی نہیں سمجھا!'' چارلی نے کہا۔

''مثال کے طور پر اس جوڑے کو لے لو۔'' رونالڈ نے قریب کی میز پر موجود ایک جوڑے کی طرف اشارہ کیا۔ ''تمہارے آنے سے پہلے میں ان کے قریب منڈلا رہا تھا۔ آدھے گھنٹے تک ان کے قریب رہنے سے مجھے کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ اول یہ کہ مرد کا نام پال ہے اور وہ میکملن ایڈورٹائزنگ کمپنی میں کام کرتا ہے۔ اس کے اطوار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کا وفادار نہیں ہے۔ اب میں اس کی بیوی کو پیش کش کروں گا کہ میں اس کے شوہر کی سراغ رسانی کرسکتا ہوں تو وہ مجھے کچھ نہ کچھ دے دے گی۔''

''یہ تو بہت آسان ہے۔'' چارلی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''اس میں تو میرا کچھ خرچ

انداز فکر

☆تعلیم نے آبادی کی ایک بہت بڑی تعداد کو پڑھنے کے قابل تو بنا دیا لیکن یہ تمیز نہیں دی کہ کون سی چیز پڑھی جائے۔ (ٹریویلین)

☆میرے آباؤ اجداد برہمن تھے انہوں نے اپنی عمریں اسی سوچ میں گزار دیں کہ 'خدا کیا ہے۔؟' میں اپنی زندگی اس سوچ میں گزارنا چاہتا ہوں کہ انسان کیا ہے۔ (علامہ اقبال)

☆تاریخ ہمیشہ یہ تو بتاتی ہے کہ فلاں جنگ میں مردوں نے اتنا خون بہایا یہ کون بتائے کہ عورتوں نے کس طرح اپنے سہاگ اجاڑے۔ (نذرالاسلام)

☆اگر چڑیاں متحد ہوجائیں تو شیر کی کھال کھینچ سکتی ہیں۔ (شیخ سعدی)

ہی نہیں ہوگا' بس تھوڑی سی چرب زبانی سے کام لینا پڑے گا۔''

''ایسا نہ کہو۔'' رونالڈ بولا۔ ''بعض اوقات معاملہ خطرناک بھی ہو جاتا ہے۔ ایک ہفتہ پہلے میں نے پولس کو ایک بدمعاش کے بارے میں اطلاعات فراہم کی تھیں اور ان سے خطیر رقم لی تھی۔ میرے خیال میں تم نے اس بدمعاش کے بارے میں پڑھا ہوگا۔ اس کا نام فرینکی میلون تھا۔ اس نے ایک دکان دار کو ہلاک کر دیا تھا اور پھر آرکنساس میں جا کر چھپ گیا تھا۔ میں نے پولس کو بتا دیا کہ وہ کس جگہ موجود ہے۔ پولس نے اسے چوہے کی طرح گرفتار کر لیا۔ اب وہ جیل میں ہے اور مجھے یقین ہے کہ اسے بجلی کی کرسی نصیب ہوگی۔''

''اس میں کیا خطرناک بات ہے۔'' چارلی نے سوال کیا۔

''لکی میلون' فرینکی میلون کا بڑا بھائی ہے اور ایک بڑے گروہ کا سرغنہ ہے۔ اگر اسے معمول ہو جائے کہ فرینکی کی مخبری میں نے کی ہے تو۔''

''میں سمجھ گیا۔'' چارلی جلدی سے بولا۔ ''مگر میں ایسے معاملات میں ہاتھ نہیں ڈالوں گا جس میں ریوالور نکلے یا خنجر کے دل میں پیوست ہونے کا احتمال ہو۔ میں تو بے ضرر سی معلومات کا سودا کروں گا۔''

''اچھا اب میں چلتا ہوں۔'' رونالڈ بولا۔ ''آئندہ بدھ کو ملاقات ہوگی۔ اس وقت تک تم اس کاروبار میں قدم جمانے کی کوشش کرو۔ میں بھی تمہاری رہ نمائی کروں گا۔''

''اوکے۔'' چارلی نے اس سے ہاتھ ملایا۔

اس روز چارلی نے تھوڑی سی رقم جیت لی تھی' اس لیے شراب کی دو بوتلیں خرید لیں۔ اپنے فلیٹ پر پہنچ کر اس نے شراب کی پہلی بوتل کھولی تو پانچ ہزار ڈالر کا ہندسہ اسے دوبارہ ڈسنے لگا۔ رتھ کا مستقبل اسے تاریکی میں ڈوبتا دکھائی دیا۔ اس کے حلق سے شراب اتر رہی تھی اور انگلیوں میں پھنسا ہوا سگار آدھا ہو چکا تھا مگر کوئی ایسی ترکیب دماغ میں نہیں آ رہی تھی جس سے رقم کا بندوبست ہو سکے۔ رونالڈ کے کاروبار سے یک مشت اتنی بڑی رقم نہیں مل سکتی تھی۔

آدھی رات کے وقت دوسری بوتل بھی ختم ہو گئی تو وہ جھومتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے لڑکھڑاتے قدم ٹیلی فون کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ٹیلی فون ڈائریکٹری تپائی کے نیچے تھی۔ چارلی نے اسے نکالا اور ورق گردانی کرنے لگا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اسے مطلوبہ نمبر مل گیا تو اس نے ڈائل پر انگلیاں گھمائیں۔

رابطہ قائم ہو گیا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''یس میلون انکارپوریٹڈ۔''

میں چارلی بول رہا ہوں اور لکی میلون سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' چارلی بولا۔

اس نے خیالوں میں جیکسن کو یونیورسٹی جاتے اور ترقی کرتے دیکھا۔ وہ اور رتھ ہنس رہے تھے اور ہاتھوں میں ہاتھ دیے چلے جا رہے تھے۔

لکی میلون کی آواز سنائی دی تو اس نے کہا۔ ''میرے پاس چند قیمتی اطلاعات ہیں اور میں انہیں فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم مجھے پانچ ہزار ڈالر ادا کر دو تو میں یہ بتانے کو تیار ہوں کہ تمہارے بھائی فرینکی کی کس نے مخبری کی ہے اور کس طرح اس کی گردن پھنسوائی ہے۔''

ماضی کے فرار

کرم الٰہی

اس کی نگاہ پیلی رنگت والے ایک لمبے آدمی پر جم کر رہ گئی۔ اس آدمی کے ہونٹ جسم پر چھوٹے چھوٹے بال اگے ہوئے تھے اور اس کے نوکیلے دانت ہونٹوں سے باہر نکلے ہوئے تھے' ذاک خوفزدہ ہو گیا۔ وہ حیران تھا کہ خوابیدہ ہال سے اسے کہاں بھیج دیا گیا ہے۔ کہیں انہوں نے غلطی سے اسے کسی دوسری جگہ تو نہیں بھیج دیا۔

اس شمارے کے لیے ایک دلچسپ تحریر

برفباری میں شدت پیدا ہو گئی تھی۔

ذاک نے کپڑوں پر جمی ہوئی برف کو جھاڑا اور سڑک کی دائیں جانب بنی ہوئی عمارت کے صدر دروازے کے سائبان تلے کھڑا ہو گیا۔ جیل سے فرار ہونے میں اسے زیادہ دشواری نہیں ہوئی تھی۔ اس نے فرار کا منصوبہ بڑی ہوشیاری سے بنایا تھا۔

اچانک اسے چند آوازیں سنائی دیں اور وہ بری طرح چونک پڑا۔ سامنے ہی چند پولیس مین شکاری کتوں کے ہمراہ اس کی تلاش میں چلے آ رہے تھے۔ خوف کی ایک سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی۔

گیارہ سال جیل میں گزارنے کے بعد دوبارہ جیل کی چار دیواری میں لوٹ جانے کا تصور بے حد خوفناک تھا۔ اس نے قریب آتے ہوئے کتوں کو دیکھا اور پھر دوڑتا ہوا ایک ایسی عمارت

کے صدر دروازے میں داخل ہو گیا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

یہ عمارت خوابیدہ ہال کہلاتی تھی' جہاں مستقبل میں جانے کے خواہشمندوں کو بلا معاوضہ منجمد کیا جاتا تھا۔

یہ ایک تجرباتی خوابیدہ ہال تھا جس کے تمام اخراجات حکومت برداشت کرتی تھی۔

ڈاک نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا اور پھر خوابیدہ ہال کے ڈائریکٹر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد دو آدمی اسے اسٹریچر پر اٹھائے خوابیدہ ہال کی طرف لے جا رہے تھے۔

☆☆

گیارہ سال پیشتر اس نے جم کارٹر کو قتل کر دیا تھا۔ کارٹر تیس سال کا ایک دراز قد اور خوب رو جوان تھا۔ وہ میکسیکو سے آیا تھا اور اس نے نیویارک میں ہیرے' جواہرات کی ایک بہت بڑی دکان کھولی تھی۔

ان دنوں مارتھا پر اصلی ہیروں کا نیکلس پہننے کا جنون طاری تھا۔ جب وہ دونوں 'کارٹر جیولرز' کے شان دار شوروم میں داخل ہوئے تو کارٹر اپنے آفس میں سے نکل رہا تھا۔ اس نے حسین مارتھا کو دیکھا تو سیلز مین کو ہٹا کر خود اس کی جگہ کھڑا ہو گیا۔ مارتھا باوقار انداز میں چلتی ہوئی کاؤنٹر کی طرف بڑھ رہی تھی اور ڈاک دل ہی دل میں اسے کوس رہا تھا۔

''فرمایئے۔'' کارٹر نے کہا اور احتراماً گردن کو خم دے کر مسکرانے لگا تھا۔ ''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

''یہ میری بیگم ہیں۔'' ڈاک نے نرم آواز میں کہا۔ ''یہ اصلی ہیروں کا نیکلس خریدنا چاہتی ہیں۔''

''خوب۔'' وہ مسکرایا۔ ''تشریف آوری کا شکریہ۔ اتفاق سے میرے پاس اصلی ہیروں کے چند ایسے نیکلس موجود ہیں' جو یقیناً آپ کی حسین و جمیل بیوی کی پسند پر پورے اتریں گے۔''

مارتھا کے رخساروں پر سرخی نظر آنے لگی۔ غالباً اسے نوعمر جوہری کا انداز گفتگو پسند آیا تھا۔

کارٹر نیچے جھک گیا۔ اس نے شوکیس سے ایک ٹرے نکال کر مارتھا کی طرف بڑھا دی۔ اس ٹرے میں نیکلس جگمگا رہے تھے۔ مارتھا بے اختیار ان پر جھک گئی۔ ہیروں کی چمک نے اس کی آنکھیں چندھیا دی تھیں۔ اس کے لیے کسی ایک نیکلس کا انتخاب کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

''میرا خیال ہے' یہ نیکلس بہتر رہے گا۔'' ڈاک نے کہا۔ اس نے اپنی بیوی کی الجھن کو محسوس کر لیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک نیکلس پر انگلی رکھ دی۔ مارتھا چونک کر اس نیکلس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''لاجواب انتخاب ہے جناب۔'' کارٹر نے کہا۔ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ ''لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کی بیگم کے لیے تین ہیروں والا نیکلس بہتر رہے گا۔''

مارتھا نے چونک کر کارٹر کی طرف دیکھا اور اس کے ہاتھ سے تین ہیروں والا نیکلس لے لیا۔ نیکلس کو گلے میں ڈال کر قد آدم شیشے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ منفرد ساخت کا یہ نیکلس واقعی ایک نادر چیز تھی۔ مارتھا کی آنکھوں میں پسندیدگی کے تاثرات پیدا ہوئے۔

وہ نیکلس پہنے ہوئے باوقار انداز میں گھوم کر کارٹر کی طرف دیکھنے لگی۔

''چار لاکھ پچاس ہزار ڈالر مادام۔'' کارٹر نے اس کی آنکھوں کا مفہوم سمجھتے ہوئے کہا۔ ''یہ قیمت صرف آپ کے لیے ہے' خاتون۔''

ڈاک نے جھرجھری سی لی اور آگے بڑھ کر کاؤنٹر کا سہارا لیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے جوہری اس کی جیب سے اتنی بڑی رقم نہیں بلکہ اس کے جسم سے بڑی مقدار میں خون نکالنا چاہتا ہو۔ وہ ایک اداکار تھا۔ دو سال پیشتر یہ رقم اس کے لیے زیادہ

اہم نہیں تھی لیکن اب کئی فلموں کی مسلسل ناکامی کے بعد اس کا مستقبل تاریک ہو گیا تھا اور چار لاکھ پچاس ہزار ڈالر کی رقم اس کے لیے اچانک بہت بڑی رقم بن گئی تھی۔

اس نے ایک نظر مارتھا کے گلے میں جگمگاتے ہوئے نیکلس پر ڈالی اور چپ چاپ جیب سے چیک بک نکال کر چیک بنانے میں مصروف ہو گیا۔ مارتھا کی خوشی اسے بے حد عزیز تھی اس لیے وہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

''تھینک یو۔'' کارٹر نے ایک نظر چیک کو دیکھا اور اسے کاؤنٹر کے نیچے رکھ دیا۔ مارتھا فخر سے گردن اکڑائے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

''میری طرف سے' آپ کی خدمت میں' ایک حقیر سا تحفہ۔'' کارٹر نے کہا اور شوکیس سے ایک انگوٹھی نکال کر ٹرے میں ڈال دی۔ انگوٹھی میں ایک بیش قیمت ہیرا جگمگا رہا تھا۔

''کیا مطلب۔'' ڈاک نے کہا اور کارٹر کو گھورنے لگا۔

''میرا مطلب واضح ہے جناب۔'' کارٹر نے چاپلوسی سے کہا۔ ''میں آپ کی بیگم کو یہ انگوٹھی تحفتاً پیش کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ دوبارہ بھی خدمت کا موقع دیں گے۔''

''کیا واقعی۔'' مارتھا کی آنکھیں حیرت اور بے یقینی سے پھیل گئیں۔ غالباً اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی جوہری اتنی قیمتی انگوٹھی محض تحفے میں بھی دے سکتا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر انگوٹھی ٹرے سے اٹھائی اور اسے اپنے دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں ڈال لیا۔

ڈاک کا جی چاہا کہ وہ مارتھا کو یہ تحفہ قبول کرنے سے سختی کے ساتھ منع کر دے لیکن وہ کسی نا معلوم وجہ کے تحت خاموش رہا۔

مارتھا نیکلس اور انگوٹھی پہن کر کسی ننھی سی بچی کی طرح خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔

''بہت بہت شکریہ..... مسٹر۔'' مارتھا نے کہا۔ اس کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی۔

''کارٹر۔'' کارٹر نے مارتھا کو تعریفی نگاہ سے گھورتے ہوئے کہا۔

''جم کارٹر۔''

''آپ ایک عمدہ انسان ہیں' مسٹر کارٹر۔'' مارتھا نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ کسی روز ہمارے گھر تشریف لائیں تو ہماری عزت افزائی ہو گی۔''

''مجھے' آپ سے دوبارہ مل کر خوشی ہو گی۔'' کارٹر نے کہا اور مسکرانے لگا۔

مارتھا نے اسے اپنا ایڈریس دیا اور اٹھلاتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ کارٹر نے دروازے سے باہر نکلتی ہوئی حسین مارتھا کو ایک نظر دیکھا اور پھر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

شام کی چائے پر کارٹر کی موجودگی ایک معمول بن گئی تھی۔ ڈاک نے محسوس کیا کہ چند دنوں سے مارتھا کے رویے میں کچھ تبدیلی آ گئی ہے۔ اس کی تمام توجہ کارٹر کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ ڈاک کو اس بدلے ہوئے انداز پر افسوس تھا لیکن اس نے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا بلکہ خاموشی سے اس کا یا پلٹ کا جائزہ لیتا رہا۔

ایک روز اسے اسٹوڈیو میں دیر ہو گئی۔ اس نے ٹیلیفون پر مارتھا کو بتایا کہ اسے شوٹنگ کی وجہ سے رات بھر اسٹوڈیو میں رہنا پڑے گا۔

ڈاک' اسٹوڈیو میں بیٹھا ہیروئین کا انتظار کر رہا تھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ڈاک نے آگے بڑھ کے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے پروڈیوسر جھلائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''شوٹنگ ملتوی کر دی جائے۔ ہیروئین کی طبیعت ناساز ہو گئی ہے۔''

اس نے زیر لب ہیروئین کی شان میں ایک لمبا قصیدہ پڑھا اور ریسیور کریڈل پر رکھ کر اسٹوڈیو سے باہر نکل آیا۔

وہ گھر پہنچا تو گیٹ بند تھا اور مارتھا کی خواب گاہ روشن تھی۔ رات کے اس پہر خواب گاہ میں روشنی دیکھ کر اسے حیرت ہوئی مارتھا سونے سے پہلے روشنی بجھا دیا کرتی تھی۔ وہ گیٹ کھول کر الجھن آمیز نگاہوں سے مارتھا کی خواب گاہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا..... ممکن ہے کہ مارتھا کو تنہائی میں نیند نہ آئی ہو اور وہ اس وقت کوئی ناول پڑھ رہی ہو۔ ناول دلچسپ ہو تو وہ عموماً اسے ختم کر کے ہی سویا کرتی تھی۔

چاروں طرف گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور گیٹ پر چڑھ کر اندر کود گیا۔ اس نے اطلاعی گھنٹی نہیں بجائی تھی۔ اس کے ذہن میں مارتھا کا بدلا ہوا رویہ تھا..... اور وہ سوچ رہا تھا کہ شاید اس کی کوئی خاص وجہ سامنے آجائے۔

وہ دبے قدموں چلتا ہوا مارتھا کی خواب گاہ تک پہنچا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور آواز پیدا کیے بغیر کمرے میں داخل ہو گیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے حیرت اور صدمے کا شدید جھٹکا لگا۔ مارتھا اور کارٹر ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔

یہ منظر دیکھ کر ڈاک کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر آتش دان پر رکھا ہوا بھاری گلدان اٹھایا اور.....!

اس کی بند پلکوں میں ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی اور پھر اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔

جاگنے کے بعد اسے اپنے جسم میں کسی خاص تبدیلی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ ضرورت سے زیادہ سونے کے بعد بیدار ہوا ہو..... اور جسم میٹھے میٹھے درد میں جکڑا ہوا ہو۔

''جاگ گیا ہے۔'' اسے بیدار ہوتے دیکھ کر کسی نے کہا۔ یہ ایک زرد رو آدمی تھا۔ وہ ڈاک کو بیدار ہوتے دیکھ کر قریب کھڑی ہوئی عورت سے مخاطب ہوا تھا۔

ڈاک نے آنکھیں کھولتے ہی چاروں طرف دیکھا۔

اس کی نگاہ پیلی رنگت والے ایک لمبے آدمی پر جم کر رہ گئی۔ اس آدمی کے پورے جسم پر چھوٹے چھوٹے بال اگے ہوئے تھے اور اس کے نوکیلے دانت ہونٹوں سے باہر نکلے ہوئے تھے' ڈاک خوفزدہ ہو گیا۔ وہ حیران تھا کہ خوابیدہ ہال سے اسے کہاں بھیج دیا گیا ہے۔ کہیں انہوں نے غلطی سے اسے کسی دوسری جگہ تو نہیں بھیج دیا۔

''میں..... میں کہاں ہوں۔'' اس نے بے چینی سے غور کیا۔ ''کیا انسان تبدیل ہو کر موجودہ شکل اختیار کر گیا ہے۔''

خوف اس کے رگ و پے میں اترنے لگا تھا لیکن قریب کھڑی ہوئی چمکدار یونیفارم میں ملبوس عورت کو دیکھ کر اس کے دل کی بے ترتیب گئی۔ چھوٹے چھوٹے بال اس عورت کے جسم پر بھی موجود تھے۔ اس کی ناک بہت چھوٹی تھی لیکن وہ بھدی اور بدنما نہیں نظر آرہی تھی۔ اسے دیکھ کر نفرت یا کراہیت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

''تمہیں خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔'' یونیفارم میں ملبوس عورت نے نرمی سے کہا اور اس پر جھک گئی۔ ''میرا نام' کی ہے اور میں میڈیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ کی سربراہ ہوں۔ تمہارا ریکارڈ ہمارے پاس اب تک محفوظ ہے۔''

وہ خاموشی سے اس عورت اور زرد رو آدمی کو گھورتا رہا۔

''تمہارا نام برنارڈ ڈاک ہے نا۔''

''نہیں۔'' ڈاک نے فوراً ہی اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام اسمتھ ہے۔ ہیرالڈ اسمتھ۔'' اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''تمہارے منجمد ہونے کے چند ہی لمحے بعد کچھ آدمی تمہیں تلاش کرتے ہوئے خوابیدہ ہال تک پہنچ گئے تھے۔'' عورت نے مسکراتے ہوئے

کہا۔ ''ان کا تعلق ایف آئی بی سے تھا۔ انہوں نے تمہارے نام کی تصحیح کی اور خوابیدہ ہال کے عملے کو تفصیل سے ہدایات دی تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ جیل سے فرار ہونے کے باوجود تم پولیس سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ وہ لوگ لیون ورتھ سے خوابیدہ ہال تک بڑی آسانی سے پہنچ گئے تھے لیکن خوش قسمتی سے اس وقت تک تمہیں منجمد کیا جا چکا تھا۔ منجمد کیے ہوئے آدمی کو وقت سے پہلے ہوش میں لانا خطرناک ہوتا ہے۔ اس لیے پولیس نے خوابیدہ ہال کے عملے کو ہدایت کی تھی کہ تم جیسے ہی جاگو تمہیں اسی وقت گرفتار کر لیا جائے۔''

''پکڑا گیا۔'' ڈاک نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''دو ہزار سال کا سفر کرنے کے بعد بھی میں جیل سے محفوظ نہیں ہوں۔'' اس کی آواز بھرا گئی مایوسی سے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

اس نے جیل سے فرار ہونے کے بعد خوابیدہ ہال کے عملے کو دھوکا دیا تھا۔ اپنا اصلی نام بتانے کی بجائے اس نے ایک فرضی شخصیت کے سہارے سے خود کو رضاکارانہ طور پر منجمد کرنے کے لیے پیش کر دیا تھا۔ چونکہ اس تجرباتی ہال کو ایسے رضاکاروں کی شدید ضرورت تھی جو مستقبل میں جانے کے لیے آمادہ ہوں۔

اس نے ایک طویل سانس لی اور زرد رو آدمی کی طرف دیکھا یہ آدمی' عورت سے قدرے مختلف اور سخت گیر نظر آتا تھا۔ اس کے جسم پر جو رواں تھا اس میں کھردرے پن کی جھلک تھی جبکہ عورت کے بال ملائم تھے۔ اس نے بغور عورت کی طرف دیکھا۔ عورت نے زیور نام کی کوئی چیز نہیں پہن رکھی تھی۔ ڈاک کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا زمانے نے واقعی اتنی ترقی کر لی ہے کہ عورتیں زیورات سے بے نیاز ہو گئی ہیں۔

عورت اسے عجیب نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ اس کے چہرے پر تجسس کے تاثرات تھے اور آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔ غالباً وہ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھی۔

ڈاک کو ایک ٹب سے نکال کر بستر پر لٹا دیا گیا تھا۔ وہ ٹب اس وقت بھی کمرے ہی میں موجود تھا۔ اسے یاد آیا کہ خوابیدہ ہال میں' منجمد کرنے سے پہلے بھی اس کا جسم ایک ایسے ہی ٹب میں رکھا گیا تھا' پھر اس ٹب میں گاڑھا سیال بھرنے لگا تھا۔ اس سیال میں حیرارت نہیں تھی بلکہ اسے عجیب سی خنکی کا احساس ہوا تھا اور پھر جسم سُن ہونے لگا اس کی آنکھیں بھاری ہونے لگی تھیں۔ یہ بات ڈاک کے ذہن میں محفوظ نہیں تھی کہ ٹب پہلے لبالب بھر گیا تھا یا اس پر غنودگی طاری ہوئی تھی۔

''مسٹر ڈاک.....'' عورت نے اسے مخاطب کیا۔

وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ عورت اس پر جھکی ہوئی تھی مرد خاموش اور بے حس و حرکت

مشورہ

لڑکیوں کی الجھنیں اور پریشانیاں دور کرنے کے مشورے دینے والی خاتون سے ایک نوجوان لڑکے نے پوچھا۔ ''کیا آپ لڑکوں کو بھی مشورے دیتی ہیں۔؟''

جواب ملا: ''نہیں میں صرف لڑکیوں کو مشورے دیتی ہوں۔''

سوال کیا: ''لڑکوں کو مشورے کیوں نہیں دیتیں۔؟''

''اگر میں لڑکوں کو مشورے دینا شروع کر دوں تو ساری لڑکیاں کنواری رہ جائیں گی۔''

کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

''تم جیل میں کتنے دن رہے تھے۔'' عورت نے سوال کیا۔

''گیارہ سال۔'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''یہ ایک طویل مدت ہے اگر میں جیل سے فرار نہ ہوتا تو شاید پاگل ہو گیا ہوتا۔''

چھوٹی ناک والی عورت ہنسنی لگی۔ غالباً اسے ذاک کی اس بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

''کیا تمہیں یقین نہیں آیا کہ میں.....!''

''نہیں' یہ بات نہیں۔'' عورت نے کہا۔ ''میں جیل اور جیل میں رہنے والوں کے بارے میں ایک ذہنی خاکہ تیار کرنا چاہتی تھی۔''

ذاک خاموش رہا۔ وہ حیران تھا کہ اب اسے کن حالات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس وقت وہ ۳۹۹۸ء میں سانس لے رہا تھا۔ وہ اپنی صدی سے کتنے ہزار سال آگے نکل آیا تھا' اس کا اندازہ لگانا ذاک کے لیے بہت مشکل تھا۔

''تم نے یہ اندازہ کیسے لگا لیا کہ تمہیں دوبارہ جیل بھیج دیا جائے گا۔''

ذاک خاموش رہا..... لیکن وہ پرامید نگاہوں سے عورت کی طرف دیکھنے لگا۔ عورت نے بھی شاید اس کی پریشانی بھانپ لی تھی۔

''نہیں نہیں۔'' عورت نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر ذاک تمہارے زمانے کے مقابلے میں اب دنیا بہت بدل چکی ہے۔ اب یہاں جرم ہوتے ہیں اور نہ ہی سزائیں دی جاتی ہیں۔ پولیس جج۔ مقدمے' جیل اب ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ اب سرے سے جیل کا وجود ہی نہیں ہے۔'' ذاک نے پوچھا۔

''ہاں' اب کوئی جیل نہیں ہے۔ مسٹر ذاک' آخر کار تمہیں چھٹکارا مل ہی گیا۔ تمہارے تمام جرائم معاف کر دیے گئے اور تم اس دنیا کے باقاعدہ شہری ہو۔ تمہیں وہ تمام مراعات اور حقوق حاصل ہوں گے جو دوسروں کو حاصل ہیں۔''

عورت نے اسے ایک کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری شہریت کا نمبر ۵۱۷۸ ٹی' آر۔ ۴۵۸۹۔ ۸۰ ہے یہ شناختی کارڈ تم کو ہر وقت اپنے پاس رکھنا پڑے گا اور یونیفارم کی پشت پر بھی نمبر کم از کم چار انچ لمبے حروف میں لکھوانا پڑے گا۔ ہم نے تمہارے لیے یونیفارم کا انتظام کر دیا ہے اور اب تم جس وقت چاہو یہاں سے جا سکتے ہو۔ خدا حافظ' مسٹر ذاک۔ میں تمہیں اس دنیا میں خوش آمدید کہتی ہوں۔''

ایک گھنٹے بعد وہ مستقبل کے اس ہال کمرے میں نکلا۔ سڑکوں پر بے شمار لوگ تھے۔ ہر ایک یونیفارم پہنے ہوئے تھا جس کی پشت پر اس کا نمبر درج تھا۔ وہ حیران و پریشان ادھر سے ادھر گھوم رہا تھا کہ یکا یک زور زور سے گھنٹی بجنے لگی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آسمان سے گھنٹی کی آواز سنائی دے رہی ہو۔ سب لوگ تیز تیز ایک سمت میں دوڑنے لگے۔

''یہ کیا ہے۔ یہ گھنٹی کیسی ہے۔'' وہ بوکھلا کر ہر شخص سے پوچھنے لگا لیکن بدحواسی میں کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ آخر میں ترس کھا کر ایک آدمی نے اسے بتایا کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے اور سب لوگ اس مقام کی طرف جا رہے ہیں جہاں کھانا تقسیم کیا جائے گا۔

ذاک کا منہ حیرت سے کھل گیا اور اس کے چہرے پر زردی پھیل گئی وہ ماضی کی جیل سے فرار ہو کر مستقبل کے ایک ایسے قید خانے میں پہنچ چکا تھا۔ جس کی دیواریں نہیں تھیں اور وہاں ہر قیدی شہری کہلاتا تھا جسے ایک مخصوص نمبر بھی دیا گیا تھا..... بالکل ماضی کے قیدیوں کی طرح۔ وہ زیر لب اپنا نمبر دہرانے لگا۔

''۵۱۷۸ ٹی' آر۔ ۴۵۸۹۔ ۸۰''

میٹھی آگ

ایس اے ہاشمی

نیلم کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔
حالات نے اسے زندگی کی
کس نازک موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔
کیا اس کی قسمت میں الم ہی لکھ دیے گئے ہیں۔
اسے خوشی بھی ملتی تھی تو نوحے کی صورت میں
اس کی زندگی کا عنوان درد و الم سے رقم کیا گیا تھا۔ قسمت اس سے کیسا مذاق کر رہی تھی۔

اس شمارے کے لیے ایک دلچسپ و معاشرتی تحریر

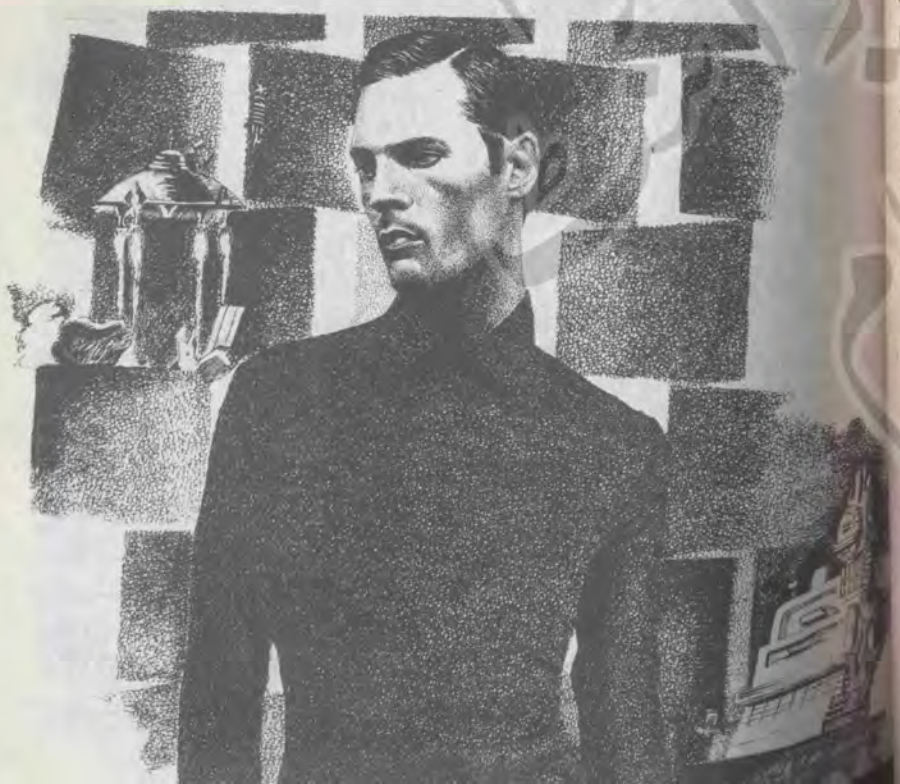

رحمان صاحب شام کو تھکے ہارے گھر پہنچے تو بیگم نے حسب معمول گرم چائے کی پیالی لاکر سامنے رکھی۔ انہوں نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور بیگم کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ”کیا بات ہے آج کچھ خوش خوش دکھائی دے رہی ہو۔“

”بری لگ رہی ہے میری خوشی۔“ بیگم رحمان سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے بولیں۔ ان کے لہجے میں مصنوعی خفگی تھی۔

”ارے یہ بات نہیں ہے۔“ رحمان صاحب گڑبڑا گئے۔

”بات یہ ہے کہ میں نے ایک عرصے کے بعد تمہارے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی ہے۔“

”ہاں آج میں بہت خوش ہوں۔“ بیگم رحمان جذباتی انداز میں بولیں۔ ”آج دوپہر ڈاکیہ خط دے گیا ہے۔ کل ہماری بیٹی نیلم دارالحکومت سے واپس آرہی ہے۔ ہم پورے ایک سال بعد اسے دوبارہ دیکھ سکیں گے۔“

”نیلم۔“ رحمان صاحب کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔ ان کے چہرے پر افسردگی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی اور ذہن کے کسی گوشے میں تلخ یادیں جاگ اٹھی تھیں۔

جمشید نگر دارالحکومت سے کوئی سوسوا سو میل کے فاصلے پر ایک کوہستانی شہر تھا۔ پچاس ساٹھ سال پہلے تک اس کی حیثیت ایک اجاڑ بنجر کوہستانی گاؤں سے زیادہ نہیں تھی لیکن پھر ایک وقت ایسا آیا جب جمشید نگر نے ایک صنعتی شہر کی صورت اختیار کرلی۔

رحمان صاحب بہت پہلے قسمت آزمائی کے لیے جمشید نگر آئے تھے۔ احمد رضا مائننگ کمپنی میں ایک اوورسیر کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور ترقی کرتے کرتے انجینئر کے عہدے تک پہنچ گئے پھر تو وہ یہیں کے ہورہے۔ احمد رضا مائننگ کمپنی میں ان کی خاصی عزت تھی۔ جمشید نگر کی بیشتر آبادی کان کنی سے متعلق تھی۔ رحمان صاحب جس مائننگ کمپنی میں ملازم تھے۔ وہاں کا ماحول خاص طور پر بھائی چارے کا تھا۔ کمپنی سے متعلق تمام افراد ایک ہی خاندان کے فرد معلوم ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ کمپنی کے مالک احمد رضا بھی خود کو عملے سے الگ تصور نہ کرتے تھے۔ وہ عملے کے دکھ سکھ اور مختلف تقریبات میں پیش پیش رہتے تھے۔

صنعتی فضا اور پیشہ ورانہ ماحول کے دباؤ اور گھٹن کو کم کرنے کے لیے وہ اکثر ایک دوسرے کو مدعو کیا کرتے۔ ایسے ہی ایک موقع پر رحمان صاحب نے محسوس کیا کہ ان کی اکلوتی بیٹی نیلم کمپنی کے ایک ذمے دار افسر اور احمد رضا کے پرسنل سیکرٹری باقر کی طرف مائل ہے۔ تعلقات اور میل ملاپ اپنی جگہ لیکن رحمان صاحب کو یہ بات پسند نہ آئی۔ باقر اچھا افسر ضرور تھا لیکن اچھا آدمی نہیں تھا۔ اس کی شہرت بھی اچھی نہیں تھی۔ دفتر کے ساتھی کی حیثیت سے تو اسے گوارا کیا جاسکتا تھا لیکن انہیں یہ بات پسند نہ آئی کہ نیلم جوان کی اکلوتی اولاد تھی، باقر سے ربط وضبط بڑھائے۔

رحمان صاحب نے دبے الفاظ میں اپنی بیگم کو اس طرف توجہ دلائی کہ وہ نیلم کو اس پیش قدمی سے باز رکھے۔ بیگم رحمان نے شوہر کے کہے پر عمل کیا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ پانی سر سے اونچا ہوچکا ہے۔ نیلم کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ملاقاتیں جاری رہیں اور اب تو لوگوں نے انگلیاں اٹھانی شروع کردی تھیں۔ باقر وجیہہ آدمی تھا۔ اس کی شخصیت پرکشش تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ صنف نازک کی طرف متوجہ ہو اور وہ اس سے متاثر نہ ہو۔ نیلم بھی اسی سراب کا شکار ہوئی تھی۔ رحمان صاحب اور ان کی بیگم اس معاملے کو جنگل کی آگ کی طرح پھیلتے دیکھتے رہے لیکن لڑکی کی خودسری دیکھ کر مہر بہ لب رہے۔ وہ جوان لڑکی پر زیادہ دباؤ نہیں ڈال سکتے تھے۔ مبادا وہ بغاوت پر اتر آئے اور مزید کسی رسوائی کا سامنا کرنا پڑے۔

نیلم اور باقر کے تعلقات کو دیکھ کر انہیں

اندازہ تھا کہ ان کی اکلوتی بیٹی، باقر سے شادی کے لیے ان سے ضرور اصرار کرے گی۔ لیکن اس کے برعکس ایک عجیب بات ہوئی۔ نیلم نے یکا یک باقر سے ملنا جلنا بند کردیا۔ جب کہ باقر اس کے گرد منڈلاتا رہا۔ رحمان صاحب نے بیگم کے توسط سے، نیلم سے اس بدلی ہوئی صورت حال کو کریدنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہے۔ بہرحال انہیں خوشی ہوئی کہ دلدل میں پھنسنے سے پہلے ان کی بیٹی کو ہوش آگیا تھا۔ لیکن ان کی خوشی اس وقت کافور ہوگئی جب نیلم نے ارادہ ظاہر کیا کہ وہ اپنی ایک سہیلی کے پاس دارالحکومت جانا چاہتی ہے جہاں وہ تعلیم کا سلسلہ مزید آگے بڑھائے گی۔

رحمان صاحب کچھ زیادہ ترقی پسند آدمی نہ تھے۔ وہ لڑکیوں کے لیے میٹرک تک تعلیم کافی سمجھتے تھے جو نیلم نے جمشید نگر کے ہائی اسکول سے حاصل کرلی تھی۔ جمشید نگر میں کوئی کالج نہیں تھا نہ اس کی ضرورت سمجھی گئی تھی۔ دارالحکومت جانے کی ضد، دوسری ضد تھی جو نیلم نے کی تھی۔ رحمان صاحب شاید اس کے لیے کبھی راضی نہ ہوتے اگر ان کی بیگم نے یہ کہہ کر انہیں قائل نہ کرلیا ہوتا کہ اس طرح نیلم کی توجہ بٹ جائے گی اور باقر بھی اس کا پیچھا چھوڑ دے گا۔

یہ ایک سال پرانی بات تھی اور اب نیلم واپس آرہی تھی۔ رحمان صاحب کے لیے یہ بات بڑی مسرور کن تھی کہ باقر جمشید نگر میں موجود نہیں ہے۔ نیلم کے جانے کے کچھ ہی عرصے بعد وہ بھی ملازمت سے استعفادے کر کہیں چلا گیا تھا اور پھر اس کے بارے میں کوئی خبر موصول نہیں ہوئی تھی۔

☆☆

اگلے روز، رات کو رحمان صاحب، بیگم رحمان اور نیلم کھانے کی میز پر موجود تھے۔ رحمان صاحب کھانا کھاتے ہی اٹھ گئے تھے۔ میز پر ماں بیٹی تنہا رہ گئی تھیں۔ بیگم رحمان نے غور سے بیٹی کا جائزہ لیا۔ نیلم میں ایک سال کے عرصے میں کافی تبدیلی آگئی تھی۔ وہ دبلی اور زرد نظر آرہی تھی اس کے علاوہ گفتگو اور طور طریقے میں کچھ زیادہ سنجیدگی آگئی تھی۔ رحمان صاحب کی موجودگی میں کھل کر گفتگو نہیں ہوسکی تھی۔ رحمان صاحب نے بھی بس واجبی سی گفتگو کی تھی لیکن اب جب کہ وہ سونے کے لیے چلے گئے تھے، بیگم رحمان نے نیلم کو کریدنا شروع کیا۔ انہوں نے شفیق لہجے میں پوچھا۔ ”بیٹی! کیا تم نے اپنی تعلیم مکمل کرلی ہے۔“

”نہیں امی! آپ لوگوں سے دور رہ کر جی بالکل نہیں لگا۔ سال بھر خود کو پڑھائی کی طرف مائل کرتی رہی لیکن ناکام رہی۔ اب میرا یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔ گھر سے دور رہ کر پتہ چلا کہ گھر کیا ہوتا ہے اور کیسی کیسی نعمتیں اور آسودگی اپنے گھر میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔“

بیگم رحمان کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ نیلم اب گھر میں رہے گی۔ وہ مسرور لہجے میں بولیں۔ ”ٹھیک ہے بیٹی! جس کام پر دل مائل نہ ہو وہ نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی تمہارا گھر آباد ہوجائے گا۔ کوئی لڑکا.....“

”نہیں امی!“ نیلم چیخ پڑی۔ ”میں شادی نہیں کروں گی، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“

بیگم رحمان بیٹی کو حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگیں۔

”لیکن بیٹی!“ وہ قدرے توقف سے بولیں۔ ”کوئی لڑکی کب تک والدین کے سہارے زندگی بسر کرسکتی ہے۔ ایک نہ ایک دن تو اسے اپنا گھر بسانا ہی پڑتا ہے۔ یہی دنیا کی ریت ہے اس سے خاندان آگے بڑھتا اور پھلتا پھولتا ہے۔“

”لیکن امی میں نے کہہ دیا نا کہ شادی نہیں کروں گی۔ اس سلسلے میں کوئی کوشش نہ کی جائے۔“

”آخر کیوں۔“ بیگم رحمان کی حیرت اور الجھن بدستور قائم تھی۔

”اس لیے کہ میری شادی ہوچکی ہے۔“ نیلم

نے کہا اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔

بیگم رحمان کے لیے یہ انکشاف ایک دھماکے سے کم نہ تھا۔ وہ سن ہو کر رہ گئیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ نیلم والدین کی اجازت کے بغیر شادی کر بیٹھے گی۔ وہ دیر تک دم بخود بیٹھی رہیں پھر کانپتی ہوئی آواز میں بولیں۔ ”تم نے شادی کہاں اور کس سے کی ہے۔“

”یہیں!“ جمشید نگر میں اور باقر کے ساتھ۔“ نیلم سسکتے ہوئے بولی۔

”باقر کے ساتھ!“ بیگم رحمان بدحواس ہوگئیں۔ ”لیکن کب۔ تم تو دارالحکومت چلی گئی تھیں۔ اور تمہارے جانے کے بعد ہی باقر بھی ملازمت چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔“

”یہ ایک سال پہلے کی بات ہے امی!“ نیلم نے آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ اٹھا کر کہا۔ ”شادی کے بعد ہی میں دارالحکومت چلی گئی تھی۔“

”جب اس سے شادی کر ہی لی تھی تو دارالحکومت جانے کی کیا ضرورت تھی۔“ بیگم رحمان قدرے برہم ہوگئیں۔

”اب کیا بتاؤں امی! وہ میری غلطی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ والدین کا کہنا نہ ماننے اور من مانی کرنے کا کتنا بھیانک نتیجہ نکلتا ہے۔“ نیلم کا جسم شدت کرب سے کانپ رہا تھا۔ وہ ندامت، شرمندگی اور پچھتاوے کے کرب سے گزر رہی تھی۔

”لیکن یہ شادی ہوئی کس طرح۔“ بیگم رحمان نے گلوگیر لہجے میں پوچھا۔ ”تو نے ماں باپ تک کو ہوا نہ لگنے دی تو اتنی سنگ دل تو نہ تھی۔ تیرے باپ کو معلوم ہوگا تو ان کا کیا حال ہوگا۔ کیا یہ بات یہاں کے دوسرے لوگوں کو معلوم ہے کہ.....“

”نہیں امی کسی کو بھی نہیں معلوم۔ یہ خفیہ شادی تھی۔ یہ شادی جمشید نگر میں نہیں، رسول پور میں ہوئی تھی۔ نکاح کے وقت باقر کے چند دوست ہی موجود تھے۔ ہم صبح رسول پور گئے تھے۔ ہوٹل میں شادی ہوئی سہ پہر تک ہم وہاں تھے پھر غروب آفتاب کے وقت واپس آ گئے تھے۔“

بیگم رحمان کی حالت غیر تھی۔ وہ بہت مشکل سے خود کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ جی چاہتا تھا بیٹی کو دھنک کر رکھ دیں۔ مگر وہ ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ نیلم ان کی کمزوری تھی۔ کچھ دیر وہ ساکت و صامت بیٹھی رہیں جیسے مفلوج ہوگئی ہوں اور گویائی جاتی رہی ہو پھر کچھ دیر بعد سنبھلیں اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولیں۔ ”جب شادی کر ہی لی تھی تو پھر دارالحکومت جانے کی کیا تک تھی۔“

”یہ ایک دوسرا المیہ ہے۔“ نیلم کے چہرے کی زردی گہری ہوگئی اور آنکھوں سے افسردگی جھلکنے لگی۔ ”باقر پہلے سے..... شادی شدہ تھا۔“

”کیا!“ حیرت اور دکھ سے بیگم رحمان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ انہیں محسوس ہوا جیسے ان کی سانس رکی جا رہی ہو۔

”ہاں امی! نکاح کے بعد ہم نے ہوٹل میں قیام کیا۔ باقر زرادیر کے لیے غسل خانے میں گیا تو میری نگاہ اس کے کوٹ کی طرف اٹھ گئی۔ کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ جھانک رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر میں نے وہ لفافہ نکالا اور پڑھنے لگی۔ وہ خط اس کی بیوی کا تھا۔ اس کی بیوی سخت بیمار اور قریب المرگ تھی۔ اس نے لکھا تھا باقر اس کی خطاؤں کو معاف کر دے اور زندگی کی آخری سانسوں میں اس سے آ کر مل لے۔“

بیگم رحمان گم صم بیٹھی رہیں۔ نیلم دوبارہ بولنے لگی۔ ”خط پڑھتے ہی مجھ پر سکتہ سا طاری ہوگیا تھا۔ غسل خانے سے واپس آتے ہی میں نے وہ خط اس کے منہ پر مار دیا اور گھر واپسی آ گئی۔ اس نے بعد میں بڑی منت سماجت کی اور صفائیاں پیش کیں لیکن میرا دل ٹوٹ چکا تھا، میں اس سے برگشتہ ہو چکی تھی۔ میں ایک لمحے کو بھی اس کی شکل نہیں

دیکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ یہی بہتر جانا کہ ایک طویل عرصے کے لیے دارالحکومت چلی جاؤں۔ لیکن وہاں بھی دل نہ لگا۔“

”تمہارے جانے کے کچھ ہی دنوں بعد وہ کم بخت بھی ملازمت چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔“

”اب یہ ذکر چھوڑو امی۔ پیچھے کی طرف دیکھتی ہوں تو وحشت ہونے لگتی ہے۔ کچھ یہاں کا حال سناؤ۔“

”یہاں کا حال میں تمہیں لکھتی ہی رہی ہوں۔ کوئی خاص تبدیلی نہیں، سوائے اس کے کہ رضا صاحب کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہ تمہارے لیے نئی اور تعجب خیز بات ہوگی کہ مردہ بچے کی پیدائش کے بعد رضا صاحب کی بیوی کے جان کے لالے پڑ گئے۔ ضائع شدہ بچے کی پیدائش کا ان کے دل و دماغ پر برا اثر پڑا تھا۔ اور ڈاکٹر نے بھی کہہ دیا تھا کہ ان کے یہاں اب کسی بچے کی پیدائش نہ ہو سکے گی۔ رضا صاحب بیوی کی طرف سے بے حد پریشان تھے۔ وہ بیوی کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے لیکن اللہ بھی بڑا کارساز ہے۔ ایک صبح ایک بڑا خوب صورت شیر خوار بچہ ان کو دروازے پر کپڑے میں لپٹا پڑا ملا۔ بچہ پانے کے باوجود اگرچہ رضا صاحب کی بیوی نہ بچ سکیں لیکن رضا صاحب نے اس بچے کا سواگت اس طرح کیا جیسے وہ ان کا اپنا خون ہو۔ وہ بچے کو دیوانگی کی حد تک چاہتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ان کے گھر میں کوئی ایسا نہیں ہے جو صحیح طریقے سے بچے کی دیکھ بھال کر سکے۔ ملازمہ ہے لیکن وہ اپنی نفیس اور سلیقہ مند نہیں ہے جیسی رضا صاحب چاہتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے گھر شمشاد مائننگ کمپنی کے مالک شمشاد صاحب کی بیٹی رخشی آ جاتی ہے لیکن مستقل طور پر بچے کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی، رضا صاحب اس سلسلے میں بے حد پریشان ہیں۔ وہ اپنی مرحومہ بیوی کو بہت چاہتے تھے۔ ان کا شادی کا قطعی ارادہ نہیں ہے لیکن شاید بچے کی خاطر انہیں شادی کرنے پڑی اور اگر شادی کی تو رخشی ہی سے کریں گے کیوں کہ اس وقت وہی ان کے نزدیک ہے اور افواہ بھی کچھ اسی قسم کی گرم ہے۔ رخشی کافی چالاک اور چلتا پرزہ ہے۔ وہ رضا صاحب پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ انہیں کسی ایسی تعلیم یافتہ اور شائستہ عورت کی تلاش ہے جو بچے کی دیکھ بھال کر سکے۔ اس سلسلے میں وہ معقول مشاہرہ دینے کو تیار ہیں لیکن یہاں بات مشاہرے کی نہیں انسانیت کی ہے۔ میرا خیال ہے اس سلسلے میں تم ان سے جا کر مل لو۔ وہ نیک نفس آدمی ہیں۔ تمہارے ابو کے ان سے مالک اور ملازم سے ہٹ کر بھی تعلقات ہیں۔ میرا خیال ہے تمہارے ابو تمہارے اس اقدام سے خوش ہوں گے اور تمہاری مصروفیت کا ایک ذریعہ بھی ہو جائے گا۔ اگر اس اثنا میں کہیں اس کم بخت باقر کا پتہ چل گیا تو ہم رضا صاحب کے ذریعے زور ڈلوا کر تمہیں طلاق دلوا دیں گے۔ رضا صاحب اثر و رسوخ کے آدمی ہیں۔ باقر کو طلاق دیتے ہی بنے گی پھر اس کے بعد تم آزاد ہوگی۔ ایک نئی زندگی ایک نیا مستقبل تمہارے سامنے ہوگا۔“

جانے کب کا سیلاب تھا جو رکا ہوا تھا اور بیٹی کو سامنے پا کر پھٹ پڑا تھا۔ بیگم رحمان نے بولنا شروع کیا تھا تو بولتی ہی چلی گئی تھیں۔ وہ رکیں تو نیلم اپنی جگہ سے اٹھی اور ماں سے لپٹ کر رونے لگیں۔ بیگم رحمان نے بیٹی کو سینے سے بھینچ لیا اور سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ وہ بیٹی کی ساری کوتاہیاں اور لغزشیں معاف کر چکی تھیں اور انہیں یقین تھا کہ رحمان صاحب بھی ایک باپ کی حیثیت سے بیٹی کی خطاؤں کو درگزر کر دیں گے۔ اولاد کچھ ایسی ہی چیز ہوتی ہے۔ اسے پیدا تو کیا جا سکتا ہے۔ مارا نہیں جا سکتا۔ والدین وہ مقدس خالق ہوتے ہیں جو دم آخر تک اپنی تخلیق کی فکر رکھتے ہیں۔

☆☆

رضا صاحب نے بچے کی گورنس کی حیثیت

سے نیلم کا پرتپاک خیر مقدم کیا تھا۔نیلم کو رضا صاحب کی آبائی حویلی ماربل ہاؤس میں رہتے ہوئے پورا ایک مہینہ ہو چکا تھا۔اس مختصر عرصے میں بچہ حیرت انگیز طور پر اس سے مانوس ہو گیا..... وہ اکثر شام کو بچے کو لے کر باہر نکل جاتی اور دیر تک سیر کراتی۔کبھی کبھی وہ بچے کے ساتھ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے والدین کے گھر چلی جاتی۔رحمان رحمان صاحب اور بیگم رحمان بچے کو دیکھ کر بے حد خوش ہوتے۔آج بھی نیلم کا ارادہ بچے کو لے کر اپنے گھر جانے کا تھا۔وہ بچے کو تیار کر رہی تھی کہ دفعتاً عقب سے رضا صاحب کے قدموں کی آواز سنائی دی۔وہ نیلم سے مخاطب تھے۔"نیلم' دانیال اتنے کم عرصے میں تم سے اس قدر مانوس ہو گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے شاید اسے احساس ہے کہ تم اس سے بے پناہ پیار کرتی ہو۔"

نیلم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔اس نے مڑ کر دیکھا۔رضا صاحب دروازے پر کھڑے تھے۔جانے وہ کب سے کھڑے ہوئے تھے ان کے چہرے پر مخصوص دل کش مسکراہٹ تھی۔نیلم نے غور سے رضا صاحب کا جائزہ لیا۔نیلم کو وہ واقعی یاد آ گیا جب رضا صاحب بھرپور جوان ہوا کرتے تھے۔اس وقت وہ بہت پرمزاح اور بزلہ سنج ہوا کرتے تھے۔ان کی بزلہ سنجی اور..... خوش مزاجی سماجی حلقوں میں مشہور تھی۔وہ انی حاضر دماغی اور شگفتگی کی وجہ سے محفلوں کی جان بن جایا کرتے تھے لیکن وقت نے انہیں بہت کاری ضرب لگائی تھی۔بیوی کی بے وقت موت نے ان سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ان کے لبوں پر مسکراہٹ اب بھی آتی تھی لیکن اندر سے وہ مرجھا چکے تھے وقت نے ان کا جو چرکہ لگایا تھا اس کا ازالہ ممکن نظر نہیں آتا تھا۔نیلم نے بڑے دکھ سے سوچا کہ کاش رضا صاحب کے درد کا مداوا ہو سکتا۔رضا صاحب کے لیے دوسری شادی کر لینا ہی مناسب تھا۔خواہ شادی رخشی سے ہی کیوں نہ ہو۔اس طرح کم از کم ماربل ہاؤس کی بہاریں تو لوٹ آئیں گی۔سوتے در و دیوار تو جاگ اٹھیں گے۔

رضا صاحب دروازے پر کھڑے اس کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔نیلم نے پلکیں جھکا لیں اور حجاب آلود لہجے میں بولی۔"دانیال اتنا پیارا بچہ ہے کہ ہر کسی کو اس پر پیار آنے لگتا ہے۔" اس نے بچے کو چمٹا لیا۔

"تمہیں یہ معلوم ہی ہوگا کہ کس طرح یہ بچہ ہمیں ملا تھا۔میرا خیال تھا کہ اس بچے کی وجہ سے میری بیوی کی زندگی بچ جائے گی لیکن....." رضا صاحب کی آواز بھرا گئی۔"بہر حال مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس کی دیکھ بھال کی ذمے داری قبول کر لی ہے۔اس بچے کے لیے تم ماں کا بہترین نعم البدل ہو۔"

نیلم نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا اور بچے کے گرد بازوؤں کا حلقہ کستے ہوئے بولی۔"شکریہ۔"

"باہر شوفر تمہارا منتظر ہے۔" رضا صاحب نے کہا اور اپنے کمرے میں جانے کے لیے مڑ گئے۔

نیلم بچے کو لیے ہوئے اپنے کمرے سے نکل آئی۔پھر وہ ہال سے گزر کر برآمدے میں پہنچی تھی کہ کسی نے اسے قریب سے آواز دی۔نیلم اپنا نام اور مانوس لہجہ سن کر ٹھٹک گئی اور جب اس طرف دیکھا تو اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا..... محسوس ہوا۔

"باقر تم!" وہ آہستہ سے بولی پھر گھبرائی اور سہمی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

"ڈرو نہیں' آس پاس کوئی نہیں ہے اور یوں بھی ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔میں تمہارا شوہر ہوں۔" وہ نیلم کے قریب آتے ہوئے بولا۔

"میرے قریب مت آؤ۔اب میں تمہارا سایہ بھی اپنے قریب پھٹکنے نہیں دینا چاہتی۔" نیلم کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"اوہو' بہت زیادہ ناراض معلوم ہوتی ہو۔" باقر ڈھٹائی سے بولا۔"تم نے یہ تک نہیں پوچھا کہ تمہاری تلاش میں کہاں کہاں مارا مارا پھرا ہوں اور دوبارہ رضا صاحب کی ملازمت حاصل کرنے میں کتنی دشواری کا سامنا کرنا پڑا ہے۔"

"میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔تم ایک بے ضمیر آدمی ہو۔تم پہلے سے شادی شدہ تھے۔تمہاری بیوی بیمار اور قریب المرگ تھی لیکن تم نے مجھ سے یہ بات چھپائی۔تم جیسے بے حس انسان سے میں کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی۔"

"ناراض نہ ہو نیلم! میری بیوی مر چکی ہے۔اب ہم اپنی خوش گوار زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں۔" باقر خوشامد سے بولا۔

"میں کہتی ہوں نکل جاؤ یہاں سے' اب میرا تمہارا کوئی تعلق نہیں رہا۔" نیلم مشتعل ہو گئی۔اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔"تم جیسے مردوں کا کیا اعتبار۔آج ایک کا ہاتھ پکڑتے ہو کل دوسری کا۔اپنی مرحوم اور الم نصیب بیوی کا تذکرہ ایسے کر رہے ہو جیسے کوئی خوش خبری سنا رہے ہو۔کان کھول کر سن لو اب بھی میرے پاس آنے کی جرات نہ کرنا۔"

"شاید تم بھول رہی ہو کہ اب بھی میری بیوی ہو۔شرعی اور قانونی مجھے تم پر اختیار ہے۔" باقر کا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔"اب تک یہ بات ڈھکی چھپی ہے لیکن اب میں ہر ایک کو بتاؤں گا پھر دیکھوں گا تمہاری ضد اور انا کا کیا ہوتا ہے۔بہتر یہی ہے کہ میرے ساتھ یہاں سے چلی چلو۔مجھے دار الحکومت میں ملازمت مل جائے گی۔ہم وہاں آرام سے رہیں گے۔"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ جو غلطی میں کر بیٹھی ہوں' وہ سب کو معلوم ہو جائے۔تاکہ وہ یہ جان لیں کہ تم کتنے بڑے فریبی اور بے ضمیر آدمی ہو۔میں تم سے طلاق لوں گی۔میں تمہارے ساتھ زندگی بسر کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

"اگر ہمارا کوئی بچہ ہوتا تو تم ایسی باتیں نہ کرتیں۔" باقر بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب۔" نیلم چونک پڑی۔

"کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ مجھے تمہارے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔جب تم اچانک یہاں سے چلی گئیں تو میں بھی تمہاری تلاش میں نکل پڑا۔دار الحکومت میں بڑی مشکل سے ایک دواساز فیکٹری سے تمہارے بارے میں پتہ چلا۔وہیں سے معلوم ہوا کہ تم ماں بننے والی ہو اور ملازمت چھوڑ کر چلی گئی ہو۔میں نے فیکٹری سے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کیں اور تمہاری سہیلی سے بھی ملا۔اس نے بہت ٹالنا چاہا لیکن میں نے اس سے اپنے مطلب کی بات اگلوا ہی لی۔پھر میں یہاں آ گیا۔لیکن میں یہ پوچھے بغیر نہیں رہوں گا کہ میرا بچہ کہاں ہے۔"

"وہ..... وہ مر گیا۔" نیلم نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔یہ سوچتے ہوئے کہ وہ اپنے بچے کو مرا ہوا کہہ رہی ہے۔جب کہ بچہ اس کی بانہوں میں دبا ہوا تھا۔یہی اس کا اپنا بچہ تھا۔اپنا خون' اپنا جگر گوشہ۔

نیلم کے رگ و پے میں وہی تلخی عود کر آئی' جب اسے پتہ چلا تھا کہ باقر پہلے سے شادی شدہ ہے۔پھر باقر سے قطع تعلق کرنے کے بعد اس پر یہ ہولناک انکشاف بھی ہوا تھا کہ اس کا وہ مہینہ بے داغ گزرا تھا۔اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے کہ کیا کرے' کیا نہ کرے۔اب والدین کے پاس رہنے کا تصور بھی اس کے لیے سوہان روح بن چکا تھا۔اگر وہ اس وقت اپنی ماں کو سب کچھ بتا دیتی تو وہ اسے باقر ہی کی طرح دھتکار دیتیں اور باقر سے تو اسے جیسے چڑ سی ہو گئی تھی۔کچھ سوچنے سمجھنے کے لیے اس نے یہی بہتر جانا تھا کہ دار الحکومت میں اپنی ایک سہیلی کے پاس چلی جائے۔چنانچہ وہ حصول تعلیم کی آڑ لے کر سہیلی کے گھر پہنچ گئی۔وہاں پہنچ کر اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی کوکھ محض باقر سے نفرت کی

وجہ سے نہیں اجاڑے گی۔ اس سلسلے میں سہیلی نے بھی اس کی بھرپور مدد کی۔ وہ خود بیوہ تھی اور ایک دوا ساز فیکٹری میں کام کر کے اپنے دو بچوں کی پرورش کر رہی تھی۔ اس کی کوششوں سے اسے فیکٹری میں ملازمت مل گئی۔ چند ماہ بعد ہی وہ نازک گھڑی سر پر آ گئی۔ عین وقت پر اس نے ملازمت چھوڑ دی اور تخلیق کا مرحلہ بحسن وخوبی طے ہو گیا۔

وہ سخت پریشان تھی۔ اس طرح بچے کو چھپائے ہوئے وہ ماں باپ سے کب تک دور رہ سکے گی اور جب اچانک والدین پر حقیقت حال کا انکشاف ہو گا تو کیا وہ یہ صدمہ سہار سکیں گے۔ انھی سوچوں نے اس کی راتوں کی نیند اڑا دی تھی۔ وہ اعصابی اضمحلال کی شکار ہو گئی تھی۔ کیا کرے کیا نہ کرے۔ ایک جائز اور اپنا بچہ مسئلہ بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ انھی دنوں اس کی امی کا خط آیا تھا۔ دیگر باتوں کے علاوہ انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ رضا صاحب کے یہاں ایک مردہ بچہ ہوا تھا۔ رضا صاحب کی بیوی اس صدمے سے بے حال ہے اور جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ امی نے یہ بھی لکھا تھا کہ قدرت کا کیا کرشمہ ہے' کوئی آتا ہے' کوئی جاتا ہے' جگہ کبھی خالی نہیں رہتی۔ بس اس فقرے سے اسے وہ بات سوجھ گئی تھی اور چند ہی لمحوں میں وہ ایک انتہائی اہم اور نازک فیصلہ کر چکی تھی۔

اپنی سہیلی سے مشورہ کر کے وہ جمشید نگر کے لیے روانہ ہو گئی۔ جمشید نگر کی حدود میں پہنچی تو رات ہو چکی تھی۔ یوں بھی اس نے چادر اچھی طرح لپیٹ رکھی تھی اور شیر خوار بچہ چادر میں چھپا رکھا تھا۔ اپنے شہر میں پہنچتے ہی اس کے دل میں ہوک اٹھی اور سینہ کسکنے لگا۔ وہ شہر میں تھی لیکن والدین کے گھر نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں کافی وقت سوچ بچار میں گزارا اور آخر کسی نتیجے پر پہنچ کر' آنسو بہاتی ہوئی ماربل ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس نے بچے کو دلائی میں خوب اچھی طرح لپیٹا' پیشانی چومی' بھینچ بھینچ کر پیار کیا اور ماربل ہاؤس کی سیڑھیوں پر اسے رکھ دیا۔

"خدا حافظ! میرے لال۔" اس نے زیر لب کہا تھا اور آنسو بہاتی ہوئی دوبارہ ویٹنگ روم میں واپس آ گئی۔

سارا کھیل یہ تھا کہ کچھ دیر بعد ماربل ہاؤس کے کسی مکین کی نظر اس بچے پر پڑے گی اور وہ اندر پہنچا دیا جائے گا۔ ماربل ہاؤس کا مالک جو حال ہی میں بچے سے محروم ہو چکا تھا اسے نعمت خداوندی اور قدرت کا عطیہ سمجھ کر اپنا لے گا۔

اسے یقین تھا کہ ایک خوشحال گھرانے میں اس کے جگر گوشے کی اچھی پرورش ہو گی اور مزید یہ کہ وہ بعد میں جمشید نگر پہنچ کر ہمیشہ اسے اپنی نظروں میں رکھ سکے گی۔

وہ دھندلا خاکہ جو اس نے ترتیب دیا تھا آج مجسم ہو کر اس کے سامنے تھا۔ لیکن اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ باقر اس کے سکون کو برباد کرنے کے لیے دوبارہ نمودار ہو جائے گا۔ اپنی جنت کو بچانے کے لیے اسے کتنا اذیت ناک جھوٹ بولنا پڑا تھا۔ اس کے لیے یہ تصور ہی کتنا سوہان روح تھا کہ یہ شخص جو سامنے کھڑا تھا' اس کے بچے کا باپ تھا۔ اس نے بے اختیار بچے کو سینے سے چمٹا لیا جیسے اسے گدھ سے بچانا چاہتی ہو۔

"مجھے..... مجھے تم سے محبت ہے نیلم!" باقر خوشامد پر اتر آیا۔

"مگر مجھے تم سے نفرت ہے۔ تم نے یہی بات اپنی مرحوم بیوی سے بھی کہی ہو گی۔ آج مجھ سے کہہ رہے ہو کل کسی اور سے کہو گے۔ اچھا میرے راستے سے ہٹ جاؤ اور دیکھو میری راہ میں کبھی آنے کی کوشش نہ کرنا تم نے مجھے جو دھمکی دی ہے کہ ہمارے بارے میں سب کو بتا دو گے تو میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ ایسا ہی ہو۔ ایک طرح سے یہ تم میرا ہی کام کرو گے۔ یہ بات میرے حق میں جائے گی۔ میرے لیے مفید ثابت ہو گی اور میری آئندہ کی راہیں کھلیں گی۔"

نیلم' باقر سے کترا کر نکل گئی۔ باقر اپنی جگہ گم صم کھڑا رہا۔

☆☆

رحمان صاحب اور بیگم رحمان دونوں ہی دانیال کے دیوانے تھے۔ وہ آپ ہی آپ' پیار سے اسے دانی کہنے لگے تھے۔ نیلم نے بھی ان کی دیکھا دیکھی دانی کہنا شروع کر دیا تھا۔ اسے یہ نام اچھا لگا تھا۔ دانیال بھی اچھا نام تھا لیکن دانی کی بات ہی کچھ اور تھی۔ دانی کہتے ہوئے نیلم کو محسوس ہوتا جیسے اس کا منہ ایک مٹھاس اور ایک انوکھے ذائقے سے بھر گیا ہو۔ اس کے وجود میں سرور کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ نیلم اگر کسی بھی وجہ سے دانی کو لے کر والدین کے پاس نہ جاتی تو وہ اصرار کرتے کہ اسے ضرور اپنے ہمراہ لایا کرے۔ اس وقت بھی وہ دانی کو لے کر پہنچی تو ان کے چہرے کھل اٹھے۔

"لاؤ مجھے دے دو۔" بیگم رحمان دونوں ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولیں۔ نیلم نے دانی کو ان کی گود میں دے دیا۔

رحمان صاحب کچھ ہی دیر پہلے دفتر سے آئے تھے اور قدرے فکر مند دکھائی دے رہے تھے۔ بالآخر وہ بیوی کی طرف مڑے اور بھاری لہجے میں بولے۔ "وہ مردود پھر واپس آ گیا ہے اور رضا صاحب نے دوبارہ اسے ملازم رکھ لیا ہے۔"

"کون۔ کس کا ذکر کر رہے ہو۔" بیگم رحمان' دانی کو اچھالتے ہوئے رک گئیں۔ نیلم کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

"وہی باقر اور کون۔" رحمان صاحب برہمی سے بولے۔

بیگم رحمان خاموش رہیں۔ وہ کن انکھیوں سے نیلم کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"اگر اس نے میرے گھر میں قدم رکھا تو دھکے دے کر نکلوا دوں گا۔" رحمان صاحب غصے سے پھنکارے۔

بیگم رحمان اس بار بھی خاموش رہیں۔ ملازمہ چائے لے کر آئی تو موضوع گفتگو بدل گیا۔ رحمان صاحب کی نظر دانی پر پڑی تو ان کا موڈ یک لخت تبدیل ہو گیا۔ چہرے پر سختی کی جگہ نرمی آ گئی۔ مسکراتے ہوئے بولے۔ "بہت خوب صورت بچہ ہے۔ کسی اچھے خاندان کا چشم و چراغ معلوم ہوتا ہے۔ اس پر آنکھ نہیں ٹھہرتی جانے وہ کون لوگ تھے جو اسے اس طرح چھوڑ کر چلے گئے۔ خدا جانے اس کے ماں باپ زندہ ہیں بھی یا نہیں۔"

"کیا معلوم کیا حالات پیش آئے ہوں۔ ورنہ کون اپنی اولاد کو اس طرح جدا کرتا ہے۔" بیگم رحمان بولیں۔

بچہ بیگم رحمان کی گود میں ہمک رہا تھا۔ نیلم پیالی لیے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے خود پر قابو پائے ہوئے تھی۔ حالات کسی کو اتنا بے بس کر سکتے ہیں۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

رحمان صاحب نے دانی کو لے لیا اور اسے گھٹنوں پر بٹھانے کی کوشش کرنے لگے۔ پھر وہ نیلم کی طرف مڑتے ہوئے بولے۔ "میں تمہیں بھی اسی طرح بٹھایا کرتا تھا اور تم کبھی نہیں گریں۔" انہوں نے بیوی کی طرف تائیدی نظروں سے دیکھا۔ کیوں بیگم ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔"

"تم کوئی بات غلط کہتے ہی کب ہو۔" بیگم رحمان مسکراتے ہوئے بولیں۔ "بیٹی کو کھلایا ہے تو کسی دن نواسے کو بھی کھلا لو گے۔"

نیلم کا ہاتھ کانپ گیا۔ چائے چھلک گئی اور اس کے کپڑوں پر گر پڑی۔ میاں بیوی نے غور سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ پھر رحمان صاحب شفقت سے بولے۔ "کیا بات ہے بیٹی۔ کیا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے ابو! بس آپ لوگوں کی باتیں سن کر ہنسی آ گئی تھی۔" نیلم خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"جاؤ جا کر کپڑے کو دھو لو۔ ورنہ دھبہ پڑ جائے گا۔" رحمان صاحب نے دوبارہ کہا۔

نیلم اٹھ کر غسل خانے میں چلی گئی۔ وہ خود بھی وہاں سے اٹھ جانا چاہتی تھی تاکہ اپنے اس المیے پر جی بھر کے رو سکے۔ ابو اس کے کپڑے کے دھبے کے بارے میں فکر مند ہو گئے تھے لیکن کیا انہوں نے اس کے دل کا داغ بھی دیکھا تھا۔ وہ داغ جسے وہ کسی کو دکھا نہیں سکتی تھی۔

☆☆

نیلم نے ہچکچاتے ہوئے لائبریری کے دروازے پر دستک دی۔ فوراً ہی اندر سے رضا صاحب کی نرم آواز سنائی دی۔ ”کون ہے اندر آجاؤ۔“

نیلم دروازہ کھول کر لائبریری میں داخل ہوگئی۔ کمرے میں چاروں طرف الماریوں میں سلیقے سے کتابیں رکھی ہوئی تھیں اور رضا صاحب دروازے کی طرف پشت کیے مطالعے میں مصروف تھے۔ قریب ہی چھوٹی میز پر ایک ٹرے رکھی ہوئی تھی۔ جس میں چائے کی دو خالی پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ نیلم کو معلوم تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے رخشی، رضا صاحب سے مل کر گئی تھی۔ چائے ان دونوں نے ساتھ ہی پی تھی۔

نیلم خاموش کھڑی رہی تو رضا صاحب نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر کتاب رکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔

”کیا بات ہے، نیلم۔“

”دانی کو بخار ہو گیا ہے۔“

”دانی۔“ رضا صاحب نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”میرا مطلب ہے، دانیال۔“ نیلم جلدی سے بولی۔

”اوہ تو تم نے اپنی پسند کا مختصر نام بھی وضع کر لیا۔“ رضا صاحب ہنس پڑے۔ ”اچھا نام ہے، پسند آیا۔“ پھر وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔ ”فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ موسم تبدیل ہو رہا ہے۔ اور شیر خوار بچے موسم کا اثر جلد قبول کر لیتے ہیں۔ میرے خیال میں دانیال یعنی تمہارے دانی کو کچھ گرم کپڑوں کی ضرورت ہے۔“ ان کے چہرے پر اداسی لہرائی۔ ”اگر زریں زندہ ہوتی تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ بہر حال میرے لیے یہی اطمینان اور سکون کا باعث ہے کہ تم اس گھر میں موجود ہو تم ایک ماں ہی کی طرح دانی کی دیکھ بھال کر رہی ہو۔ لگتا ہے، جیسے وہ تمہارا اپنا بچہ ہے۔“

نیلم کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کی خوب صورت سیاہ بھونرا جیسی آنکھیں، آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔ اس نے جلدی سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اگر اس کی یہی کیفیت رہی تو وہ کب تک اپنا راز چھپائے رکھ سکے گی۔

”کچھ دیر ہوئی رخشی آئی تھی۔“ رضا صاحب کہہ رہے تھے۔ ”اس نے دانی کے لیے کچھ گرم کپڑے تیار کیے تھے لیکن ساتھ لانا بھول گئی۔ وہ کسی کے ہاتھ کپڑے بھجوائے گی اور ہاں، تم دانی کے بارے میں بالکل فکر مند نہ ہو۔ ضرورت پڑی تو میں ڈاکٹر کو بلوا دوں گا۔“

نیلم جانے کے لیے مڑی۔ لیکن اسی وقت رضا صاحب کی آواز سنائی دی۔ ”ذرا ایک منٹ نیلم۔“

نیلم دوبارہ رضا صاحب کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”جی۔“

”کیا تمہارے اور باقر کے درمیان کچھ کشیدگی ہے۔“ انہوں نے پوچھا۔

نیلم کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“ اس نے بہ مشکل تمام جواب دیا۔

”جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے دارالحکومت جانے سے پہلے تمہارے اس سے اچھے تعلقات تھے۔ کیا اب آپس میں جھگڑا کر بیٹھے ہو۔“

نیلم کچھ کہے بغیر تیزی سے پلٹی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ رضا صاحب ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور نیلم کے سامنے آتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں بولے۔ ”مجھے افسوس ہے

کہ میں نے تمہارے ذاتی معاملے میں دخل دیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ تمہارے بارے میں کچھ زیادہ ہی سوچنے لگا ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ تم دانی کے سلسلے میں بڑے ایثار سے کام لے رہی ہو۔ میں اکثر سوچتا ہوں اور سوچ کر رنجیدہ ہو جاتا ہوں کہ اگر تم نے شادی کر لی تو میں اور دانی تمہیں کھو دیں گے۔“

”میں..... میں کبھی شادی نہیں کروں گی۔“ نیلم نے نظریں جھکائے ہوئے رک رک کر جواب دیا۔

رضا صاحب کے چہرے پر حیرت پھیل گئی۔ ”تم یہ ہرگز نہیں کرو گی۔“ وہ اپنائیت سے بولے۔ ”تم ساری عمر دوسروں کے بچے پال کر خوش نہیں رہ سکو گی۔ عورت کو کبھی نہ کبھی اپنے بچے کا بھی خیال آتا ہے۔ مگر..... مگر میں یہ سب کیوں کہہ رہا ہوں۔ مجھے شرمندگی ہے کہ میں تمہاری ذاتیات میں کچھ زیادہ ہی دخل دے رہا ہوں۔“ رضا صاحب واقعی خفیف سے نظر آنے لگے تھے۔

نیلم کا دل اتھل پتھل ہونے لگا تھا۔ اس نے خود کو سنبھالا اور رضا صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اپنے دانی کی دیکھ بھال کر کے جس قدر خوش ہوں۔ شاید زندگی میں کبھی خوش نہ رہ سکوں۔“

”واقعی تم اپنے ہی بچے کی مانند اس کا خیال رکھتی ہو۔ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ وہ تمہارا بچہ نہیں ہے۔“ رضا صاحب قدرے شوخی سے بولے تو نیلم مسکرا کر خاموش ہو گئی۔

وہ دانی کے ببب تہ کر کے رکھ رہی تھی کہ خالہ کمرے میں داخل ہوئی۔ خالہ حویلی کی خاندانی ملازمہ تھی۔ ملازمہ کہنا کچھ غلط ہی ہوگا کیونکہ اس گھر کے ایک بزرگ کا درجہ دیا جا چکا تھا۔ وہ باورچی خانے سے لے کر صفائی ستھرائی تک ہر کام اپنی نگرانی میں کراتیں۔ انتظامی امور اور دیگر معاملات میں اس کے فیصلوں سے کوئی بھی انحراف نہیں کرتا تھا۔

”کوئی لڑکی تم سے ملنے آئی ہے بیٹی!“ خالہ نے اطلاع دی۔ ”وہ شمشاد صاحب کے گھر سے آئی ہے اور شاید منے کے لیے کپڑے وغیرہ لائی ہے۔“

”ٹھیک ہے تم اسے بٹھاؤ، میں آتی ہوں۔“ نیلم آخری ببب تہ کرتے ہوئے بولی۔

نیلم کمرہ نشست میں پہنچی اور جیسے ہی اس لڑکی پر نظر پڑی تو حیرت کے ساتھ اسے خوشی بھی ہوئی۔ وہ فریدہ تھی۔ دونوں ہائی اسکول میں ساتھ پڑھ چکی تھیں۔ وہ خاصی باتونی اور جھگڑالو لڑکی تھی۔ نیلم کو دیکھ کر وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بھی نیلم کو دیکھ کر خوش ہوئی ہے۔

”فریدہ تم!“ نیلم کے منہ سے نکلا۔

”کیا فریدہ سے مل کر خوش نہیں ہوئیں۔“ وہ شوخی سے بولی۔

”ارے یہ بات نہیں ہے۔“ نیلم جلدی سے بولی۔ ”پرانے ساتھیوں سے مل کر کون خوش نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ تمہیں یہاں اچانک دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔“

”ہاں میرا یہاں آنا کچھ حیرت ہی کی بات ہے۔“ فریدہ بولی۔ ”وہ رخشی کی بچی نے فون کر کے مجھے مجبور کیا کہ اس کا ایک چھوٹا سا کام کر دوں۔“ اس نے صوفے پر پڑے ہوئے ایک بڑے سے پیکٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ”کچھ گرم کپڑے تھے جو یہاں پہنچانے تھے۔“

”اچھا آؤ بیٹھو۔“ نیلم، فریدہ کو بازو سے پکڑتے ہوئے بولی۔ دونوں قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ خالہ چائے دے گئی تو وہ چائے سے شغل کے ساتھ ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئیں۔ وہی پرانی بھولی بسری باتیں جو ہر کسی کا سرمایہ ہوتی ہیں۔

فریدہ خوب چہک رہی تھی۔ سن کم، بول زیادہ رہی تھی۔ اس نے ساتھیوں کی تعریف کم کی، برائی

زیادہ کی۔ سب کے کیڑے نکال کے رکھ دیے۔ پھر آخر میں اسے احساس ہو گیا کہ وہ سرپٹ دوڑ رہی ہے۔ چنانچہ واپسی کا سفر اختیار کرتے ہوئے بولی۔ ”تم نے رضا صاحب اور رخشی کے بارے میں سن ہی لیا ہوگا۔ عنقریب ان کی شادی ہونے والی ہے۔“

”مجھے تو نہیں معلوم کب ہے ان کی شادی۔“ نیلم نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

”بس عنقریب سمجھ لو۔“ فریدہ پیر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”پھر اس کے بعد تم اس گھونسلے سے نکال دی جاؤ گی۔ رخشی کے اس گھر کی مالکن بننے کے بعد تمہیں یہاں سے جانا ہی ہوگا۔“

”غلط خیال ہے تمہارا۔“ نیلم سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”دانی کی دیکھ بھال کے لیے بہرحال ایک گورنس کی ضرورت باقی رہے گی۔ رخشی یہ فرائض انجام دینے سے رہی۔“

فریدہ کے لبوں پر استفہامی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”تم کس خیال میں ہو بی بی! اس گھر میں کوئی بچہ ہوگا ہی نہیں جو گورنس کی ضرورت پیش آئے۔ ننھے دانی کو کسی دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے۔ میں نے رخشی اور اس کی امی کو آج ہی اس بارے میں بات کرتے سنا ہے۔ رخشی کی ماں بڑی مکار بڑھیا ہے۔ اس نے فیصلہ کیا ہے کہ رخشی کی شادی ہوتے ہی بچے کو اس حویلی سے جانا ہی ہوگا۔“

نیلم کا چہرہ سفید پڑ گیا ’نہیں‘ یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ ہرگز ایسا نہیں کریں گے۔ رضا صاحب ہرگز اس کی اجازت نہیں دیں گے۔“ وہ بڑبڑائی۔

فریدہ غور سے نیلم کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ ”یہ تم اس لیے کہہ رہی ہو کہ تم رخشی کے خاندان سے واقف نہیں ہو۔ میں نے ان لوگوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ خصوصاً رخشی کے والدین کی ذہنیت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ رخشی رضا صاحب کی بیوی بن گئی تو وہ لوگ ہر صورت میں بچے سے چھٹکارا پانے کی سبیل نکال لیں گے۔ رخشی رضا صاحب کو مجبور کرے گی کہ وہ بچے کو کسی رفاہی اور بہبود اطفال کے ادارے میں بھجوا دیں۔ یہ سب کچھ تمہارے سامنے اسی وقت آ جائے گا جب رضا صاحب‘ رخشی کی انگلی میں شادی کی انگوٹھی پہنائیں گے۔“

یک بیک نیلم خود کو بیمار محسوس کرنے لگی۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اس کا بچہ اس سے جدا ہونے والا تھا۔ وہ اس جدائی کو کس طرح برداشت کرے گی۔ کیا اسے ظاہر کرنا پڑے گا کہ دانی اس کا اپنا بچہ‘ اپنا خون ہے۔ پھر نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔ والدین اسے باقر کے حوالے کر دیں گے یا باقر قانونی طور پر اس سے بچہ چھین لے گا۔ وہ بچے کے ساتھ اسی صورت میں رہ سکتی تھی‘ جب وہ باقر کو قبول کر لے لیکن کیا وہ باقر کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہے۔ کیا اس کے اندر اتنا حوصلہ ہے۔ کیا وہ عمر بھر باقر کو برداشت کر سکے گی اور یہ بھی کیا معلوم کب باقر اسے چھوڑ کر بھاگ جائے۔ وہ خوش رنگ تتلیوں پر منڈلانے والا ہرجائی بھونرا تھا۔ وہ ایک بار پھر زندگی کے منجدھار میں اکیلی رہ جائے گی۔

نیلم کا دماغ سن ہونے لگا تھا۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اسے پتہ بھی نہ چل سکا کہ کب فریدہ نے اس سے اجازت لی اور کب رخصت ہوئی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے کپڑے کا پیکٹ اٹھایا اور ڈگمگاتے قدموں سے ایک بار پھر رضا صاحب سے ملنے‘ کمرہ مطالعہ کی طرف چل پڑی۔

اس نے دروازے پر دستک دی۔ جواب نہ پا کر اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا اور کمرے میں داخل ہو گئی۔ رضا صاحب اس کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے لیکن مطالعے میں مصروف نہیں تھے۔ وہ سامنے میز پر رکھی ہوئی ایک چھوٹی سی خوب صورت ڈبیہ کو گھورے جا رہے تھے۔

نیلم کے قدموں کی چاپ سن کر وہ چونکے اور

کھوئے کھوئے انداز سے بولے۔ ”اوہ‘ یہ تم ہو نیلم۔“

”میں نے دستک دی تھی مگر شاید آپ نے سنا نہیں۔“ نیلم نظریں جھکائے ہوئے‘ پیر کے انگوٹھے سے قالین کو کریدتے ہوئے بولی۔

”میں ہوائی محل تعمیر کر رہا تھا۔“ رضا صاحب پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ پھر ان کی نظر نیلم کے ہاتھ میں دبے ہوئے پیکٹ پر پڑ گئی۔ ”کیا رخشی نے کپڑے بھجوائے ہیں۔“

”جی ہاں‘ میں نے سوچا شاید آپ دیکھنا پسند کریں۔ رضا صاحب نے ہاتھ بڑھا کر پیکٹ نیلم کے ہاتھ سے لے لیا پھر اسے کھولے بغیر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔

”مجھے تو ان چیزوں کا تجربہ نہیں ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے ان کپڑوں کے بارے میں۔“

”رخشی صاحبہ نے بھیجے ہیں‘ اچھے ہی ہوں گے۔“ بالآخر نیلم نے جواب۔ ”یہ ان کی بڑی مہربانی ہے۔“

”ہاں اس کی خاصی مہربانیاں رہی ہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ گزشتہ چند مہینوں میں اس کے بغیر میرا کیا حال ہوتا۔“

نیلم نے رضا صاحب کے اس جملے میں معنی تلاش کرنے کی کوشش کی۔ بین السطور کون سا جذبہ پوشیدہ تھا چاہت یا تشکر لیکن وہ کچھ اخذ نہ کر سکی۔ چنانچہ اس نے اپنے طور پر سعی کی۔ ”رخشی صاحبہ سے آپ کو بڑا سہارا ملا ہوگا۔“ پھر اس نے طبیعت پر جبر کر کے مزید کہا۔ ”وہ ایک اچھی خاتون ہیں۔“

”رخشی کے بارے میں تم یہ رائے رکھتی ہو نیلم۔ کیا واقعی۔“ رضا صاحب کی آنکھوں میں تجسس کی چمک ابھر آئی تھی۔

”کیوں۔ کیا وہ آپ کی‘ میرا مطلب ہے آپ کی مرحوم بیوی کی دوست نہیں تھیں۔“

”ہاں مس نیلم! رخشی اور زریں بہترین دوست تھیں۔“ رضا صاحب گہری سانس لے کر بولے۔ ”یہی وجہ ہے کہ میں سوچتا ہوں۔“

یک بیک وہ رک گئے اور جملہ ادھورا رہ گیا۔ نیلم نے اپنے وجود میں زبردست کھنچاؤ محسوس کیا۔ ”آپ کچھ کہہ رہے تھے جناب۔“

رضا صاحب نے گہری نظر سے نیلم کے چہرے کا جائزہ لیا۔ شاید انہوں نے حرف مدعا زبان پر لانے میں کچھ عجلت کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد دوبارہ بولے۔ ”دیکھو نیلم! میں تم سے اور تمہارے گھر سے اچھی طرح واقف ہوں۔ کمپنی کے قیام کے زمانے سے ہی تمہارے خاندان اور میرے خاندان کے درمیان‘ ربط وضبط اور آنا جانا رہا ہے۔ پھر اس کے علاوہ میں نے تمہیں گورنس کبھی نہیں سمجھا۔ گورنس سے الگ ہٹ کر میں تمہیں اور بھی بہت کچھ سمجھتا رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے جو مسئلہ درپیش ہے‘ اس پر میں تم سے بے تکلفی سے گفتگو کر سکتا ہوں۔“ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھی ہوئی خوب صورت ڈبیا اٹھائی اور کھول کر نیلم کے چہرے کے سامنے لے گئے۔ سرخ مخمل کی تہ میں ہیرے کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔

نیلم کے وجود میں ایک سہرد لہر دوڑ گئی۔

”نیلم! لوگ ایسے شخص کے بارے میں کیا کہیں گے جو بیوی کے انتقال کے فوراً بعد شادی کر لے۔“ رضا صاحب کی آواز ابھری۔ ”لیکن نہیں‘ اسے اس طرح سمجھو۔ تم میرے بارے میں کیا رائے قائم کرو گی اگر میں شادی کروں۔ میں تمہارا دیانت دارانہ جواب چاہتا ہوں۔“

نیلم کوئی جواب نہ دے سکی۔ وہ گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ تو فریدہ صحیح کہہ رہی تھی۔

”تمہارے چہرے کے تاثرات بتا رہے ہیں کہ تم نے اس بات کو پسند نہیں کیا۔“ رضا صاحب کی آواز سنائی دی۔ نیلم چونک پڑی اور ہکلاتے ہوئے بولی۔ ”اگر‘ اگر آپ رخشی کو پسند کرتے ہیں

تو۔"

"ہاں میں اسے پسند کرتا ہوں۔" رضا صاحب کا لہجہ اس بار قدرے تیز تھا۔ "لیکن بات صرف پسند کی نہیں ہے۔ اس گھر کو ایک عورت کی ضرورت ہے' ایک ایسی خاتون کی جو ننھے دانی کو ماں کا پیار دے سکے۔ میں سمجھتا ہوں۔ رخشی اس مقصد کے لیے بہتر لڑکی ثابت ہوگی۔"

نیلم نے آنکھیں موند لیں۔ اسے جگا جیسے کسی نے اس کے دل میں تیز دھار خنجر اتار دیا ہو..... ننھے دانی کو ایک ماں کی ضرورت تھی۔ کیا اس عرصے میں وہ اپنی ماں کے قریب نہیں رہا۔ ماں جو اس سے پیار کرتی رہی۔ اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی رہی۔ نیلم کا دل چاہا کہ چیخ چیخ کر سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو بتائے کہ دانی کی ماں اسی گھر میں موجود ہے۔ وہ اس کا اپنا حقیقی بیٹا ہے۔ اسے کسی دوسری ماں کی ضرورت نہیں ہے لیکن وہ ایسا نہ کر سکی

"افسوس کہ تم نے میرے ساتھ تعاون نہیں کیا تم نے کوئی واضح رائے نہیں دی اور مسئلہ اپنی جگہ رہا۔" رضا صاحب نے تلخ لہجے میں کہا اور ڈبیا اٹھا کر جیب میں رکھ لی۔ پھر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور موضوع بدلتے ہوئے بولے۔ "کیا تم خالہ زینب کو جانتی ہو۔"

"جی ہاں جانتی ہوں۔ وہ بچپن میں آپ کی آیا رہی تھیں اور اب شہر کے مغربی حصے میں رہتی ہیں۔"

"ان کے گھر سے واقف ہو۔"

"جی ہاں۔"

"یہ اچھی بات ہے۔ تم کل دانی کو لے کر ان کے یہاں چلی جانا۔ انہوں نے اب تک دانی کو نہیں دیکھا ہے' کل شام چلی جانا۔ میں واپسی میں تمہیں ان کے گھر سے لے لوں گا۔"

"بہتر ہے۔"

"خدا حافظ۔"

نیلم کی وہ رات اور اگلا دن پریشانی اور وحشت میں گزرا۔ وہ سوچتے سوچتے پاگل ہوگئی کہ رخشی کے اس گھر میں آنے کے بعد اس کے دانی کا کیا بنے گا۔ رضا صاحب کے تیور سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ رخشی سے شادی ضرور کریں گے۔ اگر وہ رضا صاحب کو اس شادی سے منع کرتی تو کیا وہ مان جاتے۔ شاید نہیں۔ وہ اسے اس کی خود غرضی اور ضد پر محمول کرتے۔ وہ ضرور پوچھتے کہ آخر اسے کیا اعتراض ہے۔ پھر وہ کیا جواب دیتی۔

سہ پہر کو وہ دانی کو خالہ زینب کے یہاں لے جانے کے لیے تیار کرنے لگی۔ اس نے سوچا وہ پہلے اپنے گھر جائے گی پھر وہاں سے خالہ زینب کے گھر۔

نیلم دانی کو لے کر برآمدے میں آئی تھی کہ یکا یک اس کے قدم رک گئے۔ سامنے ہی باقر کھڑا تھا۔ نیلم کو دیکھ کر اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ قریب آ کر کچھ دیر گہری نظروں سے دانی کا جائزہ لیتا رہا پھر نیلم کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "اچھا ہوا تم مل گئیں۔ میں تم سے ہی ملنے آیا تھا۔"

"میں نے کہا تھا کہ میں تم سے ملنا نہیں چاہتی۔" نیلم تیوری چڑھا کر بولی۔

"تمہارے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ میرا تم پر قانونی اور شرعی حق ہے' سنو..... میں بہت دنوں سے تم سے تفصیلی ملاقات نہیں ہوئی۔ میں تمہاری سخت ضرورت محسوس کر رہا ہوں اور یہ کوئی غلط اور غیر اخلاقی بات نہیں ہے تم میری بیوی ہو اور میں تمہارا شوہر۔"

نیلم کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ زخمی شیرنی کی طرح بپھر کر بولی۔ "تمہیں اس انداز میں گفتگو کرنے کی جرات کیسے ہوئی۔"

"بہت خوب۔" باقر تمسخر سے ہنس دیا۔ "کیا آج کل رضا صاحب پر ڈورے ڈال رہی ہو جو مجھ سے اتنی برگشتہ ہو۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ وہ رخشی سے شادی کرنے والے ہیں۔ کیا ان کی داشتہ بن کر رہو گی۔"

"کمینے آدمی تجھے یہ الفاظ کہنے کی جرات کیسے ہوئی۔" نیلم نے طیش میں آ کر باقر کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔

"بہت برا لگا' کیوں۔" باقر ڈھٹائی سے ہنس دیا۔ پھر وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "غور سے سن لو نیلم! اگر تم آج رات آٹھ بجے مجھے شہر کے مغربی حصے میں ان سرخوں کے قریب نہ ملیں جو اب مردہ ہو چکی ہیں تو تمہارے حق میں بہت برا ہوگا۔ وہ جگہ سرِ شام ویران ہو جاتی ہے۔ ہم وہاں اطمینان سے گفتگو کر سکیں گے۔ میں اب اس معاملے کو مزید طول نہیں دے سکتا۔ کوئی فیصلہ کن بات ہو ہی جانی چاہیے۔ میں تمہیں قائل کروں گا کہ تم غلطی پر ہو اور اپنی زندگی برباد کر رہی ہو۔"

"میں ہرگز نہیں آؤں گی۔ مجھے جو فیصلہ کرنا تھا' کر لیا۔ ہٹو میرے راستے سے مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"اچھا تو پھر اس کے نتائج بھی دیکھ لو گی۔" باقر کے چہرے پر کرختگی دوڑ گئی۔ "میں تمہیں تباہ و برباد کر دوں گا۔ تمہارے پورے خاندان کو ملیا میٹ کر دوں گا۔ اس سلسلے میں رضا صاحب کو بھی نہ بخشوں گا۔ میری دنیا کو اجاڑ کے وہ بھی سکھی نہ رہ سکیں گے۔"

"اس معاملے سے ان کا کیا تعلق۔" نیلم کانپتے ہوئے بولی۔

"پہلے تم مجھ سے ناراض تھیں اب ان کی وجہ سے برگشتہ ہو گئی ہو۔ وہ درمیان نہ آتے تو شاید تمہاری ناراضگی دور ہو چکی ہوتی۔"

"یہ بکواس ہے۔ رضا صاحب کا ہمارے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہوں نے کبھی ہمارے معاملے میں مداخلت نہیں کی۔ انہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ میں تم سے شادی کی حماقت کر بیٹھی ہوں۔ میں تو یہاں اس بچے دانی کی خاطر رہ رہی ہوں۔ میں اس کی گورنس ہوں۔"

"مگر میں نے تو سنا ہے تم اسے ماں کا پیار دے رہی ہو۔" باقر طنز سے بولا۔ "اور اس وقت بھی لگ رہا ہے جیسے..... اپنے بچے کو لیے ہوئے ہو۔"

دفعتاً باقر کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ نمودار ہوئی وہ سفاک لہجے میں بولا۔ "سنو اگر تم آج رات آٹھ بجے مقررہ جگہ پر مجھ سے ملنے نہ آئیں تو مجھے اس بات کی بھی پروا نہیں ہوگی کہ اس بچے کو اغوا کرنا پڑے۔"

نیلم کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے لگا جیسے وہ چکرا کر گر پڑے گی۔ اس کے منہ سے احتجاج کا ایک لفظ نہ نکل سکا۔

نیلم کی کیفیت دیکھ کر باقر کو اندازہ ہوگیا کہ اس کا یہ وار بھرپور اور کاری رہا۔ اس نے اطمینان کی گہری سانس لی اور اندر جاتے ہوئے بولا۔ "میں ضدی اور عملی آدمی ہوں' جو کہتا ہوں کر کے دکھاتا ہوں امید ہے' اس ننھی سی جان پر ظلم نہیں کرو گی۔"

باقر چلا گیا تو نیلم بھی اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا' دماغ کام نہیں کر رہا تھا' اس کے وجود میں پے در پے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ دل تھا کہ ڈوبا جا رہا تھا۔ باقر نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا..... اس کا دانی اس سے چھن جائے گا۔ کیا وہ اس کے بغیر اپنی زندگی کا تصور کر سکتی ہے۔ پہلے رخشی کا خدشہ اور باقر کا خوف۔ آخر دنیا اس ننھے سے وجود' ننھی سی جان کی دشمن کیوں ہو رہی تھی۔ کیا وہ دانی کو بچانے کے لیے خود کو باقر کے حوالے کر دے اور حالات کے دھارے پر چھوڑ دے۔ نہیں یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ وہ ٹوٹ جائے گی۔ مر جائے گی مگر جھکے گی نہیں۔

اور تب اس نے ایک عجیب فیصلہ کیا۔ وہ دانی کو لے کر کہیں نکل جائے گی اس شہر کو چھوڑ دے گی ابھی اور اسی وقت پھر اس کی اور دانی کی دنیا میں

کوئی رنجشی کوئی باقر نہیں ہوں گے۔

نیلم نے جلدی جلدی تیاری شروع کر دی۔ دانی کے کپڑوں کی پوٹلی تیار کی اور جو کچھ بھی ہاتھ لگا' ساتھ لیا اور چلنے کو تیار ہوگئی۔

باہر نکل کر والدین کا خیال آگیا۔ انہوں نے اس کی خاطر بڑے دکھ اٹھائے تھے۔ اس نے انہیں کوئی سکھ نہیں دیا تھا۔ ان کو آخری بار دیکھنے اور آنکھیں سینکنے کے لیے اس کا دل تڑپ اٹھا پھر زندگی رہے نہ رہے۔ ملاقات ہو نہ ہو۔

گھر پہنچی تو والدین حسب معمول بڑی شفقت سے اس سے ملے۔ دانی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ گٹھری دیکھ کر رحمان صاحب چونک پڑے۔ ”یہ کیا ہے بیٹا۔“ انھوں نے پوچھا۔

نیلم کا دل بھر آیا۔ وہ بڑی مشکل سے امڈتے ہوئے آنسوؤں کو پیتے ہوئے بولی۔ ”یہاں سے خالہ زینب کے ہاں جانے کا ارادہ ہے۔ ہوسکتا ہے رات کو وہاں رکنا پڑے۔ اس میں دانی کے کپڑے ہیں۔ وہ جلدی جلدی کپڑے خراب کرلیتا ہے۔“

”بہت شریر ہے۔“ بیگم رحمان' دانی کے سرخ پھولے پھولے رخسار کو تھپتھپاتے ہوئے بولیں۔ پھر انہوں جھک کر اس کی پیشانی چومی۔ ”شیر خوارگی میں نیلم بھی کپڑے بہت خراب کیا کرتی تھی۔“ وہ ہنس پڑیں۔

نیلم ایک حبس' ایک گھٹن سی محسوس کر رہی تھی۔ دل پر پہاڑ جیسا بوجھ تھا اور وہ اس بوجھ تلے دبی جارہی تھی' پسی جارہی تھی پھر یک بیک اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ پہلے بیگم رحمان پھر رحمان صاحب نے اسے دیکھا اور چونک پڑے۔

”یہ کیا نیلم!“ دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش میں نیلم کا جسم کانپنے لگا۔

رحمان صاحب بیٹی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر الجھ سے گئے۔ بیگم رحمان نے نیلم کو گھسیٹ کر اپنی آغوش میں لے لیا۔ ننھا دانی زور زور سے رونے لگا۔

”مجھے تمہاری پریشانی کا احساس ہے بیٹی۔ مجھے معلوم ہے تم کس آگ میں جل رہی ہو لیکن اس کا کوئی حل نکالنا ضروری ہے۔ اس طرح جی ہلکان کرنے سے کیا فائدہ۔“ بیگم رحمان بیٹی کا سر سہلاتے ہوئے بولیں۔ نیلم کو یوں روتے دیکھ کر وہ بے قرار ہوگئی تھیں۔ نیلم ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ اکلوتی نہ ہوتی تو بھی اولاد اولاد ہی ہوتی ہے۔ اس کا دکھ اس کی چبھن رگ و جان میں محسوس ہوتی ہے۔

”یہ کیا ہے بھئی۔ یہ تم لوگوں نے کس قسم کی گفتگو شروع کر دی۔“ رحمان صاحب مزید الجھتے ہوئے بولے۔

بیگم رحمان سوچ میں ڈوب گئیں پھر انہوں نے سر کو اس طرح جنبش دی جیسے اندر ہی اندر کوئی فیصلہ کر بیٹھی ہوں۔

”ذرا ایک منٹ کے لیے میرے ساتھ آنا۔“ انہوں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے رحمان صاحب سے کہا۔

رحمان صاحب فکر مند سے بیگم کے ہمراہ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ نیلم کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اندر کیا باتیں ہو رہی ہوں گی۔ اس نے دانی کو سینے سے چمٹا لیا۔ اس کی ماں بھی ابھی تک ادھوری حقیقت سے باخبر تھی۔ اسے کب معلوم تھا وہ بچہ جو اس وقت اس کی آغوش میں ہے اور جسے وہ خود دیوانہ وار چاہتی ہیں ان کا اپنا بچہ اور نواسا تھا۔ وہ بے چاری تو بس اتنا ہی جانتی تھیں کہ ان کی بیٹی ضد اور سرکشی میں باقر جیسے شخص سے خفیہ طور پر شادی کر بیٹھی ہے اور دکھ سہہ رہی ہے۔ وہ یہی بات بتانے کے لیے شوہر کو دوسرے کمرے میں لے گئی تھیں۔

پورے آدھے گھنٹے بعد رحمان صاحب اور بیگم رحمان کی واپسی ہوئی۔ رحمان صاحب کا چہرہ

اترا ہوا تھا۔ وہ نیلم سے آنکھیں نہیں ملا رہے تھے۔ انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور رنجیدہ رنجیدہ سے دور بیٹھ گئے۔ ایک عجیب سا سناٹا مسلط ہوگیا تھا۔ دانی بھی ماں کی آغوش کی گرمی پا کر سو گیا...... نیلم کو اپنے باپ پر بڑا ترس آرہا تھا۔ اس کے دل میں خواہش سر اٹھا رہی تھی کہ وہ باپ کے قدموں میں سر رکھ کر رو رو کر اپنی کوتاہی اور عاقبت نا اندیشی کی معافی مانگے کہ اس نے ان کی انا اور وقار کو مجروح کیا تھا۔ عزت نفس کو چور چور کر دیا تھا لیکن اس کی ہمت نہ پڑی۔ وہ اپنی جگہ مجرم بنی بیٹھی رہی۔

”کیا باقر تم سے اب بھی ملتا ہے۔“ کچھ دیر بعد بیگم رحمان نے نیلم سے پوچھا۔ ان کا لہجہ نرم تھا۔

”ہاں ملتا ہے۔“ نیلم نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے' اس سے ملتے ہوئے وہ مجھے دھمکیاں بھی دیتا ہے۔“

”دھمکیاں! کیسی دھمکیاں۔“ رحمان صاحب بول پڑے اور نیلم کو بڑی خوشی ہوئی کہ اس کا باپ کچھ تو بولا تھا۔

”ملتے رہنے کی' ساتھ رہنے کی۔ اگر میں اس کے ساتھ نہ رہی تو وہ سب کو تباہ کر دے گا۔ مگر میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی...... اس نے آج بھی۔“ نیلم کہتے کہتے رک گئی۔

”ہاں! کیا ہوا آج۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی نیلم نے وہ بات بتا دی کہ کس طرح باقر نے رات آٹھ بجے ملنے کے لیے دھمکی دی تھی۔ لیکن درمیان میں وہ بچے کا ذکر گول کر گئی تھی۔

رحمان صاحب سوچ میں ڈوب گئے...... پھر کچھ دیر بعد انہوں نے کہا۔ ”تم اس سے ملنے نہیں جاؤ گی۔ میں جا کر ملوں گا اس سے' لیکن تم کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کرو گی۔“

نیلم نے سر کو اثبات میں جنبش دی لیکن اس کا فیصلہ اپنی جگہ برقرار تھا۔ یعنی یہ کہ اسے ہر حال میں جمشید نگر کو خیر باد اور والدین کو الوداع کہنا ہے۔ اسے آج رات بلکہ اسی وقت یہاں سے چل پڑنا ہے۔ اب خالہ زینب کے یہاں بھی جانے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ اسے شہر اور باہر دارالحکومت جانے والی بسوں کے اڈے تک جانا تھا۔

اس نے باپ کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ ماں کے سینے سے لپٹ کر پیشانی پر الوداعی بوسہ دیا اور دانی کو لے کر باہر نکل آئی۔

باہر نکل کر اسے پتہ چلا کہ اس کوہستانی علاقے میں رات اتر آئی تھی اور سردی میں اچھا خاصا اضافہ ہوگیا تھا۔ اس نے دانی کو چادر سے اچھی طرح ڈھک لیا اور رفتار تیز کر دی۔ ”دانی! پیارے دانی! تمہیں مجھ سے کوئی جدا نہیں کرسکتا۔“ وہ گنگنائی اور جھک کر بچے کی پیشانی چوم لی۔

وہ کوہستانی علاقہ تھا۔ سردی تو تھی ہی' شام سے کہر بھی پھیلنی شروع ہوگئی تھی۔ رات ہوتے ہوتے کہر کی چادر خاصی دبیز ہوگئی۔ نیلم کو قدم اٹھانا دشوار ہوگیا پھر اچانک ہی بارش شروع ہوگئی اور بارش کے ساتھ ہی سردی اور کہر میں شدت آگئی۔ نیلم کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ دفعتاً نیلم کو احساس ہوا کہ وہ ایک بھاری غلطی کر بیٹھی ہے۔ رات کے وقت بچے کو لے کر اس طرح سفر کرنا خطرناک بات تھی۔ شدید جذباتی کیفیت میں اسے خیال نہیں رہا تھا کہ موسم خراب بھی ہوسکتا تھا۔ اب کیفیت یہ تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا پھر اوپر سے وہ علاقہ ایسا تھا جو گڑھوں' کھائیوں اور متروک سرنگوں سے پٹا پڑا تھا۔ اب ان گڑھوں اور سرنگوں میں مستقل پانی بھرا رہتا تھا۔ ایک قدم غلط پڑا اور زندگی سے محروم ہوئے۔ نیلم بچے کی طرف سے بے حد فکر مند ہوگئی۔ تاریکی میں راستہ نہیں سجھائی دے رہا تھا۔ اب وہ آگے بڑھ سکتی تھی نہ پیچھے جا سکتی تھی

لیکن دم بہ دم بڑھتی ہوئی سردی اور بارش میں وہاں رکا بھی نہ جا سکتا تھا۔

اس نے جسم سے چادر اتار کر دہری تہری کی اور بچے کو اچھی طرح لپیٹ کر سینے سے چمٹا لیا۔ اس طرح بچہ زیادہ دیر تک سردی اور بارش سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ وہ بچے کی طرف سے ایک حد تک مطمئن تو ہوئی لیکن خود اس کی اپنی حالت غیر ہو گئی۔ سردی سے اس کا جسم کانپنے لگا اور دانت بجنے لگے۔ کپڑوں کی پوٹلی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر گئی تھی۔ وہ بچے کو سینے سے چمٹائے ہوئے دہری ہو گئی تاکہ بچہ بارش سے زیادہ سے زیادہ محفوظ رہے اور اسی اس کے جسم کی حرارت ملتی رہی۔

نیلم جانے کتنی دیر اس کیفیت میں رہی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا جسم اکڑ کر رہ گیا ہو اور وہ کبھی سیدھی کھڑی نہ ہو سکے گی۔ پھر بارش رک گئی اور دھلے ہوئے آسمان پر زرد چاند ابھر آیا۔ نیلم بچے کو سنبھالے ہوئے کھڑی ہو گئی لیکن اب اس میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ وہ آگے جا سکتی یا واپسی کا سفر اختیار کرتی اسے فوری طور پر ایک پناہ گاہ کی ضرورت تھی جہاں ٹھہر کر وہ اپنی اس انتہائی خستہ حالت پر قابو پانا چاہتی تھی۔ اس نے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ دائیں سمت میں دو فرلانگ کے فاصلے پر اسے ایک چوبی مکان نظر آیا۔ وہ ادھر سے کئی بار گزری تھی۔ یہ شعبان بابا کا مکان تھا۔ وہ چرواہا تھا اور کچھ تو ضرورتاً اور کچھ جھکی طبیعت ہونے کی وجہ سے سب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ اشد ضرورت ہی کے تحت شہر کے مرکز کی طرف جاتا تھا۔

نیلم نے ہمت کر کے اپنی قوت کو مجتمع کیا اور اس مکان کی طرف چل پڑی۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے دستک دی مگر دروازہ نہ کھلا پھر اگلے لمحے اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ دروازے پر باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ شعبان بابا اپنے مکان میں نہیں تھا، کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ وہ قلندر سا آدمی تھا اور دروازے میں قفل نہیں ڈالتا تھا۔ نیلم نے کنڈی کھولی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں ایک تخت پڑا ہوا تھا جس پر میلا اور بوسیدہ بستر لگا ہوا تھا۔ نیلم نے جلدی سے بچے کو بستر پر لٹا دیا۔ پھر اس نے چادر نچوڑی اور خشک ہونے کے لیے پھیلا دی۔ وہ پانی سے شرابور تھی اور سردی سے بے حال ہو رہی تھی۔ لیکن اسے اپنی فکر نہیں تھی۔ اس نے بستر کی چادر اٹھائی اور ننھے دانی کا جسم خشک کرنے لگی پھر وہ چونک پڑی۔ دانی کا جسم گرم ہو رہا تھا اور وہ غفلت کی کیفیت میں تھا۔ نیلم بدحواس ہو گئی۔ جلدی سے دانی کے کپڑے اتار کر اسے خشک چادر میں لپیٹ دیا، اس نے ایک بار پھر دانی کی پیشانی چھو کر دیکھی وہ تپ رہی تھی۔ اسے بخار چڑھ آیا تھا۔ نیلم کا دل زیر و زبر ہونے لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی اگر دانی کو کچھ ہو گیا تو کیا ہو گا۔ وہ تو دانی کو آفات سے بچانا چاہتی تھی لیکن یہ کیا ہو گیا۔ اس وقت تو وہ کچھ کر بھی نہ سکتی تھی۔ اسی وقت چاند دوبارہ چھپ گیا اور بھیانک تاریکی مسلط ہو گئی۔ باہر وحشت خیز سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نیلم نے دانی کے چہرے پر اپنا چہرہ رکھ دیا اور آنسو بہانے لگی۔

دفعتاً باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر دروازے پر دستک کی آواز آئی۔ نیلم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”کون ہے۔“

”کیا یہ تم ہو نیلم۔“ باہر سے آواز آئی۔ ”دروازہ کھولو۔ میں رضا ہوں۔“

شدید ترین مایوسی کے عالم میں نیلم کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے رستے ہوئے زخم پر پھایا رکھ دیا ہو۔ وہ آواز کیا تھی، ایک نئی زندگی کی نوید تھی۔ آپ ہی آپ اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ اس کا جی چاہا، قلقاریاں مارے، کھلکھلا کر ہنس پڑے، اس نے دوڑ کر دروازہ کھول دیا۔

رضا صاحب نے اندر آنے کے بعد دروازہ بند کر دیا۔ انہوں نے لالٹین جلایا اور ایک نظر نیلم پر ڈالی پھر تخت کی طرف دیکھنے لگے۔ اندھیرے میں کوئی چیز واضح نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ وہ لالٹین کی روشنی میں باورچی خانے کی طرف گئے اور لالٹین جلا کر لے آئے۔ لالٹین کی لو انہوں نے کافی اونچی کر دی اور ایک اسٹول پر رکھنے کے بعد نیلم کی طرف مڑے۔ کچھ دیر اس کی طرف غور سے دیکھتے رہے پھر انتہائی پرسکون لہجے میں بولے۔ ”یہ سب کیا ہے نیلم! تم اس طرف کیسے آ نکلیں۔“

نیلم کے لب کانپے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی کہ اس سے پہلے رضا صاحب دوبارہ بول پڑے۔ ”ٹھہرو! یہ باتیں تو بعد میں ہو جائیں گی۔ مجھے تمہاری حالت ٹھیک نظر نہیں آتی۔ تم بری طرح کانپ رہی ہو۔“ انہوں نے اپنا کوٹ اتارا اور آگے بڑھ کر نیلم کے کندھوں پر ڈال دیا۔

”آ..... آپ کو سردی لگے گی۔“ وہ کانپتی ہوئی بولی۔

”میری فکر نہ کرو۔ میں بارش میں بھیگا نہیں ہوں۔“ رضا صاحب نے نرمی سے کہا۔

”تو..... تو دانی کے جسم پر ڈال دیجیے۔ اسے بخار ہے۔“ نیلم کوٹ اتارنے لگی۔

”ایک منٹ۔“ رضا صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ وہ تخت کے قریب گئے اور دانی کی پیشانی چھو کر دیکھی۔ ”ہاں اسے بخار ہے لیکن زیادہ تیز نہیں ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ہم اس وقت یہاں سے نکل بھی نہیں سکتے۔ بارش پھر شروع ہو گئی ہے، گاڑی میں نے نیچے ڈھلان پر کھڑی کی ہے اور یہاں تک لائی نہیں جا سکتی تھی۔ گاڑی تک جاتے جاتے پھر بھیگ جائیں گے، جو کسی طرح بھی مناسب نہ ہو گا۔ بارش رکنے کا انتظار کرنا ہو گا۔“ انہوں نے کہا اور نیلم کے قریب ہی کھڑے ہو گئے۔

”مجھے تمہاری حالت دانی سے زیادہ خراب معلوم ہوتی ہے۔ تم پر کپکپی طاری ہے۔“ قدرے توقف کے بعد انہوں نے کہا۔ ”تم بیٹھ جاؤ۔ میں ذرا باورچی خانے کا جائزہ لے لوں۔“

رضا صاحب باورچی خانے کی طرف چلے گئے۔ نیلم غنودگی کی کیفیت میں تخت پر بیٹھ گئی۔ وہ ایک قسم کے احساس جرم کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھی۔ وہ یہاں اپنی موجودگی کا کیا جواز پیش کرے گی۔ کوئی اس کے دل کا حال کیا جانے اوروں کے نزدیک تو اس نے ایک انتہائی غیر ذمے داری کا ثبوت دیا تھا۔ اب وہ دنیا کو کیا بتائے اور کیسے بتائے۔ اس نے اپنے جگر گوشے کو تحفظ کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا لیکن اسے کیا پتہ تھا کہ ساری آفات ارضی و سماوی اسی کے لیے ہیں۔

رضا صاحب کچھ دیر کے بعد باورچی خانے سے نکلے تو ان کے دونوں ہاتھ میں چائے کی پیالیاں تھیں۔ وہ نیلم کے قریب گئے اور ایک پیالی بڑھاتے ہوئے بولے۔ ”بڑے میاں کے پاس چینی برائے نام ہی تھی۔ چائے میٹھی نہیں ہو گی۔“

نیلم نے چائے کی پیالی لے لی۔ جس مٹھاس کا ذائقہ وہ چکھ رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں چینی کیا حیثیت رکھتی تھی۔ رضا صاحب اپنی پیالی ہونٹوں تک لے گئے تھے کہ یک بیک چونک پڑے۔ ”ارے۔“ انہوں نے پیالی زمین پر رکھ دی اور نیلم کے پیروں پر جھکتے ہوئے بولے۔ ”تمہارے بائیں پیر کا سینڈل کہاں ہے اور ٹخنے پر یہ خون کیسا جما ہوا ہے۔ اچھی خاصی سوجن ہو گئی ہے۔“

نیلم کو شاید اس کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ اس نے بھی پیالی رکھ دی اور پیر اٹھا کر دیکھنے لگی۔

”چائے پیو چائے..... ورنہ ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ رضا صاحب نے کہا اور اپنی قمیص کے دامن سے ایک دھجی پھاڑ لی۔ انہوں نے آہستہ آہستہ زخم پر سے خون صاف کرنا شروع کیا۔ نیلم درد سے کراہ اٹھی۔ خون صاف کرنے کے بعد رضا صاحب نے

ایک نئی دھجی پھاڑی اور کس کر زخم پر باندھ دی۔

''اب قدرے آرام آجائے گا۔ باقاعدہ مرہم پٹی صبح ہوگی۔'' انہوں نے کہا اور چائے کی پیالی اٹھالی۔

رات سرکتی رہی۔ کچھ دیر بعد رضا صاحب نے کہا۔ ''میرا خیال ہے تم آرام سے لیٹ جاؤ۔ یوں بیٹھے رہنے سے تھکن بڑھے گی۔ جب جانے کا وقت ہوگا تو میں تمہیں اٹھالوں گا۔''

''آرام سے لیٹ جاؤ۔'' نیلم نے دل ہی دل میں کہا۔ ''تم نے تو میرے دل و دماغ میں طوفان برپا کر دیا ہے۔ اس مختصر عرصے میں' میں جو ایک نئے درد سے آشنا ہوگئی ہوں' اس کا مداوا کون کرے گا۔ پاؤں کے زخم کی تو ان انگلیوں نے مسیحائی کر دی تھی لیکن دل پر جو زخم آ گیا تھا اس کی چارہ گری کون کرے گا۔ پاؤں کے زخم کی ٹیسوں پر دل کی ٹیسیں غالب آ گئی تھیں اور ان ٹیسوں میں ایک ایسا نشہ' ایسا سرور تھا جس سے وہ کبھی آشنا نہ ہوئی تھی۔

''آ..... آپ جائیں گے۔'' اس نے رک رک کر پوچھا۔

رضا صاحب مسکرا دیے۔ ''اس وقت میں' تم دونوں کا گورنس ہوں فکر نہ کرو۔ کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔ خدمت مفت۔''

ظالم اس کو خدمت کہہ رہا تھا۔ اگر کسی کی نیند اڑ دینا خدمت ہے تو یہ عجیب خدمت تھی۔ وہ رضا صاحب کی مسکراہٹ کو پلکوں پر سجائے ہوئے دانی سے لپٹ کر لیٹ گئی۔

صبح چار بجے رضا صاحب نے نیلم کو جگا دیا۔ وہ تیار ہو کر باہر نکلے تھے کہ مالک مکان آتا دکھائی دیا۔ وہ اپنے مکان میں اجنبی لوگوں کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔

''حیران نہ ہو۔ رات ہم بارش اور کہر میں پھنس کر اس مکان میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہ ایک مجبوری تھی تاہم.....'' رضا صاحب نے پرس نکالا اور سو کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ بوڑھے چرواہے نے غور سے نیلم اور پھر اس کی گود میں دبے ہوئے بچے کی طرف دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں صاحب! آپ بیوی بچے کے ساتھ اس مکان میں سر چھپانے آگے تھے۔ مکان تو ہوتا ہی اسی لیے ہے۔''

نیلم کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور رضا صاحب کے چہرے کی کیفیت بھی تبدیل ہو گئی تھی۔ انہوں نے جلدی سے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور نوٹ زبردستی چرواہے کی جیب میں ڈالتے ہوئے بولے۔ ''یہ معاوضہ نہیں ہے۔ میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں۔'' پھر وہ مسکرائے۔ ''یہ میں اس لیے بھی دے رہا ہوں کہ تم اس سے بہت سی چینی خرید کر باورچی خانے میں رکھ دو۔ تاکہ آئندہ ہم جیسا کوئی مسافر تمہارے مکان میں پناہ لے تو اسے بغیر چینی کی چائے نہ پینی پڑے۔''

بوڑھا چرواہا بے ساختہ ہنس دیا اور اس وقت تک انہیں دیکھتا رہا جب تک کہ وہ گاڑی میں بیٹھ کر نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔

''ابھی گھر دور ہے لیکن جب وہاں پہنچیں گے تو ایک عدالت کا سامنا ہوگا۔ ہم سے مختلف سوال کیے جائیں گے۔'' رضا صاحب بولے۔ وہ نیلم کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔ ''لیکن اس سے پہلے میں خود تم سے دو سوال کرنا چاہوں گا۔''

نیلم کا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔ وہ اس مرحلے سے ڈر رہی تھی لیکن یہ مرحلہ ناگزیر تھا۔ ایک بات چھپانے کے لیے کتنی باتیں چھپانی پڑتی ہیں۔

''پہلی بات تو یہ کہ جب طے ہو گیا تھا کہ تم خالہ زینب کے یہاں جاؤ گی تو تم وہاں کیوں نہیں گئیں۔ دوسرے یہ کہ تم اس طرف دانی کو لے کر کیوں آئی تھیں۔'' رضا صاحب سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولے۔

''م مجھے امی جان کے پاس دیر ہو گئی تھی۔ اس لیے سوچا کہ اب خالہ زینب کے یہاں

جانا بے کار ہے۔'' نیلم حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے بولی۔

''دیر ہو گئی تھی اور اسی لیے اس طرف گھومنے نکل آئیں۔''

''مم' میں نے سوچا تھوڑا سا دانی کو گھما دوں۔'' اس نے بے ساختہ جواب دیا۔ اس کو تقویت یوں ملی کہ کون سوچتا کہ ایک کورس بچے کو اغوا کر کے لے بھی جا سکتی ہے۔''

رضا صاحب خاموش ہو گئے۔ خدا جانے انہیں اس کی بات کا یقین آیا تھا یا نہیں پھر انہوں نے کسی تجسس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ البتہ کچھ دیر بعد نرم لہجے میں بولے۔ ''جب تم خالہ زینب کے یہاں نہیں ملیں تو میں نے سوچا کہ اپنے والدین کے یہاں چلی گئی ہو گی لیکن تم وہاں بھی نہیں تھیں پھر مجھے پریشانی ہوئی۔ میں اندازے کے مطابق اس طرف نکل آیا۔ بارش اور کہر کی وجہ سے مجھے خدشہ ہوا کہ تم راستہ نہ بھٹک گئی ہو۔ کیونکہ ان موسموں میں یہی ہوتا ہے۔''

''بالکل یہی ہوا تھا۔ میں راستہ بھٹک گئی تھی اور پھر پناہ لینے کے لیے اس مکان میں گھس گئی تھی۔'' نیلم بڑی طمانیت سے بولی۔ ایک بوجھ تھا جو دل و دماغ سے اتر گیا تھا۔

''تمہارے والد صاحب تو گھر پر نہیں تھے لیکن پتہ ہے والدہ کتنی پریشان ہوئیں تمہارے بارے میں سن کر۔ اب وہ میرے گھر پر تمہاری منتظر ہوں گی۔''

نیلم بے چین ہو گئی۔ وہ والدین کے لیے بڑے دکھ کا سبب بن رہی تھی۔ اب ان سے بھی جھوٹ بولنا ہوگا اور فی الواقع وہی ہوا جو رضا صاحب نے کہا تھا۔ اس کی امی حویلی میں موجود تھیں۔ اسے دیکھتے ہی لپٹ گئیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ نیلم کو انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ رضا صاحب کے کہنے سننے سے وہ نارمل ہوئیں۔ انہوں نے نیلم کو غیر ذمے دارانہ حرکت' پر پیار بھری ڈانٹ پلائی اور آئندہ محتاط رہنے کی ہدایت کر کے رخصت ہو گئیں۔

نیلم کی طبیعت سنبھلی نہیں تھی۔ اس کے ٹخنے کی سوجن تو کم ہو گئی تھی لیکن درد باقی تھا۔ پھر اس کے علاوہ وہ دانی کی طرف سے بھی پریشان تھی لیکن رضا صاحب نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ دانی کو اب بخار نہیں رہا اور خالہ نے اسے تھپک کر آرام سے سلا دیا ہے۔

رضا صاحب اور نیلم تنہا ہوئے تو رضا صاحب نے الماری سے ابتدائی طبی امداد کا ڈبا نکالا اور نیلم کے بستر کے قریب فرش پر بیٹھ گئے۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔'' نیلم بوکھلا کر اٹھ بیٹھی۔

''جو کچھ کروں گا' تم ابھی دیکھ لو گی۔'' رضا صاحب اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ''ذرا پایاں پیر آگے بڑھاؤ۔ پٹی بدل کر مرہم لگا دوں گا تو شام تک آرام آجائے گا۔''

''کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔ نیلم سمٹتے ہوئے بولی۔

''اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے۔ آدمی کسی نہ کسی سے مرہم پٹی کرواتا ہی ہے۔ میں ڈاکٹر تو نہیں ہوں لیکن یہ کام بہرحال کر سکتا ہوں۔''

نیلم کے نہ..... نہ کرتے انہوں نے ہاتھ بڑھا کر پاؤں سے رات کی باندھی ہوئی پٹی کھول دی اور مرہم لگانے لگے۔ نیلم نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے بیٹھی رہی۔ مرہم لگانے کے بعد رضا صاحب نے دوسری پٹی باندھی اور کھڑے ہو گئے۔ ہاتھ دھونے اور تولیے سے پونچھنے کے بعد وہ نیلم کے سامنے کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔

''میں تم سے ایک بات کہنا چاہ رہا ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا کس طرح کہوں۔ مناسب الفاظ نہیں مل رہے۔'' رضا صاحب نے سوچ میں ڈوبے ہوئے کہا۔

نیلم سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس کا دل تیزی سے

دھڑکنے لگا تھا' وہ قیاس نہیں کر پائی تھی کہ رضا صاحب اس سے کیا کہنا چاہ رہے تھے جو اس قدر فکر مند ہو گئے ہیں۔

'کیا تمہیں دانی سے بہت زیادہ محبت ہے۔'' اچانک رضا صاحب نے پوچھا۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔'' نیلم نے جواب دیا۔''جو کچھ ہے آپ کی نظروں کے سامنے ہے۔''

''مجھے بھی دانی سے بے حد محبت ہے۔ وہ میرا خون نہیں ہے لیکن پھر بھی میری اولاد ہے۔'' رضا صاحب جذباتی لہجے میں بولے۔''تمہارا اس گھر کے بارے میں کیا خیال ہے۔ کیا تم اس چار دیواری میں اجنبیت محسوس کرتی ہو۔''

''ہرگز نہیں۔ مجھے یہاں بہت سکون ملتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں دانی موجود ہے۔'' نیلم نے جواب دیا۔ لیکن وہ اندر سے بہت بے چین ہو گئی تھی۔

رضا صاحب اٹھ کھڑے ہوئے' کچھ دیر اضطراری کیفیت میں ٹہلتے رہے پھر نیلم کی طرف مڑتے ہوئے بولے۔''تمہاری میرے بارے میں کیا رائے ہے نیلم! یعنی میں کیسا آدمی ہوں۔''

نیلم کا حلق خشک ہو گیا۔''آ..... آپ اچھے آدمی ہیں۔ مہربان اور مخلص۔''

''میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ کیا تم مجھے پسند کرتی ہو۔''

نیلم کا وجود کانپ کر رہ گیا۔ اسے خوشی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی رونا بھی آیا تھا۔ اس منزل پر جب کہ وہ معلق تھی پاؤں کے نیچے زمین نہیں تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ رضا صاحب کی بات کا کیا جواب دے کیا نہ دے۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں نیلم!'' رضا صاحب بھرآئی ہوئی آواز میں بولے۔''تم میری اور دانی کی زندگی میں بہار کے جھونکے کی طرح آ گئی ہو۔ اب مجھے اپنی زندگی بے کیف نہیں محسوس ہوتی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس حویلی کے در و دیوار پر یہ بہار ہمیشہ سایہ فگن رہے۔ کیا تم اپنے دل میں میرے لیے کوئی نرم گوشہ محسوس کر رہی ہو۔''

نیلم کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ حالات نے اسے زندگی کے کس نازک موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔ کیا اس کی قسمت میں ایسے ہی لکھ دیے گئے ہیں۔ اسے خوشی بھی ملتی تھی تو نوحے کی صورت میں اس کی زندگی کا عنوان درد و الم سے رقم کیا گیا تھا۔ قسمت اس سے کیسا مذاق کر رہی تھی۔

''تم نے جواب نہیں دیا نیلم!'' رضا صاحب کی امید و بیم کی کیفیت لیے ہوئے آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''م' میں آپ کو پسند کرتی ہوں لیکن شا..... شادی نہیں ہو سکتی۔'' اس نے مری ہوئی آواز میں کہا پھر جلدی سے بولی۔''آپ تو رخشی سے شادی کرنے جا رہے تھے۔ وہ اچھی لڑکی ہے۔ اس سے کر لیجیے۔''

''بے شک' رخشی اچھی لڑکی ہے اور میں اسے پسند بھی کرتا ہوں لیکن چاہت اور پسند میں فرق ہے۔ رخشی کے بارے میں تم یوں سمجھنے کی کوشش کرو کہ میں نے اسے گھر کی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر اس کا انتخاب کیا تھا۔ سوچا تھا وہ اس گھر میں آئے گی تو دانی دیکھ بھال ہو جائے گی اور زریں کے مرنے کے بعد اس گھر میں جو ویرانی در آئی ہے وہ بھی دور ہو جائے گی لیکن اتنے دن تمہارے ساتھ رہ کر محسوس ہوا کہ اس گھر کی اصل ضرورت تم ہو۔ رخشی دانی کو وہ توجہ اور پیار نہیں دے سکے گی جو تم دے رہی ہو۔ میری خاطر نہیں تو دانی کی خاطر۔'' رضا صاحب قدرے دکھ سے بولے۔ ان کے لہجے میں التجا تھی۔''دانی کو تم سے بہتر ماں کا نعم البدل نہ مل سکے گا۔'' انہوں نے کہا اور کمرے سے نکل گئے۔

نیلم بستر پر گر کر رونے لگی۔ دانی کو اس سے بہتر ماں نہ مل سکے گی۔ کیسا حیرت انگیز تھا۔ کیسا بھیانک مذاق تھا۔ جیسے کسی نے دو دھاری تلوار اس کے سینے میں اتار دی ہو۔ ماں کے سوا بھی کیا کوئی اور ماں ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر کر تکیے میں جذب ہوتے رہے۔

سہ پہر کے قریب خالہ نے نیلم کو جگا دیا۔''رخشی بی بی تم سے ملنے آئی ہیں۔'' انہوں نے اطلاع دی۔

اس اطلاع پر نیلم کو قدرے حیرانی ہوئی۔ رخشی اس سے پہلے بھی آتی رہی تھی لیکن کبھی خاص طور پر اس سے ملنا پسند نہیں کیا تھا۔ نیلم سوچنے لگی کہ اس خصوصی عنایت کا مقصد کیا ہو سکتا ہے وہ خالہ سے کہنے ہی والی تھی کہ رخشی کو اس کمرے میں بھیج دیں کہ رخشی خود دندناتی ہوئی کمرے میں داخل ہو گئی۔ نیلم کو پہلی نظر میں اندازہ ہو گیا کہ رخشی کے تیور اچھے نہیں ہیں۔ نیلم نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا لیکن وہ بیٹھی نہیں۔ کڑی نظروں سے نیلم کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کرخت لہجے میں بولی۔''میں نے جو کچھ خالہ سے سنا ہے..... کیا صحیح ہے۔''

''کیا سنا ہے۔'' نیلم نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''یہی کہ رضا صاحب تم سے شادی کرنے والے ہیں۔''

نیلم سٹ پٹا گئی۔''مجھے تو کچھ نہیں معلوم۔'' وہ ہکلا کر بولی۔

رخشی نے سوالیہ نظروں سے خالہ کی طرف دیکھا۔ خالہ بھی گڑبڑا گئیں۔ خفیف سی ہو کر بولیں۔''دوپہر کو رضا میاں نے مجھے یہی بتایا تھا وہ بہت خوش تھے کہہ رہے تھے کل مقامی اخبار میں یہ خبر آ جائے گی۔''

نیلم کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ رخشی اس کی آنکھوں میں گھورتی ہوئی ناگن کی مانند پھنکاری۔''کیا یہ سچ ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے۔ رضا میاں نے مجھ سے یہ بات یونہی کہہ دی ہو گی۔'' خالہ نے برا مانتے ہوئے کہا۔

''تم چپ رہو جی!'' رخشی خالہ پر برس پڑی۔''اسے خود بولنے دو۔'' پھر وہ دوبارہ نیلم کی طرف مڑی۔''ہاں اب بتاؤ۔ کیا تم رضا سے شادی کرنے جا رہی ہو۔'' اس کا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔

''م' مجھے نہیں معلوم۔'' نیلم سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ وہ پوری جان سے کانپ رہی تھی۔

''مجھے نہیں معلوم' کیا مطلب ہے تمہارا اس سے۔ رضا نے ضرور تم سے اس سلسلے میں بات کی ہو گی۔ ورنہ وہ خالہ سے کیوں ذکر کرتے۔''

''یہ..... یہ شادی نہیں ہو سکتی۔'' بالآخر نیلم رو دی۔

''کیوں نہیں ہو سکتی یہ شادی۔'' خالہ اس کی مدد کو آگے بڑھیں۔''کیا تم کسی سے کم ہو۔''

''یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ.....''

اس سے پہلے کہ نیلم جملہ مکمل کرتی رضا صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور رخشی پر نظر پڑتے ہی مسکراتے ہوئے بولے۔''رخشی تم۔ حیرت ہے۔''

''اس وقت جتنی حیرت زدہ میں ہوں تم نہیں ہو گے۔'' رخشی کا لہجہ برف کی طرح سرد تھا۔''اب میری سمجھ میں آ رہا ہے تم نے مجھ سے ملنا جلنا کیوں ترک کر دیا ہے۔''

رضا صاحب ہنس پڑے اور نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔''میرا خیال ہے' خالہ نے بلی تھیلے سے نکال دی ہے۔ خیر..... کل شہر کے سارے لوگ جان لیں گے کہ میں نیلم سے شادی کر رہا ہوں۔'' پھر وہ پیچ و تاب کھاتی ہوئی رخشی کی طرف مڑے۔''مجھے خوشی ہے کہ اس خبر کو سننے والی تم پہلی ہستی ہو رخشی۔''

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی زور سے چیخ اٹھی۔ سب اس طرف متوجہ ہو گئے پھر خالہ نے بڑھ

کر ریسیور اٹھا لیا لیکن فوراً ہی انہوں نے ریسیور رضا صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”رضا میاں! تمہارا فون ہے۔ فورمین رحمت بات کرنا چاہتا ہے۔“

رضا صاحب نے ریسیور لے لیا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے اور سر ہلاتے رہے۔ ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔ پھر آخر میں انہوں نے یہ کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔ ”میں فوراً پہنچ رہا ہوں رحمت، تم پولیس کو فون کر دو۔“

”کیا کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔“ خالہ نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

”ایسی ویسی گڑبڑ۔ ایک خوفناک حادثہ رونما ہو گیا ہے..... چوکیدار نے کچھ دیر پہلے فورمین رحمت کو اطلاع دی ہے کہ ایک متروک سرنگ میں ایک لاش پائی گئی ہے اور وہ لاش میرے سیکریٹری باقر کی ہے۔“

”لاش! باقر کی! وہ مر گیا ہے!“ بے ساختہ نیلم کے منہ سے نکلا۔ اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جو رخشی اس کی طرف غور سے دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔ رخشی کے چہرے سے شدید حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

”نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔“ نیلم ہذیانی انداز میں بڑبڑائی۔

”چوکیدار دھوکا نہیں کھا سکتا۔“ رضا صاحب، نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”وہ باقر کو اچھی طرح پہچانتا ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا وہ سرنگ کے قریب کیا کرنے گیا تھا۔ بہرحال مجھے فوراً جا کر صورت حال سے نمٹنا ہے۔“

رخشی کو نیلم کا ردعمل بہت عجیب لگا تھا۔ رضا صاحب کی پریشانی سمجھ میں آتی تھی کیونکہ باقر ان کا سیکریٹری تھا اور وہ اپنے عملے کے ایک محنتی فرد سے محروم ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ اس کی موت بھی پراسرار حالت میں ہوئی تھی لیکن نیلم کا ردعمل اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ باقر کی موت کے بارے میں

یہ کر وہ اس قدر نروس اور وحشت زدہ کیوں ہو گئی تھی۔ کیا ان کے درمیان کوئی تعلق تھا۔ تجسس کے جذبے سے اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

”راستے میں تمہارا گھر آئے گا۔ کہو تو تمہیں ڈراپ کر دوں۔“ رضا صاحب، رخشی کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

”شکریہ میرے پاس گاڑی ہے۔“ رخشی نے کہا پھر نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے منہ بنا کر بولی۔ ”ابھی تو میں نے اس لڑکی کو مبارک باد بھی نہیں دی ہے جس سے تم شادی کرنے جا رہے ہو۔“

”میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔“ اچانک نیلم نے رضا صاحب سے کہا۔

”نہیں، تم وہ خوفناک منظر نہ دیکھ سکو گی۔ تم ایک کمزور دل لڑکی ہو۔“

”اچھا تو پھر آپ کو کار تک چھوڑ آؤں۔“ نیلم نے اصرار کیا۔

”ٹھیک ہے۔ ویسے میں جلد آنے کی کوشش کروں گا۔“ رضا صاحب نے کہا اور کمرے سے نکل گئے۔ نیلم بھی ان کے ساتھ ہی گئی تھی۔

نیلم کمرے میں واپس آئی تو خالہ اسے پیار سے مخاطب کرتے ہوئے بولیں۔ ”تم ابھی تک پریشان ہو بیٹا! دیکھو تو چہرہ کیسا سفید پڑا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے میں چائے بنا لاؤں۔“

خالہ چلی گئیں تو رخشی، نیلم کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ”کافی خوفناک خبر ہے۔“

”ہاں۔“ نیلم بڑبڑائی۔ وہ رخشی سے آنکھیں نہیں ملا رہی تھی۔

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ باقر اور تم ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف تھے۔ ایک ساتھ دیکھے جاتے رہے تھے بلکہ تمہارے بارے میں کچھ افواہیں بھی پھیلی تھیں۔ اگر وہ افواہیں ہی تھیں۔“ رخشی کا لہجہ معنی خیز اور زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

”تمہارا مقصد کیا ہے۔“ نیلم، رخشی پر پلٹ پڑی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

”کوئی خاص نہیں۔ بس حیرت ہو رہی تھی کہ تم باقر کی موت کی خبر سن کر بری طرح گھبرا گئی تھیں۔ لگتا ہے جیسے تمہیں اس سے ایک خاص لگاؤ تھا۔“

”تم..... مجھے اس سے نفرت تھی اور.....“ جملہ مکمل کرنے سے پہلے نیلم سنبھل گئی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ”میں جا کر خالہ کا ہاتھ بٹاتی ہوں۔“

رخشی فوراً اس کے راستے میں آ گئی۔ ”تم اس طرح نہیں جا سکتیں۔“ وہ تیز لہجے میں بولی۔ ”خالہ اپنی مدد آپ کر لیں گی۔ وہ تمہاری محتاج نہیں ہیں۔ تم نے ابھی تک مجھے مبارک باد دینے کا موقع نہیں دیا۔“

نیلم کا جسم تن گیا۔ وہ سخت لہجے میں بولی۔ ”میں نہیں سمجھتی کہ تم مبارک باد دینا چاہو گی۔“

رخشی اس تبصرے پر بوکھلا گئی۔ وہ نیلم کو محض ایک گورنس یا رضا صاحب کی ملازم سمجھتی تھی۔ وہ نیلم کو اس سے بڑا درجہ دینے پر تیار نہیں تھی لیکن جب نیلم نے اس سے اس لہجے میں بات کی تو وہ سٹ پٹا گئی۔ ”تمہارے ذہن میں یہ خیال کیوں آیا۔“ اس نے پوچھا۔

”اس لیے کہ تم خود اس گھر کی مالکہ بننے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔“ نیلم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ وہ بہت دیر سے اسے برداشت کر رہی تھی۔

”بدقسمتی سے تمہیں مجھ پر ایک فوقیت حاصل تھی۔“ رخشی ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں شب و روز رضا کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع میسر تھا۔ تم نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر اپنے تمام حربے آزمائے۔“ رخشی مشتعل ہوتی جا رہی تھی..... ”تم نے بچے کے ذریعے ان پر قبضہ جما لیا۔ تم توقع سے زیادہ چالاک ثابت ہوئیں۔ تم نے رضا کو یہ تاثر دیا۔ جیسے دائی تمہارا اپنا بچہ ہے۔ تم نے اپنی سازش کے لیے اس معصوم بچے کو بڑی خوب صورتی سے استعمال کیا۔“

”تم مجھ سے اس لب و لہجے میں بات نہیں کر سکتیں مس رخشی۔“

”میں جس طرح چاہوں گی تم سے بات کروں گی..... تم نے مجھے اور رضا صاحب کو بیک وقت بے وقوف بنایا ہے کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ تم اس قدر شاطر اور چالاک ثابت ہو گی۔“

عین اسی وقت خالہ چائے لے کر آ گئیں۔ انہوں نے فضا پر مسلط تلخی اور کشیدگی محسوس کر لی۔ ”یہاں یہ کیا شروع ہو گیا ہے بھئی۔“ وہ ناگواری سے بولیں۔ انہیں رخشی کبھی اچھی نہیں لگی تھی۔ وہ محض رضا صاحب کی وجہ سے اسے برداشت کرتی آ رہی تھیں۔

خالہ کے استفسار پر کوئی کچھ نہیں بولا۔ نیلم نے چائے کی پیالی اٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ”دائی بہت دیر سے اکیلا ہے اور میں بھی آرام کی ضرورت محسوس کر رہی ہوں۔“ وہ کمرے سے نکل گئی۔

رخشی چپ کھڑی رہ گئی۔ اس نے چائے کی پیالی کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس کے چہرے سے فکرمندی جھلک رہی تھی اور ہونٹ بار بار پھڑک رہے تھے۔

”مجھے بھی کچھ جلدی ہے مس رخشی! بہت سے کام نمٹانے ہیں۔“ خالہ نے بے اعتنائی سے کہا۔

یہ ایک طرح سے کھلا سگنل تھا کہ رخشی اب رخصت ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔ رخشی نے چائے کی پیالی کو ہاتھ میں نہیں لگایا اور پیر پٹختی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

☆☆

سرنگ کے قریب کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جو خواب گاہ میں بے چینی سے

ٹہلتی ہوئی نیلم کے ذہن کو بھسم کیے دے رہا تھا۔ اسے رضا صاحب کی واپسی کا بڑی شدت سے انتظار تھا۔ ان کی واپسی پر ہی اسے اصل صورت حال معلوم ہو سکتی تھی۔ نہ جانے وہ کتنے بار کھڑکی کے قریب گئی کہ رضا صاحب اب آئے اور جب آئے لیکن رضا صاحب کا دور دور تک کوئی پتہ نہ تھا۔ کسی کار کی آواز نہیں سنائی دی۔ کسی کار کی ہیڈ لائٹس نہیں چمکیں۔ بس وقفے سے کسی درماندہ کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے جاتی یا پھر دم بہ دم گہری ہوتی ہوئی رات میں ہوا کا کوئی مست خراب جھونکا کھڑکی کو چھوتا ہوا گزر جاتا پھر دھند نے فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

دانی کی آنکھ کھل گئی تھی، نیلم نے اسے گود میں اٹھا لیا اور دوبارہ سلانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ اس کا اپنا خون تھا، اس نے جھک کر دانی کی پیشانی چوم لی۔ دانی دوبارہ سو گیا تھا۔ اس نے آہستگی سے اسے بستر پر لٹا دیا۔ لٹا کر سیدھی ہوئی تھی کہ باہر کار کی آواز سنائی دی۔ وہ تیزی سے کمرے سے نکلی اور زینہ اترتی ہوئی دوڑ کر نیچے ہال میں آ گئی۔ رضا صاحب آ گئے تھے۔ نیلم پر نظر پڑتے ہی وہ چونکے اور اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ نرمی سے بولے۔ ”تم ابھی تک جاگ رہی ہو۔ کافی رات ہو گئی ہے۔“

”نیند نہیں آ رہی تھی پھر میں نے سوچا کہ آپ کو چائے کی ضرورت ہو گی۔“ اس کی محرابی پلکیں جھک گئی تھیں۔

رضا صاحب نے بھرپور نظروں سے نیلم کی طرف دیکھا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ نیلم ان کے ساتھ ہی کمرے میں آ گئی تھی۔ رضا صاحب کرسی پر بیٹھ گئے تو ٹائی موڑتے ہوئے بولی۔ ”میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

”ضرورت نہیں ہے۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر منع کرتے ہوئے بولے۔

نیلم کچھ دیر سر جھکائے کھڑی رہی پھر دل کڑا کر کے بولی۔

”آخر حادثہ ہوا کس طرح۔“

”بیٹھ جاؤ کھڑی کیوں ہو۔“ رضا صاحب نے ساتھ رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

نیلم بیٹھ گئی تو وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”میں پہنچا تو پولیس وہاں موجود تھی۔ انہوں نے اپنے طور پر کچھ نظریے قائم کیے ہیں، صحیح حالات تو تفتیش مکمل ہونے کے بعد ہی معلوم ہو سکیں گے۔ فی الحال صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ چوکیدار نے لاش دریافت کی تھی۔ لاش کو سرنگ میں پڑے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ موت ریڑھ کی ہڈی ٹوٹنے کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔“

”اس سلسلے میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے۔“ نیلم اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتی ہوئی بولی۔

”حادثے کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔“ رضا صاحب نے کہا پھر نیلم کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ”لیکن تم اس قدر خوف زدہ کیوں ہو۔ اور یہ تمہارا چہرہ کیوں زرد پڑ گیا ہے۔“

”نن..... نہیں تو۔“ نیلم نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”پولیس کی مکمل تفتیش کے بعد ہی کوئی بات سامنے آئے گی۔“

تفتیش کے نتیجے میں یہ بات بھی پولیس کی دانست میں آئے گی کہ باقر اس کا شوہر تھا اور شاید کسی ذریعے سے یہ بھی پتہ لگا لے کہ اس کے ابو باقر سے سرنگ پر ملنے گئے تھے۔

یہ باتیں سوچ کر اس کا دل و دماغ بے کار ہو گیا تھا اور اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا پھر اچانک ہی ایک نئے خیال نے اسے آ لیا۔ اس نے چور نظروں سے رضا صاحب کی طرف دیکھا۔ اگر یہ واقعات رضا صاحب کی دانست میں آ گئے تو میری شخصیت کس قدر مشکوک ہو جائے گی۔

نیلم نے محسوس کیا کہ وہ یہ بات برداشت نہ کر سکے گی۔ چنانچہ بہتر ہے کہ وہ خود اپنے بارے میں ساری باتیں انہیں بتا دے پھر رضا صاحب جو چاہیں کریں، وہ ہر صورت حال بھگتنے کے لیے تیار ہو گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہو گا کہ اسے اس جنت سے نکل جانا پڑے گا مگر اس کا دانی، اس کا اپنا دانی اس کے ساتھ ہو گا۔ وہی تو اس کا اصل سرمایہ ہے۔ وہ ہو گا تو وہ زندگی کے تمام مصائب، تمام سرد و گرم خندہ پیشانی سے جھیل جائے گی تو پھر اب کاہے کا ڈر کیسی احتیاط اور کیسی گھٹن۔

”مجھے آپ سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔“ نیلم دل کڑا کر کے مضبوط لہجے میں بولی۔

”باقر کے بارے میں۔“ رضا صاحب نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”جی ہاں میں سمجھتی ہوں کہ یہ بات آپ کو بتا دینا ہی بہتر ہے۔“ اسے اپنی ہمت اور جرات پر حیرت ہو رہی تھی۔

”مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سب جانتا ہوں۔“ رضا صاحب نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔

”آپ جانتے ہیں۔ مگر کس طرح۔ آپ کو کیسے علم ہوا۔“ نیلم کی سانس شدت جذبات سے رکنے لگی۔

رضا صاحب نے ہاتھ بڑھایا اور نیلم کا شانہ تھپکتے ہوئے بولے۔ ”باقر کی موت کی خبر سن کر تم پر جو کیفیت طاری ہوئی تھی اس سے بہت کچھ ظاہر ہو گیا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ تم باقر کو پسند کرتی تھیں لیکن مجھے تمہارے ماضی سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ اب تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔“

نیلم نے پلکیں اٹھائیں اور رضا صاحب کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ اسے ان کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت کے سمندر موجزن دکھائی دیے۔ اس لمحے اسے رضا صاحب پر بہت رحم آیا۔ اس کا دل، جو رضا صاحب کی محبت سے پہلے ہی سرشار تھا، یکایک چھلک گیا۔ وہ بے خودی اور خود فراموشی کی کیفیت میں کہہ اٹھی ”میں تم سے محبت کرتی ہوں رضا! بہت زیادہ، اتنی زیادہ کہ الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔“

رضا صاحب نے بے اختیار اسے قریب تر کر لیا۔ ”میں یہی سننا چاہتا تھا جانم! یہ لمحہ میری خوشی کا لمحہ ہے۔“

”لیکن رضا! میری بات تو سنو۔“

لیکن رضا صاحب نے اس کی بات نہیں سنی۔ انہوں نے اس کے ہونٹوں پر اپنی شہادت کی انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کی تلقین کی۔ وہ ان کی گرم جوشی سے اپنا وجود اور ثبات کھو بیٹھی پھر اسے اپنی سدھ بدھ نہ رہی لیکن یہ لمحات کچھ زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوئے۔

☆☆

اگلے دن نیلم اپنے والدین کے گھر گئی تو بیگم رحمان اسے دیکھتے ہی بولیں۔ ”بیٹی میں تمہاری ہی منتظر تھی۔“

”دراصل میں ابو سے کچھ معلوم کرنے آئی تھی۔“ نیلم سامنے بیٹھے ہوئے رحمان صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”کہو کیا بات ہے۔“ رحمان صاحب نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔ ”یہی پوچھنا چاہتی ہو نا کہ میں نے رات باقر کو سرنگ میں دھکا تو نہیں دیا۔“

نیلم چونک گئی۔ بیگم رحمان خفگی سے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔“

”کیا رات باقر سے آپ کی کوئی بات ہوئی۔“ نیلم نے دوبارہ ہمت کر کے باپ سے پوچھا۔

”میری اس سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ میں پونے آٹھ بجے گھر سے نکلا تھا۔ دیر تک اس کا

انتظار کرتا رہا لیکن وہ آیا ہی نہیں۔ اس وقت تک کہر اچھی خاصی دبیز ہوگئی تھی۔ میں نے سوچا اس نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ چنانچہ میں واپس چلا آیا۔''

اطمینان کی ایک لہر نیلم کے وجود میں دوڑ گئی تو اس کے ابو باقر کی موت میں ملوث نہیں تھے۔ وہ رات سے خوامخواہ اس قدر پریشان تھی۔

''تم نے ہمیں اس بات سے بے خبر کیوں رکھا کہ تمہاری اور رضا صاحب کی شادی ہونے والی ہے۔'' رحمان صاحب نے تلخ لہجے میں پوچھا۔ ''یہ خبر میں نے آج صبح اخبار میں پڑھی ہے۔''

نیلم گڑبڑا گئی۔ ''مم..... مجھے کل رات خود اس کے بارے میں یقین نہیں تھا۔'' وہ مری ہوئی آواز میں بولی۔

بیگم رحمان فوراً اس کی حمایت کو آگئیں۔ ''اے ہے۔ تو اس میں برائی کیا ہے۔ کہیں نہ کہیں تو شادی ہونی ہی تھی اس کی..... رضا صاحب کیا برے ہیں۔ میں تو سمجھتی ہوں نیلم کی قسمت جاگنے والی ہے۔ وہ رخشی کب سے پھیرے لگا رہی تھی ان کے گھر کے لیکن انہوں نے نیلم کو پسند کیا۔ گھر بیٹھے معقول، مال دار اور عزت دار لڑکا مل رہا ہے اور تم غصہ کر رہے ہو۔''

رحمان صاحب چپ ہوگئے۔ وہ شروع ہی سے بیوی کی داب میں رہے تھے۔ نیلم بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولی۔

''لیکن شادی سے پہلے مجھے ان کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دینا چاہیے۔ انہیں لاعلمی میں رکھنا بددیانتی ہوگی۔''

''یہ بات تو تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھی۔'' رحمان صاحب غرائے۔

''میں نے کئی بار کوشش کی لیکن میرا منہ نہ پڑا۔ اب ان باتوں کا چھپانا میرے حق میں اچھا نہ ہوگا۔'' نیلم سر جھکائے ہوئے بولی۔

''میری اور باقر کی شادی چھپی نہ رہ سکے گی۔ پولیس تفتیش کے دوران یہ بات ضرور معلوم کر لے گی۔ اسے باقر کے گھر سے کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور مل جائے گا پھر بہت برا ہوگا۔ میں ابھی مارٹل ہاؤس جاتے ہی سب کچھ رضا صاحب کو بتا دوں گی۔ وہ تمام باتیں بھی بتا دوں گی جو میں نے آپ کو بھی نہیں بتائی ہیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا۔'' بیگم رحمان چیخ اٹھیں۔ ''کیا بتانے کو اب بھی کچھ باقی ہے۔''

نیلم کی نگاہ بستر پر مرکوز ہوگئی جہاں دانی گہری نیند سو رہا تھا۔ نیلم نے ارادہ کیا کہ وہ دانی کے بارے میں انہیں سب کچھ بتا دے لیکن اسی وقت بیرونی دروازے پر دستک سنائی دی۔

رحمان صاحب اٹھ کر باہر چلے گئے اور جب وہ کمرہ نشست میں واپس آئے تو تنہا نہیں تھے، ان کے ساتھ پولیس کے دو آدمی تھے۔

نیلم اور بیگم رحمان نے پردہ سرکا کر کمرہ نشست میں دیکھا اور دھک سے رہ گئیں۔ انہوں نے اندر ہونے والی گفتگو پر کان لگا دیے۔

دفعتہً پولیس افسر نے جیب سے ایک ڈبا نکالا اور رحمان صاحب کو دکھاتے ہوئے بولا۔ ''کیا آپ اسے پہچانتے ہیں۔''

دروازے کے دوسری طرف کھڑی ہوئی بیگم رحمان اور نیلم کے دل کی دھڑکن گویا رک گئی۔ وہ اس ڈبے کو اچھی طرح پہچانتی تھیں۔ وہ رحمان صاحب ہی کا ڈبا تھا۔ وہ اس میں تمباکو رکھتے تھے ڈبا دیکھ کر رحمان صاحب کا چہرہ بھی متغیر ہوگیا تھا۔

''یہ ڈبا ہمیں اس سرنگ کے پاس ملا تھا جہاں مسٹر باقر کی موت واقع ہوئی تھی۔ آپ وہاں کیا کرنے گئے تھے۔'' پولیس افسر رحمان صاحب سے پوچھ رہا تھا۔

''دیکھو آفیسر!'' رحمان صاحب نے بولنا شروع کیا۔ ''میں اس سرنگ تک تو نہیں گیا البتہ چہل قدمی کے سلسلے میں اس طرف سے گزر ضرور تھا لیکن گہری کہر کی وجہ سے جلد ہی واپس

آ گیا۔ غالباً اس دوران میں ڈبا بھی وہیں کہیں گر پڑا ہوگا۔'' وہ رکے اور پھر توقف کے بعد احتجاج کے انداز میں بولے۔ ''تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا میں نے باقر کو سرنگ میں دھکا دیا ہے۔''

''یہ بات نہیں ہے رحمان صاحب۔ ابھی حتمی طور پر کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا اور پھر یہ ایک رسمی کارروائی ہے۔ اس بات کا واضح ثبوت موجود ہے کہ آپ رات کو حادثے سے کچھ پہلے یا بعد وہاں موجود تھے۔ اس لیے آپ سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔ ایک معزز اور امن پسند شہری کی حیثیت سے قانون سے تعاون کرنا آپ کے فرائض میں شامل ہے۔ کیا آپ نے سرنگ کے آس پاس کسی کو دیکھا تھا۔''

''کہر اتنی دبیز تھی کہ میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''رات آپ کس وقت چہل قدمی کے لیے نکلے تھے۔ میرا مطلب ہے جب آپ سرنگ کے پاس سے گزرے تھے تو کیا وقت رہا ہوگا۔'' پولیس افسر نے پوچھا۔

''ساڑھے آٹھ کا عمل ہوگا۔'' رحمان صاحب نے جواب دیا۔

''ڈاکٹر نے قتل یا حادثے کا یہی وقت متعین کیا ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے آفیسر یہ حادثہ ہے یا قتل۔'' رحمان صاحب نے پوچھا۔

''میں نے عرض کیا نا کہ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تفتیش جاری ہے۔ دیکھیے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ ممکن ہے میں آپ کو دوبارہ بھی زحمت دوں۔ تعاون کا شکریہ۔''

پولیس افسر اور اس کے نائب کے جاتے ہی بیگم رحمان نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''اگر وہ تفتیش کے دوران تمہاری اور باقر کی شادی کے بارے میں معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئی تو تمہارے ابو باقر کے حادثے میں ملوث نہیں سمجھے جائیں گے۔ پولیس یہی نتیجہ اخذ کرے گی کہ تمہارے ابو باقر سے ملنے گئے تھے اور گفتگو کے دوران مشتعل ہو کر اسے سرنگ میں دھکا دے دیا۔'' وہ نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے باقاعدہ رو دیں پھر وہ نیلم سے مخاطب ہوئیں۔

''بیٹی! تم رضا صاحب کو اپنی شادی کے بارے میں نہیں بتاؤ گی۔ تمہاری اور باقر کی شادی کی بات کھلی تو پولیس کا شبہ تمہارے ابو پر جائے گا پھر ان کا بچنا محال ہو جائے گا۔'' بیگم رحمان، نیلم کی طرف التجا بھری نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔

''لیکن امی ابو نے باقر کو قتل نہیں کیا۔ وہ ایسی حرکت نہیں کر سکتے۔''

''تمہاری ناکام شادی کی بات کھلنے پر شبہ انہی کی طرف جائے گا کہ انہوں نے مشتعل ہو کر نالائق داماد کو ہلاک کر دیا۔''

''لیکن میں رضا صاحب کو تاریکی میں رکھ کر ان سے شادی نہیں کر سکتی۔''

''بیٹی یہ تمہارے باپ کی زندگی کا سوال ہے۔'' بیگم رحمان رو دیں۔ ''اتنی سنگدل نہ بنو۔ اپنی ماں پر یہ ظلم تو نہ کرو۔''

''اچھا امی! جیسی آپ کی مرضی۔'' نیلم نے سر جھکا دیا۔

☆☆

وہ دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ اندر کا منظر اس کے سامنے تھا اور گفتگو بھی اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہی پولیس افسر جو تفتیش کے سلسلے میں اس کے والد کے پاس آیا تھا۔ اس وقت مارٹل ہاؤس میں موجود تھا۔ کمرے میں رضا صاحب کے علاوہ پولیس افسر اور اس کا نائب بھی تھا۔ چند رسمی باتوں کے بعد پولیس افسر نے رضا صاحب سے باقر کی موت کے سلسلے میں چند سوالات کرنے کی اجازت چاہی۔ رضا صاحب نے اسے سر کے اشارے سے اجازت دی۔

''آپ نے اپنے سیکریٹری مسٹر باقر کی لاش شناخت کر لی تھی۔ کیا آپ کو اس پر حیرت نہیں ہے

کہ وہ رات کو جب کہ گہری کہر چھائی ہوئی تھی سرنگ کے قریب گیا تھا۔'' پولیس افسر نے پوچھا۔

''ہوسکتا ہے وہ ٹہلتے اس طرف نکل گیا ہو۔اس سلسلے میں میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''آپ کی دانست میں کوئی ایسا شخص جس سے اس کی دشمنی ہو یا حال ہی میں کسی سے لڑائی جھگڑا ہوا ہو۔''

''مجھے تو کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو اس کی جان کا..... خواہاں ہو۔''

''شکریہ رضا صاحب!'' پولیس افسر نے کہا اور جانے کی تیاری کرنے لگا۔رضا صاحب نے اصرار سے انہیں چائے پینے کے لیے روکا۔باتوں باتوں میں رضا صاحب نے پوچھا۔''مسٹر آفیسر' اب تک کی تفتیش کے بارے میں تو کچھ بتاؤ۔''

''جناب بہت سے نکات ایسے بھی ہیں جن پر غور کیا جاسکتا ہے۔سب سے پہلے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ' ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق سرنگ میں گرنے اور ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جانے سے موت واقع ہوئی ہے۔پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ باقر کو کسی نے قتل کر کے سرنگ میں ڈال دیا ہو۔اس سلسلے میں ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ سرنگ میں گرنے کے بعد ہی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹنے سے موت واقع ہوئی ہے۔اس کے بعد ایک اور چیز بھی سامنے آتی ہے وہ ہے باقر کے معدے سے بہت زیادہ مقدار میں شراب کا پایا جانا' ہم نے شہر کے تمام شراب خانے چیک کیے۔آخر رین بوبار سے یہ بات معلوم ہوئی..... کہ باقر شام ہی سے شراب پیتا رہا۔بہت زیادہ شراب پی جانے کی وجہ سے وہ نشے میں دھت ہوگیا۔اسی مدہوشی میں اس نے بکنا جھکنا شروع کر دیا۔قریب بیٹھے لوگوں نے سنا وہ کہہ رہا تھا۔آج میں بہت خوش ہوں۔مجھ سے آج ایک لڑکی نے ملنے کا وعدہ کیا ہے لیکن نہ ہی اس نے لڑکی کا نام لیا اور نہ ہی کسی نے لڑکی کے بارے میں پوچھا۔''

دروازے سے لگی ہوئی نیلم کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔خنکی کے باوجود اس کا جسم پسینے میں نہا گیا۔وہ ہسٹریائی کیفیت میں گفتگو کے اگلے مرحلے کا انتظار کرنے لگی۔

پولیس افسر کہہ رہا تھا۔''اتنی زیادہ شراب پینے کے بعد انسان خود پر قابو نہیں رکھ سکتا اور پھر اتنی شدید کہر میں کہیں بھی بھٹک اور گر سکتا ہے۔ہم نے ان کے گھر کی تلاشی بھی لی لیکن کوئی ایسی چیز نہ مل سکی جس سے ان کے عزیز و اقارب کے بارے میں پتہ چلتا۔ان کے قریبی دوستوں اور ملنے والوں سے بھی معلومات حاصل کیں لیکن وہ اس کے کسی قریبی یا دور کے عزیز کی نشان دہی کرنے سے قاصر رہے۔''

ایک بار پھر گویا سوکھی کھیتی ہری ہوگئی۔نیلم پل پل دہشت اور خوف کے جہنم سے گزر رہی تھی۔وہ لمحہ لمحہ مر رہی تھی' جی رہی تھی۔ایک عذاب تھا جو اس کے سر پر سے گزر رہا تھا پھر اسے اس وقت قرار آ گیا جب پولیس افسر نے اپنے کاغذات سمیٹتے ہوئے آخری بات کہی۔''رضا صاحب! اب شواہد کی روشنی میں میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں مسٹر باقر کی موت کو اتفاقی اور حادثاتی قرار دے کر داخل دفتر کر دوں۔''

قصہ ختم ہوگیا تھا۔وہ ڈراؤنا خواب اختتام کو پہنچ گیا تھا۔جس نے اسے سولی پر لٹکا رکھا تھا۔نیلم کا جی چاہا کہ وہ اچھلے کودے' ناچے گائے۔اب وہ ایک پرندے کی طرح آزاد تھی۔اس کے راستے کی ساری رکاوٹیں' سارے کانٹے دور ہوگئے تھے۔اس کی زندگی کی سیاہ رات تمام ہوئی تھیں اور ایک درخشاں مستقبل سامنے تھا۔

☆☆

نیلم بہت خوش تھی۔وہ دوڑ کر خالہ سے لپٹ گئی۔خالہ گرتے گرتے بچیں۔''پاگل ہوئی ہے لڑکی!'' وہ پیار سے بولیں۔

''آج میں بہت خوش ہوں خالہ! دانی نے بولنا سیکھ لیا ہے۔آج اس نے پہلا لفظ منہ سے نکالا ہے۔جانتی ہو اس نے کیا کہا تھا۔وہ پہلا لفظ کیا تھا۔''

''میں کیا جانوں تو بتا۔''

''اس نے امی کہا تھا۔امی۔'' یہ کہتے ہوئے نیلم کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔وہ ایک بار پھر خالہ سے لپٹ گئی۔

''تو..... تو اس کی امی ہی تو ہے۔'' خالہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔''تو نے اسے ماں بن کر پالا ہے۔وہ تجھے ماں ہی سمجھتا ہے اور اب کچھ دن بعد تو سچ مچ کی ماں بن جائے گی۔''

وہ خالہ کو چھوڑ کر لائبریری کی طرف بھاگی تاکہ رضا صاحب کو کائنات کا سب سے خوب صورت لفظ سنائے۔رضا صاحب اسے دیکھ کر کھڑے ہوگئے اور غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔

''کیا بات ہے خوشی سے بے حال ہوئی جا رہی ہو۔''

''خوشی کی بات ہی ہے۔ابھی کچھ دیر پہلے دانی نے مجھے امی کہا ہے۔'' وہ ہانپتی ہوئی بولی۔

''میں سمجھتا ہوں تمہارے روپ میں اسے کوئی بہتر ماں اور مجھے بہتر بیوی نہیں مل سکتی۔'' رضا صاحب مسکراتے ہوئے بولے اور بوڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اسی وقت خالہ کمرے میں داخل ہوئیں۔نیلم جلدی سے الگ ہٹ گئی۔

''رخشی آئی ہے رضا میاں! وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔'' انہوں نے اطلاع دی۔

ناگواری سے رضا صاحب کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔''بھیج دو۔'' بالآخر وہ بولے۔

کچھ دیر بعد رخشی کمرے میں داخل ہوئی۔رضا صاحب رسمی طور پر بولے۔''بہت دن بعد دکھائی دی ہو رخشی۔''

''بس ذرا مصروف رہی۔'' رخشی نے سرسری انداز میں کہا۔پھر اس نے نیلم پر نگاہ ڈالی۔''دراصل میں تم سے ملنے آئی تھی۔''

''بڑی مہربانی مس رخشی!'' نیلم نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

''میں نے سوچا تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ تمہاری ایک دوست سے میری ملاقات ہوئی ہے۔'' رخشی معنی خیز انداز میں بولی۔

نیلم کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے لیکن وہ خاموش رہی۔رخشی' رضا صاحب سے مخاطب ہو کر بولی۔

''میری چچا زاد بہن دارالحکومت سے آئی ہے۔وہ ڈاکٹر ہے اور ایک میٹرنٹی ہوم چلاتی ہے۔وہ نیلم سے اچھی طرح واقف ہے۔'' رخشی نے کن انکھیوں سے نیلم کی طرف دیکھا۔نیلم کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔رخشی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔''اس نے اخبار میں تمہاری اور نیلم کی شادی کی خبر پڑھی تو مجھ سے نیلم کے بارے میں پوچھ بیٹھی پھر اس نے نیلم کو دیکھ کر پہچان لیا۔اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ نیلم کو دوسری شادی کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔کیا اس کے شوہر نے اسے طلاق دے دی ہے۔''

''یہ کیا بکواس لے بیٹھیں تم۔'' رضا صاحب برہمی سے بولے۔

''یہ بکواس نہیں حقیقت ہے۔'' رخشی تیز ہو کر بولی۔''کہو تو اس کو بلوا کر اس بات کی تصدیق کرادوں۔'' پھر وہ سراسیمہ نیلم کو مخاطب کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولی۔''تمہیں چپ کیوں لگ گئی ہے۔تم بھی تو کچھ بولو۔''

''میں تم کو نیلم کی توہین کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔'' رضا صاحب برہمی سے بولے۔''یہ الزام تراشی تم محض حسد کی وجہ سے کر رہی ہو۔''

''آپ اسے کیوں نہیں بولنے دیتے۔'' رخشی زہر خند کے ساتھ بولی۔''اس نے اب تک میرے کسی الزام کی تردید نہیں کی ہے۔''

''اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔محض نیلم کو ذلیل کرنے کے لیے تم نے ایک بے بنیاد کہانی گھڑی ہے۔'' رضا صاحب غصے میں دھاڑے۔

نیلم کا برا حال تھا۔ اسے اپنے خواب جلتے اور جنت تباہ ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ بخ ہو کر رہ گئی۔

”کیا تمہارے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے نیلم۔“ رخشی، نیلم سے مخاطب ہوئی۔ ”تمہاری خاموشی معنی خیز ہے۔ بہتر یہی ہے، تم اقرار کر لو کہ تم رضا صاحب کو دھوکا دے رہی ہو، اس گھر پر قبضہ جمانے کے لیے تم نے بڑا گھٹیا اور گھناؤنا طریقہ اختیار کیا ہے۔“

”میں کہتا ہوں نکل جاؤ میرے گھر سے۔“ رضا صاحب دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخ اٹھے۔

رخشی نے گہری سانس لی۔ ”مجھے غلط مت سمجھو رضا! میں یہاں صرف اس لیے آئی ہوں کہ تمہیں ایک غلط اور فریبی لڑکی سے شادی کرنے سے روک دوں۔“

”پلیز تم یہاں سے چلی جاؤ۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ تم کیا کہے چلی جا رہی ہو۔“ رضا صاحب کا لہجہ ملتجیانہ تھا۔

”نیلم صاحبہ آپ ہی کچھ فرمائیں۔ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے آپ گونگی بہری ہوں۔“ رخشی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”میں بتاتی ہوں کہ اس کی زبان تالو سے کیوں لگ گئی ہے۔ رضا صاحب جب آپ کو حقیقت معلوم ہوگی تو آپ بھی سر پکڑ کے رہ جائیں گے۔“

رضا صاحب بری طرح الجھ گئے تھے۔ وہ نیلم کی طرف مڑے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ”یہ سب کیا ہے نیلم۔ یہ رخشی کیا قصہ لے بیٹھی ہے۔“

نیلم کرسی پر گر گئی۔ اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور ٹوٹی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں، میں تم سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“

”مجھے یہی توقع تھی کہ یہ تم سے یہی کہے گی۔ جو کچھ یہ آپ سے تنہائی میں کہنا چاہتی ہے مجھ سے سنو۔ اس نے باقر سے خفیہ شادی کر لی تھی۔ اس شادی کے نتیجے میں ایک بچہ بھی وجود میں آیا لیکن یہ تمام باتیں اس نے تم سے چھپائیں۔ مجھے باقر کی موت بھی ایک سازش نظر آ رہی ہے۔ باقر کی موت سے اس کا راستہ صاف ہو گیا ہے۔ اس نے بڑی عیاری سے اس بچے کی گورنس کی جگہ حاصل کی پھر تم پر قبضہ کیا۔ جس کے نتیجے میں اب تم دونوں کی شادی ہونے والی ہے۔ سنو! رضا صاحب، تم مجھ سے شادی کرو یا نہ کرو۔ مجھے کوئی لالچ نہیں ہے۔ لیکن دیرینہ مراسم کی وجہ سے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ تمہیں اس فریب سے آگاہ کر دوں۔“

رضا صاحب کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ سے سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے خالی خالی نظروں سے نیلم کی طرف دیکھا اور کھوکھلی آواز میں بولے۔

”کیا یہ سچ ہے نیلم۔“

”م م...... میں نے باقر کو ہلاک نہیں کیا۔“ وہ اٹکتے ہوئے بولی۔

”اس رات تو خود میری زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ آپ تو اس کے گواہ ہیں۔“

”کیا تم باقر سے اپنی شادی کے سلسلے میں تردید کر سکتی ہو۔ کیا وہ تمہارا شوہر نہیں تھا۔“ رضا صاحب نے بڑے کرب سے نیلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

نیلم کی آنکھیں جھک گئیں۔ رضا صاحب کو جواب مل گیا تھا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اضطرابی کیفیت میں ٹہلنے لگے پھر رک کر دکھی لہجے میں بولے۔ ”کاش یہ بات تم مجھے پہلے ہی بتا دیتیں نیلم۔“

نیلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ یہ سب کچھ اس نے اپنے بچے کے لیے کیا تھا۔ بہرحال یہ بات اب بھی اس کے لیے باعث اطمینان تھی کہ رخشی، رضا صاحب اور خود اس کے والدین اس بات سے بے خبر تھے کہ دانی اس کا اپنا بیٹا ہے، جس کی خاطر وہ یہ ذلت جھیل رہی تھی۔

”اور تمہارا وہ بچہ کہاں ہے۔“ رضا صاحب کی آواز ابھری۔

”وہ وہ مر گیا ہے۔“ نیلم سسکتے ہوئے بولی۔

کمرے میں ایک تکلیف دہ خاموشی چھا گئی۔ رخشی نے بھی اب سکوت اختیار کر لیا تھا۔ نیلم اٹھ کھڑی ہوئی اور رضا صاحب کو مخاطب کرتے ہوئی بولی۔ ”اب آپ کی رسائی حقیقت اور سچائی تک ہو گئی ہے۔ خدا حافظ۔“

نیلم کے جانے کے بعد رضا دیر تک دروازے کے خلا میں گھورتے رہے پھر وہ مڑے اور رخشی کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

”نیلم میری شریک حیات نہیں بن سکی لیکن وہ میری محبت ضرور ہے اور میرے دل میں زندہ رہے گی۔ ہو سکتا ہے اس گھر کے دروازے اس کے لیے بند ہو گئے ہوں لیکن دل کے دروازے بند نہیں ہوئے۔“ ان کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”جو اطلاع تم نے مجھ تک پہنچائی ہے اس کی کیا قیمت ادا کروں۔ کاش تم یہ اطلاع مجھ تک نہ پہنچاتیں۔ بعض حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان پر پردہ پڑا رہنا ہی اچھا ہوتا ہے لیکن تم نے یہ نہیں چاہا۔ بہرحال اب تم جا سکتی ہو۔“

☆☆

نیلم مایوس و دل شکستہ اپنی سہیلی کے پاس دارالحکومت لوٹ آئی تھی اور اب اسے یہاں رہتے ہوئے دو مہینے ہو گئے تھے۔ اس عرصے میں اسے بیگم رحمان کے خطوط برابر ملتے رہے تھے۔ وہ اس بات سے مطمئن تھی کہ دانی ماربل ہاؤس میں بڑے ناز و نعم سے پل رہا تھا۔ خالہ اور خود رضا صاحب اس پر پوری توجہ صرف کر رہے تھے۔ ان کے خط سے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ رخشی متواتر ماربل ہاؤس کے چکر لگا رہی تھی لیکن رضا صاحب تو جیسے بے حس ہو کر رہ گئے تھے۔ اب وہ بہت تبدیل ہو گئے تھے اور شاید صرف دانی کے لیے جی رہے تھے پھر ایک دن نیلم کو امی کا بڑا وحشت ناک خط ملا۔ وہ کانپ کر رہ گئی۔ انہوں نے لکھا تھا۔ ”بیٹی! میں نے ایک بات شروع سے لکھنے سے گریز کیا تھا۔ محض اس لیے کہ تم پریشان ہو جاؤ گی۔ بات یہ ہے کہ جس دن تم نے ماربل ہاؤس چھوڑا، دانی اسی دن سے بیمار ہے۔ اب اس کی حالت بہت خراب ہے۔ چند دن کا مہمان معلوم ہوتا ہے۔ ہو سکے تو فوراً واپس آؤ۔ شاید تمہاری وجہ سے یہ ننھی جان بچ جائے۔ تاکید ہے کہ فوراً واپس آؤ۔“

خط پڑھ کر نیلم پر غشی طاری ہو گئی جس کی خاطر وہ سب کچھ جھیل رہی تھی۔ بدنام ہوئی تھی۔ دیس نکالا ملا، وہی رخصت سفر باندھ رہا ہے نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ بلک کر رو دی۔ ”نہیں دانی نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔“

اس نے اپنی سہیلی کو صورت حال کی نزاکت بتائی اور مختصراً سامان پیک کر لیا۔ آنکھوں میں کئی راتوں کی نیند اور دل پر پہاڑ جیسا بوجھ لیے وہ جمشید نگر پہنچی اور جب وہ ماربل ہاؤس میں داخل ہوئی تو صبح طلوع ہو چکی تھی۔ رضا صاحب نے اسے حیرت اور دکھ سے دیکھا اور پھر ان کی سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ ”کیا لینے آئی ہو۔“ وہ نظریں پوچھ رہی تھیں۔

”ایک نظر دانی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔“ وہ گڑگڑاتے ہوئے بولی۔

”لیکن کیوں۔ اب تم اس کی گورنس تو نہیں ہو۔“

”بس ایک نظر۔ ذرا دیر کے لیے۔“ وہ سسک پڑی۔

”میں پھر وہی سوال دہراؤں گا۔ آخر کیوں۔ تمہارا اس سے کیا رشتہ۔ کیا تعلق ہے۔“

”میں اس کی ماں ہوں۔ وہ میرا بیٹا ہے۔ حقیقی بیٹا، میرا لال میرا جگر گوشہ۔“ وہ پھٹ

پڑی۔ ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ وہ جسم و جاں سے بری طرح کانپ رہی تھی اور مجسم التجا بن گئی تھی۔

رضا صاحب دکھ' حیرت اور کرب کی تصویر بن کر رہ گئے تھے۔ یہ ان کے لیے انکشاف تھا۔

''میں ہی اپنے بچے کو آپ کے دروازے پر ڈال گئی تھی۔ میں اسی کی خاطر گورنس بن کر آپ کے دروازے پر آئی تھی۔'' وہ مجسم آنسوؤں میں ڈھل گئی۔ ''پلیز! مجھے اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے دیں۔ مجھ پر رحم کریں' ایک ماں پر رحم کریں' میرا بچہ مر جائے گا..... اسے دیکھ لینے دو۔''

اس نے جھک کر رضا صاحب کے پیر پکڑ لیے۔ رضا صاحب کو اپنے پیروں پر آنسوؤں کی نمی محسوس ہوئی۔ انہوں نے جھک کر نیلم کو اٹھایا اور ایک طرف ہٹ گئے۔

نیلم بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔ پلک جھپکتے میں وہ مطلوبہ کمرے میں پہنچ گئی۔ سامنے دانی چادر میں لپٹا بستر پر پڑا تھا۔ خالہ اس کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس نے دانی کو اٹھا لیا اور بوسوں کی بارش کر دی۔ سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ وہ کیسی آگ تھی جو ٹھنڈی ہی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ کیسی مٹھاس تھی جس سے سیری ہی نہ ہوتی۔ دفعتاً دانی نے آنکھیں کھول دیں۔ نیلم کا چہرہ محویت سے تکتا رہا پھر آہستہ سے بول پڑا۔ ''امی۔''

''میرے بچے میرے لال۔'' نیلم نے اپنا بھیگا ہوا چہرہ دانی کے تپتے ہوئے چہرے پر رکھ دیا۔

رضا صاحب نے دانی کے مکمل طور پر صحت یاب ہونے تک نیلم کو حویلی میں ٹھہرنے کی اجازت دے دی تھی اور دانی تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ نیلم نے اپنے والدین کو دانی کی حقیقت کے بارے میں بتا دیا تھا۔ پہلے وہ حیرت زدہ ہوئے تھے اور پھر اس خوب صورت اور معصوم حقیقت کو قبول کر لیا تھا۔

ایک شام نیلم' دانی کو لے کر اپنے گھر پہنچی تو والدین کو غیر معمولی طور پر مسرور پایا۔ بیگم رحمان نے لپک کر نواسے کو گود میں لے لیا اور پیار کرتے ہوئے نیلم سے بولیں۔ ''ذرا میرے ساتھ آنا۔''

وہ نیلم کو اس کے کمرے میں لے گئیں جہاں ایک مدت سے اسی سونا نصیب نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کمرے کو دیکھ کر سکتے میں رہ گئی۔ اس کمرے میں وہ تمام ساز و سامان قرینے اور اور نفاست سے سجا ہوا تھا جو ماربل ہاؤس میں اس کے اور دانی کے کمرے میں لگایا گیا تھا۔

''یہ کیا ہے امی۔'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''بیٹی! آج صبح رضا صاحب ہم لوگوں سے ملنے آئے تھے۔ انہوں نے کہا ہے کہ تم دانی کو لے کر اپنے گھر منتقل ہو سکتی ہو۔ انہوں نے دانی کو تمہیں دے دیا ہے۔ ایک ماں کو اس کا بچہ لوٹا دیا ہے اب تم اور دانی یہیں رہو گے۔ انہوں نے خالہ کو پینشن دے دی ہے اور ماربل ہاؤس کو منتقل کر کے ایک طویل عرصے کے لیے باہر جا رہے ہیں۔''

نیلم چکرا کر رہ گئی۔ جانے کیا ہوا کہ دل اندر ہی اندر کٹنے لگا۔

''میرا خیال ہے وہ اسٹیشن روانہ ہو چکے ہوں گے۔'' بیگم رحمان نے کہا پھر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولیں۔ ''اچھے اور دردمند انسان ہیں' یہ رضا صاحب بدقسمتی دیکھو کہ سب کچھ ہے ان کے پاس' ایک خوشی نہیں ہے۔''

نیلم کچھ کہے بغیر گھر سے نکلی اور تیزی سے ماربل ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئی لیکن راستے میں خیال آیا کہیں وہ اسٹیشن نہ پہنچ چکے ہوں اور جب وہ اسٹیشن پہنچے تو گاڑی جا چکی ہو۔ وہ فوراً اسٹیشن کی طرف چل پڑی۔

پلیٹ فارم پر رضا صاحب نہیں دکھائی دیے تو نیلم کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی پھر اس کی نگاہ ویٹنگ روم کی طرف اٹھ گئی۔ وہ اس طرف بڑھی اور

ویٹنگ روم میں داخل ہو گئی۔

رضا صاحب ویٹنگ روم میں موجود تھے اور تنہا تھے۔

رضا صاحب نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ کوئی ہلچل نہیں ہوئی۔ چہرہ سپاٹ ہی رہا۔ ''تم یہاں کیا کر رہی ہو۔'' انہوں نے پوچھا۔

''میں' میں اپنے گھر سے آ رہی ہوں۔ امی نے بتایا کہ آپ یہاں سے جا رہے ہیں۔''

''تو پھر.....''

آگے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ وہ کسمساتے ہوئے بولی۔ ''آ..... آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے۔''

''شکریہ کس بات کا۔'' انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''وہ تمہارا بیٹا ہے۔ اس پر تمہارا حق ہے۔''

''اس پر آپ کا حق نہیں ہے۔ وہ آپ کا بیٹا نہیں ہے۔'' اس نے پر امید نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

رضا صاحب کھوکھلی ہنسی کے بعد خاموش رہے۔

''اگر ایسا نہیں ہے تو آپ اس کہر کی رات اسے ڈھونڈنے کیوں نکلے تھے۔ گم ہو جانے دیتے اسے۔ وہ آپ کا بچہ تو نہیں تھا۔''

رضا صاحب کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''ٹرین کا وقت ہو گیا ہے۔'' انہوں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ لیکن نیلم نے ان کی آنکھوں میں دل کا چور دیکھ لیا تھا۔ وہ ان کے راستے میں آ گئی۔ ''رضا! نہ جاؤ میری خاطر نہ سہی دانی کی خاطر نہ جاؤ۔ مجھ سے نہ سہی' تمہیں دانی سے تو محبت ہے۔ میری طرح وہ تم سے بھی بہت مانوس ہے۔ تم چلے جاؤ گے تو وہ تمہاری یاد میں تڑپے گا اور شاید بیمار ہو جائے۔ کیا تمہیں اس سے محبت نہیں ہے۔ اس کی زندگی عزیز نہیں ہے۔''

ٹرین پلیٹ فارم پر آ چکی تھی۔

''خدا حافظ نیلم!'' رضا صاحب نے آگے بڑھنا چاہا لیکن نیلم ان کے راستے میں کھڑی ہو گئی۔

''رضا! حالات کے جبر کی اتنی بڑی سزا تو مجھے نہ دو۔ جو کچھ ہوا' اسے نوشتہ تقدیر سمجھ کر مجھے معاف کر دو۔ میں بہت منتشر ہو چکی ہوں۔ تمہارا جانا برداشت نہ کر سکوں گی۔ دانی ایک بار پھر بغیر ماں باپ کے رہ جائے گا۔ ماربل ہاؤس کے دروازے سے اٹھایا ہوا بچہ ایک بار پھر سائبان سے محروم ہو جائے گا۔''

رضا صاحب نے نیلم کو بازو سے پکڑا اور ایک طرف ہٹا دیا۔

نیلم خشک پتے کی مانند کانپ کر رہ گئی۔ اس نے رضا صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا اور زم خوردہ لہجے میں بولی۔ ''اچھا تو میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ دانی کو میں نے اس کی قسمت پر چھوڑا کہ اس بھٹکی ہوئی معصوم روح کا یہی مقصد تھا۔''

''نہیں۔'' یک لخت رضا صاحب چونک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ ''یہ نہیں ہو سکتا۔''

''تو بتاؤ پھر میں کیا کروں۔'' نیلم بے اختیار رو دی۔ ''کیا کروں۔ کیا مجھ سے بھی زیادہ کوئی ماں بدنصیب عورت ہو گی۔''

''تم بدنصیب نہیں ہو نیلم!'' رضا صاحب کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ انہوں نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ''ماربل ہاؤس کو تمہاری' دانی کی اور میری ضرورت ہے۔''

''اور مجھے تمہاری اور دانی کی ضرورت ہے۔'' نیلم نے سرشاری سے کہا پھر رضا صاحب کے سینے پر سر رکھ دیا۔

انجن نے دوسری وسل دی اور ٹرین حرکت میں آ گئی۔ دور پہاڑوں پر کہر دبیز ہوتی جا رہی تھی۔

کاروان

ایم اے راحت

اگر جہد مسلسل کی جائے تو کچھ بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ہر معاشرے میں بعض واقعات ایسے ضرور ہوتے ہیں کہ جن کے متعلق کسی کو بھی علم نہیں ہوتا۔ مشرق میں ایسے بے شمار واقعات موجود ہیں کہ جن کی بارے میں بہت کم لوگوں کو علم ہے۔

وہ خاندانی وقار رکھتا تھا۔ وہ ناتجربے کار تھا، مگر معاشرے نے اسے بہت کچھ سکھادیا، وہ جو کچھ بننا چاہتا تھا، وقت اسے کچھ اور ہی سمجھانا چاہتا تھا، اس نے اپنے ضمیر کے خلاف کسی فیصلے کو قبول نہیں کیا تھا، البتہ دُنیا اسے کچھ اور سکھانا چاہتی تھی، وہ اپنے گھر سے بلند و بانگ دعوے کر کے نکلا تھا کسی گھٹیا پن کو قبول نہیں کرنا چاہتا تھا۔

زندگی کی پر پیچ راہوں کے مسافر کی تلخ و شیریں داستان

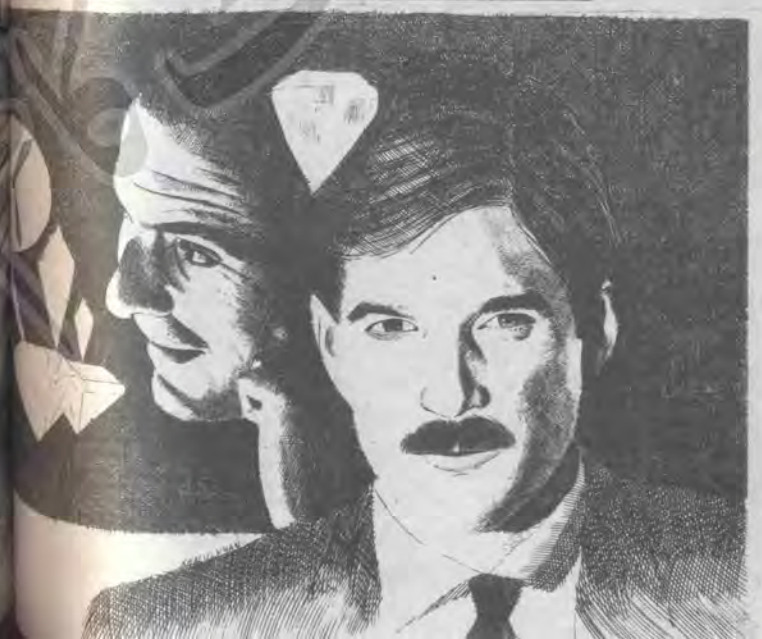

بے شک مجھے ان معصوم بہن بھائیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن بہرحال وہ تو اس سارے معاملے میں بالکل ہی بے قصور تھے۔ یہ تو بہت ہی برا ہوا ہے۔ افسوس یہ تو بہت ہی برا ہوا ہے۔ وہ متضاد کیفیات کا شکار رہا پھر شاہینہ ہی نے اسے جگایا تھا۔

''سوتے رہو گے' کیسی طبیعت ہے اب۔''

''میں واقعی سو گیا تھا۔'' اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔ شاہینہ کی قربت سے اسے خوف سا محسوس ہونے لگا لیکن بہرحال اب وہ اس قدر احمق بھی نہیں تھا کہ اس خوف کا اظہار شاہینہ پر کر دیتا' اس نے کہا۔

''بس ٹھیک ہے طبیعت۔ ایسا کرنا شاہینہ! دو چار جوڑے کپڑے نکال دینا' تین دن کے لیے کافی ہوں گے۔ ایک چھوٹے سے سوٹ کیس میں دیگر ضروریات کی چیزیں بھی رکھ دینا۔''

''میں سب کر دوں گی۔ کیا اپنی گاڑی سے جاؤ گے۔''

''نہیں بھئی' اپنی گاڑی چھوڑ جاؤں گا۔ تم آفس سے منگوا لینا۔''

''پروگرام کیا ہے۔''

''بتایا تھا تمہیں' صبح کو یہ سب چیزیں تیار کر کے گاڑی میں رکھوا دینا اور اس کے بعد میں آفس چلا جاؤں گا پھر وہیں سے اپنے کام پر نکل جاؤں گا' تم میری کمی کو محسوس تو نہیں کرو گی۔''

''کیوں' تم کیا سمجھتے ہو محسوس نہیں کرنا چاہیے مجھے۔''

''مجبوری ہے۔''

''یہ تو میں جانتی ہوں' میں نے تم سے کچھ کہا اس سلسلے میں۔

''نہیں شاہینہ! ٹھیک ہے۔ چلو اب کیا پروگرام ہے۔ آج طبیعت کچھ مضمحل سی ہے۔''

''کہیں باہر چلیں۔''

''ہاں' ایسا کرتے ہیں' کھانا باہر کھائیں گے۔'' قیصر نے کہا اور شاہینہ تیار ہو گئی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر تردد کے نقوش نظر آئے تھے لیکن دوسرے لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ قیصر نے دل ہی دل میں سوچا کہ ممکن ہے کہ یہ سوچ رہی ہو کہ باہر کے کھانے میں وہ اپنی کارروائی کی تکمیل کیسے کرے گی' وہ زہر اسے کیسے دے سکے گی لیکن بہرحال وہ خود بھی خوفزدہ تھا۔ حالانکہ شہروز نے اسے کہہ دیا تھا کہ زہر کی شیشی تبدیل کر دی گئی ہے لیکن پھر بھی نجانے کیوں قیصر کے ذہن میں خوف کا احساس تھا..... بہرحال تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے باہر نکل آئے اور قیصر اسے اپنی کار میں بٹھا کر لے چلا..... ایک خوبصورت سے ہوٹل میں انہوں نے اپنے لیے ایک میز منتخب کی اور بیٹھ گئے..... ویٹر نے مینو لا کر رکھ دیا تھا۔

''تمہاری پسند سے کھاؤں گا۔'' قیصر نے کہا اور شاہینہ ویٹر کو آرڈر نوٹ کروانے لگی۔ ویٹر آرڈر لے کر چلا گیا اور شاید اس سے باتیں کرنے لگا۔

☆☆☆

دل و دماغ شدید ہیجان کے شکار تھے۔ پوری دنیا میں اب اس کے علاوہ کون ہے لیکن یہ..... یہ دشمن ہے..... اسے قتل کرنا چاہتی ہے یہ جس کے لیے دل میں پیار ہی پیار ہے۔ مجھ سے زیادہ بدنصیب بھی روئے زمین پر کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ ماں باپ ختم ہو گئے' چھوٹے چھوٹے بہن بھائی بھی تھے۔ بلاوجہ ذہن میں شدت آ گئی تھی۔ سوتیلی ماں بہرحال انسان ہی تھی۔ کیا بگاڑتی میرا' کیا کر لیتی۔ دنیا جب برائی پر آمادہ ہوتی ہے تو پھر تعین مشکل ہو جاتا ہے۔ جنہیں دشمن سمجھا جائے' وہی سب سے زیادہ اور برے دوست بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔

یہ فیصلہ کرنا مشکل کام ہے کہ کس کے دل میں دشمنی چھپی ہوئی ہے اور کون دشمن ہے۔ اگر

اب سے تعاون کر لیتا' ماں کی موت کو تقدیر کا لکھا سمجھ لیتا تو اتنی دوری تو نہ ہوتی یا ان سے پھر اسے زندگی میں شامل کرنے سے پہلے کچھ دعائیں حاصل کر لیتا۔ کم از کم باپ سے شورہ ہی کر لیتا تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ آہ کیا کروں' کیا دل کی حالت اسی سے بیان کر دوں' اس سے کہوں کہ بدبخت عورت میری دولت چاہتی ہے تو لے لے' جو کچھ میرے پاس ہے' سب مجھ سے لے لے۔ بس مجھ سے اپنا پیار نہ چھین۔ میں اوباش فطرت نہیں ہوں جس کسی سے دشمنی مول نہیں لے سکتا' مجھے محبت چاہیے یا پھر اس پولیس آفیسر کو ہی گولی مار دوں جو میرے ذہن کو پراگندہ کر گیا ہے۔

''کیا بات ہے ڈارلنگ' کچھ عجیب سے نظر آ رہے ہو' کھوئے کھوئے سے' پریشان پریشان سے۔'' ایش پارکر نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کیا اور اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ ایک لمحے کے لیے دل چاہا کہ ساری حقیقتیں اس کے سامنے منکشف کر دے۔ محبت بھی مانگے اور زندگی کی بھیک بھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھالا نہیں' اب اس قدر کھلونا بھی نہیں بننا چاہیے اور پھر بات ان مظلوموں کی بھی ہے جنہیں اگر میری وجہ سے مارا گیا ہے تو شاید میرے لیے بھی معافی کا کوئی خانہ نہیں ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے' کبھی کبھی اولاد کی پرورش کر کے انسان ایسے خسارے سے بھی دوچار ہو جاتا ہے۔ فوراً ہی دل میں مکاری نے جنم لیا اور وہ مسکرا کر بولا۔

''شاہینہ! کیا تمہیں علم ہے کہ میں تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے مجھے علم نہیں ہوگا۔''

''ہونا تو چاہیے۔''

''میں جانتی ہوں ڈیئر۔''

''بس تو پھر یہ سمجھ لوں کہ اس تین دن کی جدائی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''چھوڑو' کیوں اپنے سر اتنے جھگڑے مول لیے ہیں۔ کاروبار پہلے بھی چل رہا تھا' چلتا رہے گا۔ طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اگر کوئی اتنا ہی ضروری کام ہے تو کسی اور کو بھیج دو۔'' شاہینہ یا ایش پارکر نے دلسوزی سے کہا۔

''جانا ہی تو ضروری ہے' کسی اور سے کام چل سکتا تو ضرور اسے بھیج دیتا۔''

''تو پھر ہمت کرو' ظاہر ہے میں تمہاری بیوی ہوں' تمہاری واپسی کا انتظار کروں گی۔''

قیصر ہنس دیا پھر اس کے بعد وہ بہت دیر تک ہوٹل میں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور اس کے بعد قیصر اپنی جگہ سے اٹھ دیا۔

خواب گاہ میں جب تک ایش پارکر جاگتی رہی' وہ اس سے باتیں کرتا رہا پھر سو گیا لیکن یہ سونا صرف دکھاوے کے لیے تھا۔ احساسات بھلا سونے دیتے' جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ دل و دماغ بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ ایسی کسی شخصیت سے دل کی بات کیا کہنا جو زندگی بھی لینے کے درپے ہو لیکن کیا اس بدبخت عورت کو اور کیا اس بے غیرت انسان کو اپنی دولت دے کر اس دنیا سے رخصت ہو جانا چاہیے۔ ہرگز نہیں..... اتنی آسانی سے مرنے والوں میں بھی نہیں ہوں میں۔

رات کے نجانے کون سے حصے میں اس نے اپنے آپ کو بہرحال اس تجربے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ حالانکہ دل کے ہر گوشے سے یہی آواز نکلتی تھی کہ آفیسر کو بھی غلط فہمی ہی ہوئی ہے لیکن اگر فیصل عظیم اس طرح یہاں موجود ہے اور ایش پارکر کے اس سے معاملات چل رہے ہیں تو پھر.....

صبح کو ناشتے پر البتہ وہ پرسکون تھا۔

پھر ایش پارکر نے اس کے لیے لباس تیار کیے' اس کے پسندیدہ لباس۔ اگر آفیسر کا کہنا سچ ہے تو یہ عورت دنیا کی سب سے بڑی اداکارہ

ہے۔ اسے اس شاندار اداکاری کے ایوارڈ ملنے چاہئیں لیکن بہرحال تجربہ شرط ہے' چنانچہ وہ ایش پارکر سے رخصت ہو کر اپنا سوٹ کیس اپنی گاڑی میں رکھ کر دفتر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

''ڈرائیور گاڑی لے آئے گا اور اس دوران جب میں یہاں موجود نہیں ہوں۔ تمہیں مکمل آزادی ہے' گھومنا پھرنا اپنی پسند کی تفریحات کرنا۔''

''کس کے ساتھ۔'' ایش بولی۔

''ضروری ہے کہ کسی کا ساتھ ہو۔ میرے تصور کو اپنے ساتھ قائم رکھنا۔''

پھر وہ کار میں بیٹھ کر کافی دیر تک سوچتا رہا۔ آخر کار شہروز کو فون کیا اور تھوڑی دیر کے بعد اس سے رابطہ قائم ہو گیا۔

''شہروز صاحب! میں قیصر جمال بول رہا ہوں۔''

''جی قیصر جمال صاحب۔''

''آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے تمام کام کر لیا ہے۔''

''گڈ' دفتر سے کس وقت اٹھیں گے۔''

''لنچ کے بعد۔''

''تو پھر ٹھیک ہے' میں آپ کو ایک پتا بتا دیتا ہوں یا تو اس پتے پر آ جایئے یا پھر جیسا بھی آپ پسند کریں۔''

''نہیں' میں آ جاؤں گا۔ آپ مجھے پتا بتا دیجئے۔'' اور شہروز نے اسے کریم سوسائٹی کا پتہ بتا دیا پھر بولا۔

''آپ یہاں آرام سے پہنچ جائیں گے۔ ممکن ہو سکا تو میں آپ کو یہیں ملوں گا۔''

''بہت بہتر شہروز صاحب! میں آپ کی ہدایت کے مطابق اس پتے پر پہنچ جاؤں گا۔''

لنچ پر اس نے منیجر کو اپنے کام سمجھائے اور اس سے بھی یہی کہا کہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں وہ شہر سے باہر جا رہا ہے اور دو تین دن تک اس کی واپسی ممکن نہیں ہو گی۔ گاڑی بھی اس نے ڈرائیور کے حوالے کر دی تھی اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر چل پڑا تھا۔

کافی دور تک وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر سفر کرتا رہا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو اس نے ایئرپورٹ چلنے کے لیے کہا تھا لیکن پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ اس وقت کوئی بھی اس کی نگرانی کے لیے موجود نہیں ہے تو اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

''معاف کرنا ڈرائیور! کچھ غلطی ہو گئی۔''

''کیا ہوا صاحب۔''

''یار! میں اپنا ٹکٹ وغیرہ تو بھول ہی آیا جس جہاز سے مجھے سفر کرنا تھا۔ وہ دس منٹ کے اندر اندر روانہ ہو جائے گا' ٹائم ختم ہو گیا۔''

''آپ بولو صاحب کیا کرے۔''

''چلو یار چلو..... دوسری بکنگ کرانی پڑے گی۔''

''ادھر ہی لے چلے صاحب جدھر سے آپ کو لایا ہے۔''

''نہیں' میں تمہیں پتا بتاتا ہوں۔'' تھوڑی دیر کے لیے وہ کریم سوسائٹی پر اتر گیا تھا۔ کوٹھی تلاش کرنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس لے کر وہ کوٹھی کے گیٹ پر پہنچا تو ایک آدمی اسے اپنا منتظر ملا۔

''آپ کا نام قیصر جمال ہے جناب!'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں..... میں قیصر جمال ہے۔''

''میرا نام نیاز خان ہے۔''

''میں شہروز صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''اندر آپ کا انتظار کر رہے ہیں' آیئے۔''

نیاز خان نے کہا اور قیصر جمال کو لے کر اندر چل پڑا۔ ایک بڑے سے خوبصورت کمرے میں اسے انسپکٹر شہروز اور ایک خوب صورت سی لڑکی نظر آئی تھی شہروز نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔

''آیئے قیصر جمال صاحب..... یہ ناہید

ہیں اور مجھے اسسٹ کرتی ہیں۔''

شہروز نے ناہید کو سلام کیا اور بولا۔ ''رسمی طور پر مجھے یہی کہنا چاہیے مس ناہید کہ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں زندگی کے جس عذاب میں گرفتار ہوں' اس میں شاید خوشیوں کا کوئی گزر نہیں ہے' اس لیے الفاظ کو ادا نہ کرنے پر مجھے معاف کر دیجئے گا۔''

''بیٹھئے قیصر جمال صاحب زندگی میں بہت سے کھیل ایسے ہوتے ہیں جو انسان کی توقع کے خلاف ہوتے ہیں' شہروز صاحب سے مجھے آپ کی پوری داستان معلوم ہو چکی ہے اور وہ اس لیے کہ بہرحال میرا اور ان کا جو تعلق ہے اس میں یہ سب کچھ بے حد ضروری تھا..... بات اصل میں صرف اتنی سی ہے کہ تھوڑی سی غلطی کبھی کبھی نجانے کتنے بڑے نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔ مجھے تو صرف اس بات کا دکھ ہے کہ آپ کے والد..... والدہ اور بہن' بھائی اس دولت کا شکار ہو گئے جو بہرحال لازمی طور پر ابھی کسی کے قبضے میں نہیں آئی ہے۔''

''قیصر جمال آپ نے شاہینہ صاحبہ کو مطمئن کر دیا ہے۔''

''جی ہاں۔'' قیصر جمال نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''تھوڑا سا وقت آپ کو یہیں گزارنا ہو گا..... میں انتظامات کرتا ہوں اور اس کے بعد آپ کو میری ہدایت پر عمل کرنا ہو گا۔''

''آفیسر میں نہیں جانتا کہ آپ کی پوسٹ کیا ہے..... البتہ اتنا اندازہ مجھے ہو گیا ہے کہ آپ کا تعلق محکمہ سراغ رسانی سے ہے' میں شہروز ہی کہہ کر آپ کو مخاطب کروں گا..... براہ کرم میری بات کا برا نہ مانیے۔''

''جی نہیں کسی کو کسی بھی نام سے مخاطب کریں' اس کا کیا تصور ابھرتا ہے۔''

''میں بہت دل برداشتہ ہوں سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں' بس یوں سمجھئے ایک بسی بسائی دنیا اجڑ گئی۔''

''یہ آپ کی غلط فہمی ہے' آپ بدکرداروں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں اپنا فرض ادا کر رہے ہیں..... یقین کیجئے مجھے یہ کام تو کرنا ہی تھا۔''

''آہ' کوئی گنجائش تو باقی نہیں ہے..... میرا مطلب ہے شک کی کوئی گنجائش.....''

''میں نہیں کہہ سکتا' لیکن بہرحال میرے الفاظ میں آپ کو مایوسی ہی ملے گی۔''

''تو پھر اب مجھے بتایئے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''آپ نے جب اطلاع دی کہ آپ یہاں پہنچ رہے ہیں تو میں نے بھی کچھ انتظامات کر لیے ہیں..... آپ کو اس کیس میں باقاعدہ پولیس کی مدد کرنی ہو گی اور آپ کو اپنا ذہن صاف کرنے کے لیے بھی یہ ضروری ہے' لیکن قیصر صاحب میں آپ کو تھوڑا سا بریف کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی۔''

''ابھی تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص یہاں پہنچے گا' میں اس سے آپ کی ملاقات کرواؤں گا اور پھر آپ کو اپنی ہی کوٹھی میں ایک اجنبی کی حیثیت سے کچھ وقت گزارنا پڑے گا۔''

''مطلب۔''

''اور اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہو گا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے..... میری دعا ہے کہ وہ ہو جو آپ کی خواہش ہے' لیکن اگر آپ کی خواہش کے مطابق وہ سب نہ ہو تو ایک ہدایت میں آپ کو دوں گا اور آپ کو اس پر عمل کرنا ہو گا۔''

''کیا۔''

''اپنے جذبات پر قابو رکھیے' کوئی ایسا عمل وقت سے پہلے نہ کر ڈالیے گا جو پولیس کے لیے مشکل کا باعث بن جائے۔''

''میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں' لیکن میں وہاں کیسے رہ سکوں گا۔''

''اس کا انتظام میں کررہا ہوں۔'' پھر کافی دیر تک انتظار کرنا پڑا تھا..... پھر اس کے بعد نوید علی کریم سوسائٹی کی اس کوٹھی میں داخل ہوا تھا' نیاز خان اسے چھوڑنے آیا تھا لیکن اندر ناہید اور شہروز کے ساتھ اپنے مالک کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا..... قیصر جمال کے چہرے پر بھی شدید حیرت کے نقوش تھے۔

''نوید خان تم!'' اس نے حیرانی سے کہا' لیکن نوید خان کے منہ سے کوئی جواب نہیں نکلا تھا..... وہ سہمی ہوئی نگاہوں سے شہروز کو دیکھ رہا تھا۔

''بیٹھو نوید خان' تمہارا رتبہ اب ایک معمولی آدمی کا نہیں ہے اور اگر قیصر صاحب غصہ کریں تو جو محسن ہوتا ہے وہ بہت بڑے رتبے کا حامل ہوتا ہے..... یہ وہ محسن ہے قیصر جمال صاحب جسے کے ذریعے یہ تمام انکشافات ہوئے۔''

''بابا نوید خان۔'' اور نوید علی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا..... اس نے جھک کر شہروز کے پاؤں پکڑے اور زار و قطار رونے لگا۔

''بابا یہ سچ ہے کیا' بابا یہ سچ ہے کیا۔'' قیصر نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا' لیکن نوید علی کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا تھا۔ شہروز نے اسے خاموشی سے رونے دیا اور جب اس کے دل کی بھڑاس نکل گئی تو پھر اس نے کہا۔

''مالک اعظم علی صاحب برے انسان نہیں تھے..... ان کے ساتھ برائی ہوگئی ہے مالک' بہت افسوس کی بات ہے بہت برا ہوا ہے مالک' ہم اپنے مالک کی موت کا غم کبھی نہیں بھلا سکیں گے۔''

قیصر خاموشی سے نوید خان کی صورت دیکھتا رہا..... شہروز نے کہا۔

''نوید خان اب تم پر فرض ہے کہ اپنے مالک کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچاؤ' اس کے لیے اگر تم نے ذرا بھی اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑا تو نہ صرف تمہارے مالک کی روح' خدا کا قانون بلکہ زمین کا قانون بھی تمہیں معاف نہیں کرے گا۔ اس وقت قانون تو تم لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے۔ یوں سمجھ لو یہ سب کچھ تم اپنے مالک کے لیے نہیں بلکہ قانون کی مدد کے لیے کررہے ہو اور اگر قانون کو تمہارے اس کام میں ذرا بھی سقم محسوس ہوا تو پھر تم قابل گرفت ہوگے۔''

''صاحب! ہم نے اب تک آپ کی ہدایت پر جو کچھ کیا ہے اگر اس میں کوئی کمی رہ گئی ہے تو ہم معافی چاہتے ہیں' لیکن آپ اطمینان رکھیے آپ جو حکم دیں گے ہم وہی کریں گے۔''

''تو پھر سنو! ابھی تھوڑی دیر کے بعد میں قیصر جمال صاحب کا چہرہ بدلے دیتا ہوں' تم انہیں خاموشی سے اپنے کوارٹر لے جاؤ گے اور یہ کہو گے کہ تمہارا بھانجا آیا ہے..... وہ بھی اس وقت جب کوئی قیصر جمال کو دیکھ لے' قیصر جمال رات کی تاریکی میں وہاں پہنچیں گے' ابھی انہیں تمہارے ساتھ بھیجنا مناسب نہیں ہوگا..... میں نے اپنا ایک پروگرام فوری طور پر بدل دیا ہے' انہیں اپنے کوارٹر میں ٹھہرا دینا اور کوشش کرکے انہیں دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہی رکھنا..... تمہارا پہلا کام یہ ہوگا۔''

''مگر صاحب' مالک کی شکل تو سب لوگ پہچان لیں گے۔''

''ابھی تھوڑی دیر کے بعد اپنے مالک کی شکل تم خود بھی نہیں پہچان پاؤ گے۔''

''مم..... مگر کیسے صاحب۔''

''تم یہ میرے اوپر چھوڑ دو۔''

''ٹھیک ہے جو آپ کا حکم۔''

''اس کے بعد تمہیں یہاں سے واپس جاکر تفصیلی طور پر دیکھنا ہے کہ تمہاری مالکہ یعنی شاہینہ بیگم کے معمولات کیا رہتے ہیں..... یہ تمام تفصیل تم مجھے فون پر بتاؤ گے اور اس کے لیے تمہیں بے شک تکلیف ہوگی لیکن جب کام شروع

کر ہی دیا ہے تو چھوٹی موٹی تکلیف کا خیال نہ رکھنا۔''

''اس کی تو آپ بالکل ہی فکر نہ کریے مالک' ہم تو جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔''

''میں تم سے جو کچھ بھی کہوں تمہیں وہ کرنا ہے کیونکہ نوید خان زہر کی وہ شیشی تم نے ہی مجھے لاکر دی تھی۔ وہ ساری کہانی ذرا قیصر جمال کو سنا دو جو تم مجھے سنا چکے ہو۔''

''زبان نہیں کھولنی چاہیے تمہیں۔''

''ہاں نوید خان' بہرحال نوید خان بتاؤ تاکہ میرے دل کو تھوڑا سا قرار حاصل ہو۔'' اور پھر نوید خان نے ساری کہانی قیصر جمال کو سنا دی..... قیصر کے چہرے پر جذبات کی سرخی نظر آرہی تھی' اس نے کہا۔

''وہ زہر کی شیشی تم نے وہاں سے ہٹائی تھی۔''

''ہاں اور افسر صاحب نے اس کی جگہ دوسری شیشی ہمیں دے دی تھی۔''

''ٹھیک ہے نوید خان میں اب تم سے بھی شرمندہ ہوں' کیا کہوں' کیا نہ کہوں۔''

''اب کچھ نہ کہو قیصر' اپنے آپ کو مجسم انتقام بنالو' اگر کسی نے تمہارے خلاف سازش کی ہے تو اس سازش کو ختم کرنا تمہارا فرض ہے اور قیصر جمال ویسے بھی میں تم سے کہوں یہ طویل زندگی ہے اس میں لوگ ملتے بھی ہیں بچھڑ بھی جاتے ہیں' جو بچھڑ گئے ان کا غم کرو اور جو بچھڑ جائیں اور وہ نہ ہوں جو تم سمجھتے ہو تو اس پر خدا کا شکر ادا کرو اور آنے والے وقت میں اپنے لیے ایک بہتر زندگی تلاش کرو۔'' قیصر جمال خاموش ہوگیا تھا..... بہرحال نوید خان کو قیصر جمال کے سامنے ہی پوری بریفنگ کی گئی۔ ناہید بھی اس معاملے میں شریک تھی اور اس کے بعد شہروز' قیصر جمال کو لے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا' جہاں میک اپ وغیرہ کا سامان موجود تھا..... ناہید نوید خان اور نیاز خان سے باتیں کرتی رہی تھیں۔

شہروز نے انتہائی مہارت سے قیصر جمال کا میک اپ کیا..... قیصر بہرطور امریکہ میں رہتا تھا۔ ان تمام چیزوں سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا تھا..... ویسے بھی ذہین نوجوان تھا اور اس وقت ایک اعلا پولیس آفیسر کے سامنے تھا..... شہروز نے تمام معاملات کو مدنگاہ رکھتے ہوئے اس کے چہرے کا میک اپ کیا اور اسے نچلے درجے کا ایک ایسا فرد بنا دیا جسے دیکھ کر کوئی یہ سوچ بھی نہ سکے کہ یہ اس حیثیت کا مالک ہوگا..... پھر جب قیصر جمال نے آئینہ دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''مائی گاڈ' مائی گاڈ۔''

''اس سلسلے میں اور کوئی مشورہ قیصر صاحب۔''

''آپ..... شہروز صاحب آپ..... بس میں کیا کہوں براہ راست مجھے اس کا تجربہ کبھی نہیں ہوا۔ فلموں وغیرہ میں دیکھا ہے یا پھر مختلف واقعات سنے اور پڑھے ہیں لیکن چہرے اس طرح تبدیل کردیے جاتے ہیں' آپ یقین کریں' میں سخت حیران ہوں۔ آپ تو بین الاقوامی معیار کی شخصیت ہیں۔''

''ارے چھوڑیے قیصر صاحب! صرف اپنے معیار کی بات کریں۔ اب آپ کو ایک ایسا لباس بھی پہننا پڑے گا جو بہرطور پر آپ کے شایان شان نہیں۔ باقی اور کوئی تفصیل بتانے کی ضرورت آپ کو نہیں ہے۔''

پھر اس لباس میں قیصر جمال کو لے کر شہروز جب کمرے میں داخل ہوا تو ناہید تک حیران رہ گئی تھی۔ نوید خان نے اجنبی نگاہوں سے قیصر جمال کو دیکھا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ کوئی اور ہے اور ایک دم خاموش ہوگیا تھا' تب شہروز نے کہا۔

''نوید خان! یہ تمہارے مالک قیصر جمال ہیں۔''

''جی۔'' نوید خان بوکھلائے ہوئے انداز میں کھڑا ہوگیا۔

''پہچان لو انہیں' اب یہ تمہارے بھانجے ہیں' نام کچھ بھی رکھ لو۔''

''میرا نام الیاس ہے۔'' قیصر جمال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ویری گڈ' بہترین نام منتخب کیا ہے قیصر صاحب آپ نے۔''

''مم..... مالک..... س..... سچ مچ..... ارے باپ رے یہ کیسے ہوگیا۔''

''اب تم نے انہیں دیکھ لیا..... اطمینان سے واپس جاؤ اس سے زیادہ تمہارا گھر سے غائب رہنا مناسب نہیں ہے۔''

''جی صاحب ٹھیک ہے۔'' پھر نوید خان ان لوگوں سے اجازت لے کر وہاں سے چل پڑا تھا۔

☆☆

آخر کار ایش پارکر نے اپنے آپ کو مطمئن کرلیا تھا' حالانکہ ابتدا میں دل کی خلش نے بے چین کیا تھا۔ سوچوں کا انداز ذرا سا تبدیل ہوا تھا لیکن پھر فیصل کے ساتھ ایک خوبصورت زندگی کے تصور نے اسے مطمئن کردیا تھا۔ دولت بھی ہاتھ آجائے گی اور محبوب بھی پھر اس کے بعد اور کیا درکار ہوگا۔ تقدیر موقع بھی دے رہی تھی..... کافی وقت گزر گیا..... شام کو تقریباً چھ بجے اس نے فیصل کو ٹیلی فون کیا' فیصل نے فوراً ہی فون ریسیو کیا تھا۔

''ہیلو فیصل! ایش بول رہی ہوں۔''

''فیصل کا آدھا بدن۔''

''ڈیئر! وہ چلا گیا ہے۔''

''کہاں گیا ہے' یہ کچھ پتا چل سکا۔''

''اصل میں ان باتوں کو میں ہی نہیں پوچھتی۔''

''ضرورت بھی نہیں ہے لیکن کم از کم یہ بھروسا ہونا چاہیے کہ وہ اتنے ہی عرصے کے لیے گیا ہے جتنا اس نے تم سے کہا ہے۔''

''میرا خیال ہے اجل نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا۔''

''ہاں' اس کی نہ ضرورت ہے اور نہ امکان تو پھر اب کیا پروگرام ہے جناب عالی۔''

''آجاؤ۔''

''کتنی آسانی سے کہہ رہی ہو آجاؤ' کیا میرا وہاں آنا خطرناک نہیں ہوسکتا۔''

''خطرناک۔''

''تو اور کیا' ملازم بھی تو ہیں وہاں۔''

''ملازم میری مٹھی میں ہیں اور پھر بہرحال اب ایسا بھی نہیں ہے کہ میں ان سے خوفزدہ ہوجاؤں۔''

''ہوں مگر میں رات کو پہنچوں گا۔''

''کیوں' خیریت' کوئی مصروفیت ہے۔''

''مصروفیت ہی سمجھ لو۔''

''کیا مصروفیت ہے۔''

''نہیں' بس کوئی خاص نہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ دن کی روشنی میں ہمیں وہاں ہونا ہی نہیں چاہیے۔''

''فیصل! تم خوفزدہ ہو۔''

''ارے کیسی باتیں کرتی ہو' میں اور خوف دو الگ الگ چیزیں ہیں۔''

''تو پھر آجاؤ' کھانا کہیں باہر ہی کھائیں گے۔''

''ہوں تو پھر یوں کرتے ہیں کہ تم گاڑی لے کر نکلو' ڈرائیور کی ضرورت نہیں ہے اور اس کے بعد ہوٹل ضیافت پہنچ جاؤ راستہ یاد ہے نا۔''

''ہاں' میں جانتی ہوں۔''

''بس وہیں ملاقات ہوگی' اس کے بعد میں تمہاری کار میں وہاں چلوں گا۔ بہتر یہ ہوگا کہ چھپ کر چلوں۔''

''چلو ایسا کرلو۔''

''بس اس کے بعد تفریحات کریں گے۔''

''اوکے میں پہنچ جاؤں گی۔'' ایش پارکر نے کہا اور پھر وہ انتظار کرنے لگی۔ خاصا وقت گزرنے کے بعد وہ کار میں بیٹھی اور کار لے کر باہر نکل آئی۔ اب اسے یہاں کے بارے میں خاصی معلومات ہوچکی تھیں۔ ہوٹل ضیافت میں فیصل نے اس کا استقبال کیا۔ ایش پارکر بھی خوبصورت لباس میں ملبوس تھی۔ فیصل اسے دیکھ کر مسکراتا ہوا بولا۔

''اور ایک بہادر لڑکی کو میں نے اپنے سامنے دیکھ کر خوش آمدید کہتا ہوں۔''

''بہادر لڑکی!'' ایش نے عجیب سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''کیوں۔''

''اس بات کو ذہن میں رکھنا کہ میں بالکل بہادر نہیں ہوں۔''

''کیا بات کرتی ہو ایش! اس کا مطلب ہے کہ تم اپنے آپ کو سمجھتی ہی نہیں ہو۔''

''فیصل! یقین کرو کبھی کبھی شدید خوف زدہ ہوجاتی ہوں۔''

''بھلا کس بات سے۔''

''یہی کہ جو کچھ ہم سوچ رہے ہیں' کیا وہ اتنی آسانی سے ہوجائے گا۔''

''میرا خیال ہے ساٹھ فیصد ہوچکا ہے' اب رہ کیا گیا ہے۔''

''ساٹھ فیصد۔''

''تو اور کیا۔''

''نہیں' ابھی وہ تو نہیں ہوا ہے جو ہم چاہتے ہیں۔''

''مثلاً۔''

''اس سلسلے میں جلد بازی بالکل نہ کرنا' آہستہ آہستہ سوچنے دو۔''

''مگر تم بتاؤ ایسا کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔''

''دیکھو جس وقت اس کی حالت زیادہ بگڑنے لگے اور وہ بستر مرگ پر پہنچ جائے تو خود اس کے دل میں گداز ہوگا' تم اپنا یہ طریقہ کار جاری رکھنا' یعنی اس سے محبت کا بے پناہ اظہار۔ یہی چیز اس کے دل میں گداز پیدا کرے گی اور وہ یہ سارا کام خود بخود کردے گا۔'' ایش سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ فیصل کی بات اس کی سمجھ میں آرہی تھی' کچھ لمحات کے بعد اس نے کہا۔

''ہاں' یہی طریقہ نیچرل ہوگا۔''

''اس کے علاوہ ایش ہمیں بہت زیادہ ایک دوسرے سے نہیں ملنا چاہیے' حالانکہ خود میرا بھی دل للچاتا ہے' تم کیا سمجھتی ہو۔''

''اب یہ بتاؤ ہم کریں کیا۔'' ایش نے سوال کیا۔

''مجھ سے محبت۔'' فیصل مسکرا کر بولا اور ایش بھی مسکرانے لگی۔

''اس کے لیے کہنے کی ضرورت نہیں۔''

''ہے تو نہیں لیکن تم نے یہ سوال کیا تو میں کہہ رہا ہوں۔''

''چلو چھوڑو ان باتوں کو' اس شریف آدمی نے ہمیں یکجا ہونے کا موقع دیا ہے تو اس موقع کو ہم یوں نہیں گنوائیں گے' اب باقی ساری باتیں گھر چل کر ہوں گی۔'' اور پھر فیصل نے ویٹر کو کھانے کا آرڈر نوٹ کرادیا تھا۔

☆☆

ایک عجیب سی تھکن' ایک عجیب سا احساس' دل میں پژمردگی ذہن میں مستقبل کا خوف' تنہا زندگی کیسے گزرے گی ایش پارکر اگر واقعی وہی نکل آتی ہے جس کا شبہ ظاہر کیا گیا ہے تو پھر زندگی سے اس کا فاصلہ ہوجائے گا۔ یہ فاصلے میں کس طرح قبول کروں گا۔ آہ..... کاش یہ سب کچھ نہ ہو' آہ..... کاش لیکن تقدیر میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے اسے کیسے ٹالا جاسکتا ہے۔ شہروز اپنے طور پر درست تھا۔ ایک اعلا پولیس آفیسر لیکن انتہائی اعلا شخصیت کا مالک ورنہ ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں' فرض کی انجام دہی بے شک ایک مقام رکھتی ہے

لیکن اس کے لیے ذاتی جنون بہت کم پایا جاتا ہے۔

ایک طاقت ور ڈکٹو فون سیٹ اسے دیا گیا تھا اور نوید خان کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی کہ وہ اس ڈکٹا فون سیٹ کو بیڈ روم میں پہنچا دے' اس کے لیے جگہ بھی منتخب کر لی گئی تھی اور یہ بات قیصر سے زیادہ بہتر کون جانتا تھا کہ یہ ڈکٹا فون سیٹ کہاں نصب کیا جا سکتا ہے۔ باقی اس کی کوئی ذمہ داری نہیں رکھی گئی تھی اور شہروز نے اس سے کہا تھا کہ بقیہ معاملات وہ اس پر چھوڑ دے' اس کے لیے شہروز نے اپنے طور پر بندوبست کیا تھا کیونکہ ایک عام آدمی پر وہ اتنے بڑے کام کا بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔

البتہ اور دوسرے ایسے انتظامات کر لیے گئے تھے۔ نوید خان اس کا اس دیوار کے قریب منتظر تھا جس کی نشاندہی قیصر جمال نے خود کی تھی۔ مقررہ وقت پر وہ اپنے میک اپ میں دیوار کو عبور کر کے نوید خان کے پاس پہنچ گیا۔ نوید خان نے اسے سلام کیا۔ سلام کا جواب دے کر اس نے کہا۔

''کیا کیفیت ہے نوید خان۔''

''بیگم صاحبہ گئی ہوئی ہیں۔''

''کہاں۔''

''یہ تو نہیں معلوم صاحب۔''

''اکیلی گئی ہیں۔''

''جی ہاں' خود کار چلا کر لے گئی ہیں۔ ڈرائیور کو بھی ساتھ نہیں لیا۔''

''یہ نہیں پتا چل سکا کہ کہاں گئی ہیں۔'' قیصر نے مغموم لہجے میں کہا۔

''نہیں صاحب! بھلا یہ کیسے پتا چل سکتا تھا۔'' نوید خان کا کہنا بالکل درست تھا۔

مالکوں سے یہ سوال تو نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ بہرحال قیصر جمال ایک ناخوشگوار کام کی سرانجام دہی کے لیے تیار ہو گیا اور گزرنے والے وقت کا انتظار کرتا رہا۔ وہ جاگ رہا تھا اور نوید خان اس کے ساتھ جاگ رہا تھا۔ مالک کے غم کو وہ اچھی طرح سمجھتا تھا' دوسرے کسی آدمی کو اس کی یہاں موجودگی کا احساس نہیں ہوا تھا اور شاید قیصر جمال نوید خان کے کوارٹر ہی میں پوشیدہ تھا۔ مزید پوشیدہ رہنے کے لیے اس نے جگہ منتخب کر لی تھی۔

نوید خان کا کوارٹر بھی ایسی جگہ تھا جہاں سے گیٹ پر نظر رکھی جا سکتی تھی اور کوٹھی کے بیرونی حصے کا پوری طرح جائزہ لیا جا سکتا تھا پھر رات کو تقریباً گیارہ بجے دونوں کی واپسی ہوئی اور کار سے ایش پارکر کے ساتھ فیصل عظیم کو اترتے دیکھ کر قیصر جمال کا کلیجہ خون ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی ابھر آئی اور وہ شدید درد و کرب کے عالم میں سوچنے لگا کہ یہ بدکار عورت کس طرح اسے بے وقوف بناتی رہی ہے۔

اب بھی بھلا کسی شک و شبہ کی گنجائش ہے۔ یہ سارا مسئلہ بڑا عجیب و غریب تھا اور پھر وہ ان دونوں کو کوٹھی میں جاتے دیکھتا رہا' بہت دیر ہو گئی لیکن نہ اسے اور نہ ہی نوید خان کو یہ احساس ہو سکا کہ اسی جگہ اور اسی دیوار سے شہروز بھی نیچے کودا ہے اور اس کے بعد نوید خان کے کوارٹر میں داخل ہو گیا ہے۔ وہ دونوں اسے دیکھ کر چونک پڑے تھے۔ قیصر نے حیرانی سے کہا۔

''سر آپ۔''

''ہاں قیصر صاحب' اصل میں مجھے بھی کام کرنا ہے نا۔ ظاہر ہے میں اپنے کام کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔''

''ہاں مجھے معلوم ہے کہ وہ دونوں ابھی ابھی کوٹھی میں داخل ہوئے ہیں۔''

''میں آپ کے سامنے شرم سے نگاہیں نہیں اٹھا سکتا شہروز صاب۔'' قیصر جمال نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

''کیوں بھئی' ایسی کیا بات ہے۔''

''آہ..... کبھی کبھی اولاد والدین کے لیے اس طرح بھی عذاب بن جاتی ہے' کیا عجیب بات ہے۔ میں ابھی اولاد کو نہیں جانتا لیکن جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔ ماں باپ کس طرح اولاد کی پرورش کرتے ہیں' بہت سی آرزوؤں اور امنگوں کے ساتھ یہ تو حق ہے ان کا شہروز صاحب کہ وہ جس درخت کی آبیاری کریں' اس کے سائے کے بھی آرزومند ہوں لیکن کبھی کبھی یہ سائے کس قدر زہریلے ہو جاتے ہیں' کاش ایسا نہ ہوتا۔''

''حوصلہ رکھیے قیصر صاحب! فیصلے غلط بھی ہو جاتے ہیں' بہرحال خوشی کی بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں آپ بے قصور نکلے ورنہ آپ یقین کیجیے اگر میری طرح تحقیقات کرنے والا کوئی اور نہ ہوتا تو سیدھا سیدھا آپ کو مجرم قرار دے دیا جاتا اور اپنی سوتیلی ماں اور سوتیلے بہن بھائیوں کے قاتل آپ ہی قرار پاتے۔''

''کاش ایسا ہو جاتا' مجھے اس ناکردہ گناہ کی سزا مل جاتی۔ موت کی سزا ہو جاتی تو کم از کم یہ عذاب میری زندگی میں شامل نہ ہوتا۔ آہ..... وہ زیادہ بہتر ہوتا کیونکہ وہی میرے گناہوں کا کفارہ ہوتا۔''

''آپ کو حوصلہ رکھنا چاہیے۔ دیکھیے یہ ایک طاقتور ٹیپ ریکارڈر ہے اور یہ ڈکٹا فون کا وہ ریسیور اصل میں یہ کام میں نے کسی اور کے سپرد کیا تھا لیکن بعد میں یہ فیصلہ کیا کہ میں خود ہی آپ کی موجودگی میں ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سنوں تاکہ آپ کو بھی ایش پارکر اور اپنے اس دوست نما دشمن کے بارے میں صحیح طور سے اندازہ ہو جائے۔''

قیصر نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ شہروز اس کے سامنے ہی ٹیپ ریکارڈر سیٹ کرنے لگا۔ وائرلیس پر بیڈ روم کی آوازیں ابھرنے لگی تھی۔ فیصل عظیم کی بات پر ہنس رہا تھا' ایش پارکر نے کہا۔

''فیصل! یہاں تمہارا کون کون ہے۔''

''میرا۔'' فیصل بولا۔

''ہاں۔''

''ایش پارکر ہے اور۔''

''اور کون ہے۔''

''پھر ایش پارکر ہے۔'' فیصل نے کہا اور ایش پارکر ہنس پڑی۔

''میرے علاوہ بھی کوئی اور ہے۔''

''تمہارے علاوہ اس کائنات میں کوئی اور نہیں ہے' تم کوئی اور بات کر رہی ہو۔''

''تم مجھے اتنا چاہتے ہو۔''

''ایش! تم نے خود غور نہیں کیا اس پر۔''

''نہیں' خیر مجھے یہ تو یقین ہے کہ تم مجھے بے پناہ چاہتے ہو۔''

''اتنا ایش پارکر کہ تمہاری وجہ سے میں چار افراد کا قاتل بن چکا ہوں۔''

''سچ بتاؤ فیصل! اس سے پہلے بھی کسی کو قتل کیا۔''

''نہیں ایش! قتل نہیں کیا میں نے لیکن میری فطرت میں ایک عجیب سی ہیجان خیزی رہی ہے۔ حقیقت یہ ہی کہ تم سے اب کچھ چھپانے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ میں نے یورپ میں بھی بہت سے جرائم کیے ہیں۔ اصل میں میری فطرت کا یہ پہلو ایک عجیب سے انداز میں متاثر ہوا ہے' بعد میں تمہیں بھی اس کی کہانی بھی سناؤں گا۔''

''قتل تم نے پہلی بار کیے ہیں۔''

''ہاں..... اور اس کے لیے انتہائی ذہانت سے ایک طریقہ کار منتخب کیا۔''

''میں لباس تبدیل کر لوں' اس کے بعد تم سے بات چیت کروں گی۔''

''کیا مطلب۔ لباس تبدیل کرنے کے لیے تمہیں کہیں اور جانا پڑے گا۔''

''بے شرم آدمی۔''

''ارے..... ارے..... یہ تم پر مشرقیت کا بھوت کیوں سوار ہوتا جا رہا ہے۔''

''یعنی اب تمہیں لباس تبدیل کرنے کے لیے مجھے بے شرم بھی کہنا پڑے گا۔'' ایش پارکر ہنس پڑی تھی پھر وہ بولی۔

''ویسے ایک بات کہوں۔''

''ہاں کہو۔''

''مشرق کی ہوائیں بڑی معصوم ہوتی ہیں۔''

''معصوم۔''

''ہاں..... سخت' زہر آلود۔''

''بھلا کن معنوں میں۔''

''یہاں رہ کر خوامخواہ تقدس کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ دل میں اور بہت سے ایسے احساسات ابھر آتے ہیں جو نہیں ابھرنے چاہئیں۔''

''یعنی شرافت کے جراثیم پیدا ہونے لگتے ہیں۔''

''ہاں..... یہی سمجھو۔''

''چلو خیر یہ یہاں کی ہواؤں کا قصور ہے' میرا نہیں۔''

فیصل نے کہا اور اس کے بعد سرسراہٹیں سنائی دیتی رہیں۔ قیصر جمال کا سر پھر شرم سے جھک گیا تھا۔ شہروز نے اسے تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں قیصر جمال! وہ صرف تمہاری ایک غلطی ہے' بیوی نہیں۔'' قیصر جمال نے آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر شہروز کو دیکھا اور اس کی ہلکی ہلکی سسکیاں شروع ہو گئیں۔

''ارے ارے..... قیصر جمال! تمہیں تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تمہیں اپنے باپ کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا موقع مل رہا ہے۔''

''اب..... اب کیا کریں گے شہروز صاحب۔''

''دیکھتے رہو سنتے رہو کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ پریشان ہونے کی بالکل کوئی ضرورت نہیں۔'' شہروز نے کہا اور پھر خاموش ہو کر دوسری طرف کی باتیں سننے لگا۔

''ہاں' اب بتاؤ۔''

''بس بھئی' ظاہر ہے تم تو قیصر کی زندگی میں شامل ہو گئیں۔ شادی کر لی تو دونوں نے اور اس کے بعد رقابت نے مجھے وہ منظر برداشت نہیں کرنے دیا اور اس کا بہترین طریقہ میں نے یہی سوچا کہ یورپ چھوڑ دوں پھر میں یہاں آ گیا اور اس کے بعد میں نے وہ طریقہ کار منتخب کیا جس کے تحت پہلا قدم مکمل طور پر کامیاب ہو جائے۔''

''اس کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کیا تم نے۔''

''سب سے پہلے میں نے اعظم علی صاحب کا جائزہ لیا' ان کی مصروفیات کی مشغولیات' ان کی بیوی' ان کے بچے یہ سب اندازہ لگانے لگا میں کہ کون سا ایسا لمحہ ہو سکتا ہے جب میں انہیں اس دنیا سے رفو چکر کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔''

''پھر۔'' ایش پارکر نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ایش! میرے ذہن کی تمہیں داد دینی پڑے گی۔ میں یہ تمام اندازے قائم کرنے کے بعد سوچنے لگا کہ وہ کون سا ایسا مناسب طریقہ ہو جس سے ان لوگوں کو ٹھکانے لگایا جا سکے اور کوئی خاص شبہ بھی نہ ہو سکے' اس کے لیے میں نے اپنا روپ بدلا اور ایک لاابالی سے انسان کی حیثیت سے فیروز پلازہ نامی ایک عمارت میں ایک فلیٹ حاصل کیا۔ یہاں زیادہ تر تنہا لوگ رہا کرتے ہیں کیونکہ وہ علاقہ ٹرانسپورٹروں کا علاقہ ہے اور وہاں سب سے بڑا ٹرک اڈہ ہے۔ مجھے ایک ٹرک درکار تھا پھر اس ٹرک کے حصول کے لیے میں نے گل خان نامی ایک معصوم سے شخص کا سہارا حاصل

کیا' اس سے دوستی کر لی اور پھر ایک رات اس وقت جب مجھے علم تھا کہ اعظم علی اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ایک چھوٹے سے قریبی شہر گیا ہوا تھا' میں گل خان سے ٹرک لے کر نکل آیا اور میں نے ٹرک ایک ایسی جگہ کھڑا کر دیا جہاں سے ان لوگوں کو گزرنا تھا۔ بہت بڑا رسک تھا یہ لیکن بہرحال میری تقدیر نے میرا ساتھ دیا اور جب میں نے ان کی کار آتے ہوئے دیکھی تو میں تیار ہو گیا اور اس کے بعد ٹرک سے میں نے کار کو ٹکر ماردی اور اس انداز میں ماری کہ کوئی بھی نہ بچ سکا اور بس میرا کام پورا ہو گیا۔''

''بچے بھی تھے۔'' ایش پارکر نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔

''یہ تم کس انداز میں گفتگو کر رہی ہو ایش! وہ بچے ہی تو ہمارے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہو سکتے تھے کیونکہ وہ اس دولت اور جائیداد کے حصے دار بچتے اور بہرحال ان کی موجودگی اس جائیداد کا تصفیہ نہیں کر سکتی تھی۔''

''ہوں..... مگر تم نے سوچا خوب اور اس کے بعد تم نے وہ جگہ چھوڑ دی ہو گی۔''

''پھر وہاں رہنا اپنی موت کو آواز دینا تھا۔''

''اس ٹرک کا پتہ چل گیا۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہرحال گل خان بھی ایک کردار تھا جس سے مجھے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا تھا۔''

''فیصل! کوئی ایسی غلطی تو نہیں کر بیٹھے ہو تم کہ پولیس ہمیں شناخت کرے۔'' جواب میں فیصل کی ہنسی سنائی دی تھی۔

''نہیں ڈارلنگ! انسان محبت میں پاگل ہو کر نجانے کیا کیا کر بیٹھتا ہے لیکن بہرحال عقل و دانش کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہیے اور فیصل تو میں خود ہوں اور اس کا مفہوم بھی عقل ہی ہے۔'' فیصل ہنس کر بولا۔ ایش پارکر خاموش ہو گئی۔ شہروز سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور قیصر جمال اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہو گیا شہروز صاحب۔''

''یار قیصر جمال معاف کرنا تمہاری یہ اداسی مجھے پسند نہیں آ رہی۔ تمہارے باپ' سوتیلی ماں اور بہن بھائیوں کے قاتل کا پتا چل گیا ہے اور اب وہ اپنی گردن پھانسی کے پھندے کے لیے تیار کرنے کو موجود ہے اور تم اداس بیٹھے ہو۔ مردوں کا کھیل ہے قیصر کبھی کبھی ایسی عورتیں بھی زندگی میں آ جاتی ہیں لیکن اس کے لیے افسردگی میں سمجھتا ہوں غیر مناسب ہے بلکہ صحیح معنوں میں اپنے والد کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہو تم۔ تقدیر نے تمہیں یہ موقع دیا ہے کہ ان بے گناہ معصوموں کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچاؤ۔''

''میں اپنی اس کمزوری کا اعتراف کرتا ہوں شہروز صاحب! کوشش کروں گا کہ میرے ذہن سے یہ داغ دھل جائے۔''

''اصل میں یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ کام تو اتنا آسان ہو گیا کہ میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ بہت سے پاپڑ بیلنے پڑیں گے اور بہرحال فیصل عظیم کو گھیر میں لانے کے لیے بہت سی چالیں چلنا پڑیں گی لیکن دیکھو' خون یوں سر چڑھ کر بولتا ہے۔ گناہ اس طرح سامنے آ جاتے ہیں۔ جرم کرنے والا جرم کرتے ہوئے ایک خونی درندہ ہوتا ہے لیکن خونی درندے کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ زندگی اللہ کی امانت ہوتی ہے اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ کچھ لمحوں کی خوشیوں کے لیے دوسروں کی زندگی چھین لے۔ جب گناہ کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے تو اسی طرح انسان کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے اب مزید وقت ضائع کرنے کی گنجائش نہیں۔ تم اپنے چہرے سے یہ میک اپ اتار دو' یہ میک اپ تو میں نے اس لیے کیا تھا کہ ممکن ہے چند روز تمہیں یہاں گزارنے پڑیں۔ فیصل فوراً ہی یہاں آنے کی

بے وقوف نہ کرے۔ لیکن یہ میرا خیال تھا ورنہ قدرت کچھ اور ہی سوچ رہی تھی اور قدرت نے وہ کر دکھایا' اب تم یہ دیکھو' یہ پورا اعتراف ریکارڈ ہو گیا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں یعنی گل خان' مجھے اس کے بارے میں رپورٹ مل چکی ہے۔ یہ شخص بہترین گواہ ہے' بات ہی ختم ہو جاتی ہے۔''

''تو پھر اب کیا ارادہ ہے۔''

''قاتل کو مزید مہلت دینا گناہ ہے۔''

''اور یہ بدبخت عورت۔''

''وہ فاحشہ اپنے جرم کے ساتھ گرفتار ہو جائے گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' پھر شہروز نے اس کا مک اپ اتارا تھا اور وہ منہ ہاتھ دھو کر اپنی اصلی شکل میں آ گیا تھا۔ اس دوران شہروز اپنے محکمہ کی افراد کو ٹرانسمیٹر پر طلب کر رہا تھا اور پھر ان کا انتظار کرنے میں تھوڑا سا وقت صرف ہوا۔ وہ لوگ اندر داخل ہوئے تھے اور باقاعدہ گیٹ سے اندر آئے تھے۔ چوکیدار کو قابو میں کر لیا گیا تھا۔ ویسے پھر بھی احتیاط برتی جا رہی تھی۔ شہروز نے احتیاط کے پیش نگاہ نہیں ایسی جگہوں پر متعین کر دیا جہاں سے اگر فیصل عظیم بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے گرفتار کر لیا جائے اور اس کے بعد اس نے قیصر سے کہا۔

''اپنے جذبات اپنے احساسات کو قابو میں رکھنا' تمہارا اب ایش پارکر سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ بدبخت عورت صرف ایک مجرمہ ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اعانت جرم میں اسے بھی موت سے کم سزا نہیں دلواؤں گا' یہ میرا عہد ہے۔ آؤ۔''

پھر شہروز قیصر جمال کے ساتھ آگے بڑھ گیا' وہ قیصر جمال کی کیفیت کو محسوس کر رہا تھا لیکن اسے یہ اطمینان تھا کہ قیصر کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں ہے۔ قیصر سے زیادہ عمارت کے بارے میں اور کون جان سکتا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ خواب گاہ پر پہنچ گئے۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور کوئی ایسی کھڑکی اندر موجود نہیں تھی جس سے فیصل فرار ہو سکے۔ قیصر کے چہرے پر اب خون کی سرخی لہرا رہی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو قابو میں کیے ہوئے تھا۔ دروازے پر تیسری بار دستک دی تو اندر سے ایش پارکر کی آواز سنائی دی۔

''کون ہے..... کیا بات ہے۔''

''دروازہ کھولیے.....'' شہروز نے کہا۔

''میں سو رہی ہوں' بھاگ جاؤ' کون ہے اس وقت' یہ آنے کا وقت ہے۔''

''ایک بہت بڑی بات ہو گئی ہے میڈم! کوٹھی میں آگ لگ گئی ہے۔ براہ کرم دروازہ کھولیں۔'' شہروز نے کہا۔

''آگ.....'' اندر کچھ ہڑبڑاہٹ سنائی دی اور چند لمحوں کے بعد تیز روشنی ہوئی' پھر دروازہ کھول گیا' ایش پارکر شب خوابی کے لباس میں کھڑی تھی' شہروز آگے تھا اور قیصر اس کے پیچھے' ایش نے شہروز کو دیکھتے ہوئے کہا

''مگر تم کون ہو۔ اور کیا۔'' ایش پارکر کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ شہروز نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے زور سے دھکا دیا اور ایک تیز آواز کے ساتھ پیچھے گرتے گرتے بچی' شہروز اندر داخل ہو گیا اور اس کے پیچھے قیصر بھی' قیصر نے دروازہ بند کر لیا تھا' ایش پارکر نے دہشت زدہ نظروں سے قیصر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تت..... تم..... تم۔'' قیصر نے جواب دیا۔ شہروز چاروں اطراف نگاہیں دوڑا رہا تھا' پھر اس نے کہا۔

''فیصل عظیم باہر نکل آؤ' مجھے علم ہے کہ تم واش روم میں چھپے ہوئے ہو۔'' ایش پارکر کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا' اس نے خوفزدہ نگاہوں سے واش روم کی جانب دیکھا' شہروز نے قیصر سے کہا۔

''قیصر علی یہ عورت باہر نہ نکلنے پائے میں واش روم میں دیکھتا ہوں۔''

واش روم کا دروازہ شاید اندر سے بند نہیں کیا گیا تھا' شہروز نے برق رفتاری سے دوڑ لگائی اور اسی وقت فیصل نے اس پر حملہ کر دیا..... شہروز کے دروازہ کھولنے سے پہلے فیصل دروازہ کھول کر شہروز پر ٹوٹ پڑا تھا لیکن بدنصیب یہ نہیں جانتا تھا کہ واسطہ کس سے ہے' شہروز نے اسے اپنے بدن پر روکا اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے زمین پر پٹخ دیا' فیصل نے نیچے گرتے ہی اٹھ کر ایک بار پھر شہروز پر حملہ کیا تھا لیکن اس بار شہروز کا گھونسا اس کے جبڑے پر پڑا اور وہ اچھل کر مسہری پر جا گرا' وہ خونی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ایش پارکر دیوار سے جا لگی اور قیصر دروازے پر پتھر کے بت کی مانند خاموش کھڑا ہوا تھا۔ فیصل نے ایک بار پھر کوشش کی اور پھر شہروز کے ہاتھوں اچھا خاصا پٹ گیا' شہروز نے اس کے جبڑے سوجا دیے تھے' فیصل زمین پر گر کر ہانپنے لگا تو شہروز نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے فیصل' دولت ہی اس دنیا میں سب کچھ نہیں ہوتی اور یہ سفید فاحشہ اس کا تو کام ہی یہ ہے' بہرحال تم دونوں اپنے آپ کو زیر حراست سمجھو' میرا تعلق محکمہ پولیس سے ہے۔''

پھر شہروز نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی اور چند لمحات کے بعد فیصل اور ایش پارکر کو ہتھکڑی لگا دی گئی' ایش پارکر نے خوفزدہ نگاہوں سے قیصر جمال کو دیکھا اور کہا۔

''قیصر..... قیصر یہ سب کیا ہے۔''

''یہ سب کیا ہے ایش.....'' قیصر نے اس کی جانب اشارہ کر کے کہا اور ایش خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی' پھر ایش اور فیصل کو گاڑی میں بٹھا کر پولیس ہیڈ کوارٹر لایا گیا..... شہروز کے پاس اب بہترین ثبوت موجود تھے' چنانچہ دونوں کو لاک اپ میں داخل کر دیا گیا اور اس کے بعد شہروز نے قیصر کو سمجھا بجھا کر روانہ کر دیا' پھر یہ کیس چلتا رہا' شہروز نے تمام شواہد جمع کر کے عدالت میں چالان پیش کر دیا اور بس اتنا ہی کام تھا' اس کا لیکن جو ثبوت فیصل اور ایش پارکر کے بارے میں فراہم کیے گئے تھے' ان میں قطعی یہ گنجائش نہیں تھی کہ ان لوگوں کی زندگی کا امکان رہتا' دونوں کو آخرکار موت کی کرسی تک جانا تھا' قیصر البتہ خاصا دلبرداشتہ نظر آتا رہا تھا' ناہید اور شہروز نے ایک دن اس کی کوٹھی پر جا کر اسے سمجھایا۔

''ڈیئر قیصر' میں تم سے پہلے یہ بھی کہہ چکا ہوں کہ زندگی کے کھیل انوکھے ہوتے ہیں اور کبھی کبھی انسان انجانے پن میں ایسے اقدامات کر بیٹھتا ہے جو بہت بڑے نقصانات کا باعث بن جاتے ہیں' لیکن بہرحال زندگی خود اپنا مرہم ہوتی ہے' اب تم نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرو اور یوں سمجھو کہ جو کچھ پیش آیا تھا وہ ایک دلدوز سانحہ تھا اور کچھ نہیں' محبت اس سے کی جا سکتی ہے جس سے محبت حاصل ہو' اپنا کاروبار سنبھالو ان دونوں کو سزائے موت ہو گی اور تم ان کی سزائے موت کا منظر بالکل اجنبی نگاہوں سے دیکھو گے۔''

''شہروز صاحب! آپ کا شکر گزار ہوں میں اور یقیناً آپ کی ہدایت پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔'' قیصر جمال نے وعدہ کیا۔

☆☆☆

زبیر شاہ نے میڈم کا جائزہ لیا' خوبصورت اور پروقار عورت تھی۔ ون' ٹو' تھری نے بتا دیا تھا کہ وہ اصل جہانزیب ہے۔ اس لیے میڈم نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''آخرکار تم میرے چنگل میں آ ہی گئے' جہانزیب.....'' وہ زہریلے لہجے میں بولی۔ ''میں نے کہا تھا نہ آگ سے نہ کھیلو' جل جاؤ گے' زندگی اتنی بھی مختصر نہیں کہ کبھی ٹکراؤ ہی نہ ہو' مجھے ہر لمحہ یاد ہے' وہ سب کچھ یاد ہے جب تم نے کالج کی زندگی

میرے لیے جہنم بنادی تھی۔ فوزیہ تو بہت معصوم تھی' آہ ماضی کتنا حسین تھا۔''

میڈم کی آنکھیں خواب ناک ہوگئیں' فوزیہ کالج کے پارک میں سبز گھاس پر بیٹھی کسی کتاب کے مطالعے میں محو تھی۔ اس کا یہ پیریڈ خالی تھا۔ اتفاق سے اس وقت پارک میں چند طلبا اور طالبات ہی نظر آرہے تھے۔ وہ بھی ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے' جہانزیب ایک قریبی درخت کی آڑ سے نکل کر فوزیہ کے سامنے آ گیا۔ فوزیہ نے چونک کر سر اٹھالیا۔ جہانزیب کو دیکھ کر اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں پڑ گئیں' وہ اٹھنے لگی۔

''پلیز مس فوزیہ!'' جہانزیب نے جلدی سے کہا۔ ''میں آپ سے تقریباً ایک گز کے فاصلے پر ہوں' فوری طور پر کوئی خطرہ ثابت نہیں ہوسکتا اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ فاصلہ اتنا ہی رہے گا' بس میری ایک بات سن لیں۔''

''آپ جو جھک مارنا چاہتے ہیں' وہ میں جانتی ہوں۔'' فوزیہ نے جواب دیا۔

''جی نہیں' آپ نہیں جانتیں' یہی تو افسوس ہے۔''

''بکیے! کیا بکنا چاہتے ہیں۔''

''شکریہ۔'' جہانزیب نے ایک گہری سانس لی۔ ''آپ مجھے ایک لاابالی' آوارہ مزاج اور غیر ذمہ دار طالب علم خیال کرتی ہیں۔ بلاشبہ میں ایسا ہی تھا..... تھا کے استعمال پر چونکیے نہیں' کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ اب میں انتہائی سنجیدگی اور مستقل مزاجی سے اپنی اصلاح کررہا ہوں۔ گزشتہ کئی ماہ سے آپ نے میرے بارے میں کوئی افواہ بھی نہیں سنی ہوگی' اور حاضری کا ریکارڈ بھی آپ خود چیک کرسکتی ہیں کہ اب میں ایسا کوئی پیریڈ مس نہیں کررہا ہوں۔''

''اگر یہ حقیقت ہے تو بہت اچھی بات ہے کہ آپ کو اپنی غلط روش کا احساس ہوگیا ہے۔''

فوزیہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''مگر میرے اندر یہ احساس' یہ ادراک آپ کی شخصیت نے پیدا کیا ہے۔'' جہانزیب نے بڑے مخلصانہ لب و لہجے میں بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ ''میں اب تک غفلت کی تاریکی میں بھٹک رہا تھا' آپ کی ذات میرے لیے اس اندھیرے میں روشنی کی کرن بن کر نمودار ہوگئی ہے۔ کہنے کو تو بہت عام الفاظ ہیں' ہزاروں' لاکھوں مرتبہ کے دہرائے ہوئے' مگر یہ حقیقت ہے کہ مس فوزیہ میں آپ سے بے پناہ محبت کرتا ہوں' مجھے احساس ہے کہ سردست میں آپ کی ادنیٰ توجہ کے قابل نہیں' لیکن میں صرف اتنا ہی چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اپنا خلوص ثابت کرنے کا موقع دیجیے' آپ ایک بھٹکے ہوئے انسان کو نیکی اور شرافت کی راہ پر لاسکتی ہیں۔''

''اگر آپ سو فیصد سچ بھی بول رہے ہوں۔'' فوزیہ کھڑی ہوگئی۔ ''تب بھی میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتی۔''

''مگر کیوں مس فوزیہ۔''

''دیکھیے مسٹر جہانزیب محبت کوئی ایسا جذبہ نہیں جسے آپ اپنی مرضی کے مطابق جس پر چاہیں مسلط کردیں۔'' فوزیہ نے جواب دیا۔ ''آپ اپنی زندگی میں باقاعدگی پیدا کررہے ہیں' حصول علم کی سنجیدہ کوشش میں مصروف ہیں تو یہ خود آپ کی آئندہ زندگی کے لیے مفید ہے۔ آپ مجھ سے اس کی داد کیوں چاہتے ہیں۔''

''اس لیے کہ میں سہارے کا محتاج ہوں' آ نے ہاتھ نہ پکڑا تو میں پھر بھٹک جاؤں گا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ آپ میں خود اعتمادی کی کمی ہے' مرد کو اس قدر کم حوصلہ نہیں ہونا چاہیے۔'' فوزیہ نے کہا۔ ''بہرحال میں اس سلسلہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتی' مجھے افسوس ہے۔''

''کیا اس لیے کہ آپ مجھے اپنے قابل نہیں

سمجھتیں۔''

''یہ بھی ایک وجہ ہوسکتی ہے' لیکن اس سے زیادہ اہم اور بنیادی سبب یہ ہے کہ والدین نے مجھے کسی اور کے ساتھ منسوب کردیا ہے' اور مجھے ان کے اس فیصلے سے اتفاق ہے۔'' اتنا کہہ کر فوزیہ جہانزیب کو کچھ اور کہنے کا موقع دیے بغیر تیزی سے اس روم کی طرف چل دی۔

فوزیہ کالج سے واپس آتے ہوئے اپنے گھر کی طرف جانے والی گلی میں مڑی تو اچانک نہ جانے کس طرف سے جہانزیب نے نکل کر اس کا راستہ روک لیا' آج اس کی حالت عجیب تھی' کپڑے میلے اور مسلے ہوئے' شیو اتنا بڑھا ہوا' کھلا گریبان' سر کے بال بھی بکھرے ہوئے تھے۔

''میرا راستہ چھوڑ دیجیے مسٹر جہانزیب۔'' فوزیہ نے ناگواری سے کہا۔ ''ورنہ یہ میری گلی ہے جہاں میری ایک آواز پر ایک کی حجامت کے لیے پورا محلہ جمع ہوسکتا ہے۔''

''تو کیا میرے لیے تمہارے پتھر دل میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

''جی نہیں۔'' فوزیہ نے برہمی سے جواب دیا۔ ''اور یہ میں آپ کو آخری مرتبہ وارننگ دے رہی ہوں آج کے بعد آپ نے کہیں بھی میرے راستے میں آنے کی کوشش کی تو میں پرنسپل صاحب تک ہی نہیں پولیس تک بھی پہنچ سکتی ہوں۔''

''میں نے انتہائی خلوص سے تمہیں چاہنے اور تمہیں حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مس فوزیہ!'' جہانزیب نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن تم نے میرے جذبات اور احساسات کی قدر نہیں کی' اب تم مجھے وارننگ دے رہی ہوں تو میری وارننگ بھی سنتی جاؤ' تم میری نہیں بن سکتی تو کسی اور کی بھی نہیں بن سکتی اور اگر کبھی ایسا ہوگیا تو میں تم سے اس قدر خوفناک انتقام لوں گا کہ ہمیشہ یاد رکھوں گی۔''

وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ فوزیہ جلدی سے آگے بڑھ گئی' مگر پھر پہنچنے کے بعد بھی دیر تک اس کا دل قابو میں نہیں آیا جب بھی اسے جہانزیب کی دھمکی آمیز خوفناک الفاظ یاد آتے وہ سر سے پیر تک کانپ جاتی۔

اس دن کے بعد سے جہانزیب کالج سے غائب ہوگیا' جب مہینے دو مہینے تک اس کی شکل نظر نہیں آئی تو فوزیہ نے اطمینان کی سانس لی اور یہ سمجھ کر بھلانے کی کوشش کی کہ وہ اسے محض خوفزدہ کرکے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن جب اس نے دیکھ لیا کہ وہ اس کے لالچ میں آئی نہ ہی دھمکیاں اسے ڈرا سکیں تو وہ اسے اپنی ایک کوشش لاحاصل سمجھ کر اس سے دستبردار ہوگیا' مگر فوزیہ کی خوش فہمی تھی جو جلد ہی اس وقت ختم ہوگئی' جب ایک رات اپنی سہیلی کے گھر سے واپس آتے ہوئے اسے چند غنڈوں نے زبردستی اغوا کرنے کی کوشش کی' لیکن محض اتفاق سے اس وقت روڈ پر پولیس کی ایک جیپ آجانے کی وجہ سے وہ اسے چھوڑ کر بھاگ گئے' پھر دوسری مرتبہ اسے دن دہاڑے بس اسٹاپ سے اٹھانے کی کوشش کی گئی' لیکن عین اسی وقت تیز رفتار بس اسٹاپ پر رکنے کی کوشش کرتے کرتے جھٹکا لگا' جھٹکے سے وہ اور دو غنڈے سڑک پر گرے' مگر وہ اپنی چوٹوں کی پروا کیے بغیر اٹھ کر دوبارہ کالج بس میں گھس گئی۔ غنڈوں نے شکار کو ہاتھ سے نکلتے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر کار اور فکرمند ہوگئے' انہوں نے اسے تھرڈ ایئر سے ہی کالج سے اٹھالیا اور پھر ایک ماہ کے اندر اندر اس کی شادی نیئر سے کردی جو نہ صرف اس کا ماموں زاد بھائی بلکہ بچپن کا منگیتر بھی تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے۔

شادی کی رات تھی فوزیہ حجلہ عروسی میں دلہن بنی بیٹھی تمام سہیلیاں ایک ایک کرکے جا چکی تھیں' شریر و شوخ چھوٹی نندیں بھی تھرے چست کرنے

کے بعد رخصت ہوگئی تھیں۔ اب ہر طرف خاموشی تھی یا پھر دور کسی کمرے سے گھر والوں کے باتیں کرنے اور گاہے کسی دلچسپ بات پر ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں کہ کسی کے بھاری قدموں کی چاپ ابھری۔ فوزیہ کے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہوئی' کوئی کمرے میں داخل ہوا اور آہستہ سے کمرے کا دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی' مگر فوزیہ کا دھڑکتا ہوا دل اس وقت بھی اتنی ہی تیزی سے نہیں دھڑکا تھا جتنا اس کے چند ثانیہ بعد ہی ایک زوردار چھناکا سن کر دھڑکا اٹھا تھا۔ آواز بائیں جانب کی کھڑکی سے آئی تھی۔ دلہنا پے کی تمام شرم وحیا بھول کر فوزیہ نے گھبرا کر بائیں جانب دیکھا کمرے کے وسط میں کھڑا سہیل بھی چونک کر اسی طرف دیکھ رہا تھا' کمرے کے فرش پر کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کی کرچیاں پڑی تھیں' ان کے دیکھتے ہی دیکھتے کسی نے ٹوٹے ہوئے حصے میں ہاتھ ڈال کر کھڑکی کی کنڈی کھولی اور پھر پلک جھپکتے کود کر اندر کمرے میں آ گیا۔ فوزیہ کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی' وہ جہانزیب تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک خوفناک ریوالور تھا جس کی نال نیئر کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

''کوئی غلط حرکت مت کرنا۔'' اس نے دبے ہوئے مگر تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''ورنہ یہ حجلہ عروسی تم دونوں کا مقبرہ بھی بن سکتا ہے۔ میں اس وقت اپنی جان پر کھیل کر یہاں آیا ہوں۔ اس لیے تمہاری جانیں ضائع ہونے کی بھی پروا نہیں ہوگی۔'' وہ ایک لمحہ کے لیے خاموش ہو کر غور سے نیئر کو دیکھنے لگا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر اس سے مخاطب ہوا۔ ''باوجود اس کے کہ دولہا کا لباس پہنے کھڑے ہو مجھے تو تمہارے اندر کوئی خاص بات نہیں نظر آئی' نہ ہی اتنے حسین ہو اور نہ تمہارا جسم مردانہ صحت و تندرستی کا کوئی قابل ذکر نمونہ ہے۔ سوائے اس کے کہ ایم اے ایل ایل بی فائنل کے طالب علم ہو اور ایک دولت مند خاندان کے فرد' تمہارے اندر میرے مقابلے میں کوئی اضافی خوبی نہیں ہے لیکن یہ لڑکیاں بھی عجیب ہوتی ہیں' فوزیہ نے میری محبت کو مسترد کر کے تمہاری رفاقت قبول کر لی ہے اور بظاہر اس وقت میں شکست کھایا ہوا رقیب ہوں۔'' چند لمحے رک کر وہ قدرے فوزیہ کی طرف گھوما۔ ''یہ عارضی کامیابی مبارک ہو فوزیہ!'' اس نے کہا۔ ''اس وقت میں چاہوں تو صرف دو گولیاں خرچ کر کے اپنی توہین کا بدلہ لے سکتا ہوں' مگر اس اذیت کے مقابلے میں انتہائی کم تر درجہ کی اذیت ہوگی۔ جو تمہاری اس حرکت سے میرے دل کو پہنچی ہے۔ اس لیے میرا کوئی ارادہ تم دونوں کو ایسی آرام دہ موت دینے کا نہیں' بشرطیکہ تم اپنی کسی فوری حرکت سے مجھے مجبور نہ کرو نہیں' مس فوزیہ اور مسٹر نیئر! تمہیں اتنی معمولی سزا دے کر میرے دل کو چین نہیں آئے گا' تمہارے لیے تو میں نے ایسی موت سوچی ہے کہ جب تک زندہ ہو تھوڑا تھوڑا کر کے اندر ہی اندر گھٹ کر اور سلگتے ہوئے اپنی آخری سانسوں تک پہنچو میں تمہیں صرف اتنا ہی بتانے آیا تھا کہ مس فوزیہ شادی کر کے اپنے آپ کو کامیاب مت تصور کرنا' میرا جذبہ انتقام تمہارے سر پر کسی بال میں بندھی تلوار کی طرح لٹکتا رہے گا اور اس لیے مجھے بھول مت جانا اور ڈرتی رہنا' اس وقت سے جب یہ تلوار کسی ایسی چیز پر گرے گی جس پر لگا ہوا ایک ایک زخم تمہیں اپنے جسم پر نہیں اپنی روح کی گہرائیوں میں اترتا محسوس ہوگا' سردست الوداع۔''

اس کے بعد وہ جس طرح کھڑکی سے کود کر کمرے میں آیا تھا' اسی طرح ایک چست بلی جا کر باہر نکل گیا۔

وقت گزرتا رہا' فوزیہ اور نیئر کئی ماہ تک جہانزیب کی خوفناک دھمکی سے خوفزدہ رہے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید وہ ان میں سے کسی کو یا ان کے عزیز' بہن' بھائیوں اور والدین میں سے کسی کو

مار کر یا اغوا کر کے اپنا انتقام لینا چاہتا ہے۔ مگر مہینے گزر گئے اور کوئی قابل ذکر یا قابل فکر بات وقوع پذیر نہیں ہوئی' ایک سال بیت گیا۔ وہ جہانزیب کی یاد کو فراموش کر کے زندگی کی رنگینیوں اور دلچسپیوں میں مصروف ہو گئے۔ نیئر نے ایم اے ایل ایل بی کا امتحان نمایاں پوزیشن سے پاس کر لیا اور پریکٹس کرنے لگا' پھر ایک میڈیکل چیک اپ کے دوران لیڈی ڈاکٹر نے فوزیہ کو عنقریب ماں بننے کی خوشخبری سنائی' فوزیہ کا ہر طرح خیال رکھا جانے لگا' طبی نگہداشت میں بھی کوئی کمی اٹھا نہیں رکھی گئی' لیکن جو ہونی کا تب تقدیر نے قسمت میں لکھ دی ہو اس کو وقوع پذیر ہونے سے کون روک سکتا ہے۔

مقررہ وقت پر فوزیہ کو ایک بہترین اور جدید سہولتوں سے آراستہ میڈیکل سینٹر میں داخل کیا گیا اور بالآخر ممبر آپریشن کے بعد دو بچوں کی ولادت ہوئی' کیس نے ایسی پیچیدہ صورت حال اختیار کر لی تھی کہ ڈاکٹر سخت جدوجہد کے بعد ہی زچہ و بچہ کو بچانے میں کامیاب ہو سکے' لیکن ایک ایسی صورت حال یہ پیدا ہوئی کہ آئندہ کے لیے کسی بچے کی پیدائش ممکن نہ رہی' اولاد سے آئندہ کے لیے محرومی کا احساس اس کے لیے قابل برداشت ہو گیا کہ دو بچے اللہ نے انہیں دے ہی دیے تھے۔ جن میں سے ایک لڑکا تھا اور ایک لڑکی' ہر خطرے سے باہر اور پوری طرح نارمل اور صحت مند۔

لڑکے کا نام حسن اور لڑکی کا نام ماہ نور رکھا گیا' خوب خوشیاں منائی گئیں' سب یہی کہہ رہے تھے کہ خدا نے ایک ہی وقت میں لڑکے اور لڑکی کی آرزو پوری کر دی ہے۔ یہی جیتے رہیں' والدین اور خاندان کا نام روشن کریں' مزید بچے نہ بھی ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے' شاید اس میں بھی خدا کی کوئی مصلحت ہو۔

دونوں بچوں کی بڑے ناز و نعم سے پرورش ہونے لگی' دونوں گورے چٹے' خوبصورت اور صحت مند تھے۔ وقت تیزی سے پر لگا کر اڑتا رہا' یہاں تک کہ دونوں کی سالگرہ منانے کی تاریخ آ گئی اور گزشتہ سال کی طرح اس برس بھی تمام روایات کو برقرار رکھا گیا' سالگرہ کا خوبصورت اور لذیذ کیک تالیوں کی گونج میں بچوں کے ہاتھ سے کٹوایا گیا۔ ''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو'' کی سریلی آوازیں گونجیں' کھانے کا وقت آیا تو دونوں بچوں کو نیند ستانے لگی' چنانچہ سلا کر انہیں گہواروں میں لٹا دیا گیا جو کہ بیڈ روم میں رکھے تھے۔ مہمانوں نے اطمینان سے کھانے سے انصاف کیا۔ اس کے بعد ایک مختصر سا ورائٹی پروگرام دیکھا اور مبارکباد دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

فوزیہ اور نیئر ہنستے مسکراتے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اپنے کمرے میں داخل ہوئے' سب سے پہلے ان کی نظر کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی پر پڑی' مگر موسم گرما تھا' انہوں نے کوئی توجہ نہ دی' بچے بظاہر سکون سے سوئے ہوئے معلوم ہو رہے تھے' باری باری باتھ روم میں جا کر انہوں نے لباس تبدیل کیے' پھر ایک دوسرے کو شب بخیر کہنے سے پہلے عادتاً بچوں کو پیار کرنے کے لیے گہواروں کی طرف بڑھے' نیئر نے جھک کر حسن کی پیشانی پر بوسہ دیا' فوزیہ بیٹی کو چومنے جھکی تو فوراً ہی ایک چیخ مار کر سیدھی ہو گئی' اس کی آنکھیں خوف و حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ نیئر نے قریب ہو کر دیکھا تو گہوارے میں ماہ نور کی جگہ ایک پلاسٹک کی گڑیا رکھی ہوئی تھی۔ اس نے جھپٹ کر گڑیا اٹھائی' اس کے سینے پر سیفٹی پن سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ لگا ہوا تھا' اس نے سیفٹی پن کھول کر کاغذ نکالا' اس کی تہ کھولی' یہ ایک چند سطری خط تھا' لکھا تھا۔

''فوزیہ۔

میں نے تم سے وعدہ کیا تھا نا کہ میں تمہیں ایسی موت دوں گا کہ تم اپنی آخری سانس تک سسک سسک کر مرتی رہو گی۔ آج اس وعدہ کے

ایفا کا آغاز ہے۔ میں تمہاری خوبصورت بیٹی کو لیے جا رہا ہوں، میں نے اسے پہلی نظر دیکھا تو کچھ یوں لگا جیسے تم بھی اپنے بچپن میں ایسی ہی رہی ہوگی، غنیمت سمجھو کہ میں نے دونوں کے بجائے صرف ایک کو لینے پر اکتفا کیا اور وہ بھی لڑکی لڑکے سے تمہارے خاندان کا نام چلتا رہے گا۔ البتہ یہ افسوس ضرور ہے کہ تم ماہ نور کا نعم البدل نہ پاسکوگی۔ تمہارا...... وہ ہی......"

فوزیہ جو نیئر کے ساتھ ہی جھکی ہوئی خط پڑھ رہی تھی، ایک دبی ہوئی سسکی سی لی اور بے ہوش ہو کر فرش پر لڑھک گئی۔

معروف پبلک پراسیکیوٹر نیئر احمد یہاں تک اپنی داستان بیان کر کے خاموش ہو گئے اور اپنی بیگم کی طرف دیکھا جو ان کے دائیں جانب صوفے پر رنج والم کی تصویر بنی بیٹھی تھی، ان کی عمر چالیس سال سے کچھ ہی زیادہ ہوگی، مگر وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھی نظر آ رہی تھیں۔ سر کے بیشتر بال سفید ہو چکے تھے۔ چہرے پر جھائیاں اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ایک مستقل حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ میں نے آخری کش لے کر سگریٹ کا ٹوٹا ایش ٹرے میں مسل دیا۔

"اس حادثے کو اندازاً کتنی مدت گزر گئی۔" میں نے پوچھا۔

"تقریباً بیس سال۔" نیئر احمد نے جواب دیا۔ "لیکن اس درندہ صفت انسان کا انتقام ابھی جاری ہے انسپکٹر اکرم! وہ ہمیں واقعی سسکا سسکا کر مار رہا ہے، ظاہر ہے کہ ماہ نور کی گمشدگی پر میں نے اس کی تلاش میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا، لیکن اس کو نہ ملنا تھا اور نہ آج تک ملی ہمیں، یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں اور زندہ ہے تو کہاں ہے۔ انسانی فطرت کا مزاج ایسا ہے کہ آدمی رفتہ رفتہ ہر غم کا سہارا لیتا ہے۔ ہم نے بھی ماہ نور کی جانب سے صبر کیا اور حسن ہی کو اپنی تمام تر محبت اور شفقت کا مرکز و محور بنا کر پروان چڑھایا، ہم نہ تو ماہ نور کو بھول سکتے تھے نہ اس ظالم جہانزیب کو۔ مگر اتنی امید ضرور ہونے لگی تھی کہ خدا اب کبھی زندگی میں اس سے واسطہ نہیں ڈالے گا مگر یہ امید بھی پوری نہ ہوئی...... یہ دیکھیے!" اتنا کہہ کر انہوں نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک بڑا سا لفافہ نکالا اور اس میں سے کاغذ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "پہلے اسے پڑھیے۔" میں نے کاغذ ان کے ہاتھ سے لے لیا وہ ایک مختصر سا خط تھا۔

"فوزیہ۔

امید تو یہ ہے کہ تم مجھے ابھی تک نہیں بھولی ہوگی اور یقیناً یہ بھی یاد ہوگا کہ جب میں نے اپنی پرخلوص محبت تمہارے قدموں میں رکھ دی تھی تو تم نے مجھے اس لیے ٹھکرا دیا تھا کہ مجھ جیسے عیاش طبع، آوارہ مزاج لڑکے کسی شریف لڑکی کی محبت پانے کے اہل نہیں ہوتے، ہر چند ان خیالات کا اظہار تم نے زبان سے نہیں کیا تھا اور بظاہر نیئر سے اپنی منگنی کی آڑ لی تھی، مگر تمہارے جذبات میرے بارے میں یہی تھے، اس تحریر کے ساتھ چند فوٹو منسلک ہیں، ذرا انہیں غور سے دیکھنا، دوسرا چہرہ سیاہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، قابل غور بات یہ ہے کہ آج تمہارا انجیب الطرفین بیٹا حسن اسی گندگی میں ملوث ہے، جس کے لیے تم نے مجھے قابل نفرت سمجھا تھا، یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ تم اس کے لیے کسی شریف بیٹی کے باط کے دروازے پر دستک دینا مناسب سمجھتی ہو یا نہیں، دوسری بات ان تصویروں کو عام ہونے سے بچانے کے لیے تم کتنا خرچ کر سکتی ہو۔ یہ جاننے کے لیے عنقریب پھر رابطہ قائم کروں گا۔

"تمہارا...... وہ ہی۔"

میں خط پڑھ چکا تو نیئر صاحب نے وہ فوٹو بھی میرے ہاتھ میں دے دیئے، میں نے انہیں دیکھا، مگر وہ میرے لیے نئے نہیں تھے۔ گزشتہ پندرہ دن میں ایسے دو کیس میرے علم میں آ چکے تھے، یہ فوٹو بھی گزشتہ تصویروں کی طرح تھے، انہیں شرمناک تو نہیں کہا جا سکتا، مگر حسن کے ماں، باپ کے لیے وہ تکلیف دہ ضرور تھے لڑکے کا چہرہ بہت واضح اور نمایاں تھا، جبکہ لڑکی کو شناخت سے بچانے کے لیے اس کا چہرہ بالکل سیاہ کر دیا گیا تھا۔

"کیا اس نے دوبارہ رابطہ قائم کیا۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" نیئر صاحب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "اس کا مطلب ایک لاکھ روپے ہے۔"

"اس کا امکان ہے کہ یہ فوٹو جعلی ہوں۔" میں نے کہا۔ "حسن کا چہرہ فوٹو ٹرک سے کسی اور مرد کے جسم پر لگا دیا گیا ہو۔"

"اس کا امکان نہیں۔" نیئر صاحب نے مایوسی سے کہا۔ "ہم نے حسن سے بات کی تھی، وہ شرمندہ ہے، مگر تصویروں کی سچائی سے منکر نہیں۔"

"جہانزیب نے یہ سب سے زیادہ گہرا زخم میری روح پر لگایا ہے۔"

مسز نیئر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔ "میں نے حسن کی پرورش بڑے ناز سے کی تھی۔ مگر اس نے میری تمام محنت و ریاضت پر پانی پھیر دیا۔ یہ سب لڑکے جوان ہو کر ایسے کیوں ہو جاتے ہیں۔"

"یہ منفی سوچ ہے فوزیہ!" جہانزیب نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "اسے ذہن میں جگہ مت دو۔ تم نے جہانزیب کو ٹھکرا دیا تھا لیکن اس نے انتقاماً ہمیں برسوں سے اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ تو کیا اسے یہ سمجھا جائے کہ کوئی شریف لڑکی کسی غنڈے کی چیرہ دستیوں کا جواب نہ دے۔ کیا تمہیں کبھی اس فیصلے پر افسوس ہوا۔"

"نہیں، کبھی نہیں۔" مسز نیئر نے بڑے جوش سے کہا۔

"یہ اتفاق ہے یا قدرت کی کوئی مصلحت کہ خدا نے اس کی رسی دراز کر رکھی ہے، مگر آج نہیں تو کل وہ کیفر کردار کو ضرور پہنچے گا، تم نے اسے ٹھوکر نہ ماری ہوتی تو اس سے زیادہ اذیت ناک حالات میں ہوسکتی یا یوم حساب تم بھی اس کے گناہوں میں شریک سمجھی جاتیں، اس طرح حسن کا معاملہ ہے وہ ایک شریف النفس لڑکا ہے اور اس کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اسے اپنی غلطی پر ندامت ہے۔" شیطان تو آدم علیہ السلام کو بھی پل بھر کے لیے بہکانے میں کامیاب ہو گیا تھا، نیکی اور بدی کا معیار اگر رنج و راحت کو بنا لیا جائے تو تمہیں ہر زمانے کے فرعونوں اور قارونوں کو برگزیدہ ہستیوں میں شمار کرنا پڑے گا۔"

"آپ سچ کہہ رہے ہیں۔" بیگم نیئر نے جواب دیا۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ اب ہم اس شیطان سے کیسے نمٹیں گے جس کا نام جہانزیب ہے۔"

"میں نے تمہیں اسی لیے زحمت دی تھی انسپکٹر اکرم!" نیئر صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے کہ میں اس کیس کو باقاعدہ پولیس کیس نہیں بنانا چاہتا، تم نے خود محسوس کر لیا ہے کہ ایسی صورت حال میں بہت سے دوسرے معاملات کو سامنے لانا پڑے گا، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم نجی طور پر تحقیق کرو کہ جہانزیب کہاں ہے، کس بھیس میں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ وہ اسی شہر میں موجود ہے اس کا ثبوت وہ فون بھی ہیں جو اس نے اب تک ہمیں کیے اور یہ حقیقت ہے کہ اس نے ایک لاکھ کی رقم کی ادائیگی کے لیے شہر کا ایک ہی مقام منتخب کیا ہے۔"

"اس نے ابھی کسی تاریخ کا تعین تو نہیں کیا۔" میں نے سوال کیا۔

"اس نے ہمیں دو ہفتے کی مہلت دی ہے، جس کا آج تیسرا دن گزر رہا ہے۔" نیئر صاحب نے جواب دیا۔

"آپ کا ارادہ کیا ہے۔ کیا رقم ادا کریں گے۔"

''اگر ان دس' گیارہ دنوں میں تم کچھ نہیں کر سکے تو یہی کرنا ہوگا۔'' نیئر صاحب نے کہا۔

اس کے بعد میں نے ان سے جہانزیب کے حلیے' اس کی کسی مخصوص نشانی یا عادت کے بارے میں پوچھا' مگر نیئر صاحب کو صرف بیس بائیس سال قبل کا حلیہ ہی معلوم تھا' وہ اس کی کسی خاص پہچان یا عادت کے متعلق کچھ نہیں بتا سکیں' میں نے نیئر صاحب سے حتی الامکان کوشش کرنے کا وعدہ کیا اور رخصت کی اجازت چاہی۔

ہیڈ کوارٹر واپس پہنچا تو ڈی ایس پی صاحب بڑی بے تابی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔

''کہاں غائب رہتے ہو۔'' انہوں نے شکایت کی۔ ''کبھی تو اپنی کرسی پر بیٹھے نظر آ جایا کرو۔''

''کرسی پر بیٹھتا ہوں تو آپ ہی شکایت کرتے ہیں کہ حکومت مجھے کرسی پر بیٹھ کر مکھیاں مارنے کی تنخواہ نہیں دیتی۔ ذرا باہر نکل کر تنخواہ حلال کرنے کی کوشش بھی کر لیا کروں۔'' میں نے مسکرات ے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھیک کہتا ہوں تم جب کرسی پر بیٹھتے ہو تو صرف مکھیاں ہی مارتے ہو۔'' ڈی ایس پی صاحب نے کہا۔ ''بہرحال' سیٹھ افضل صاحب نے فون کیا تھا کسی نے ان کے سیف سے دس ہزار روپے اور کچھ قیمتی چیزیں چرا لی ہیں۔''

''تو ہمارا اس سے کیا تعلق۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''وہ اپنے حلقے کے تھانے میں رپورٹ کریں۔''

''انہوں نے اپنی رپورٹ درج کرا دی ہے۔'' ڈی ایس پی صاحب نے بتایا۔ ''مگر انہیں شکایت ہے کہ تین دن گزر چکے ہیں اور متعلقہ تھانے کے عملے نے کوئی کارروائی نہیں کی ہے' تم جانتے ہو کہ سیٹھ افضل بڑے اثر و رسوخ والا آدمی ہے' بظاہر وہ کچھ کرتا نظر نہیں آتا' ملک کی دو بڑی سیاسی پارٹیوں کی اعلا قیادت اس کے لاکھوں چندے سے مستفید ہوتی ہے اور جواباً انہیں بھی سیٹھ افضل کی خوشی ناخوشی کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ہم عوامی محکموں کے ملازمین کی ایک پرابلم یہ بھی ہے کہ ہم کم سے کم بڑی سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں کو ناراض نہیں کر سکتے' ممکن ہے کہ کل وہ برسر اقتدار آ کر ہم سے اس ناراضگی کا سود طلب کریں' سیٹھ افضل نے خاص طور پر تمہیں بھیجنے کے لیے کہا ہے' ذرا جا کر دیکھ لو کیا معاملہ ہے۔''

''آپ یہ کیس باقاعدہ میرے سپرد کر رہے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''احمقانہ باتیں مت کرو۔'' ڈی ایس پی صاحب مسکرائے۔ ''کچھ کیس آف دی ریکارڈ بھی ہوتے ہیں۔''

''سیٹھ افضل کا سیف یقیناً نمبروں والا ہوگا۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں اور چونکہ نمبروں کے معاملے میں ان کی یادداشت بہت زیادہ خراب ہے' اس لیے فضل نمبر انہوں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کر رکھا ہے۔''

''چوری کے بعد سیف چابی سے کھولا گیا تھا یا نمبروں سے۔''

''سیٹھ افضل کا کہنا ہے کہ دوسرے دن انہیں سیف کھلا ہوا ملا' مگر اس کے قفل پر یا کسی بھی جگہ کوئی ایسا نشان یا علامت نہیں تھی جس سے سمجھا جائے کہ کسی نے اسے زبردستی کھولنے کی کوشش کی۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''آپ سیٹھ افضل کو فون کر دیں کہ میں دو گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں' تب تک وہ اپنے گھر کے ہر فرد کو میرے آنے تک جانے نہ دیں۔''

''دو گھنٹے!'' ڈی ایس پی صاحب چونکے۔ ''دو گھنٹے تک کیا کرو گے۔ ابھی کیوں نہیں چلے جاتے۔''

''میری کرسی میں کھٹمل بہت زیادہ ہو گئے

ہیں۔'' میں نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''کھٹمل مارنے پر آپ اعتراض کرتے ہیں' اس لیے آئندہ دو گھنٹے تک کھٹمل مارنے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا' ورنہ عین ممکن تھا کہ میز پر رکھا ہوا شیشے کا پیپر ویٹ مجھے کھینچ کر مارنا پڑتا ہے۔

سیٹھ افضل کی شاندار کوٹھی کے گیٹ پر چوکیدار مجھے دیکھتے ہی اٹینشن ہو گیا' اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے میں آگے بڑھا تو کوٹھی کے برآمدے میں خود سیٹھ صاحب سے ملاقات ہو گئی' مجھے دیکھتے ہی وہ باچھیں پھاڑ کر مسکرائے اور بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔

''آپ نے سب گھر والوں کو جمع کیا۔''

''جی ہاں' وہ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں' مگر میں انہیں اس طرح اکٹھا کرنے کی مصلحت نہیں سمجھ سکا۔''

''ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن پر آپ کو شبہ ہے۔''

''صحیح معنوں میں تو شبہ کسی پر بھی نہیں ہے۔'' سیٹھ افضل نے جواب دیا۔

''صرف چھوٹے بھائی ساجد پر تھوڑا سا شک ہے کہ آج کل اس کے کاروباری حالات ٹھیک نہیں ہیں' گھر میں اس کی آمد و رفت بھی میرے عزیزوں سے زیادہ رہتی ہے' لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ حرکت اس کی ہے یا نہیں۔''

''نقد رقم دس ہزار تھی۔''

''جی نہیں' پوری ایک لاکھ۔'' سیٹھ افضل نے جواب دیا' میں نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔

''یہ بات صرف آپ تک رہنی چاہیے انسپکٹر اکرم!'' سیٹھ افضل معنی خیز لہجے میں بولے۔ ''میں کسی پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا کہ میں گھر میں اتنی بڑی رقم رکھتا ہوں۔''

''بہت خوب!'' میں نے اس طرح کہا کہ سیٹھ افضل اندازہ نہیں کر سکے کہ میں طنز کر رہا ہوں یا تعریف۔ ''کچھ اور قیمتی چیزیں بھی نکالی گئی ہیں۔''

''جی نہیں' بس ایک لاکھ نقد۔ رپورٹ میں قیمتی چیزوں کا اضافہ اس لیے کر دیا گیا کہ پولیس تحقیقات میں تساہل سے کام نہ لے۔'' سیٹھ افضل نے خفیف سی مسکراہٹ سے کہا۔ ''لیکن اب پولیس بڑی سمجھ دار ہو گئی ہے۔''

میں سیٹھ افضل کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہاں صرف پانچ افراد بیٹھے تھے دو مرد تین عورتیں میں نے کچھ تعجب سے سیٹھ کی طرف دیکھا۔

''یہ آپ کے کل افراد خاندان ہیں۔''

''شمار میں یہی لوگ آتے ہیں۔'' سیٹھ صاحب نے جواب دیا۔ ''باقی جو ہمیں ان میں سے ایک کو چھوڑ کر جو سعودیہ گیا ہوا ہے اور کوئی قابل ذکر نہیں۔''

انہوں نے تعارف کرایا۔ ایک ان کا لڑکا تھا محمد قاسم' جس کی عمر کسی طرح پینتیس سال سے کم نہیں تھی' جبکہ سیٹھ افضل بذات خود چالیس' پینتالیس سے زیادہ کے نہیں معلوم ہوتے تھے' دوسری اس کی بیوی آمنہ تھی' تیسری ان کی بیٹی تھی طوبیٰ جس کی عمر تیس برس سے کچھ زیادہ ہی لگتی تھی' اس کا شوہر جدہ سعودی عرب میں ملازم تھا۔ چوتھی ان کی مرحومہ بیوی کی بیوہ بہن تھی اور ساٹھ سے اوپر ہونے کے باوجود بڑی مضبوط کاٹھی کی مالک تھی۔ سیٹھ افضل نے اس کے شہر کے انتقال کے بعد اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا' جس کے عوض اس کو صرف ملازمہ کے فرائض انجام دینا ہوتے تھے۔ گھر کے سب افراد اسے رانی کہتے تھے۔ اصل نام یہی تھا یا کچھ اور نہ سیٹھ افضل نے بتایا نہ میں نے پوچھنے کی زحمت کی۔ آخر میں انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی ساجد کو متعارف کرایا جو نارتھ ناظم آباد میں واقع ایک اعلا درجہ

کے ریسٹورنٹ کا مالک تھا' اتنے لوگوں میں مجھے صرف وہی سیٹھ افضل کے خاندان کا معلوم ہوتا تھا۔

میری درخواست پر سیٹھ افضل نے مختصر طور پر واردات کی تفصیل بتائی۔ ان کے بیان کے مطابق چار دن قبل جمعرات کی رات کو وہ حسب معمول اپنی جملہ جائیداد کی آمدن و خرچ کے حسابات چیک کر رہے تھے۔ برسبیل تذکرہ یہ بتاتا چلوں کہ سیٹھ افضل کوئی کام نہیں کرتے تھے۔

مطلب یہ کہ ان کا کوئی معاشی مشغلہ یا مسئلہ نہیں تھا' چنانچہ اپنی مرحومہ بیوی کی جائیداد کا کرایہ وصول کرنے کے علاوہ ان کی کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ یہ کام وہ اپنے اسٹڈی روم میں انجام دیتے تھے جو ان کے بیڈروم کے برابر واقع تھا۔ رات کو تقریباً گیارہ بجے انہوں نے کام ختم کیا۔ رجسٹر وغیرہ اٹھا کر سیف میں رکھے' سیف بند کیا اور اطمینان سے اپنے بیڈروم میں آ کر سو گئے' دوسری صبح اٹھے' حسب دستور ناشتہ کیا اور پھر کسی ضرورت کے تحت سیف کو کھولنا چاہا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ وہ پہلے ہی سے کھلا ہوا ہے۔ حالانکہ انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ رات کام ختم کر کے انہوں نے سیف مقفل کر دیا تھا۔ اس انکشاف سے فطری طور پر گھبرا کر انہوں نے سیف کا جائزہ لیا تو اندر ایک مخصوص خانے میں رکھی ہوئی رقم میں سے ایک لاکھ روپے غائب تھے۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا گیا تھا۔ انہوں نے اپنے گھر والوں سے اس چوری کا تذکرہ نہیں کیا۔ اگرچہ بعد میں انہیں معلوم ہو گیا اور سیدھے اپنے علاقے کے تھانے میں جا کر رپورٹ درج کرا دی۔

''بس یہ ہیں انسپکٹر صاحب کل حالات۔'' وہ آخر میں بولے' میں نے ان کے اعزا کی طرف دیکھا۔

''آپ لوگوں کو تو اس بارے میں کچھ نہیں کہنا ہے۔'' میں نے پوچھا۔ ''کہنا ہو تو اس کا مناسب وقت یہی ہے بعد میں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔'' مگر سب خاموش بیٹھے رہے' میں نے قاسم کی طرف دیکھا۔

''پہلے آپ بتایئے مسٹر قاسم کہ اس کی عمر کتنی ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''اگلی جنوری میں پورے چھتیس کا ہو جاؤں گا۔'' قاسم نے جواب دیا۔ ''اس سوال سے آپ کا کیا مطلب ہے' اگر یہ ہے کہ میں اور ڈیڈی' باپ' بیٹے معلوم نہیں ہوتے تو یہ بات اپنی جگہ درست ہے۔ ڈیڈی ہمارے سوتیلے باپ ہیں ہماری ممی نے والد کے انتقال کے بعد ان سے دوسری شادی کر لی تھی۔ اس وقت میری عمر کم و بیش سولہ برس اور میری بہن طوبیٰ کی عمر چودہ سال تھی۔ ہم دونوں کے علاوہ والد صاحب کی کوئی اولاد نہیں تھی۔''

''اور آپ کی عمر کیا ہے سیٹھ صاحب!'' ہم نے دوسرا سوال کیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ چوری کے لیے تحقیقات کر رہے ہیں۔''

''پلیز سیٹھ صاحب! اگر آپ لوگ صرف سوالات کے جواب دیتے رہیں.....'' میں نے بات کاٹی۔ ''تو آپ کا وقت بھی کم خرچ ہوگا اور میرا وقت بھی ضائع ہونے سے بچ جائے گا۔''

''اس وقت میری عمر اندازاً پینتالیس سال ہے۔'' سیٹھ افضل نے قدرے ناگواری سے جواب دیا۔ ''اور اگر آپ یہ پوائنٹ آؤٹ کرنا چاہتے ہیں کہ بیس سال قبل جب میں نے قاسم کی ممی سے شادی کی تھی تو ان کی عمر مجھ سے زیادہ تھی کیونکہ وہ اس وقت بھی سولہ اور چودہ برس کے بچوں کی ماں تھیں تو مزید سوالات کی ضرورت نہیں' بلاشبہ ان کی عمر زیادہ تھی' وہ کم و بیش اڑتیس سال کی تھیں' مگر یہ ہماری آپس کی انڈر اسٹینڈنگ تھی' پھر بھی یہ کہ اس کا چوری سے

کوئی تعلق نہیں۔''

''درست کہا آپ نے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ سوال میں نے صرف بیک گراؤنڈ جاننے کے لیے کیا تھا۔ بہرحال آپ یہ بتائیں کہ گھر میں کس کس کو یہ بات معلوم تھی کہ آپ سیف میں رقم رکھنے کے عادی ہیں۔''

''تقریباً سب ہی جانتے ہیں۔''

''بہت خوب۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''میں نے سنا ہے کہ آپ کی یادداشت کچھ کمزور ہے۔''

''یہی تو میں بھی کہتا ہوں۔'' قاسم جلدی سے بول اٹھا۔ ''ڈیڈی یقیناً ایک لاکھ روپے کہیں رکھ کر یا کسی کو دے کر بھول گئے ہیں اور یہی صورت سیف کی بھی ہے' کئی مرتبہ میں نے خود ڈیڈی کو متوجہ کیا ہے کہ وہ سیف کا قفل کھلا چھوڑ آئے ہیں۔''

''میری یادداشت کمزور ضرور ہے' مگر نمبروں کے معاملے میں۔'' سیٹھ افضل نے ناگواری سے کہا۔ ''اس لیے میں تمام نمبر اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیتا ہوں۔''

''اور آپ نے سیف کے قفل کا نمبر بھی ڈائری میں نوٹ کیا تھا۔''

''یقیناً۔''

''یہ ڈائری عموماً کہاں رہتی ہے۔''

''میری میز کی دراز کے اندر اسٹڈی روم میں۔''

''جہاں سے گھر کا ہر فرد اسے آسانی سے حاصل کر دیکھ سکتا ہے۔''

''اگر چاہے تو۔'' سیٹھ صاحب نے محتاط الفاظ میں جواب دیا۔

''کیا یہ ممکن نہیں آپ جمعرات کی رات کو سیف کا قفل بند کرنا بھول گئے ہوں۔''

''جی نہیں۔'' سیٹھ صاحب نے پرزور انداز سے سر ہلایا۔ ''اس رات تو خاص طور پر مجھے یاد ہے کہ سیف بند کر دیا تھا۔''

''کیوں۔ اس رات کیا بات خاص تھی۔'' میں نے سوال کیا۔

''جب تم ام رجسٹر وغیرہ اٹھا کر سیف میں رکھ چکا۔'' سیٹھ صاحب نے جواب دیا۔ ''اور قفل کا ڈائل گھما کر اسے بند بھی کر دیا تو اچانک مجھے یاد آیا کہ میں رجسٹروں کے ساتھ ہی اپنی ڈائری بھی اندر رکھ چکا ہوں۔ میں پریشان ہو گیا' اب میں سیف کیسے کھولوں گا۔ چنانچہ میں نے اس کا ہینڈ گھمانے کی کوشش کی کہ شاید وہ ابھی پوری طرح بند نہ ہوا ہو' مگر وہ مقفل ہو چکا تھا۔''

''اور پھر صبح آپ کو کھلا ہوا ملا۔''

''جی ہاں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''اب آپ لوگ تشریف لے جا سکتے ہیں۔''

وہ سب اٹھ کر باہر جانے لگے' جب قاسم اٹھنے لگا تو میں نے اسے ٹھہرنے کی ہدایت کی' باقی سب جا چکے تو میں نے قاسم کی طرف دیکھا۔ ''تم نے اپنے ڈیڈی کے سیف سے ایک لاکھ روپے کیوں نکالے تھے مسٹر قاسم۔''

سیٹھ افضل اچھل پڑے اور گھور کر اپنے سوتیلے بیٹے کو دیکھا۔

قاسم کا چہرہ یک دم سفید پڑ گیا' اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی' ہونٹ ہلے' مگر آواز نہیں نکلی۔

''گھبراؤ نہیں۔'' میں نے تسلی دی۔ ''اگر معقول وجہ ہوگی تو سیٹھ صاحب تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔''

''میں..... میں مجبور تھا۔'' قاسم سر جھکا کر بولا۔ ''کوئی مجھے بلیک میل کر رہا تھا۔''

''تو یہ تمہاری حرکت تھی' تم نے.....'' سیٹھ صاحب غصے میں بہت کچھ کہنا چاہتے تھے' مگر میں نے روک دیا۔

''پلیز سیٹھ صاحب! آپ سردست خاموش رہیں۔'' میں نے کہا اور پھر قاسم سے پوچھا۔ ''کون تھا وہ۔''

"مجھے معلوم نہیں۔ وہ صرف فون پر بات کرتا تھا۔"

"وہ تمہیں کس سلسلے میں بلیک میل کر رہا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"اس کے پاس کچھ فوٹو تھے۔" قاسم نے جواب دیا۔ "جس میں سے دو' تین اس نے مجھے بھیجے تھے۔"

"کسی ایسی لڑکی کے ساتھ جس کا چہرہ کالا کر دیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ قاسم نے ایک دم چونک کر مجھے دیکھا۔

"آپ..... آپ کو کیسے معلوم ہوا۔" وہ ہکلایا۔

"تمہارے پاس وہ فوٹو ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"وہ مجھے دے دو۔" میں نے کہا' جواب میں قاسم نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک لفافہ نکالا۔

"یہ تمام فوٹو ہیں' ساتھ میں نگیٹو بھی۔" اس نے بتایا۔ "یہ مجھے آج صبح ہی ملے ہیں۔"

"تم نے اسے لاکھ روپے کس طرح ادا کیے۔" میرا اگلا سوال تھا۔

"اس کی ہدایت کے مطابق میں نے ایک لاکھ روپے دو لفافوں میں بند کر کے ایل نارتھ ناظم آباد کے ایک لیٹر بکس میں دن کے ٹھیک ڈھائی بجے ڈال دیے تھے' پھر مجھے نہیں معلوم کہ ان کا کیا ہوا۔ میں سوچنے لگا' ادائیگی کا یہ طریقہ وہی تھا جو سابقہ دو کیسوں میں اختیار کیا گیا' نیئر صاحب کو ابھی کوئی واضح ہدایت نہیں ملی تھی' مگر مجھے یقین تھا کہ ان سے بھی یہی کہا جائے گا۔"

"اچھی بات ہے تم جا سکتے ہو۔" آخر میں نے اس سے کہا اور قاسم اس طرح ڈرائنگ روم سے نکل گیا جیسے کوئی قیدی جیل سے رہا ہوتا ہے۔

"کمال کر دیا انسپکٹر اکرم!" سیٹھ افضل نے تعریفی لہجے میں کہا۔

"تمہیں اس پر شک کیسے ہوا۔"

"معمولی بات تھی۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔

"حالات سے ظاہر تھا کہ یہ گھر کے باہر کے کسی آدمی کا کام نہیں' ورنہ گھر کا کوئی دروازہ کھلا یا کھڑکی ٹوٹی ہوئی ملتی' جس کا ذکر آپ لازماً کرتے' جو کہ آپ نے نہیں کیا' مزید یہ کہ کوئی باہر کا آدمی صرف ایک لاکھ ہی لے جانے پر اکتفا کیوں کرتا' اب گھر کے افراد میں سے خواتین کو نکال دیں' وہ اس قسم کی حرکت اپنے شوہروں کے علاوہ عام طور پر کسی اور کے ساتھ نہیں کرتیں' رہ گئے قاسم اور ساجد..... اور ساجد یہاں رہتا ہے' آپ کے ساتھ نہیں رہتا' وہ دن میں کوئی کھڑکی کھلی چھوڑ کر رات کو اس کے ذریعے اندر آ سکتا تھا لیکن اس نے چوری کی ہوتی تو وہ سیف کھلا چھوڑ کر نہ جاتا' یہ بات صرف قاسم کو معلوم تھی کہ آپ کبھی کبھی سیف مقفل کرنا بھول جاتے ہیں' اس نے اسی امید پر سیف بند نہیں کیا کہ آپ اسے اپنی بھول سمجھیں گے اور جب سیف کھلا ہوا ہو تو کوئی بھی چوری کر سکتا ہے' چنانچہ خاص طور پر اس کی ذات شبے کی زد میں نہیں آئے گی۔"

"ونڈر فل انسپکٹر اکرم! ونڈر فل۔" سیٹھ افضل نے داد دی۔ "مگر ان تصویروں کے بارے میں آپ کو کیسے معلوم ہوا۔"

"وہ میرا اندازہ تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "جس کی وجہ یہ تھی کہ ایسے ہی دو' تین کیس اور میرے علم میں آ چکے ہیں' کوئی باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت دولت مند افراد کو بلیک میل کر رہا ہے۔"

میں ہیڈ کوارٹر واپس پہنچا تو شام کے چھ بج چکے تھے' سب سے پہلے ڈی ایس پی صاحب کو رپورٹ دی کہ ان کے دوست کی پرابلم حل ہو چکی ہے' امید ہے کہ اب سیٹھ صاحب انہیں مزید تنگ نہیں کریں گے' وہ یقیناً مجھ سے تفصیلات دریافت

کرتے' لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان کی تمام تر توجہ اس رپورٹ پر مبذول ہے جو اس وقت ان کے ہاتھ میں تھی' میں نے ایک اچٹتی نظر ڈالی اور انداز تحریر نے واضح کر دیا کہ رپورٹ انسپکٹر بشیر کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی' مجھے کچھ تجسس ہوا کہ آخر اس رپورٹ میں ایسی کیا بات تھی کہ ڈی ایس پی صاحب نے بغیر میرا سر کھائے مجھے چھوڑ دیا' انسپکٹر بشیر کی رپورٹ تھی اس لیے اتنا اندازہ ہو گیا کہ اس کا تعلق ضرور کسی تشدد انگیز جرم سے ہو گا۔ میں اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں بشیر بیٹھتا تھا' وہ اپنی کرسی پر موجود تھا۔

"کیا آج کوئی خاص معرکہ ہو گیا ہے۔" میں نے اس کے برابر کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں یار ایک خودکشی کا سیدھا سادھا کیس تھا۔" بشیر نے بے زار لہجے میں جواب دیا۔ "ایک برخوردار نے کسی گرل فرینڈ سے عشق فرمایا جو اب انہیں کچھ فوٹو ملے کہ دو ہفتے میں ایک لاکھ روپیہ ادا کر دو' ورنہ..... برخوردار یہ رقم ادا کر سکتے تھے' مگر مشکل یہ تھی کہ ان کے پدر بزرگوار ایک ماہ کے لیے امریکہ اور انگلینڈ کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔ اور امی جان سے اتنی بڑی رقم ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بڑی شرافت سے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کر لی اور پولیس کے نام خط چھوڑ گئے کہ بلیک میلنگ کا ذمہ دار میں خود ہوں' اس لیے کسی اور کو پریشان نہ کیا جائے۔"

"کس کے برخوردار کی بات کر رہے ہو۔" میں نے پوچھا۔

"ارے بھئی وہ اپنے مشہور عوامی لیڈر ہیں نا' چودھری اقبال۔"

ڈی ایس پی صاحب کے انہماک کی وجہ اب میری سمجھ میں آ گئی تھی۔

"وہ فوٹو' میں تمہارے پاس ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں ہیں' مگر ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔" بشیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے صرف لڑکی کا بایاں ہاتھ دیکھنا ہے۔" میں نے کہا۔

بشیر نے چونک کر مجھے گھورا' اب اس کی بے پروائی اور بے زاری ختم ہو چکی تھی۔

"استاد! تم کوئی بات چھپا رہے ہو۔" اس نے کہا۔

"تم وہ فوٹو دکھاؤ' کوئی قابل ذکر بات ہوئی تو بتا دوں گا۔"

بشیر نے اپنی مسز کی دراز کھول کر ایک لفافہ نکالا اور میری جانب بڑھا دیا۔ اب تک تمام لفافے بھی ایک ہی انداز کے دیکھنے کو مل گئے تھے۔ میں نے اندر سے تصویریں نکالیں۔ ایک نظر ڈالنا کافی تھا۔ میں نے فوٹو واپس لفافے میں رکھ دیے۔

"اب بتاؤ' کیا معاملہ ہے۔" بشیر نے پوچھا۔

"پچھلے پندرہ دن میں پانچویں مرتبہ میں اس قسم کے فوٹو دیکھ رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "آج کل شہر میں کوئی بہت بے باک اور سازشی بلیک میلر سرگرم عمل معلوم ہوتا ہے۔"

بشیر حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا' میں اٹھا اور اسے خدا حافظ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اب تک جو کیس سامنے آئے تھے ان میں حسن اور چودھری اقبال کے صاحب زادے کو چھوڑ کر کہ مجھے ان سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ باقی تینوں کیسوں میں بلیک میلر نے شکار پھانسنے کا کوئی خاص طریقہ اختیار نہیں کیا تھا۔ ان تینوں سے لڑکی کی پہلی ملاقات یا تو کسی ریسٹورنٹ میں ہوئی تھی یا کسی سینما ہال میں کسی پبلک پارک میں اور اس ایک پوائنٹ کے علاوہ باقی تمام طریقہ کار کم و بیش یکساں تھا۔ ایک ہی طرح کے فوٹو' لفافے ایک جیسے' رقم سب سے ایک لاکھ'

مہلت دو ہفتہ اور رقم کی ادائیگی اسی مخصوص لیٹر بکس میں۔ میں ان ہی نکات پر غور کرتے ہوئے ہیڈ کوارٹر سے واپس گھر جا رہا تھا' رات کے تقریباً ساڑھے دس بجے تھے۔ میں ڈرگ کالونی کے ایک کوارٹر میں اپنی والدہ اور شادی شدہ بہن کے ساتھ رہتا تھا۔

ابھی میں شاہراہ فیصل سے ڈرگ کالونی کی طرف گھوم کر کچھ ہی آگے بڑھا تھا کہ میں نے اپنی سیکنڈ ہینڈ ڈاٹسن کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ایک لڑکی کو عین سڑک کے درمیان کھڑے زور' زور سے ہاتھ ہلاتے دیکھا' وہ کوئی ماڈرن لڑکی تھی جس نے بلیو جینز اور شرٹ پہن رکھی تھی۔ بال بھی تراشیدہ تھے' میں نے اس کے قریب پہنچ کر اپنی کار روک لی۔

''دیکھئے مسٹر!'' لڑکی نے کار کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہنا شروع کیا' مگر فوراً ہی یوں خاموش ہوگئی جیسے کوئی غیر متوقع چیز دیکھ لی ہو' ظاہر ہے کہ میں اپنے یونیفارم میں تھا۔

''یس مس!'' میں نے پوچھا۔

''بات یہ ہے کہ جناب!'' وہ جیسے بدرجہ مجبوری بولی۔ ''میری کار کے پہیے میں پنکچر ہوگیا ہے' مہربانی کر کے اگر آپ مجھے مین روڈ تک تک لفٹ دے دیں تو وہاں سے ٹیکسی کر کے گھر چلی جاؤں گی۔''

میں نے کھڑکی سے ہی جھانک کر دیکھا چند گز کے فاصلہ پر ایک کار نظر آ رہی تھی' میں نیچے اترا' کار کے قریب گیا یہ ایک تقریباً نئی چھوٹی سوزوکی کار تھی' جس کا پچھلا پہیہ فلیٹ نظر آ رہا تھا' اس کا رخ مخالف سمت میں تھا۔

''آپ کے پاس کوئی اسپیئر وہیل ہو تو میں اسے لگا سکتا ہوں۔'' میں نے لڑکی سے کہا۔

''جی میرے پاس کوئی وہیل نہیں ہے۔'' لڑکی نے جلدی سے کہا۔ ''مگر شاید آپ کسی ضروری کام سے جا رہے تھے' آپ بے شک چلے جائیں' میں کسی اور سے لفٹ لے لوں گی۔''

''جی نہیں۔ میں ڈیوٹی ختم کر کے گھر جا رہا تھا' آپ کہیں تو آپ کے گھر تک ڈراپ کر سکتا ہوں۔''

''شکریہ۔ آپ بس مجھے مین روڈ پر اتار دیں۔''

''بیٹھیے۔'' میں نے اس کے لیے اپنی کار کی اگلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ ہچکچانے کے بعد آخر بیٹھ گئی' میں نے بھی سیٹ پر بیٹھ کر ڈرائیونگ وہیل سنبھالا' کار ٹرن کی اور دوبارہ مین روڈ کی طرف چل دیا۔ قدرتی طور پر اس کا بایاں ہاتھ میرے سامنے تھا اور میں اس کی انگلی میں چاندی کا وہ ابھرا ہوا چھلا دیکھ رہا تھا جو اب تک نگاہ سے گزرنے والی تمام تصویروں میں لڑکی کے بائیں ہاتھ میں دیکھ چکا تھا۔ کار میں جلتی ہوئی ہلکی روشنی کے باوجود میں دیکھ سکتا تھا کہ لڑکی بلا کی حسین اور بہت ہی متناسب جسم کی مالک تھی۔ مگر وہ لڑکی غالباً کسی شکار کی تلاش میں کھڑی تھی' مجھے یونیفارم میں دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ میں پولیس آفیسر ہوں' اس نے چند منٹ کے راستے میں کوئی بات بھی نہیں کی۔ میں بھی کوئی دلچسپی ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے خاموش رہا۔ مین روڈ پر چند فرلانگ آگے بڑھتے ہی اس نے اترنے کی خواہش ظاہر کی اور مجھے کار روکنا پڑی اور وہ شکریہ ادا کر کے اتر گئی' ایک موہوم سا امکان تھا کہ شاید وہ کوئی ٹیکسی کر کے اپنی کار تک واپس آئے اور پھر وہیں سے اپنی تلاش شروع کرے جہاں سے منقطع ہوگئی تھی' چنانچہ میں واپس لوٹا۔

یہ سنسنی خیز داستان جاری ہے

☆☆☆☆
ادب سے انتخاب
☆☆☆☆

چٹھی رساں

آغا بابر

آہستہ آہستہ گلاب دین کو سب کے اندرون خانہ کا حال معلوم ہوتا چلا گیا۔ مثلاً یہ گیروے رنگ کا کشادہ مکان جس میں یہ دو اور اندر رہتی تھیں' ان کی پردادی کو ایک رئیس لالہ مکند لال نے بنوا کر دیا تھا اور یہ کہ اب وہ سب سے چھوٹی لڑکی مہر النسا کے لیے کسی اچھے رئیس کی تاک میں تھی۔

ادب سے انتخاب' حساس و دلگداز تحریر

پوسٹ آفس کے پچھواڑے والی عمارت کے لمبے کمرے میں خاصی چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ آج چٹھی رسانوں کے علاقے بدلے گئے تھے۔ چٹھی رساں گلاب دین کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

کرم الٰہی نے اکرام سے پوچھا۔ ''گلاب دین کی ماں کیوں مری ہوئی ہے۔''

''بھئی' اس کی بدلی ہیرا منڈی ہوگئی ہے۔'' کرم الٰہی نے ہاتھ آگے کرتے ہوئے کہا۔

''سوں رب دی۔''

اکرام بولا۔ ''سوں رب دی۔'' اور اس نے بھانڈ کی چیڑ اس کی طرح اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر دے مارا۔ دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

''اس کا کیا مطلب ہوا جی۔ رزق دینے والا

تو خدا ہوتا ہے۔ مجھے خواہ نوکری کیوں نہ چھوڑنی پڑے۔ میں تو بڑے صاحب کے پاس اپیل کروں گا۔ آپ خود سمجھ دار ہیں۔ افسروں کو کچھ تو خیال کرنا چاہیے کہ کون سا علاقہ کس کو دینا چاہیے۔"

گلاب دین اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

وہ پانچ وقت کا نمازی تھا۔ اپنے محلے میں تراویح کی نمازوں میں قرآن خوانی کا انتظام کرنا ہمیشہ اس کے ذمے ہوتا تھا۔ بازار میں معراج شریف کا چندہ اسی کے ایما سے اکٹھا ہوتا اور اسی کے ہاتھوں سے خرچ ہوتا تھا۔ میلاد النبی کے موقع پر محلے کے لڑکے بالے اس کی ہدایت کے مطابق خوب صورت محراب نما دروازے بناتے اور جھنڈیاں لگاتے تھے۔ مسجد کے باقاعدہ نمازیوں میں اس کا شمار تھا۔ دیندار لوگوں کی صحبت سے مسئلے مسائل سے بھی خاصی آگاہی ہو چکی تھی۔ فرض شناسی اور ایمانداری کی بنا پر اپنے پرائے سبھی اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے مگر آج اس کی عزت کا دم گھٹ رہا تھا۔ تو ہیرا منڈی میں خط بانٹنے جائے گا۔ طوائفوں کے کوٹھوں پر چڑھ کر آواز دے گا' بی بی جی خط آیا۔ غلیظ گلیوں میں جا کر پیشہ وروں کو ان کے یاروں کے خط دے گا' جو ہوس سے شروع ہو کر ہوس پر ختم ہوں گے' جن کے مضمون صرف بدکاری ہوگا۔ کسی خط میں ماں کی ممتا نہ ہوگی۔ کسی خط میں باپ کا پیار نہ ہوگا۔ ماں کی چھاتیوں میں دودھ کی جگہ سنکھیا ہوگا اور باپ کی نگاہوں میں بے غیرتی' بے شرمی' بے حیائی...... وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

اگلے دن پوسٹ ماسٹر کہہ رہا تھا۔ "گلاب دین کیوں پیش ہونا چاہتا ہے۔"

سپروائزر بولا۔ "آپ سے کوئی درخواست کرنا چاہتا ہے۔ صرف دو منٹ کے لیے پیش ہونے کو کہہ رہا ہے۔"

"بلاؤ۔"

گلاب دین کا چہرہ بڑے صاحب کی پیشی میں زرد پڑ رہا تھا۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔ کترے ہوئے لب زیادہ موٹے دکھائی دے رہے تھے۔ ڈاڑھی کے بال زیادہ گھنے نظر آ رہے تھے۔ شاید تازہ تازہ وضو کر کے' دعا مانگ کر' آیا تھا۔

"کیا بات ہے' گلاب دین۔"

"جی' میں صرف یہ عرض کرنے کو پیش ہوا ہوں کہ میری تبدیلی ہیرا منڈی کر دی گئی ہے۔"

"تو پھر۔"

"جی' ذرا خیال فرمایئے۔ میں پانچ وقت کا نمازی پرہیز گار آدمی ہوں۔ میری بڑی بے عزتی ہوگی۔"

اس نے درخواست نکال کر میز پر رکھ دی اور اپنے خالی کوٹ کی جیب سے کالے دانوں کی تسبیح نکال کر بولا۔ "حضور' جس ہاتھ سے یہ تسبیح پھیری جاتی ہے' وہ بدکاری کے اڈوں میں جا کر پیشہ ور عورتوں کو خط تقسیم کرے گا۔ استغفراللہ مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا' جناب میری گزارش ہے کہ مجھے فیض باغ کا علاقہ دے دیا جائے یا مصری شاہ میں رہنے دیا جائے۔"

پوسٹ ماسٹر نے پیپر ویٹ کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے کہا۔ "تو تمہاری تبدیلی منسوخ کر دی جائے۔"

"آپ کے بچے جیتے رہیں۔ یہی کمترین کا مطلب تھا۔"

"سردست یہ مشکل ہے۔ غور کرنے کے لیے تمہاری عرضی رکھ لیتے ہیں مگر اس وقت تبدیلی منسوخ نہیں ہو سکتی۔"

گلاب دین کے سینے میں ایک تیر سا لگا۔

سراج اور گلاب دین دونوں چھٹی رساں پانی والے تالاب سے ہوتے ہوئے جب نو گزے کی قبر پر پہنچے تو سراج رک گیا۔ اس نے ہاتھ میں تھامی ہوئی ڈاک کو چھانٹا اور بولا۔ "مولوی گلاب دین آ۔ ادھر سے شروع کریں۔" وہ دائیں ہاتھ کو گھوم گیا۔

"یہ پہلا چوبارہ فیروزاں کا ہے۔ ادھر سب

گانے والیاں رہتی ہیں۔"

پھاٹک کے سامنے چارپائی بچھائے تین چار آدمی بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ مکان کے پختہ تجاوز پر ایک عورت کندھے پر تولیہ ڈالے گیلے بالوں کو انگلیوں سے جھٹکے دے دے کر سکھا رہی تھی۔ دوپٹہ نہ ہونے کی وجہ سے گلاب دین کو وہ بے شرم دکھائی دی۔ ہر جھٹکے کے ساتھ اس کا بدن...... اس کا جی چاہا وہ آنکھیں بند کر لے۔ اس نے اپنی پگڑی کا شملہ پکڑ کر ناک اور منہ چھپا لیا۔

"کل سے میری جگہ یہ چٹھیاں تقسیم کیا کریں گے۔"

"ہیں! نیا چٹھی رساں لگ گیا۔"

"جی ہاں۔"

لمبی لمبی مونچھوں والے نے تاش کے پتوں کو بازی کے بند کرتے ہوئے پہلے سراج کو دیکھا' پھر گلاب دین کی طرف نگاہ پھرائی۔ دیکھنے والے کی آنکھیں سرخ تھیں اور چارپائی کا کافی حصہ اس کے بھاری جثے نے گھیرا ہوا تھا۔ اس نے گھٹنا اٹھا کر لٹھے کی چادر کو چڈوں میں دے لیا اور پھر آسودگی سے بیٹھ گیا۔ اس کی پنڈلیوں پر منڈے ہوئے بالوں کا کھردرا غبار پھیلا ہوا تھا۔

"منشی ہوراں کا نام کیا ہے۔" نوجوان چھوکرے نے پوچھا۔

سراج نے جواب دیا۔ "گلاب دین۔"

نوجوان چھوکرے نے ہنس کر کہا۔ "او رانجھا کتھے گلاب دا میری جھولی ٹٹ پیا۔"

"وے' شرم نہیں آتی تجھے۔ سلام دعا لینے کی بجائے مسخریاں کرنے لگا۔" تجاوز پر کھڑی ہوئی طوائف نے جھڑکا۔ اس نے اپنا ایک پاؤں کٹہرے پر ٹکا رکھا تھا جس سے اس کی وزنی رانوں کا اندازہ لگانے میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی تھی۔

"او بی بی' اپنی شلوار جا کے سیو پہلے۔"

اس نے اپنا پاؤں کٹہرے سے نیچے رکھ لیا اور بولی۔

"فٹے منہ' بے شرما۔"

مونچھوں والے نے ڈبیا اٹھا کر گلاب دین سے کہا۔ "سگریٹ پیو' مولبی جی۔"

گلاب دین بولا۔ "جی نہیں۔ مہربانی۔"

سراج نے سگریٹ سلگا لیا اور سلام علیکم کر کے آگے چل دیا۔

"یہ مونچھوں والا کون ہے۔"

"اس گلی کا چودھری۔"

"اور لچر سا چھوکرا۔"

"یہ بلو کے چاچے کے لڑکا ہے۔ یہ بلو ہی تو تھی۔ ڈھولک کے گیت بہت اچھے گاتی ہے۔ یہ نچلی بیٹھک بالاں کی ہے' اور اوپر چوبارے میں گگ رہتی ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی ڈاک میں سے ایک لفافہ نکال کر گلاب دین کو دکھایا جس پر سرنامہ لکھا تھا زمرد سلطانہ عرف گگ۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر گلیارے میں آ پہنچے۔ بیٹھک خالی پڑی تھی۔ دروازے پر موتیوں سے پروئی ہوئی لڑیاں آپ ہی آپ لرز رہی تھیں۔ سراج نے میلی میلی چاندنی پر خط پھینکتے ہوئے کہا۔ "چٹھی لے لو جی۔" ایک ٹھگنی سی عورت نے آ کر خط اٹھا لیا۔

سراج بولا۔ "بی بی جی' کل سے یہ چٹھی رساں چٹھیاں بانٹا کریں گے۔"

"اچھا منشی۔" اس نے بے دھیانی میں کہا اور اضطراب سے لفافے کو دیکھ کر یہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی۔ "گگ جی' چٹھی آئی ہے۔"

واپسی پر تاش کھیلنے والوں کے پاس سے گزرتے وقت گلاب دین نے اپنی خالی خالی نگاہیں ہوا میں ڈال دیں تاکہ وہ لچر سا لڑکا اسے پھر مذاق سے کچھ کہہ نہ دے۔ مگر ان لوگوں نے دیکھا بھی نہیں کہ کون گزر گیا۔

بازار میں پہنچ کر گلاب دین نے ایک لمبا سا سانس لیا اور شملے کے سرے سے ماتھا پونچھا۔ سراج کہہ رہا تھا۔ "یہ نکا پان والا ہے۔ یہ شہابے کی دکان ہے۔ شہابے کے پان ساری ہیرا منڈی

میں مشہور ہیں۔ یہ اس کا شاگرد ہے۔ دن کو یہ بیٹھتا ہے۔ شہابا اس وقت سویا ہوا ہوگا۔ شام کو بیٹھے گا۔ پان سگریٹ کی دکانیں دلالی کے اڈے ہیں' مولوی جی۔"

اس وقت گلاب دین کو چپ لگی ہوئی تھی۔ وہ سراج کے یوں براہ راست خطاب پر چونک پڑا۔ بولا۔ "خدا غارت کرے ان لوگوں کو۔"

"بازار میں یہ لوگ' جو ہم کو اس وقت دکانوں پر بیٹھے نظر آ رہے ہیں' یہ طوائفوں کے ملازم ہیں۔"

ایک گلی کے سرے پر کھڑے ہو کر سراج چٹھی رساں نے خطوط کو پھر چھانٹا۔ "اس گلی میں پیسہ کمانے والی بیٹھتی ہیں۔" سراج نے بغیر کسی جذبے کے کورے گائیڈ کی طرح کہا اور گلاب دین کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ اس گلی میں سے سڑے ہوئے خربوزوں کی بو آ رہی تھی۔ گلاب دین نے شملے سے پھر اپنا منہ ڈھک لیا اور عاجزی سے بولا۔ "اس گلی میں جانا ضروری ہے۔"

"صرف ایک خط ہے۔"

"کس کا۔"

"کنجروں کے چودھری حاقو کا۔ اس گلی کی بہت کم چٹھیاں ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ہوتی ہے تو وہ چودھری کی یا کسی دلال کی ہوتی ہے۔"

چودھری کی خضاب لگی ڈاڑھی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور ایک شخص اس کی پنڈلیاں سونت رہا تھا۔ قریب ہی ایک تیل مالشیا بیٹھا تھا۔

"کدھر ماشٹر۔" اس نے چٹھی رساں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"چودھریوں! آپ کی یہ چٹھی تھی۔"

کسبیاں اپنی اپنی دہلیزوں پر لوہے کی کرسیاں رکھے بیٹھی تھیں۔ چہروں پر پھٹکار برس رہی تھی۔ گلاب وہیں نظریں نیچی کیے سراج کے ساتھ ساتھ گزر رہا تھا۔ اتنے میں کسی عورت کی آواز آئی۔ "میاں مٹھو' چوری کھانی ہے۔"

گلاب دین نے چور آنکھ سے دیکھا۔ ایک کسبی نے اپنے دروازے پر طوطے کا پنجرا لٹکا رکھا تھا۔ چٹھی رساں کو دیکھ کر بولی۔ "منشی جی ہماری کوئی چٹھی نہیں آئی۔" سراج نے جب نفی میں سر ہلایا تو بولی۔ "ہائے! ہمیں کوئی چٹھی نہیں لکھتا۔"

دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ دوپٹہ اتارے' سینہ اکڑائے' ایک عورت کھڑی تھی۔ بولی۔ "یاروں پٹنی' اب تجھے کون چٹھی لکھے گا۔ مر گئے تیرے سب یار چٹھیاں لکھنے والے۔"

یہ دونوں آگے نکل گئے۔ سراج نے کہا۔ "طوطے والی عورت کا نام گلابو ہے۔ اس گلی کی ساری رونق اسی کے دم سے ہے۔ بہت سے تماش بین اس گلی میں اسی کی خاطر آتے ہیں۔"

گلی آگے سے تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ تماش بین' جو چھدرے چھدرے دکھائی دیتے تھے' اب ان کی وجہ سے راستہ رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ گلاب دین کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے کھلی سڑک پر پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا' پگڑی کے شملے سے ماتھا پونچھا اور ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے وقت اسے یاد آیا کہ اس نے تماش بینوں کے ریلے میں ایک ڈاڑھی والے کو بھی دیکھا تھا جس نے ماتھے پر ہار لپیٹا ہوا تھا اور پھر کنجروں کے چودھری کی خضاب رنگی بھرویں ڈاڑھی اسے یاد آئی۔ وہ تھک چکا تھا اور اپنے کام سے بے زاری محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوچا' کاش! اس کی نون تیل کی دکان ہوتی۔ آرام سے بیٹھا دکان کرتا۔ اسے معلوم نہیں تانگوں کے اڈے تک پہنچنے میں کتنا وقت لگا۔ سینما کے قریب کا ماحول اسے کچھ عجیب لگا۔ اس کا جی چاہا سیڑھیوں پر بیٹھ کر آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہے تاکہ اس کے اعصاب پر سے کھچاؤ دور ہو جائے۔

سراج نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیوں منشی جی' تھک گئے۔"

"نہیں تو۔"

"بس یہ دو چٹھیاں اور بانٹنی ہیں۔"

یہ کہہ کر سراج نے چار پانچ خط گلاب دین کو تھما دیے۔ گلاب دین کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے غلیظ خون سے بھرے لپے لتے کوڑے کو ڈھیر سے اٹھا کر اس کے باوضو ہاتھوں میں تھما دیے ہوں۔

اتنے میں سراج ایک مکان میں داخل ہو گیا' جس کی ڈیوڑھی بہت بڑی تھی اور جو خالی پڑی تھی۔ وہ بے دھڑک آگے صحن تک بڑھ گیا۔ صحن میں ایک طرف نواڑی پلنگ پر دو نوجوان لڑکیاں لہسن کی تریاں چھیل رہی تھیں۔ سراج نے گلاب دین کے کان میں کہا' یہ بدرو اور قدرو کا مکان ہے۔ اور گلاب دین کے ہاتھ میں تھمی ڈاک میں سے ایک خط جس پر بدرالنساء کا نام لکھا تھا' نکال لیا۔ ان کی آواز سن کر دونوں لڑکیوں نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔

سراج بولا۔ "خط آیا' جی۔"

دونوں لڑکیاں بے تابی سے آگے بڑھیں۔ سراج نے خط دینے کے لیے گلاب دین کو آگے دھکیلا۔ یہ پہلا خط تھا جو گلاب دین نے دیا۔ بدرالنساء خط کھول کر پڑھ رہی تھی کہ ڈیوڑھی میں سے دو بھاری بھرکم آدمی داخل ہوئے۔ سراج بولا۔ "لو استاد ہوری بھی آ گئے۔ منشی جی' استاد نور دین کی چٹھی دیکھنا۔"

گلاب دین خط چھانٹنے لگا کہ بدرالنساء خوشی سے چلائی۔ "آپا کے کاکا ہوئی۔" دونوں لڑکیاں بدرالنسا کے پیچھے بھاگ گئیں۔

استاد نور الدین صحن میں کھڑا کہہ رہا تھا۔ "او نیوالتو! شیطانو! ہمیں چٹھی تو دکھاؤ۔"

برآمدے میں لٹکی چق کے پیچھے سے کسی معمر عورت کی آواز آئی۔ "استاد جی' قمر کے کاکی ہوئی ہے۔"

"نصیبوں والی ہو۔ مبارکاں ہوں' اماں جی۔"

"آپ کو بھی۔ اری لڑکیو' چٹھی رساں کا منہ تو میٹھا کرا دو۔"

استاد بولا۔ "ایک چٹھی رساں نہیں' دو ہیں۔"

سراج مسکرا کر بولا۔ "استاد جی' آپ بڑے جگتی ہیں...... اپنا خط بھی لیا کہ نہیں۔"

گلاب دین نے نور الدین کو اس کا خط دے دیا جو محض اشارہ پانے کا منتظر کھڑا تھا۔

دوسرا بھاری بھرکم آدمی بولا۔ "آج آپ۔"

سراج نے کہا۔ "آج میرا آخری دن ہے۔ کل سے منشی گلاب دین چٹھیاں بانٹا کریں گے۔"

سراج کے ہاتھ میں قدرو نے آ کر دو روپے دے دیے۔ استاد نے گلاب دین کی طرف دیکھ کر جگت کی۔ "بڑی قسمتوں والے ہو۔ کنجروں کے گھر سے پہلے دن ہی بوہنی کر چلے ہو۔"

بدرو بولی۔ "مسخریاں چھوڑو' استاد جی۔ باہر جا کے اپنے ہوروں کو دیکھو اور کہو' گھر مٹھائی کی ٹوکری لے کر آئیں۔"

مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہاں بیگھاں رہتی ہے۔ وہ ساتھ والا مکان بکھو کا ہے۔ اس کے پیچھے وہ جو بیٹھک نظر آتی ہے' وہ استاد نور الدین کی ہے۔ اسے بدر تکے کی بیٹھک بھی کہتے ہیں۔ دیکھنا تو ایک چٹھی مشتری کی بھی تھی۔"

گلاب دین نے ڈاک دیکھ کر کہا۔ "ہاں۔"

"یہ گھر زہرہ مشتری کا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ سامنے برآمدے میں ایک عورت چارپائی پر کروٹ لیے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے موٹے موٹے کولہوں پر سے قمیص ہٹی ہوئی تھی۔ قدموں کی چاپ سن کر بھی اس نے اس طرف نہ دیکھا' جیسے کوئی نشہ پی کر بے سدھ پڑی ہو۔

سراج نے کھانس کر کہا۔ ”چٹھی رساں آیا۔“

ساتھ والے کمرے سے ایک نازک سی دبلی پتلی لڑکی خط لینے نکل آئی۔ سامنے والے کمرے میں دو سازندے بیٹھے ایک چھوٹی سی لڑکی کو سبق دے رہے تھے‘ جس نے ناک میں نتھنی پہن رکھی تھی۔ ہاتھ کان کے پاس رکھے لمبی آواز میں کہتی جا رہی تھی آ.....اسی طرح پھر کہے جا رہی تھی.....جا۔

نئے بازار میں آ کر سراج نے دوبارہ گلاب دین کو ایک روپیہ دینے کی کوشش کی۔ دونوں روپے خود رکھ لینا اسے اچھا نہ لگتا تھا۔ اس نے ایک روپیہ زبردستی اس کے کوٹ کی جیب میں ڈال دیا۔ اور بولا۔ ”بزرگو یہ کوئی حرام کا پیسہ نہیں ہے۔ سمجھنے کی بات ہے۔ کسی کی جیب سے روپیہ نکال لینا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ روپیہ کا تو یہی حساب کتاب ہے۔ آج یہ ہماری جیب میں‘ کل دوسرے کی جیب میں۔ پرسوں وہاں سے تیسرے کے پاس۔ کسی کے پاس کب ٹھہرتا ہے۔“

گلاب دین کو وہ نتھنی والی لڑکی یاد آ گئی جسے پہلا سبق یہی دیا جا رہا تھا۔

”آ.....جا.....پھر آ.....پھر جا۔

”یہ اب کدھر کو۔“ گلاب دین نے سراج کو اب ایک تیسری گلی میں گھستے ہوئے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

”ہمیں کسی بھڑوے کا ڈر ہے‘ منشی جی۔ ہم اپنی ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ اس طرح تو آپ بھر پائے۔“

اس گلی میں کچے گوشت کی بساندسی آ رہی تھی‘ جیسی بیف مارکیٹ سے آتی ہے۔ دو رویہ کرسیوں پر پیشہ ور عورتوں مردوں کی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑی بے باکانہ بیٹھی تھیں۔ ان کی باتیں بے ہودہ اور حرکتیں بڑی لچر تھیں۔ کچھ اوپر چوباروں پر بیٹھی تاک جھانک کر رہی تھیں۔

سراج بولا۔ ”یہاں سب درڑ مال ہے۔“

نصف گلی میں پہنچ کر اس نے کہا۔ ”منشی جی‘ فضل دین معرفت الٰہی جان کا خط نکالنا۔ اسے دے دو۔“

گلاب دین نے اس پتے کا خط الٰہی جان کو دے دیا جس کے پاس سے اسے نسوار کی بو آئی۔ ایک دروازے کے سامنے بہت سے تماش بین ایک مشکی رنگ کی عورت سے چہلیں کر رہے تھے جس نے تہبند باندھ رکھا تھا‘ کانوں میں موتیے کے پھول تھے اور بالوں میں سرخ گلاب اڑس رکھا تھا۔ سراج نے یہ کہہ کر علاقے کے باخبر چٹھی رساں ہونے کا مظاہرہ کیا۔ ”یہ خانگی ذات کی مسلن ہے۔“

اس وقت گلاب دین کو یہ بات اچھی نہ لگی۔ باہر نکلتے ہی اس نے ہڑبڑا کر پوچھا۔ ”ان خانگیوں کی تعداد کتنی ہوگی۔“

”کوئی گنتی شمار نہیں۔ خانگیاں نہیں کہتے انہیں‘ مولوی جی۔ کنجریاں ہیں۔ نئی پیشہ بیٹھنے والی کو خانگی کہتے ہیں۔“

”خوک۔“ گلاب دین نے حلق کھرچ کر زور سے تھوکا۔

ڈاک تقسیم کرنے کا دو وقت تھے۔ ایک دوپہر‘ ایک سہ پہر۔ دونوں وقت گلاب دین کو علاقہ گھومنا پڑتا۔ چاروں طرف چٹھیاں بانٹنے جانا پڑتا۔ اس بات کا اسے بڑا افسوس تھا کہ وہ بدرو قدرو کے گھر سے لیا ہوا روپیہ واپس نہ دے سکا۔ اس روز سراج نے روپیہ زبردستی جیب میں ڈال دیا تھا۔ اس نے اسے اسی طرح رہنے دیا کہ اگلے روز جا کر واپس دے دے گا۔ مگر اسے ادھر جانے کا حوصلہ نہ پڑا۔ اس نے سوچا کسی روز ان کی چٹھی دینے جائے گا تو روپیہ بھی واپس کر دے گا مگر چٹھی ہی نہ آئی۔ جب آئی اس سے دو روز پہلے اس کی جیب سے وہ روپیہ نکال کر اس کی بیوی نے مٹی کا تیل منگا لیا تھا۔

بدرو اور قدرو سفید چاندنی پر لیٹی تھیں۔ گاؤ

پیچے پر ان کی چھوٹی بہن آلتی پالتی مار کر بیٹھی ہوئی تھی اور آج اپنی عمر سے بڑی دکھائی دے رہی تھی۔ پاس ان کا باپ بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ جب گلاب دین صحن میں داخل ہوا تو بدرو اسے دیکھتے ہی بولی۔ ”چٹھی رساں آیا۔“

گلاب دین نے ڈاک چھان کر تین لفافے اسے پکڑا دیے۔ اس کا باپ بولا۔

”آؤ منشی جی‘ جی آیانوں۔ لڑکیاں روز کہتی تھیں‘ چٹھی نہیں آئی۔ نئے منشی جی لگے ہیں۔ کہیں ہماری چٹھیاں دوسری جگہ نہ دے دیں۔“

گلاب دین بولا۔ ”جی نہیں۔ آپ کی چٹھی نہیں آئی تھی۔“

”میری بات کا خیال نہ کریں۔ آدمی بندہ بشر ہے۔ غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ بازار میں میری لڑکیاں بدرو اور قدرو کے نام سے مشہور ہیں۔ اصل نام بدرالنساء اور قدرالنساء ہے۔ تیسری قمر النساء کراچی میں بیٹھک کرتی ہے۔“

قدرالنسا چاندنی پر لیٹی لیٹی بولی۔ ”ابا‘ یہی تو اس روز کاکی کے پیدا ہونے کی چٹھی لائے تھے۔“

”بڑے مبارک قدم ہیں آپ‘ منشی جی۔ خدا آپ کا بھلا کرے۔ یہ منی آرڈر تو لکھ دیں۔“ اس نے گاؤ تکیے کے پیچھے سے ایک منی آرڈر فارم اٹھا کر گلاب دین کے ہاتھ میں دے دیا۔ بیٹھنے کے لیے جگہ خالی کر دی اور حقہ اس کی طرف موڑ کر لڑکی سے کہنے لگا۔

”اوئے‘ منشی جی کے لیے لسی لا۔“

”جی نہیں۔ تکلیف نہ کریں۔“

”تکلیف کس بات کی‘ بھئی گھر کی لسی ہے۔“

”کوئی لویرا ہے۔“

”بھینس ہے‘ منشی جی۔“

بدرالنسا بولی۔ ”ہمارا گھرانہ تو مغلوں کے وقت سے آباد ہے۔“

گلاب دین کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ بدرو کا باپ بولا۔ ”ہم کوئی ایسے ویسے نہیں۔ بڑے خاندانی کنجر ہیں۔“ پھر اس نے قمرالنسا کے نام منی آرڈر لکھانا شروع کر دیا۔ جب آخری خانہ آیا تو بولا۔ ”یہ دو سو روپیہ تمہیں کاکی کی چوسنی کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔ تمہاری ماں کی طبیعت اچھی نہیں‘ جونہی اچھی ہوئی‘ تمہیں ملنے آ جائے گی۔“

لسی کے شکریے کے طور پر گلاب دین نے پوچھ لیا۔ ”کیا تکلیف ہے گھر میں۔“

”چکر آتے ہیں۔ ہم لوگ پرہیز بھی تو نہیں کرتے نا‘ منشی جی۔“

گلاب دین چلنے لگا تو بدرو کا باپ بولا۔ ”منشی جی‘ جس روز گھر کی لسی پینے کو جی چاہا کرے‘ بلا تکلف چلے آیا کریں۔“

آہستہ آہستہ گلاب دین کو سب کے اندرون خانہ کا حال معلوم ہوتا چلا گیا۔ مثلاً یہ کیروے رنگ کا کشادہ مکان جس میں بدرو اور قدرو رہتی تھیں‘ ان کی پردادی کو ایک رئیس لالہ مکند لال نے بنوا کر دیا تھا اور یہ کہ اب وہ سب سے چھوٹی لڑکی مہرالنسا کے لیے کسی اچھے رئیس کی تاک میں تھے۔ گزشتہ روز قدرو کو جب مجرے کے لیے گلبرگ جانا تھا تو بدرو نے مہرالنسا کو کس طرح سجایا تھا اور وہ بقول ان کے نتھنی پہنے ہوئے موی گڑیا دکھائی دیتی تھی۔ بدار و اور قدرو کے باپ کا نام عبدالکریم تھا اور بھائی کا نام قیم تھا جو کانوں میں مندراں پہنے رہتا‘ اچھا کھاتا‘ اچھا پہنتا اور کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ بدرو اور قدرو کی ماں سخت پردہ کرتی تھی۔

زہرہ دمشتری کے گھر موٹے موٹے چوتڑوں والی عورت جو کروٹ بدلے لیٹی نظر آتی تھی وہ زہرہ دمشتری کی سوتیلی بہن ہے‘ جسے افیون کھانے کی علت ہے۔ اسی طرح گولی کھا کر لیٹ جاتی ہے۔ زہرہ دمشتری کی ماں پردہ کرتی ہے اور پچھلے سال حج کرنے گئی تھی۔ اس کی دیکھا دیکھی گھر والوں کے سامنے بدرو اور قدرو کی ماں بھی حج کرنے کی خواہش کا اظہار کرتی رہتی ہے مگر عبدالکریم اور اس کی تینوں بیٹیاں اس لے ہامی

نہیں بھرتیں کہ ماں کی صحت کمزور ہے۔
گلاب دین کو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جس گانے والی کی بیٹھک زیادہ چمکے' دوسرے کے گھر فوراً خبر پہنچ جاتی ہے کہ فلاں کے ہاں آج کل زیادہ سوسائٹیاں آتی ہیں۔ یہ سب کام طوائفوں کے ملازم کرتے ہیں جو رات بھر ادھر ادھر پھرتے رہتے ہیں۔ دن بھر دکانوں پر بیٹھے تاش کھیلتے ہیں اور ہارنے والوں سے پیڑے کی لسیاں پیتے ہیں۔
جن جن مکانوں کے دروازوں پر دن کو موٹی موٹی چقیں اور تہ دار ٹاٹ لٹکے رہتے ہیں' رات کو انہی مکانوں کے دروازے اس زور سے کھلتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے چق اور ٹاٹ کی دھجیاں اڑ گئی ہیں۔ اسے یہ سب مکان پراسرار نظر آتے تھے۔
وہ ایک دن تھکا ہوا تھا۔ پیاس بھی لگی ہوئی تھی۔ اس کا جی عبدالکریم کے گھر کی لسی پینے کو چاہا۔ اس نے سوچا یہ چار چٹھیاں بانٹ کر چوک کی طرف مڑ جائے گا۔ جونہی وہ چٹھیاں بانٹنے گلی میں داخل ہوا' وہاں شور مچا ہوا تھا۔ مسلن کی ایک رنڈی سے لڑائی ہو رہی تھی۔ چند رنڈیاں کھڑی تماشا دیکھ رہی تھیں۔ جب گلاب دین وہاں سے گزرنے لگا تو مسلن اپنی مخالف رنڈی کی طرف لچر سا اشارہ کر کے بولی۔ ''جانی' تجھے چٹھی رساں۔''
''جانی کشتیے' تجھے چٹھی رساں......'' دوسری نے پلٹ کر جواب دیا۔
سب رنڈیاں کھل کھلا کر ہنس پڑیں اور گلاب دین بغیر چٹھیاں بانٹے گلی میں سے نکل آیا اور عبدالکریم کے پاس پہنچا جو اپنی ڈیوڑھی میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ ''خیر ہے۔'' آپ کچھ گھبرائے ہوئے ہیں۔''
گلاب دین نے پگڑی کے شملے سے ماتھا پونچھا اور سارا واقعہ بیان کر دیا۔
عبدالکریم اگلے روز گلاب دین کو چودھری چاقو کے پاس لے گیا جس نے اللہ رکھی مسلن کو خوب پیٹا اور گلاب دین سے کہنے لگا۔ ''دیکھو منشی جی۔ آپ نے مجھے یہ تو نہیں بتایا نا کہ گلابو کی گلی سے گزرتے وقت پھونداں کنجری آپ کو لچکریں کیا کرتی تھی۔ جب آپ گزرتے وہ گلابو سے کہتی۔ ''نی تیرا خصم غلاب دین آیا ای۔'' مجھ سے یہ شکایت دوسری رنڈیوں نے کی تھی اور میں نے ایک دن اس بات پر پھونداں کی پسلیاں بھی توڑی تھیں۔ ہمیں تو آپ کا پہلے ہی بڑا خیال ہے' منشی جی۔ مگر ایک بات آپ سے کہنی ہے مجھے' وہ یہ کہ ان گلیوں میں سے آپ مردوں کی طرح گزارا کریں۔ کھسروں کی طرح نہیں۔ اس علاقے میں تو آدمی کو بڑا استراگل ہو کر رہنا چاہیے۔''
جب گلاب دین عبدالکریم کے ساتھ اس کے گھر پہنچا تو ڈیوڑھی سے باہر ایک لمبی سی سبز کار کھڑی دیکھ کر عبدالکریم بولا۔ ''میرا خیال ہے' رانا ہوری آئے ہیں۔''
بیٹھک میں خستہ صوفے پر' جس کا غلاف پرانی میل سے موم جامہ بن چکا تھا' رانا صاحب بیٹھے تھے۔ صوفے کے بازو پر بدرو بیٹھی تھی اور مہرو ایرانی سلک کے تھان کو اپنے بازوؤں سے ناپ رہی تھی۔ پھیلتے بازوؤں سے اس کے سینے کی گوری گولائیاں سامنے آ کر آنکھیں لڑا رہی تھیں۔
رانا سے ہاتھ ملا کر عبدالکریم گاؤ تکیے پر بیٹھ گیا اور مہرو سے بولا۔ ''گنجے سے کہو منشی جی کو لسی پلائے۔''
بدرو بولی۔ ''وہ بازار گیا ہے۔ میں جاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ صوفے کے بازو پر سے اٹھ بیٹھی اور اندر سے لسی کا ایک گلاس لا کر گلاب دین کے ہاتھ میں دے دیا۔ پھر پراسرار طریقے سے آہستہ سے بولی۔ ''آپ ابھی جائیں مت۔''
وہ وہاں سے اپنی ریشمی شلوار کو ہاتھوں میں سنبھالتی ٹاپ کر برآمدے میں پہنچی۔ وہاں سے بیٹھک میں آ کر رانا سے بولی۔ ''اماں ہوری اندر بیٹھے بھینس کا سودا کر رہے ہیں۔''
پھر باپ کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ ''منشی جی کہتے ہیں بھینس کا مالک کہتا ہے' لینا ہے تو دو دن میں آ کر اپنا مال لے جائیں۔''
باپ نے مسکرا کر رانا کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''یہ دونوں بہنیں باری باری لسی بلوتی ہیں۔ اصل میں رانا جی' اب ہماری بھینس سوکھ گئی ہے۔ روز کہتی تھی ابا' نئی لے دو۔''
رانا مہین سی نگاہیں بدرو کے چہرے پر ڈال کر بولا۔ ''تو لے لو نا۔ کتنے میں دیتا ہے۔''
''کیوں ابا جی' آٹھ سو مانگتا ہے۔''
''ہاں پتر۔''
''کل مجھ سے چیک لے لینا۔'' رانا بڑی بے غرضی سے بولا۔
بدرو نے چونچال سے وہیں کھڑے کھڑے کہا اچھا منشی جی' آپ اب جائیں۔ ڈوگر سے کہہ دیں' ابا جی آ کر بھینس لے جائیں گے۔''
بھینس۔ کیسی بھینس۔ وہ سوچنے لگا۔
اس نے باہر نکلتے ہی نیواری سے پوچھا۔ ''یہ رانا ہوری کون ہیں۔''
''جس نے بدرو کو سرفراز کیا تھا' اس کا بھتیجا ہے۔ کوئٹے سے آیا ہے۔ بھولے نہ بنو' منشی جی۔ مال لایا ہوگا۔ اب چھوٹی بھی جوان ہوگئی ہے۔ بڑا استراگل آدمی ہے۔''
استراگل کیا ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہوا نوگزے قبر کی طرف چل دیا۔
اگلے روز اسے رانا کو دیکھنے کا شوق پھر بدرو کے گھر لے گیا۔ بیٹھک میں ساتھ ساتھ دو پلنگ بچھے تھے۔ ایک پر رانا بیٹھا نائی سے شیو بنوا رہا تھا۔ دری پر چائے کی پیالیاں وغیرہ بکھری پڑی تھیں۔ ان کا ملازم گنجا برآمدے میں کونڈی میں بادام رگڑ رہا تھا اور بدرو کا بھائی قیم ریشمی تہبند کو سمیٹے منڈی ہوئی پنڈلیاں ننگی کیے اس کے پاس بیٹھا کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ قدرو اور مہرو گاؤ تکیہ پر بیٹھی لہسن چھیل رہی تھیں۔
''چودھری ہوری ہیں گھر۔''
''نہیں منشی جی۔ میری کوئی چٹھی نہیں آئی۔'' مہرو جلدی سے بن کر بولی جیسے دو دن میں اسے پر لگ گئے ہوں۔
''تیری چٹھی کہاں سے آئے گی کشتیے۔'' قدرو نے بھٹ سے اس کا پتا کاٹ دیا۔ ساتھ کے کمرے سے بدرو نکل آئی جس نے نہایت خوب صورت سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خوشبو کی شیشی تھی جو وہ اپنے لباس پر چھڑک رہی تھی۔ کچھ خوشبو اس نے رانا پر چھڑکی اور بولی۔ ''منشی جی کوئٹے کی سوغات لیتے جائیے۔ یہ چار سیب زہرہ مشتری کے گھر دیتے جائیں اور یہ دو آپ کا حصہ۔''
بدرو نے ایک پٹھو سے چھ سرخ سرخ سیب نکال کر گلاب دین کو تھما دیے جو اس نے اپنے چمڑے کے تھیلے میں ارش لیے اور لمبے لمبے سانسوں سے خوشبو کی لپٹیں لیتا ہوا باہر نکل گیا۔
زہرہ و مشتری اپنی بیٹھک میں دو اجنبیوں کے ساتھ بیٹھی رمی کھیل رہی تھیں کہ گلاب دین نے جا کر سیب ان کے سامنے رکھ دیے۔ دونوں بہنوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ''منشی جی' دیگ چڑھی ہے ان کے گھر۔'' زہرہ نے دلچسپی سے پوچھا۔
''میں نے نہیں دیکھی۔'' گلاب دین نے جواب دیا۔
برآمدے میں ان کی سوتیلی بہن کے تو بڑے نے کروٹ بدل کر گلاب دین کی طرف دیکھا اور پھر پیٹھ موڑ لی۔
اگلے دن ڈاک چھانٹتے وقت اسے زہرہ کے نام کی چٹھی ملی۔ وہ چاہتا تھا کہ بدرو یا قدرو کی چٹھی ملے تا کہ آج پھر ادھر کا پھیرا رہے۔
سہ پہر کو جب وہ ہاتھ میں زہرہ کی چٹھی لیے مکان میں داخل ہوا تو زہرہ اور مشتری میٹنی شو دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ رانا برآمدے میں ان کی بہن

سے چہلیں کر رہا تھا جو اسے اپنی جتنی موٹی موٹی گالیاں دے رہی تھی۔

ادھر بھینس خریدنے کو رقم دے آیا ہے ادھر بھینس کو چنگی لے رہا ہے۔ رانا استرا اگل آدمی ہے یا بھینسوں کا سوداگر! گلاب دین یہ سوچتا ہوا باہر نکل آیا۔

تین روز بعد اسے اڑتی اڑتی ایک خبر ملی۔ اس نے سوچا، پنواڑی کی دکان ان کے سامنے ہے، اسی سے تصدیق کرنی چاہیے۔

پنواڑی بولا۔ "جو تم نے سنا ہے، ٹھیک ہے۔ رانا تو مہرو کے لیے تیار تھا مگر بدروں کی ماں نہیں مانی۔"

گلاب دین نے پوچھا۔ "عبدالکریم اور قیم راضی تھے۔"

"قیم تو سردائیاں گھوٹ گھوٹ کر پلاتا تھا۔" نیواڑی مسکرا کر بولا۔ "جس کا مال اس کا گال منشی جی۔"

خوب صورتی کس طرح بیچی جا سکتی ہے۔ جسم کس طرح فروخت ہو سکتا ہے۔ وہ اس طرح کی باتیں سوچتا بھی جاتا، بازار میں چلتی پھرتی طوائفوں کو خالی ذہن سے دیکھتا بھی جاتا اور چٹھیاں بھی بانٹتا جاتا۔ اس نے اپنے کام سے کام رکھا اور کتنے ہی دن بدرو قدرو کے گھر نہ گیا۔ ایک روز اسے موتی بازار میں عبدالکریم ملا جس کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ انہوں نے اب نئی بھینس خرید لی ہے۔ عبدالکریم نے کہا۔ "کسی روز آنا۔ ہمارے گھر جلسہ ہونے والا ہے۔"

ایک روز بدرو کے نام پانچ سو روپے کا منی آرڈر آ گیا۔ گلاب دین نے پڑھا۔ رانا حیات بخش نے کوئٹے سے بھیجا تھا۔ آخر میں لکھا تھا جلسے کے لیے روپیہ بھیج رہا ہوں۔ مجھے بھی اس دن یاد کر لینا۔

وہ چق اٹھا کر اندر گیا تو بدرو چارپائی پر بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ آہٹ سن کر اٹھ بیٹھی۔ "شکر ہے آپ بھی آئے منشی جی۔"

"کوئی خط ہی نہیں تھا۔"

"خط نہ ہو تو کیا آنا چھوڑ دینا تھا۔ ابے ہوری اتنا یاد کرتے تھے آپ کو۔"

کمروں میں سے عبدالکریم بھی نکل آیا۔ منی آرڈر کا سن کر سب کی باچھیں کھل گئیں۔ مہرو بھی چنگیر اٹھائے بھاگی بھاگی باہر چلی آئی۔

"اب منشی جی، آپ ذرا کاغذ پنسل لے کر بیٹھ جائیں۔ کاکی اندر سے حقہ اٹھا لا۔"

مہرو نے حقہ لا کر باپ کے پاس رکھ دیا جس نے منہ میں نے لے کر گلاب دین کو دیگوں کا مسالا لکھوانا شروع کر دیا۔ گلاب دین کی حیرت دور کرنے کو عبدالکریم نے کہا۔ "ہم قمرو کی کاکی کی خوشی کرنا چاہتے ہیں۔ قیم تو ناکارہ آدمی ہے۔ کل میں اور آپ جا کر سودا لے آئیں گے۔ نائی کو بھی ساتھ لے چلیں گے۔"

اس بات چیت میں قدرو اور بدرو بھی کبھی کبھی اپنی تجویزیں پیش کرتی رہیں۔ مہرو پکے فرش پر پالتی مارے لہسن چھیلتی رہی۔ گلاب دین نے اپنے کان پر اٹکی ہوئی پنسل کو اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے آج پوچھ ہی لیا۔

"اتنا لہسن کیا کرتے ہیں آپ۔"

قدرو نے کہا۔ "ہمارے گھروں میں سالن اچھا پکتا ہے، اور بہت آدمیوں کے لیے پکتا ہے۔ اس میں ڈالا جاتا ہے۔"

بدرو بولی۔ "ہم دن بھر کیا کام کریں۔ اسی طرح اماں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔" مہرو اپنی اہمیت دکھانے کے لیے اور تیزی سے لہسن چھیلنے لگی۔

"اللہ خیر رکھے۔ اب اتوار کو دیکھ لینا نا۔" عبدالکریم گلاب دین کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

انہوں نے باسمتی چاول، خالص گھی اور مسالے کی پوٹلیاں تانگے سے اتار کر ڈیوڑھی میں رکھیں تو گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔ عبدالکریم کے کہنے سے منجا بازار سے چائے کا ایک سیٹ لے آیا۔ وہ اس کی چسکیاں لے رہے تھے کہ بدرو قدرو اور مہرو تینوں بہنیں سجی سجائی بیٹھک میں داخل ہوئیں۔ بدرو ہنس کر بولی۔ "ابا جی، ہم تو بلاوا دے آئی ہیں۔"

آج بدرو معمول سے زیادہ چنچل اور جاذب نظر دکھائی دے رہی تھی۔ قدرو کا بدن گدرایا ہوا تھا۔ اس کی ناک کی کیل بار بار چمک رہی تھی اور مہرو پر بہار شباب کی رنگینیاں لیے ان کے ہمرکاب اس طرح تھی جیسے ڈھلی نکھری بدلیوں کے ہمرکاب بجلی کی کڑک۔

پروگرام یہ تھا کہ اتوار کو دوپہر کا کھانا اور رات کو گانا۔ گلاب دین کی طرف سے جب ڈھل مل اظہار ہوا تو عبدالکریم نے کہا۔ "منشی جی، آپ کوئی اوپرے تو نہیں۔ ہمارے گھروں میں آپ کو کون نہیں جانتا۔ اول تو ہم نے زیادہ لوگوں کو بلایا نہیں۔ یہ اڑوس پڑوس کے چند گھروں کو بلایا ہے۔ باقی رہا گانا تو وہ آپ کی مرضی ہے۔"

"حافظ صاحب نے کیا فرمایا ہے، قدرو پتر۔"

"قدرو نے کہا بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید۔ کیوں ابا جی۔"

"کچھ نہیں پتر، منشی جی کو سگریٹ دو۔"

قدرو نے سگریٹ کی ڈبیا منشی جی کے آگے کر دی جس میں سے گلاب دین نے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔

"بس آپ ڈاک بانٹ کر سیدھے ادھر ہی آجائیں۔"

ہفتے کی شام کو نائی نے چولہا گاڑ دیا اور اتوار کی صبح کو اس کے دو ساتھیوں نے آ کر کام سنبھال لیا۔ جاوتری، لونگ، دار چینی اور زعفران کی خوشبو چاروں طرف پھیل گئی اور دیگوں میں بڑا کفگیر گڑ گڑ بجنے لگا۔

گلاب دین پیدائشی منتظم تھا۔ عبدالکریم نے استاد نورالدین اور منشی گلاب دین کو دیگوں کی نگرانی پر بٹھا دیا۔

بدرو کے سازندوں نے دالانوں میں کرائے کی چاندنیاں بچھا دیں۔ قیم اور اس کے دوستوں نے گاؤ تکیے لگا دیے پھر آتشدان پر گلاب پاشیاں رکھ دیں اور پوچھنے لگا۔ "آپا بدرو، ٹھیک ہے۔"

اس نے کہا۔ "ہاں جیتے رہو۔ ٹھیک ہے۔"

"آپ، سگریٹ کے لیے کچھ پیسے تو دے دو۔"

بدرو نے دس روپے کا نوٹ دے دیا۔ وہ ادھر غائب ہوئی، یہ قدرو کو لے آیا اور بولا۔ "بی بی، ہمارا انتظام ٹھیک ہے نا۔"

اس نے کمروں کا جائزہ لے کر کہا۔ "ٹھیک ہے۔"

"بی بی، سگریٹ کے لیے کچھ پیسے دے دو۔" اس سے بھی دس روپے کا نوٹ ہتھیا لیا۔

دوپہر ہوئی تو طوائفوں کی ٹولیاں آنی شروع ہو گئیں۔ انگلیوں میں سگریٹ لیے ہوئے، چھالیہ چباتیں، سرگوشیاں کرتیں، رنگا رنگ آوازیں، رنگا رنگ لباس، گورے چہرے، سنولائے چہرے، بھرے سینے، پتلی کمریں، دلبری کی تمام ادائیں اور غمزے، ابریشم و کمخواب کے تھانوں میں لپٹے ہوئے۔ کچھ جوان، کچھ سرشار، کچھ ادھیڑ۔ دالان جیسے قمریوں اور کبوتروں کی غٹرغوں سے چہک اٹھا۔ نور پلاؤ شیر مال اور قورمہ برتایا گیا۔ ایک آتا ایک جاتا رہا۔ زیادہ قریبیوں کے گھر کھانا پہنچا دیا گیا۔ اس ہجوم دلبراں میں گھرے ہوئے گلاب دین کی نیچے کی سانس نیچے، اوپر کی اوپر۔

مہمانوں کا بھگتان ہو چکا تو برتانے والوں کی باری آئی۔ پھر یہ سب کھا پی کر دالان میں بچھی چاندنی پر لیٹ کر سگریٹ کا دھواں اڑانے لگے۔ نائی اپنی دیگیں اور مجولے سنبھالنے لگا۔ "پتا نہیں، اپنے چھچھی رساں کو کچھ دیا ہے یا نہیں۔"

استاد نورالدین بولا۔ "بی بی نے چاول

دیے تھے۔"

برآمدے میں سے بدرو بولی۔ "میں نے دیے تھے ابا جی۔"

"ہمارے لیے اچھی خبریں لاتا ہے۔"

رات کو جب گلاب دین پہنچا' مجلس سج چکی تھی۔ فیروزہ نے سلمے کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی سڈول کلائیاں سونے کی چوڑیوں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ زہرہ نے ساڑھی کے ساتھ برائے نام سی چولی پہن رکھی تھی۔ جب ساڑھی کا پلو سرک جاتا تو سامنے سے اس کا کسا کسا پیٹ اور پیچھے سے چکنی چکنی کمر دکھائی دینے لگتی۔ گگ نے چوڑی دار پاجامے پر گھیرادار قمیص پہن رکھی تھی' جیسے اکبر کے زمانے کی مغنیہ۔ جب چلتی تو جوتی کے ستارے اور قمیص کی گوٹ کے بادلے جھلمل جھلمل کرتے۔ ریشمی غرارے میں مشتری کے سرین چکی کے دو پاٹوں کی طرح رگڑ کھا رہے تھے۔ غرارے کو انہوں نے اس طرح بھر دیا تھا جیسے اس میں انڈے لیے گئے ہیں۔ مشتری کی چھوٹی بہن جو چند مہینے ہوئے آجا کا سبق لے رہی تھی' آج پہچانی نہیں جاتی تھی۔ اس نے ماتھے پر جھومر لٹکا رکھا تھا۔ پلکوں کے تناؤ میں کئی اشارے اور کئی لگاوٹیں پل رہی تھیں۔ شعلہ جوالا بنی ادھر سے ادھر اپنا آپ دکھاتی پھر رہی تھی۔ بلو پھلجڑی بنی ہوئی تھی۔ اس نے سینے پر دو پٹاخے باندھ رکھے تھے۔ اس کے کئی روپ تھے۔ مہتابی' انار' پوپٹ گولہ۔ لیکن بجلیاں نہیں تھیں۔ تمام بجلیاں آج بدرو کے حصے میں آگئی تھیں جس کی لمبی جھڑی آنکھوں پر دراز پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور نسوانیت کے ابر یشمی پرتو سے چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ پان الائچی کی طشتری لیے چاروں طرف تواضع میں جتی ہوئی تھی۔ قدرو ہونٹ بھینچ بھینچ کر باتیں کرتی تو اس کے ہونٹوں کی یاقوتی تراش اور بھی غضب ڈھاتی۔ وہ اپنی انگلیوں کی خفیف سے حرکت سے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو گردن سے ہٹاتی تو یوں لگتا جیسے انگلیوں کی پوروں سے بلوریں شبنم کی پھوار پڑ رہی ہے۔

مہرو مہرو ہی نہیں لگتی تھی۔ اس کی دنیا دار آنکھوں میں اتنی گلاوٹ کہاں سے آگئی تھی۔ چوکڑیاں بھرتی پھر رہی تھی۔ تنگ لباس میں اس کا انگ انگ نظر آرہا تھا۔ چھوٹی سی تتھنی اس کے بڑے بڑے ارمانوں اور ان کہے خیالوں کی چغلی کھا رہی تھی۔ اتنے میں ایک جوڑا اندر آیا۔ سارو قدر لڑکی' چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی' سمٹے ہوئے ریشم کی طرح محفل میں داخل ہوئی۔ بڑی نزاکت سے ہاتھ کو قوس بنا کر سب کو آداب کیا۔

دالان کی دہلیز پر بیٹھے گلاب دین نے پوچھا۔ "قیم جی' یہ لڑکی کون ہے۔"

وہ اینڈتے ہوئے بولا۔ "شمو' میری پھوپھی کی لڑکی۔ خواجہ صاحب کے گھر میں ہے۔" گلاب دین کے سینے میں جیسے بہت سی سانس رکی ہوئی تھی۔ اس نے ایک لمبی سانس لی۔ وہ خواجہ کی کوٹھی میں چٹھیاں بانٹ چکا تھا۔ وہ انہیں جانتا تھا۔

سراہ کھلے ہوئے سارے پھول سامنے کے رخ اکٹھے ہو گئے تھے۔ رنگا رنگ ہنستے کھیلتے دمکتے چہرے گلدستہ بنے دکھائی دے رہے تھے۔ خارگل کے ساتھ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خواجہ صاحب ان صوفوں پر جا بیٹھے جدھر مرد مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف کو بیٹھ کر حقے کا دھواں اڑانے والے سازندوں میں سے ایک آدھ نے انہیں سلام کیا اور اپنے ساز لے کر قالینوں پر آبیٹھے۔ سب سے پہلے آہوئے رم خوردہ مشتری کی چھوٹی بہن الماس کو پکڑ کر بٹھایا گیا۔ اس کے گانے کے بعد شور مچا بدرو' بدرو۔

بدرو نے اپنی گھنی پلکوں کو اوپر اٹھایا' مردوں کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ پھر محفل کا ایک نظر سے جائزہ لیا اور اپنی ریشمی شلوار کی کریز کو چٹکیوں میں تھام کر پائنچے سنبھالتی بیچ میں آبیٹھی۔ گلاب دین دہلیز پر اور اونچا ہو گیا۔ اس نے بدرو کو اس رنگ میں کب دیکھا تھا۔ یا الٰہی! بدرو کی آواز کا لہرا اٹھایا

رم جھم۔ ایک مہمان نے نوٹ نکالا۔

گلاب دین نے ساتھ والے سے پوچھا۔ "رکنے کا ہے۔"

"دس کا۔"

گلاب دین کے سینے سے پھر ایک لمبی سانس نکلی جو دیر سے رکی پڑی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ بدرو کے اعضا میں یہ لچکیلا پن کہاں سے اترا آرہا ہے۔ اس کی آواز نکھرتی جارہی تھی۔ ایک نوٹ' دو نوٹ' تین' چار' پانچ۔

"یہ کون لوگ ہیں۔"

"اپنے اپنے ملاقاتی ہیں۔ اپنی والیوں کو سلامیاں دے رہے ہیں۔"

اب خواجہ صاحب نے نوٹ دیا' پھر شمو نے' پھر خواجہ صاحب نے' پھر شمو نے۔

سب ہنسنے لگے۔

بدرو دو غزلیں گا کر بڑی نزاکت کے ساتھ اٹھ بیٹھی۔ اب گگ جی سے فرمائش ہوئی۔ گگ نے پکے راگ سے آغاز کیا۔ جب گلا کھنگالا گیا تو ساقی نامہ شروع کیا۔ آواز کا جادو ملاقاتیوں کے سر چڑھ کر نوٹ پر نوٹ دلوانے لگا۔ گگ نے جوش میں آکر گھنگرو باندھ لیے تو سارے لوگ خوشی سے تالیاں پیٹنے لگے۔ اس نے بتا دے دے کا کس کس حسن ادائیگی سے زاہد و محتسب کی چٹکیاں لیں۔ کس کس شان دلربائی سے کمر کو لچکا دے دے کر چکرے کے دروازے پر دستک دی کہ محفل کی محفل تڑپ اٹھی۔ بدرو نے اٹھ کر سینے سے لگا لیا اور بولی۔ "گگ جی' زندہ باد۔"

ایک کونے سے آواز آئی۔ "ڈھولک۔" بلو نے چونک ہو کر اس طرف دیکھا۔ جدھر سے آواز آئی تھی۔ بلو کے ملاقاتی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بتایا' تیرا نیاز مند ادھر بیٹھا ہے۔ بلو مسکرا دی۔ مہرو نے ڈھولک لا کر بلو کے سامنے رکھ دی اور الماس کو لے کر خود بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ ڈھولک کیا گئی' وضع داریوں کے بند ڈھیلے پڑ گئے۔ بعض مہمان صوفوں سے اتر کر قالینوں پر آبیٹھے اور چٹکیاں بجانے لگے۔ تھام دینے لگے۔ رنگ محفل ہی بدل گیا۔ ایک صاحب پہلے نوٹ دیتے رہے پھر کمر پر ہاتھ رکھ کر ناچنے لگے۔ چکر پھیریاں لیتے لیتے قدرو کے پاس جا پہنچے اور ہنستے ہنستے اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لے آئے۔ شور مچا۔ "شاباش! ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" ان صاحب نے قدرو کے گھنگرو باندھ دیئے اور استاد کو اشارہ کیا۔ طبلے پر ہاتھ پڑا' تھئی۔ قدرو نے اپنے یاقوتی ہونٹوں کی پھلجھڑیوں کو بیچ کر کلائی پر کلائی سے گرہ باندھی۔ ایڑی ٹھمکی۔ آنکھوں میں رس اترا۔ پلکوں کا ریشمی تناؤ ستاروں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر چاندنی میں گھلنے لگا۔ کائنات گردش میں آگئی اور قدرو رنگوں کا پیکر بن کر گھومنے لگی۔

گلاب دین کے سینے میں اب کوئی رکی پڑی سانس باقی نہ تھی۔ وہ جسم حیرت بنا دیکھ رہا تھا۔ اللہ غنی! یہ قدرو تھی۔ اس کے پاؤں تھے' یا خط چھاننے کی خودکار مشین! بھاپ نکل رہی تھی۔ اس نے غور سے دیکھا۔ ملازم محفل میں گرم گرم کشمیری چائے کے پیالے سینوں میں رکھے پھر رہے تھے۔ چاروں طرف سگریٹوں کا دھواں پھیل رہا تھا۔ وہ ان رنگا رنگ آوازوں میں ابھی کچھ فیصلہ کرنے نہ پایا تھا کہ عبدالکریم اس کے پاس سے گزرتے گزرتے کہہ گیا۔ "ابھی جانا مت۔"

رات بہت بیت چکی تھی اس نے دو چار جمائیاں بھی لی تھیں' مگر چائے کے گرم گرم پیالے نے بدن میں پھر چستی پیدا کر دی تھی۔ ابھی اس کا پیالہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ محفل میں سے کسی نے الاپ لیا۔ وہ پھر اپنی جگہ پر آبیٹھا۔ شمو کی بلوری انگلیاں ہوا میں ایک دائرہ بنا رہی تھیں اور اس کے گلے میں سے نوری کی آواز نکل رہی تھی۔ ایک مہک چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ لفظوں کو انتہا پر لے جا کر وہ اس سکی اور آہستگی سے انہیں لوٹا دیتی تھی کہ سینوں میں دل ڈول جاتے اور محفل میں واہ

واہ ہونے لگتی۔

اس کے بعد مشتری آئی۔ چہرے پر اک سلونا پن اور ان کہے خیالوں کی جھلملاہٹ۔ ناک میں فیروزے کی کیل' ہاتھ میں فیروزے کی انگوٹھی۔ اونچی کرتی کے نیچے گول گول رانوں کو غرارے میں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔ ایک کونے سے آواز اٹھی پنجابی۔ اس نے ہولے سے استاد سے کچھ کہا اور ماہیا گانے لگی۔ ایک کے بعد دوسرا' دوسرے کے بعد تیسرے پنجابی گیت کی فرمائشیں جب پوری ہو چکیں تو بدرو اور گگ نے کہا۔ ''آپا فیروزاں۔''

فیروزاں نے سگریٹ کا ایک بھرپور کش لے کر اسے مسل ڈالا۔ پھر اپنے لب لعلین پر زبان پھیر کر خنجر خونچال کو آب دی اور سنڈول کلائیوں میں چوڑیوں کو سنوارتی اٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے پر ایک خاص تمکنت' وقار اور اعتماد تھا۔ معلوم ہوتا تھا کسی وقت میں بڑی بانکی عورت رہی ہوگی۔

کسی نے کہا۔ ''مرزا صاحباں۔'' اس نے اس طرح ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر کہا۔ ''اچھا۔''

رات کے سناٹے میں اس کی کھرج دار آواز بلندیوں کی خبر لانے لگی۔ جب مرزا کے بول دہرانے لگی تو جوش میں اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس سے بھی مطمئن نہ ہوئی تو دوپٹہ اتار کر پھینک دیا اور ہاتھ اٹھا کر لمبی لمبی تانیں اڑانے لگی' جیسے راوی کی لہریں بپھر کر کناروں سے اچھل جائیں۔ صاحباں کے بول گاتے وقت آواز کو اس طرح سمیٹ لیتی جیسے لہروں پر چاندنی رات میں چھوٹے چھوٹے پھول پڑنے لگیں۔ وہ نوٹ سمیٹی جاتی اور محفل پر اپنی لوچدار آواز کا سحر پھونکتی جاتی تھی۔

ایک نکہت بہار تھی جو ستاروں کی جھلملاتی روشنیوں کے ہمرکاب گزر گئی۔ مولوی گلاب دین اذان ہوتے ہی شاہی مسجد کے ایک دالان میں سے اٹھا اور حوض کے ٹھنڈے پانی سے وضو کیا۔ آج نماز پڑھنے میں اسے بڑا لطف آیا۔ خدا کے اس وسیع و عریض گھر میں اور گلاب دین کی کشادگی دل میں بڑی مماثلت تھی۔ اس نے لمبے لمبے سجدے کیے اور روانہ ہوگیا۔

اس نے آس پاس کی علاقے کی ڈاک تو دوپہر کو بانٹ دی' دو چٹھیاں جو اس طرف کی تھیں ان کو رکھ لیا کہ سہ پہر کو سہی۔ جب سہ پہر کو اس نے عبدالکریم کے گھر جھانکا تو سب سوئے پڑے تھے۔ اگلے روز جب گلاب دین نے چق اٹھا کر دیکھا تو سب لوگ بیٹھک میں لیٹے ہوئے تھے۔

''آؤ منشی جی' کیا حال ہے۔''

''میں کل آیا تھا۔ آپ سب سوئے پڑے تھے۔''

''برا حال تھا ہمارا۔ لڑکیاں تھک گئی تھیں۔ کیوں' اچھی رونق رہی' منشی جی۔''

عبدالکریم نے کہا۔

''او جی رونق! کمال ہوگیا۔ گگ جی نے تو حد کردی۔''

''ابھی تمہارے آنے سے دو منٹ پہلے گئی ہے۔ چار سو ہو گیا اسے۔ لڑکیوں کو اپنے ساتھ بری امام لے جانے کو کہہ رہی تھی۔ پچھلے سال گئی تھی بہت کچھ لے کر آئی تھی۔''

''پھر۔''

''پھر یہ بھی تیار ہوگئی ہیں۔''

بدرو تاش پھینٹتے پھینٹتے بولی۔ ''جو اللہ کو منظور۔''

پندرہ روز تک تینوں بہنوں کی ہمہ وقت توجہ کپڑے سلوانے پر رہی۔ درزی آتا تھا' جاتا تھا۔ گنجے کو ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ آخر استادوں نے بقچے باندھے اور تینوں بہنوں کو لے کر دس دن کے لیے بری امام کے میلے پر چلے گئے۔

عبدالکریم کو ان کے خط کا بڑا انتظار رہا۔ گلاب دین خط لایا تو عبدالکریم حقے کی نے منہ میں سے نکال کر بولا۔ ''تم سے کون سا پردہ ہے۔ پڑھ کر بھی سنا دو۔''

بدرو نے خط میں لکھا تھا کہ ہم پنڈی پہنچ کر خیریت کے ساتھ نور پور پہنچ گئے ہیں' جہاں دو کمروں کا اچھا ڈیرا مل گیا ہے۔ رات کو چوکی دیں گے تو اندازہ لگ سکے گا کہ میلہ کیسا جائے گا۔ ویسے میلہ بہت بھر رہا ہے۔ چاروں طرف سے طرح طرح کی گانے والیاں آگئی ہیں۔ کچھ ابھی آرہی ہیں۔ سنا ہے یہ میلہ اگلے سال نہیں لگے گا۔ فقط' آپ کی بیٹی بدرو۔

دوسرا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ خدا کے فضل و کرم سے میلے کے ساتھ ہم بھی بہت اچھے جا رہے ہیں۔ پانچ دن کی آمدنی چار ہزار ہوئی ہے جو استاد جی آج پنڈی جا کر روانہ کر رہے ہیں۔ ہم اٹھارہ انیس کو لاہور پہنچ جائیں گے۔ ہمارے آنے سے پہلے صوفوں کا کپڑا بدلوالیں۔ صوفوں کے اسپرنگ بھی ڈھیلے ہو چکے ہیں' وہ بھی ٹھیک کرالیں۔ بلکہ صوفے ہی نئے خرید لیں۔ پردے بھی نئے ڈلوالیں۔ سستی نہ کریں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مہرو پر ایک گڑ پٹھان عاشق ہوگیا ہے۔ آپ نتھ اتروائی اس سے جو مانگیں گے' دے گا۔ میں نے اور قدرو نے کہا یہ پردیس ہے۔ آپ لاہور آکر ہمارے مہمان ہوں۔ وہاں ہم آپ کی خدمت کریں گے۔ کہتا ہے ہم کو کیا کھلائے پلائے گا۔ قدرو نے کہا جو آپ کہیں بولا' استاد جی ہم کو بس شربت وصال پلا دو۔ ہم بہت پیاسا ہے۔ استاد جی نے کہا' خان صاحب' آپ آئیں تو۔ ہم آپ کو شربت وصال کے کنویں میں ڈبکیاں دیں گے۔ غوطے کھلائیں گے۔ مہرو کے سر پر ہمیشہ سو سو روپے کے نوٹ رکھتا ہے۔ صدقے اور قربان ہو ہو جاتا ہے۔ مہرو بھی اس سے بڑے نخرے کروا رہی ہے۔ گگ کے نوکر کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے کیونکہ اس نے چاقو مار کر کسی کی انتڑیاں نکال دی تھیں۔''

عبدالکریم نے خط سن کر اطمینان کا سانس لیا اور بولا۔ ''گلاب دینا' خدا ایسی بیٹیاں سب کو دے۔ انہوں نے باپ کو بڑی بڑی رقمیں لا کر دی ہیں اور اپر ان کو ہمیشہ فخر رہا ہے۔ اب اللہ کے فضل سے مہرو بھی کماؤ ہو جائے گی۔ پھر ایک جلسہ کریں گے۔''

جب عبدالکریم نے چار ہزار کے بینک ڈرافٹ کا رجسٹری لفافہ گلاب دین کے ہاتھ سے وصول پایا تو اگلے دن ہی تیم جا کر نئے ڈیزائن کے صوفے اور پردوں کا کپڑا لے آیا۔ بیٹھک میں سفیدی ہوگئی۔ شیشے والی دیوار گیریوں پر پالش پھر گیا۔ نئے شیشے لگ گئے۔ ڈبی بازار سے کاریگر بلوا کر نیم چھتی سے لٹکے ہوئے پرانے جھاڑ فانوس کی صفائی کرادی گئی۔ سارا گھر اجلا ہوگیا۔

لڑکیاں انیس کی صبح آرہی تھیں اور انیس کو ہی پوسٹ آفس کے پچھواڑے والی عمارت کے لمبے کمرے میں چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔

☆☆

سپروائزر نے پوسٹ ماسٹر سے کہا۔ ''گلاب دین کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔''

''کیا عرض کرنا چاہتا ہے' یہ ہر سال۔ بلاؤ۔'' پوسٹ ماسٹر نے چڑ کر سپروائزر سے کہا۔

دوسرے لمحے گلاب دین پوسٹ ماسٹر کے سامنے کھڑا تھا جو فائل پر نظر جھکائے کہہ رہا تھا۔ ''یہ تمہاری پچھلے سال والی عرضی میرے سامنے پڑی ہے۔ تمہاری منشا کے مطابق تمہاری تبدیلی اب ہیرا منڈی سے واپس معصری شاہ کر دی گئی ہے۔ اب تم کیا عرض لے کر آئے ہو۔''

''حضور' میری صرف اتنی عرض ہے کہ مجھے یہیں رہنے دیا جائے۔''

پوسٹ ماسٹر نے فائل پر سے نظر اٹھا کر گلاب دین کو حیرت سے دیکھا اور بولا۔ ''کیا کہا۔''

گلاب دین کی ڈاڑھی غائب تھی' لمبی سی تھوڑی نکلی ہوئی تھی اور موٹے موٹے ہونٹوں کے اوپر مونچھوں کا ہلکا ہلکا غبار تھا۔

تھی۔اسے آس پاس کے فلیٹ والوں کے بچے مس صاحب اور نوکر میم صاحب کہہ کر پکارتے۔اسے پہلی بار اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔انہی فلیٹوں کے صاحب لوگ جب بھی اس کے پاس سے گزرتے اسے بڑے غور سے دیکھتے' لڑکا لوگ تو اکثر مڑمڑ کر دیکھتے جاتے' اسے پہلی بار اپنی تنہائی کا احساس ہوا۔

وہ خاموشی سے دن بسر کرتی رہی۔دفتر کا کام اور پھر گھر کا کام۔چھے دن ان کاموں میں یوں گزرتے کہ کسی اور بات کی سدھ نہ رہتی۔ساتواں دن کچھ گرجے میں گزرتا کچھ بدیسی عورتوں کے ایک ہفتہ وار اجلاس میں۔ایک دن اس اجلاس میں ایک سفارت خانے کی طرف سے اعلان ہوا کہ ان کے ملک کا ایک باشندہ اس ضلعے کی سینٹرل جیل میں قید ہے۔اس ملک میں نہ تو اس کا کوئی رشتے دار ہے' نہ ہی اسے یہاں کی زبان آتی ہے۔لہٰذا اسے قید بامشقت کے ساتھ ساتھ قید تنہائی اور قید خاموشی بھی کاٹنے پڑ رہی ہے' جس کا اثر' اس پر بہت برا پڑا۔سفارت خانے نے سفارش کی کہ اس کے ہم وطن جو اس شہر میں رہتے ہیں' ہفتہ وار ملاقات کے دن باری باری اگر آئی تو اس قیدی کا دل بہل جائے گا۔اعلان میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر صرف پچاس ہم وطن بھی اس کام کے لیے تیار ہو جائیں تو سال میں ہر شخص کو صرف ایک بار ملاقات کے لیے جیل جانا ہوگا۔سال کے بعد وہ قیدی رہا ہو جائے گا۔

تتکے نے ڈوبتے کو سہارا دینا چاہا' یہ سادی سی غم گین اور یتیم جرمن لڑکی' اس جرمن قیدی سے ملنے کے لیے تیار ہو گئی۔

جیل میں ملاقات کا کمرا' دراصل ایک لمبی سی بیرک تھی جسے سلاخوں سے بندکی ہوئی محرابوں نے دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔اس حصے میں ملاقاتی اپنی چادریں بچھا کر بیٹھ جاتے اور دوسرے حصے میں قیدی ننگے فرش پر بیٹھ کر سلاں میں سے کبھی پیار سے جھانکتے' کبھی ندامت سے نظریں نیچے کر لیتے۔جیل میں طرح طرح کے قیدی ہوتے اور ان کے ملاقاتیوں کے ریلے میں بہتی ہوئی یہ جرمن لڑکی بھی اس بیرک میں آ نکلی۔ادھیڑ عمر' چھریرے بدن اور واجبی شکل و صورت کے جیلر نے اس لڑکی کو دیکھا تو باغ باغ ہو گیا۔اس نے سوچا' اب' اس کے دن پھرنے والے ہیں' پھر اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ابھی تو دو سال قید بامشقت میں سے صرف ایک سال گزرا تھا۔ابھی تو ایک گرمی' ایک خزاں' ایک سردی اور ایک بہار کے گزرنے پر کہیں اسے رہائی نصیب ہوگی۔یہ جرمن لڑکی کو دیکھتے ہی اسے خوانخواہ دنوں کے بہتر ہو جانے کا خیال کیوں آ گیا' وہ پھر رنجیدہ ہو گیا۔

لڑکی نے اسے چائے کا ڈبا۔سگریٹ کے پیکٹ اور ولایتی صابن کی ایک ٹکیا اپنی ٹوکری میں سے نکال کر دی۔اتنی سی بات پر قیدی خوش ہو گیا اور ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔اس نے اسے جیل میں اپنی زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔دوسرے قیدی اس کو اکثر گڈ مارننگ کرتے ہیں' وہ اسے گورا صاحب کہتے ہیں۔بعض تو اس کے حصے کی مشقت میں بھی ہاتھ بٹا دیتے ہیں۔اس نے چکی بھی پیسی اور بان بھی بنا۔اس نے مٹی بھی دھوئی اور اینٹیں بھی چنی ہیں۔اب وہ آٹھ قیدیوں کے ساتھ ایک عالی شان قالین بننے پر لگا ہوا ہے۔یہ قالین اسے بے حد عزیز ہے۔ابھی اسے مکمل ہونے میں چھے آٹھ ماہ لگ جائیں گے۔وہ اپنی رہائی کی تاریخ کا حساب کیلنڈر سے نہیں قالین کی تیاری سے لگاتا ہے۔قالین میں جب بھی وہ گرہ لگاتا ہے تو اسے خیال ہوتا ہے کہ اس نے قید کی زنجیر کا ایک حلقہ توڑ ڈالا ہے' پھر وہ تیزی سے گرہیں لگانے لگ جاتا ہے۔

وہ تیزی سے بہت کچھ کہہ گیا' لڑکی اتنی

روکھی پھیکی تو نہ تھی مگر بے دلی سے سنتی رہی۔وطنیت' فرض' ہمدردی' مجبوری' نہ جانے کون کون سا خیال اس لڑکی کے دل میں رہ رہ کر اٹھتا اور وہ واپسی کا ارادہ کرتی تو قیدی اس کا پاؤں پکڑ لیتا۔یہاں تک کہ ملاقات کا گھنٹا ختم ہو جاتا۔انہیں پتا بھی نہ چلتا کہ وہ ساٹھ منٹ تک کھڑے باتیں کرتے رہے ہیں۔

اگلے ہفتے وہ پھر ملاقات کے لیے پہنچی' قیدی کے قدم بوجھل تھے' اس کا سر جھکا ہوا تھا' آنکھیں سرخ اور جسم نڈھال تھا۔وہ اس لڑکی کے پاس مشکل سے پہنچا اور آتے ہی زمین پر بیٹھ گیا۔اس نے سر دیوار سے لگا دیا اور ہاتھوں سے سلاخوں کو تھام لیا۔لڑکی اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی اس نے وجہ پوچھی۔قیدی نے بتایا کہ پچھلے تین دن سے اسے مشقت سے ہٹا کر بیگار پر لگا دیا ہے۔بیگار بھی عجیب قسم کی ہے۔جب دھوپ خوب تیز نکل آتی ہے تو اسے ایک گھنٹے کے لیے دھوپ میں ننگے سر اور ننگے پاؤں بٹھا دیا جاتا ہے' وہ وجہ پوچھتا ہے' تکلیف سے شور مچاتا ہے۔اس کی کوئی نہیں سنتا اور سنے بھی کیسے' یہاں جرمن زبان کس کو آتی ہے۔لڑکی نے ملاقات ختم کرتے ہوئے کہا کہ وہ آج ہی اس سلسلے میں جیلر سے شکایت کرے گی اور ضرورت پڑی تو سفارت خانے کی معرفت احتجاج بھی کیا جائے گا۔

وہ جیلر کے دفتر میں پہنچی تو اسے کچھ دیر ایک طرف بیٹھ کر بدمزاجی کا ایسا مظاہرہ دیکھنا پڑا کہ وہ مایوس ہو گئی۔جب یہ آدمی کسی سے بھی سیدھی طرح بات ہی نہیں کرتا تو اس سے بات کرنے کا کیا فائدہ۔ضروری کاموں سے فارغ ہو کر جیلر نے اس کی بات سنی۔وہ اب نرم دل نظر آ رہا تھا اور لڑکی کی شکایت بڑے غور سے سن رہا تھا۔اس نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے اس ماتحت کو' جس کے حکم سے قیدی کو دھوپ میں بٹھایا جاتا ہے' نہ صرف منع کرے گا بلکہ سزا بھی دے گا۔اس نے لڑکی کو چائے پیش کی اور بڑی عزت کے ساتھ رخصت کیا۔

اگلے ہفتے پھر ملاقات تھی۔قیدی آج نمبر اور لکیروں والے کرتے پاجامے کے بجائے پتلون قمیص پہن کر ملنے آیا۔اس نے لڑکی کو بتایا کہ گزشتہ ملاقات پر جب اس نے جیلر سے شکایت کی تو اس کے بعد سب کا رویہ یکا یک بدل گیا۔لڑکی شکریہ ادا کرنے کے لیے جیلر کے دفتر میں گئی۔جیلر کا رویہ بھی بدلا ہوا پایا۔آج وہ خاصا بے تکلف ہو رہا تھا۔اس نے لڑکی کو چائے بھی پیش کی اور رات کے کھانے کی دعوت بھی دی اس نے چائے کی پیالی ہاتھ سے لے لی مگر کھانے کے لیے معذرت کرنے لگی۔جیلر نے بڑے اطمینان سے کہا۔''اگر آپ میرے کھانے پر نہیں آ سکتیں تو آپ کا قیدی واپس دھوپ میں بیٹھنے پر مجبور ہوگا۔قیدی کی تکلیف کی ساری ذمے داری آپ پر ہوگی جو اس کے آرام کی خاطر دعوت پر آنے کی زحمت بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ایسی خودغرض عورت سے مزید گفتگو بے کار ہے۔آپ جا سکتی ہیں۔

اگلے ہفتے قیدی نے ٹائی باندھی ہوئی تھی۔اس سے اگلے ہفتے اس نے مکمل سوٹ پہنا ہوا تھا۔جب اس سے بھی اگلا ہفتہ آیا تو وہ سیٹی پر کسی مغربی ناچ کی دھن بجا رہا تھا۔لڑکی ہر ہفتے ڈنر پر جاتی رہی۔قیدی کی آسائش میں ہر روز اضافہ ہوتا رہا۔پھر ایک بار جیلر نے چند دنوں کی چھٹی لی اور اس لڑکی کے ساتھ پکنک منانے کسی پہاڑ پر چلا گیا۔جب وہ واپس آئے تو اگلی ملاقات پر قیدی نے بتایا کہ اسے سزا میں زیادہ سے زیادہ تخفیف جو جیلر کے اختیار میں تھی' وہ بھی اسے مل گئی ہے۔اب وہ تین ماہ بعد رہا کر دیا جائے گا۔قیدی نے خوشی سے ناچتے ہوئے کہا۔تین ماہ ہوتے ہی کتنے ہیں' یونہی کٹ جائیں گے' چٹکی بجاتے' لڑکی نے سوچا تین ماہ

کتنے طویل ہوتے ہیں۔ تین ماہ میں بارہ ہفتے ہوتے ہیں' اسے بارہ ڈنر ابھی اور کھانے پڑیں گے۔ ایسا تو ایک ڈنر بھی عمر بھر کے لیے منہ کو بدذائقہ کر دیتا ہے۔ یہاں تو ابھی تین ماہ اسی حال میں گزریں گے۔ اس کا جی متلانے لگا۔

آج پھر ملاقات کی باری تھی۔ لڑکی ایک نیا ریشمی فراک پہن کر آئی۔ قیدی نے آتے ہی فراک کی تعریف کی اور جب اس نے شکریہ ادا کیا تو قیدی نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ اس نے شرما کر نظریں نیچی کر لیں۔ وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ لڑکی نے دل میں سوچا کہ یہ بھی اچھا ہوا کہ اس دن ہمارے درمیان جیل کی سلاخوں والے دروازے ہیں۔ یہ سوچتے ہی اس کے ہاتھ سلاخوں کی طرف بڑھے اور اس نے دونوں ہاتھوں سے سلاخوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ قیدی نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھ کر انہیں زور سے جکڑ لیا۔ کافی دیر خاموشی رہی' البتہ ان دونوں کے چہرے سرخ سے ہو گئے۔ آج ملاقات کے بعد جب وہ رخصت ہوئی تو لڑکی کے کانوں میں اس کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ''چار ہفتے باقی ہیں جب اتوار کی صبح ہو گی' ہم دونوں سیدھے چرچ جائیں گے اور شادی کے بعد اپنے فلیٹ کا رخ کریں گے

❀❀❀❀❀

چار

ہفتے باقی ہیں مگر ابھی تو اسے شادی کا بہت سا بندوبست کرنا ہے اور ابھی تین ڈنر بھی تو باقی ہیں۔ ڈنر کا خیال آتے ہی اس کا جی متلانے لگا۔

چرچ کا انتظام مکمل ہو گیا' فلیٹ بھی آراستہ ہو گیا۔ چند دوست اور دو چار موٹریں بھی مل گئیں۔ لڑکی نے اپنی فرم سے کچھ ایڈوانس لے کر جیل میں اس قالین کا آرڈر بھی بک کرایا' جس کی ہر گرہ سے قیدی کی یادیں بندھی ہوئی تھیں۔ اس قالین میں تو ہزاروں گرہیں لگی ہوئی تھیں۔ ہر انچ میں پانچ سو گرہوں کا حساب تھا' ہر گرہ ایک نہ ختم ہونے والا لمحہ بن چکی تھی۔ لڑکی نے کچھ ایسا انتظام کیا کہ یہ قالین ہفتے کے دن اسے مل جائے اور اتوار کی صبح کو جب قیدی اس کے شوہر کی حیثیت سے فلیٹ میں داخل ہو تو اس کا پہلا قدم اسی قالین پر پڑے۔ لڑکی نے اس بات کا قیدی سے ذکر تک نہیں کیا۔

لڑکی مجھ سے باتیں کر رہی تھی' میں نے کیلنڈر پر نگاہ ڈالی' مارچ کا مہینہ تھا اور آج ہفتے کا دن تھا۔ لڑکی بولی۔ ''میں آج صبح قالین لینے جیل کے دفتر گئی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ قالین صرف اس شرط پر مل سکتا ہے کہ آج رات کا ڈنر بھی مجھے جیلر کے ساتھ کھانا ہو گا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ کل میری شادی ہو رہی ہے مگر وہ نہ مانا اور قالین دینے سے انکار کر دیا۔ وہ کتنا خود غرض اور بے وقوف ہے' وہ میری مسکراہٹ اور آمادگی کو کتنا غلط سمجھا۔ مسکراہٹ میری عادت ہے' آمادگی میری ضرورت تھی۔ میں نے قیدی کے لیے قربانی دی یہ میری مجبوری ہے' وہ بے وقوف سمجھتا ہے کہ میں خراب لڑکی ہوں۔''

''مسٹر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ' مجھے قالین چاہیے۔''

پھر وہ لڑکی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے دفتر سے چلی گئی۔ اگلے دن وہ دونوں چرچ سے ہوتے ہوئے' اپنے فلیٹ میں پہنچے' فلیٹ کا دروازہ کھلا' قیدی کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ لڑکی کی پلکیں بھیگ گئیں' قیدی نے سوچا' شاید وہ انہی دو چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے جیل گیا تھا' ایک لڑکی اور ایک قالین۔

داغ

قاضی عبدالستار

☆☆☆☆
ادب سے انتخاب
☆☆☆☆

بیوی کا خیال آتے ہی ایک لالٹین سی جلنے لگی
اور قلعی کی ہوئی سفید اینٹوں کی دیوار پر
ایک سایہ تھرتھرانے لگا۔
جس کی گیسو لرز رہے تھے اور انگلیاں کانپ رہی تھیں۔
یہ سایہ کیا ہے۔..... سفید دیوار کا تھوڑا سا حصہ سیاہ ہو گیا ہے
یا مردہ دیوار کا تھوڑا سا حصہ زندہ ہو گیا ہے
جو ایک بلند سینے کی لرزشوں سے دھڑک رہا ہے .....!

ادب سے انتخاب' حساس و دلگداز تحریر

آوازوں کے سیلاب میں پولنگ بوتھ ڈول رہا تھا۔ اسے بھیڑ کے تھپیڑے نے جب اٹھا کر باہر پھینک دیا اور حواس کچھ درست ہوئے تو اس نے محسوس کیا کہ ایک اونی کھڑی آستین پکڑی اور بند مٹھی ملازمت کی ناکام درخواستوں سے بھری ہوئی جیب میں غولہ لگا کر باہر نکل گئی۔ اس کے بعد تو وہ آدمیوں کی موٹی دھار میں بہنے لگا۔

جب یقین ہو گیا کہ کوئی اس کا پیچھا نہیں کر رہا ہے' تب اس کا ہاتھ جس کے انگوٹھے پر ننھا سا

سیاہ کالا داغ چمک رہا تھا۔ پرانی سوتی شیروانی کی جیب سے باہر نکلنے کے لیے کسمسایا لیکن اس نے روک دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ دوسرے ہاتھ کو بھی جیب میں بھیج دیا اب اس کی دوسری جیب بھی دبلے پتلے بیمار بچوں کے بڑھے ہوئے پیٹ کی طرح پھول گئی تھی۔ اس نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ ٹیڑھی میڑھی سڑک اس کی زندگی کی طرح دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اجاڑ چہروں کے ملگجے دن' اداس آنکھوں کی دھندلی بے خواب راتیں..... جیسے سب کچھ مانوس سا تھا۔ سبک رفتار سواریاں خوش آئند خیالوں کی طرح گزر رہی تھیں اور وہ پرانے لکھنو کی مصروف سڑک پر مشغول شہری کی طرح بھاگ رہا تھا اس نے مطمئن ہو کر اپنے پیروں کو آہستہ چلنے کا مشورہ دیا۔

اب وہ اپنی 'ٹال' کے سامنے آ گیا تھا۔ اس کو لکھنو آئے آٹھ مہینے ہو گئے تھے لیکن نوکری ایک ہی مل پائی تھی' وہ بھی نوکری کم اور تہمت زیادہ تھی۔ اس ٹال کے اندر وہ بادامی رجسٹر کے خانوں میں اپنی کم نور آنکھوں کی پھیلی سیاہی بھرا کرتا تھا اور باہر ڈگریوں کی نقلیں کندھے پر لادے دفتروں کے راستے پر بھٹکتا رہتا۔ جب وہ پورے ایک دن کا بوجھ ڈھو کر رات کے کنارے پہنچتا تو ایک سو تینتیس پیسے تھوڑی دیر کے لیے اس کی مٹھی میں آ جاتے۔ اس نے پہنچتے ہی اپنی غیر حاضری کے جرمانے میں دونوں نوکروں کو چار مینار کا ایک ایک سگریٹ پلانے کے لیے ڈبیا نکالی اور خیالوں کے ان تیرہ و تاریک جنگلوں میں بھٹکنے لگا جو اسے زندہ رکھنے میں معاون تھے۔ ٹال کے رجسٹروں کے سامنے اس کا سایہ بیٹھا ہوا تھا اور وجود جگنوؤں کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

بادامی کاغذ کے تختوں پر اس کی کوٹھری کھلی پڑی تھی اور ان عذابوں کے چھوٹے بڑے بھوت ناچ رہے تھے' جو کسی خوش حال گھرانے میں غریب رشتے دار بوجھ پر سوار رہتے ہیں۔ لمبے چوڑے گھر کی چھت پر پنواڑی کی دکان کے مانند ایک کوٹھری تھی جس میں وہ۔ یعنی اس گھر کا پہرے دار اپنی بیوی کے ساتھ رہنے کا دکھ جھیل رہا تھا۔ جب وہ اس گھر میں مہمان ہوا اور تین روز بیت گئے تو پہلا وار ہوا۔ یعنی دستر خوان سے اٹھا دیا گیا۔ دوسرے حملے میں چائے بند ہو گئی اور تیسرے ہلے میں چوکیدار کا حساب کر دیا گیا۔ پرانی رشتے داری اور نئی صورت میں مجھوتہ اس طرح ہوا کہ پہرے دار کی کوٹھری اس کے حصے میں ڈال دی گئی' اب اس کا ہاتھ چپکے سے جیب کی طرف سے چلا' جیسے وہ اپنی کوٹھری کی طرف رینگ رہا ہو۔

بیوی کا خیال آتے ہی ایک لالٹین سی جلنے لگی اور قطعی کی ہوئی سفید اینٹوں کی دیوار پر ایک سایہ تھرتھرانے لگا' جس کے گیسولرز رہے تھے اور انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ یہ سایہ کیا ہے۔..... سفید دیوار کا تھوڑا سا حصہ سیاہ ہو گیا ہے یا مردہ دیوار کا تھوڑا سا حصہ زندہ ہو گیا ہے جو ایک بلند سینے کی لرزشوں سے دھڑک رہا ہے جو اسے بیوی کے وجود سے زیادہ پسند ہے۔ چار حرفوں کے اس چھوٹے سے لفظ کے گرد پیچک کی طرح ساری انسانیت کی کہانی لپٹی ہوئی ہے۔ یہ غیر مرئی آرزوؤں سے ہم آہنگی کا مادی اقرار ہے۔ پرچھائیاں بولتی نہیں اسی لیے سچی ہیں۔ یہ اس لیے بھی دل آویز ہیں کہ وجود کی طرح اپنے چھونے اور چومنے کی مادی قیمت نہیں مانگتیں' اور یہ بھی کہ سایہ ہی سب کچھ ہے۔ حقیقت کچھ بھی نہیں' یہاں جو کچھ ہے وہ سایہ ہے' عکس ہے' پرچھائیں کچھ بھی نہیں' یہاں جو کچھ ہے وہ سایہ ہے' عکس ہے' پرچھائی ہے' تاریخ کی کھوئی ہوئی مادی حقیقتوں کا منجمد عکس ہے۔ مصوری کا غیر مرئی صورتوں کا مرئی سایہ ہے۔

''یہ کیا کر رہی ہو..... تم روشنی کے قریب آ گئیں اور تمہارا قد چھت تک بلند ہو گیا' تمہارے کولھے سارے عرض میں پھیل گئے۔ روشنی سے قربت سائے کے حسن کو تباہ کر دیتی ہے اور روشنی سے زیادہ دوری بھی سائے کو دھندلا کر دیتی ہے' قتل کر دیتی ہے۔ روشنی اور سائے کی کہانی کا بیر و توازن ہوتا ہے' توازن۔''

اور اس کی جیب میں جیسے بچھو کلبلانے لگے۔ ابھی پرسوں جب وہ کالی چائے کے ساتھ باسی روٹی کا ناشتا کر رہا تھا تو اس کی بیوی نے جس کا سایہ اس کے وجود سے کہیں خوب صورت تھا' کہا۔ ''آج کل گھر میں سب لوگ باتیں کرتے ہیں کہ عورتوں کے ووٹ پچاس روپے میں اور مردوں کے پچیس روپے میں بک رہے ہیں۔''

''مگر ہم لوگوں کے یہاں ووٹ کہاں ہیں۔''

''ہاں..... لیکن جب لوگوں کے ووٹ ہوتے ہیں وہ سب کے سب ووٹ ڈالنے کہاں جاتے ہیں۔ جیسے ہمارے ووٹ گاؤں میں ہیں مگر ہم ڈالنے کہاں جا رہے ہیں۔''

''تو۔''

''تو یہ کہ ایسے لوگوں کی جگہ دوسروں سے ووٹ ڈلوا دیے جاتے ہیں۔''

''اچھا۔''

''ہاں۔''

''پہلے وہ لوگ یونہی باتیں کرتے رہے' پھر منہ پھوڑ کر مجھ سے کہا کہ اگر تم دونوں رضامند ہو جاؤ تو کپڑے لتے درست ہو جائیں۔''

''تم نے کیا کہا۔''

''میں توبہ تلا کرنے لگی۔ عورت ذات ووٹ دینے جاؤں بھی تو بے ایمانی کا' خدا نہ کرے پکڑی جاؤں تو عزت و آبرو ایک طرف' آدھی عمر چکی پیستے گزر جائے۔''

''ہوں۔''

''تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں کسی کے کہنے سننے میں نہ آ جانا۔ ہم کو اگر روٹی پر روٹی رکھ کر کھانا نصیب نہیں تو نہ ہو' بھوکے رہ لیں گے' مگر۔''

ایک لمبے چوڑے گاہک کو دیکھ کر اس کا کلیجا کانپنے لگا اور ہاتھوں میں جیسے ہتھکڑیوں کا لوہا گڑنے لگا۔ جب وہ لکڑیاں تلوا کر چلا گیا تو اسے انگوٹھے کا داغ کالے کرتوت کے کالے نشان کو مٹانے کا خیال آیا۔ بالٹیوں پانی خرچ ہو گیا۔ ہاتھوں کی ٹھنڈک کلیجے تک سرایت کر گئی' جلد سے خون جھلکنے لگا لیکن وہ کالا داغ مقدر کے لکھے کی طرح نہ مٹا۔

وہ اپنی چوری کے بھاری بھاری منصوبوں کو پاؤں تلے کچلتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ انگوٹھے کو مٹھی میں بند کر لیا اور مٹھی جیب میں چھپا لی۔ آج سیڑھیوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ کوٹھری میں قدم رکھا' تو جیسے چکر آ گئے اور اس نے آخری بار فیصلہ کر لیا کہ وہ کھانا نہیں کھائے گی۔ ملگجی بدلی میں چھپی ہوئے گوشت کے چاند سورج جھلک اٹھے۔ جیبوں میں ٹھنسے ہوئے دونوں ہاتھ کسمسانے لگے لیکن اس نے پہلا لیا اور وہ کونے میں رکھی ہوئی ایلومونیم کی پتیلی کی طرف چلی۔

''مجھے آج کچھ حرارت معلوم ہوتی ہے۔''

وہ تڑپ گئی جیسے کسی غیر مرد نے اسے پکڑ لیا ہو اور بالکل فشنی انداز میں ایک ہاتھ اس کے پہلو سے چوڑیاں چھنچھناتا اٹھا اور بھیگتی پیشانی پر چڑھ گیا۔ اسی وقت لالٹین کی گلابی روشنی میں اس کی نگاہیں اپنی بیوی کے بائیں ہاتھ کے انگوٹھی پر ٹھٹک کر گھڑی ہو گئیں۔ وہاں بھی وہی کالا داغ اپنا پھن کاڑھے بیٹھا تھا۔

☆☆☆☆
ادب سے انتخاب
☆☆☆☆

دو تھکے ہوئے آدمی

معین نظامی

لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ وہ ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی بن گئے۔ پتا نہیں وہ ایک دوسرے کا سامنا کیوں نہیں کر سکتے تھے' شاید دونوں یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے ایک دوسرے کی توہین کی ہے! جس دن دونوں کی پڑھائی کا آخری دن تھا' اس دن بھی دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔ سنا ہے اسی دن شام کے وقت وہ اپنے گانوں چلی گئی تھی..... دور بہت دور!

ادب سے انتخاب' حساس و دلگداز تحریر

محض بیوی بچوں کی کمپنی کے خیال سے میں نے ٹی۔ وی ڈرامہ دیکھا' حالانکہ آج مجھے اس میں ذرہ بھر بھی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ نو بجے خبرنامہ شروع ہوا تو میں اٹھ کر اپنے مطالعے کے کمرے میں چلا گیا۔ وقت تھا کہ رگ سا گیا تھا۔ طبیعت آج صبح ہی سے افسردہ تھی۔ یوں تو دائمی افسردگی کسی حد تک میرے مزاج کا حصہ بن گئی تھی' لیکن آج کچھ ضرورت سے زیادہ ہی افسردگی کا احساس ہو رہا تھا۔ یونیورسٹی میں' میں نے حسب معمول آج بھی ایم اے کی دونوں کلاسیں لیں لیکن کوشش کے باوجود ان دو گھنٹوں میں ایک بار بھی مسکرا نہیں سکا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اگر میں مسکرا دیا تو جیسے کوئی گناہ کبیرہ سرزد ہو جائے گا۔ لڑکے لڑکیاں بھی کیا سوچتے ہوں گے!

شیلف سے کتاب نکالی اور یہ نظم پانچ سات مرتبہ پڑھی۔

''بہار آئی تو جیسے ایک بار
لوٹ آئے ہیں پھر عدم سے
وہ خواب سارے' شباب سارے''

پھر دیر تک یہ نظم پڑھتا رہا۔

''ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں ہر کام کرنے میں۔''

جب یہ لائنیں پڑھتا۔

''بہت دیرینہ رستوں پر کسی سے ملنے جانا ہو۔''

اوہ.....

''کسی کو موت سے پہلے کسی غم سے بچانا ہو۔''

تو یوں محسوس ہوتا جیسے میں اب کبھی سانس نہیں لے سکوں گا۔

سدا بہار فائزہ کمرے میں آ گئی۔ شاید خبرنامہ ختم ہو گیا تھا۔

''اچھا حضور والا پوئٹری انجوائے کر رہے ہیں! بچوں کو روز کہانیاں سنانے کی لت ڈالی ہے تو اب اپنے شوق مطالعہ میں بھی کمی کیجیے۔'' اس کے ہونٹ بھی مسکرا رہے تھے اور آنکھیں بھی۔ ''آپ کے چہیتے آپ کے منتظر ہیں۔''

''اور یہ تو میں بھول ہی گیا تھا!''

''جی ہاں جہاں پناہ اب تشریف لائیے بھی!'' فائزہ نے میرے ہاتھ سے کتاب لے کر میز پر رکھ دی۔ شادی کے دس سال بعد بھی اس کے جسم کی شادابی اور مزاج کی تروتازگی میں کمی نہیں آئی تھی۔ میں اس کے ساتھ ہی کمرے سے نکل آیا۔

فرہاد اور رباب بڑی بے تابی سے آج کی کہانی کا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ کھل اٹھے۔

''پیارے بچو! ہماری آج کی کہانی کا عنوان ہے۔ ''دو تھکے ہوئے آدمیوں کی کہانی۔'' میں نے صوفے پہ بیٹھتے ہی کہانی چھیڑ دی۔ فرہاد میری دائیں جانب آ کر جم گیا اور رباب بائیں جانب۔ فائزہ چھوٹے موٹے کاموں میں الجھ گئی تھی۔

''ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی خوب صورت دیس میں ایک حسین سرزمین تھی جو ''پانچ پانیوں کی سرزمین'' کہلاتی تھی اس سرزمین میں چھوٹے بڑے بہت سے شہر قصبے اور گاؤں تھے' لیکن اس کا سب سے بڑا شہر' سب سے زیادہ خوب صورت تھا اور علاقے کے لوگ اسے پیار سے اپنی سرزمین کا دل کہا کرتے تھے۔'' سات سالہ فرہاد اور چار سالہ رباب بڑی معصومانہ محویت سے کہانی سن رہے تھے۔

''اس بڑے شہر میں دو تھکے ہوئے آدمی رہتے تھے۔ ان میں سے ایک لڑکا تھا جس کی عمر چوبیس سال کے لگ بھگ ہو گی اور دوسری لڑکی تھی جس کی عمر شاید اکیس سال تھی۔''

''دونوں بھائی تھے؟'' رباب کے سوالوں کا آغاز ہو گیا تھا۔

''نہیں' دو بہن بھائی نہیں تھے۔ وہ اس شہر کے رہنے والے بھی نہیں تھے۔ وہ اس خطے کے دو مختلف علاقوں سے کچھ عرصے کے لیے وہاں آئے ہوئے تھے۔ دونوں کے امی ابو نے انہیں بہت زیادہ پڑھنے کے لیے وہاں بھیجا تھا۔''

''ابو اتنے بڑے شہر میں صرف دو ہی تھکے ہوئے آدمی رہتے تھے؟'' فرہاد بھی پیچھے رہنے والا نہیں تھا۔ اس کا ذہن اور شرارتی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ سی مسکراہٹ تھی' جیسے اس نے میری غلطی پکڑ لی ہو۔

''نہیں بیٹا! وہاں یقیناً اور بھی بہت سے تھکے ہوئے لوگ ہوں گے بلکہ اکثریت تھکے ہوئے لوگوں ہی کی تھی لیکن وہ بہت بزدل تھے۔ وہ دوسروں پر اپنی تھکن ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ ہماری آج کی کہانی ان دو تھکے ہوئے آدمیوں

کے بارے میں ہے' جنہوں نے ایک دوسرے کو پہچان بھی لیا تھا اور ایک دوسرے کو مکمل کرتا بھی دیا تھا کہ وہ تھکے ہوئے ہیں۔"

"ابو! میں بھی ایک بات پوچھوں؟" رباب نے اپنا ننھا منا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

"نہیں نہیں ابو آپ کہانی جاری رکھئے! یہ تو ایسے ہی بیچ میں ٹوکتی رہتی ہے۔" فرہاد نے اس کی سرگوشی سن لی تھی۔

"پوچھوں گی' ضرور پوچھوں گی' ابو خود کہتے ہیں کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے پوچھ لیا کرو۔" رباب ٹھیک کہہ رہی تھی۔

"فری بیٹے ایسا نہیں کرتے۔ تم نے خود تو سوال کرلیا اور اب بہن کو ڈانٹ رہے ہو' پوچھو بیٹی کیا پوچھنا ہے شاباش! فری کی ڈانٹ ڈپٹ پہ نہ جایا کرو۔"

"ابو! وہ محنت مزدوری کرکے پڑھتے تھے؟"

"نہیں تو۔"

"رات دن ہر وقت پڑھتے رہتے تھے؟"

"نہیں۔"

"بہت زیادہ پیدل چلتے تھے؟"

"نہیں۔"

"اپنے سارے کام خود کرتے تھے؟"

"نہیں۔"

"انہیں اپنے امی ابو بہت یاد آتے تھے؟"

"نہیں۔"

"پھر وہ اتنے تھکے ہوئے کیوں تھے؟"

رباب کی غیر معمولی ذہانت اکثر میرے لیے مسئلہ بن جاتی تھی۔

"پتا نہیں بیٹا! جس کتاب سے میں نے یہ کہانی پڑھی تھی' اس میں یہی لکھا تھا کہ وہ دونوں ہر وقت بہت تھکے تھکے سے رہتے تھے۔ کبھی کبھی اچانک ان کی تھکن بہت بڑھ جاتی' اتنی کہ وہ برداشت نہیں کر پاتے تھے۔ اس کی وجہ کا شاید انہیں خود بھی علم نہیں تھا۔"

"ہوسکتا ہے وہ بے چارے پیدائشی تھکے ہوئے ہوں۔" فرہاد نے بڑے دکھ سے کہا۔

"بالکل! میرا بھی یہی خیال ہے کہ وہ دونوں پیدائشی تھکے ہوئے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے حالات نے ان کے دلوں میں تھکن کے بیج بو دیئے ہوں!" میں نے فرہاد کی تائید کی۔

"تھکن کے بیج؟ تھکن کے بیج ہوتے ہیں بابا؟" رباب کو یقین نہیں آرہا تھا۔ "آپ نے دیکھے ہیں؟"

"ہوتے تھے میری جان' اس زمانے میں' آج کل نہیں ہوتے۔" میں نے اس کے سرخ و سفید گال تھپتھپائے۔

"وہ دونوں اس شہر کی ایک بہت پرانی اور بڑے بڑے ستونوں والی سربلند عمارت میں پڑھنے جاتے تھے اور ایک ہی کمرے میں بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ پڑھائی کے بعد وہ ایک نہر کے کنارے بنی ہوئی خوب صورت تین منزلہ عمارتوں میں چلے جاتے جو اس بڑی عمارت میں پڑھنے والے دوسرے علاقوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے بنائی گئی تھیں۔ وہاں کچھ دکانیں بھی تھیں۔ سب لوگ وہیں سے چیزیں خریدتے تھے' کہتے تھے کہ سستی ملتی ہیں حالانکہ وہ عام دکانوں سے مہنگی ہوتی تھیں۔ خریداری اور نہر کے کنارے سیر کا زور عموماً شام سے کچھ پہلے ہوتا تھا اور یہی وہ وقت ہوتا تھا جب بیچارے کہانی والے دو آدمیوں کی تھکن حد سے بڑھ جاتی تھی۔ جب تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد لمبے لمبے درختوں کے اوپر سے کوؤں کے غول کے غول آہستہ آہستہ اپنے بسیروں کو لوٹ رہے ہوتے تھے!"

"کمال کی بات یہ ہے کہ وہ دونوں بہت ذہین اور محنتی طالب علم تھے۔ لڑکی تو پانچ وقت کی نماز بھی پڑھتی تھی اور سارے روزے بھی رکھتی

تھی۔ لڑکا نہ نماز پڑھتا' نہ روزے رکھتا' لیکن وہ بظاہر ایسا لگتا نہیں تھا۔ ان کے کلاس فیلو ان سے بہت پیار کرتے تھے۔ سارے اسٹاف بھی انہیں بے حد چاہتے۔ وہاں ایک بڑے درخت کے تلے چائے کی ایک چھوٹی سی دکان ہوا کرتی تھی' دکان والا چاچا بھی ان کی بہت عزت کیا کرتا تھا۔"

"کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک دن اس لڑکے نے لڑکی سے کہا مجھے لگتا ہے کہ آپ بہت تھکی تھکی رہتی ہیں' میرے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہم ساری زندگی اکٹھے گزاریں۔ لڑکی نے اس کی بات سن کر کہا' میں واقعی بہت تھکی رہتی ہوں اور میں نے پہلے دن آپ کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ آپ کا معاملہ بھی یہی ہے۔ باقی رہی زندگی اکٹھے گزارنے کی بات تو اس کا جواب میں ایک دو دن میں سوچ کر دوں گی۔ دو دن بعد لڑکی ایک خالی بینچ میں لڑکے سے ملی اور کہنے لگی' میں آپ کی بے پناہ عزت کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی رہوں گی۔ میرے دل میں ہمیشہ آپ کی قدر رہے گی اور میں ہمیشہ آپ کو یاد رکھوں گی' یہ میرے بس میں ہے لیکن زندگی کا فیصلہ کرنا میرے بس میں نہیں۔ یہ کام میرے امی ابو کا ہے۔ لڑکے نے کہا' مجھے اس سے کوئی اختلاف نہیں' لیکن تھکے ہوئے لوگوں کو اپنے فیصلے بہت جلد اور خود کر لینے چاہئیں' انہیں اپنی تھکن ایسے لوگوں پر مسلط نہیں کرنی چاہیے جو تھکے ہوئے نہ ہوں' کیونکہ جو خود تھکا ہوا نہیں ہوتا' اسے دوسروں کی تھکن کا اندازہ نہیں ہوتا۔ لڑکی نے کہا۔ اچھا ٹھیک ہے' ابھی تو فیصلے کے لیے بہت دن پڑے ہیں۔ لڑکے نے کہا۔ فیصلہ ہونے تک ہم کبھی کبھی ایک دوسرے کی تھکن بٹا نہ لیا کریں؟ لڑکی نے بڑی خوش دلی سے کہا۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔

اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے' لیکن دونوں جانتے تھے کہ ابھی ان میں کتنے فاصلے ہیں۔ دونوں کا خیال تھا کہ یہ فاصلے بہت ضروری ہیں۔ فاصلے مٹ جائیں تو تشخص ختم ہوجاتا ہے اور وہ دونوں تشخص کے اسیر تھے۔ کچھ لوگ سمجھنے لگے تھے کہ انہوں نے باہمی فاصلے ختم کردیئے ہیں یا بہت جلد کردیں گے۔ معلوم نہیں کیوں انہیں یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی! دونوں دو تین بار اکیلے سیر سپاٹے کے لیے بھی گئے۔ وہاں انہوں نے کشتی رانی کی' آئس کریم کھائی اور اچھی اچھی باتیں کیں۔ وہاں ایک دن چائے پیتے ہوئے لڑکی نے لڑکے سے کہا۔ میں اپنے بال بڑھا رہی ہوں۔ لڑکے نے پوچھا وہ کیوں؟ لڑکی نے کہا۔ آپ ہی تو کہتے ہیں کہ آپ کی امی کو کٹے ہوئے بالوں والی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں! لڑکے کو یوں لگا جیسے فیصلہ ہوچکا ہو۔"

"پھر پتا ہے کیا ہوا یکا یک کچھ عرصہ کے بعد لڑکے کو یوں محسوس ہونے لگا کہ لڑکی اب بہت کم تھکی تھکی رہتی ہے۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ اس نے سوچا جو لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کے درمیان فاصلوں کے حجاب باقی نہیں' وہی اس لڑکی کی تھکن میں کمی کا باعث بنے ہیں۔ اس نے لڑکی سے کہا۔ دیکھو اس تھکن کو ہمیشہ باقی رکھنا' اسے ہاتھ سے نہ جانے دینا کہ یہ میری تمہاری شناخت ہے۔ لڑکی نے کہا' سب آپ کا وہم ہے۔ میں تو پہلے بھی سے زیادہ تھک جاتی ہوں۔"

میں محسوس کررہا تھا کہ بچے اس کہانی سے بور ہورہے ہیں' میں نے اسے سمیٹنا شروع کردیا۔

"قصہ مختصر یہ کہ لڑکے کو اندازہ ہونے لگا کہ لڑکی کی تھکن روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ لڑکی بضد تھی کہ اس کا اندازہ غلط ہے۔ یوں کوئی فیصلہ ہونے سے پہلے ہی کئی اختلافات پھوٹ پڑے۔ ایک دو لڑکیوں نے جو اس لڑکی کے زیادہ قریب تھیں ان اختلافات کو مزید ہوا دی۔ شاید وہ خود لڑکے کی تھکن کی ساجھی بننا چاہتی تھیں۔ آہستہ آہستہ لڑکی نے لڑکے کی عزت کرنی بھی چھوڑ دی اور لڑکے کو سب سے زیادہ دکھ بھی اسی بات کا ہوا

اور پھر ایک دن اس نے اس لڑکی کے سامنے اپنی کلاس کے کچھ لڑکوں اور لڑکیوں میں خوب صورت کارڈ تقسیم کیے اور سرخ بال پوائنٹ سے سب کو اپنے گاؤں کا نقشہ بنا کر راستہ سمجھاتا رہا۔ لڑکی ایک کونے میں کھڑی' سر جھکائے چلغوزے اور کشمش کھاتی رہی۔ لڑکا اپنی بوڑھی ماں کی سب سے بڑی خواہش کے آگے ہار مان گیا تھا۔ وہ اس لیے بھی آسانی سے ہار مان گیا تھا کہ تھکی ہوئی لڑکی میں قوت فیصلہ نہیں تھی' وہ کانوں کی کچی تھی اور اپنی تھکن ختم کرنے کی کوشش میں لگ گئی تھی۔

لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ وہ ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی بن گئے۔ پتا نہیں وہ ایک دوسرے کا سامنا کیوں نہیں کر سکتے تھے' شاید دونوں یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے ایک دوسرے کی توہین کی ہے! جس دن دونوں کی پڑھائی کا آخری دن تھا' اس دن بھی دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔ سنا ہے اسی دن شام کے وقت وہ اپنے گاؤں چلی گئی تھی...... دور بہت دور! ٹھیک اسی لمحے جب دو وقت ملتے ہیں' جب پرندوں کے قافلے اپنے اپنے گھونسلوں کو لوٹتے ہیں اور جب تھکے ہوئے لوگوں کی تھکن حد سے بڑھ جاتی ہے!

اگلے دن اس لڑکی کی ایک کم گو سہیلی نے لڑکے کو بتایا کہ جس دن تم نے کلاس میں کارڈ تقسیم کیے' اس دن وہ اپنے کمرے میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ شاید اپنی توہین کے دکھ سے...... اور اس دن کے بعد سے وہ اندر ہی اندر بہت زیادہ تھک گئی تھی وہ تمہاری بیوی کی شکل وصورت کے بارے میں لڑکیوں سے اکثر پوچھتی رہتی تھی۔ یہ سن کر لڑکے کو یوں لگا جیسے اس کے دل میں سے کانٹا نکال کر پوری قوت سے پھر وہیں چبھو دیا گیا ہو۔ کافی عرصے بعد لڑکے کو اس کے ایک دوست نے بتایا کہ وہ لڑکی اس سے ملی تھی اور بتا رہی تھی کہ اس نے اپنے ایک کزن سے شادی کر لی ہے جو یوں تو بہت ہی اچھا ہے لیکن نہ خود تھکا ہوا ہے اور نہ کسی کی تھکن محسوس کر سکتا ہے۔

میں نے اچانک ہی کہہ دیا۔ ''کہانی ختم' پیسہ ہضم!'' میں اٹھنے لگا تو رباب نے روک لیا۔

''اس کہانی کا اخلاقی سبق تو بتایئے ابو۔''

''یہ ان کہانیوں میں سے ہے جن کے اخلاقی سبق نہیں ہوا کرتے۔'' مجھے اور کوئی جواب نہ سوجھا۔

''پھر تو یہ اچھی کہانی نہ ہوئی ناں! آپ ہی تو کہتے تھے کہ ہر اچھی کہانی کا اخلاقی سبق ضرور ہوتا ہے۔ جب آپ نے کچھوے اور خرگوش والی کہانی سنائی تھی تو کہا تھا کہ اس کا اخلاقی سبق ہے۔ 'غرور کا سر نیچا' اور لکڑیوں کے گٹھے والی کہانی کا اخلاقی سبق آپ نے 'اتفاق میں برکت ہے' بتایا تھا۔'' وہ اڑی رہی۔

''ہاں ہاں یہ بھی ایک اچھی کہانی ہے اور اس کا اخلاقی سبق یہ ہے کہ تھکے ہوئے آدمیوں کو اپنے فیصلوں میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔''

''وہ لڑکی پھر اس لڑکے سے کبھی ملی؟'' اب فرہاد کی باری تھی۔

''ہاں کہتے ہیں کہ ایک بار ملی تھی۔ اتفاق سے اسی بڑی عمارت میں جہاں وہ مل کر پڑھتے رہے تھے اور جب اسے پتا چلا کہ لڑکے نے اپنے بچوں کے وہی نام رکھے ہیں جو اس لڑکی کو بہت پسند تھے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے جنہیں اس نے گہرے آسمانی رنگ کے ٹشو پیپر میں جذب کر لیا تھا۔''

''وہ نام کیا تھے ابو۔''

''بیٹا! نام تو کتاب میں نہیں لکھے۔ بس اتنا ہی لکھا تھا جتنا بتا دیا ہے۔ اچھا اب تم لوگ فوراً جا کر سو جاؤ۔ صبح جلدی ناشتہ کر کے اسکول جانا ہے۔''

اب میں انہیں کیا بتاتا کہ وہ نام وہی تھے' جو ان کے ہیں!

☆☆☆☆☆
ادب سے انتخاب
☆☆☆☆☆

پابرگ

موپساں / ڈاکٹر مرتضیٰ عادل

مادام مارایمبل غور و فکر کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔
اس نے ایک عرصہ تک اس شخص کے تابناک
مستقبل کے سہانے سپنے دیکھے تھے اور
اس لوبہ میں اس سے شادی تھی۔
اس وقت اس کی شخصیت میں کشش تھی اور
اسی دور میں وہ اعزاز و اکرام سے نوازا گیا تھا۔

ادب سے انتخاب' حساس و دلگداز تحریر

اس دن بھی حسب معمول چار بجے سہ پہر الیگزینڈر اپنے تین پہیوں والے اس پرانے چھکڑے پر مارایمبل کے محدود و مختصر گھر کے سامنے آ کر رکا جس میں وہ اپنی بے بس بوڑھی مالکن کو ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق چھ بجے تک سیر کرانے لے جایا کرتا۔ اس نے اپنی گاڑی عین اس جگہ سیڑھی کے سہارے کھڑی کی جہاں سے وہ اپنی لحیم شحیم مالکن کو سوار کرواتا اور خود گھر کی جانب ہو لیا۔

عین اسی لمحے اسے بھاری پھٹی اور جلی بھنی آواز سنائی دی۔ یہ جوزف مارایمبل کی آواز تھی جو پیادہ فوج کا سابقہ کیپٹن اور اس گھر کا مالک تھا۔ بعد ازاں زور سے دروازہ بند کرنے اور کرسیاں گھسٹنے کی

آوازیں گونجیں پھر تیز تیز قدموں سے چلنے کی صدائیں آئیں اور فضا پر سکوت مسلط ہو گیا۔ کچھ دیر بعد الیگزینڈر اپنی تمام تر قوت سے مادام مارایمبل کو سنبھالا دیئے' نیچے لاتا دکھائی دیا۔

سیڑھیاں اترنے سے بوڑھی مالکن تھکاوٹ سے چور نظر آتی تھی جب وہ بمشکل گاڑی میں سوار ہو چکی تو الیگزینڈر ہینڈل تھامے حسب سابق اس مختصر سے قصبے کے گلی کوچوں سے ہوتا' دریا کی سمت چل دیا جہاں سے وہ دونوں اپنا مقدم کرنے والوں کا پرملائمت جواب دیتے' ہر روز گزارا کرتے۔

وہ خاتون انتہائی ہر دلعزیز تھی اور اس کا وہ بوڑھا فوجی خدمت گزار اپنی قابل احترام ڈاڑھی کے ساتھ بے حد عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

جولائی کے پرحدت سورج سے قصبے کی گلیاں بری طرح تپ رہی تھیں۔ کتے گلیوں میں اونچی اونچی دیواروں کے ڈھلتے سکڑتے سایوں میں پڑے تھے جبکہ الیگزینڈر اپنی پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بعجلت کھنچتا' جھکے پھیلے سرسبز و شاداب اشجار سے پر دور ویہ سڑک سے ہوتا' بتدریج دریا کی طرف روانہ تھا۔

مادام مارایمبل اپنے اس سفید چھاتے کے نیچے اونگھ رہی تھی جس کا سایہ اس کے خدمتگار کے جذبات سے عاری چہرے کے ارد گرد متحرک تھا چنانچہ جب وہ لیموں کے دورویہ اشجار کے سایوں تلے پہنچے تو مادام کی آنکھ کھلی اور اس نے پرخلوص انداز میں دبی زبان سے کہا۔

"گاڑی اتنی تیز کیوں چلا رہے ہو الیگزینڈر؟ اس گرمی میں تو تم خود کو ہلکان کر لو گے۔"

اس رحم دل خاتون کے دل میں' یہ احساس پہلے نہ جاگا تھا۔ شاید اب دوست روی کی اس لیے خواہاں تھی کہ سرسبز و شاداب درختوں کی گھنیری پناہ گاہ میں اس جگہ جا پہنچے تھے جہاں سڑک پر لیموں کے پرانے درخت ڈاٹ کی صورت اختیار کیے ہوئے تھے اور بل کھاتے ہوئے ناؤٹی کا متموج پانی ویلو کی پر دو جانب جھکی ہوئی جھاڑیوں کے ماہین پتھروں سے یہ تندی نیچے پھسلتا' کہر آلود فضا میں دبی دھیمی موسیقی بکھیرتا تھا۔ لانبی سانسوں اور وہاں کی پرکیف مہک سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مادام مارایمبل بولی۔

"اب مجھے ذرا فرصت نصیب ہوئی ہے۔ آج صبح سے اس کے تیور کچھ بدلے بدلے سے تھے۔"

"یقیناً ایسا ہی ہوگا۔" الیگزینڈر نے جواباً کہا۔

وہ پچھلے پینتیس برس سے ان کی خدمت کر رہا تھا۔ شروع شروع میں بحیثیت اردلی ان کے ہاں مامور ہوا تھا۔ بعد ازاں آقا کو چھوڑ کر چلے جانے کی بجائے اس نے خانسامے کا حقیر کام سنبھال لیا اور گزشتہ چھ سال سے اب وہ یہ روز سہ پہر اپنی مالکن کو گاڑی میں بٹھا کر تنگ سڑکوں پر شہر کے گرد سیر کروانے کی خدمت سرانجام دے رہا تھا۔

طول طویل عرصے کی خدمت اور ہر روز کے ساتھ نے بوڑھی مالکن کے نہاں خانہ دل میں عمر رسیدہ خدمت کار کے لیے ہمدردی اور انس کا جذبہ پیدا کر دیا تھا چنانچہ وہ دونوں بنا حیل و حجت گھریلو معاملات و حالات پر تبادلہ خیال کیا کرتے۔ ان کی گفتگو کا اہم ترین موضوع عموماً کیپٹن کی تلخ مزاجی ہوتا جو لمبے عرصے پر محیط ناسازگار حالات' ترقی کے مواقع ضائع کرنے اور اعزازات کے بغیر ریٹائر ہو جانے کا ثمرہ تھی۔ "آج صبح ہی سے اس کے تیور بگڑے بگڑے سے تھے۔" مادام مارایمبل نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے تو جب سے اس نے فوج کو خیرباد کہا ہے۔ اس کی تیوری پر بل ہی پڑے رہتے ہیں۔"

الیگزینڈر اپنی مالکن کی بات مکمل کرنے کے خیال سے آہ بھر کر بولا۔

"مادام یہ کہنے میں حق بجانب ہیں۔ فوج سے فارغ خطی پانے سے پیشتر ہی' یہ وطیرہ اس کی عادت

بن چکا تھا۔"

"بات تو کچھ ایسی ہی ہے اگرچہ قسمت کا بھی قصور ہے۔ ابتدا اس نے بیس سال کی عمر میں بہادری دکھائی اور اعزازات سے نوازا گیا پھر بیس سے تیس سال کی عمر تک وہ کیپٹن کے عہدے سے ترقی کر سکا اگرچہ اندازہ یہ تھا کہ وہ کرنل سے ریٹائر ہوگا۔"

"یہ اعتراف تو آپ کو کرنا ہی پڑے گا کہ قصور اس کا اپنا تھا۔ اگر وہ تنک مزاج نہ ہوتا تو یقیناً حکام بالا اسے پسند کرتے اور اسے ترقی دلانے میں اپنا زور رسوخ استعمال کرتے۔ بدمزاجی اچھی صفت نہیں جبکہ ترقی کے لیے لوگوں کی خوشنودی لازم ہے۔ ہمارے ساتھ اس کا رویہ بدمزاجی کا حامل ہو سکتا ہے۔ ہم اس کے رہین منت ٹھہرے! جب تک ہمیں اس کے ساتھ رہنا ہے تو اس کا یہ ستم برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ دوسرے اس کی بدخوئی کیوں برداشت کریں؟"

مادام مارایمبل غور و فکر کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ اس نے ایک عرصہ تک اس شخص کے تابناک مستقبل کے سہانے سپنے دیکھے تھے اور اس لو بھ میں اس سے شادی تھی۔ اس وقت اس کی شخصیت میں کشش تھی اور اسی دور میں وہ اعزاز و اکرام سے نوازا گیا تھا۔

"گھڑی بھر کے لیے رک جاؤ الیگزینڈر!" مادام کے لب گنگنائی اور پھر کہنے لگی۔ "ہمیشہ کی سیٹ پر ذرا دم بھر کو ذرا سستا لو!"

دورویہ درختوں سے ڈھکی ہوئی سڑک کے موڑ پر اتوار کو برائے تفریح آنے والوں کے لیے ایک لکڑی کی سیٹ بنی ہوئی تھی جس کا زیادہ حصہ ٹوٹا پھوٹا تھا۔ جونہی وہ وہاں پہنچے الیگزینڈر گھڑی بھر کو سستانے وہاں بیٹھ جایا کرتا چنانچہ وہ بہترین طریقے سے تراشی ہوئی داڑھی کو پرزور گرفت میں لیے' سب معمول اس پر بیٹھ گیا۔

غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ داڑھی سے پھسلتے پھسلتے پیٹ سے جا لگا اور اس نے داڑھی کے آخری سرے کو مضبوطی سے پکڑ لیا جیسے وہ اس کی طوالت کی نمائش کرنا چاہ رہا ہو۔

مادام مارایمبل پھر سے بولی۔

"جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو شادی کے بندھن میں جکڑی ہوئی ہوں' اس کے جو رستم برداشت کرنے کی پابند ٹھہری لیکن یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے الیگزینڈر کہ تم اس کے جور ستم کیوں برداشت کر رہے ہو؟"

"او! میں..... مادام!" وہ اپنے کندھے اچکاتا ہوا بولا۔

"واقعی.....!" مادام یکا یک کہنے لگی۔ "میں نے اس مسئلے پر اکثر غور و فکر کیا ہے۔ جب ہماری شادی ہوئی تھی' تم اس وقت اس کے اردلی تھے۔ مجھے تو ہر حال میں اس کے ساتھ بسر اوقات کرنا تھی۔ تم ہمارے ساتھ کیوں چمٹے رہے جبکہ تمہیں تنخواہ تو نہایت قلیل ملتی اور ہر وقت کی لعن طعن اور جھاڑ جھپٹ بھی سہنا پڑتی۔ ایسے میں چاہیے تو یہ تھا کہ تم اپنا مستقبل سنوارتے اور شادی کر کے اپنی فیملی کے ساتھ پرمسرت زندگی بسر کرتے۔"

"میری بات اور ہے مادام!" الیگزینڈر جواباً بڑبڑایا اور خاموشی اختیار کیے' داڑھی کے بالوں کو اس انداز سے کھینچنے لگا جیسے انہیں اکھاڑ پھینکنا چاہتا ہو جبکہ مادام مارایمبل اپنے نقطہ نگاہ سے اس کے حالات کا تجزیہ کرنے لگی۔

"آخر تم جاہل بھی تو نہیں پڑھے لکھے ہو.....!"

"میں نے لینڈ سرویئر کی تعلیم حاصل کی ہے۔" اس نے خودستائی کے لہجے میں جواب دیا۔

"پھر تم نے اپنا مستقبل داؤ پر لگا کر ہمارے ساتھ نبھاہ کیوں کیا؟"

اس نے ہلکاتے ہوئے جواب دیا۔ "اسے میری فطری کمزوری سمجھیے!"

"فطری کمزوری سے تمہاری مراد کیا ہے۔"

میں تو کچھ سمجھ نہیں پائی!"

"جی......! جب میں کسی کا ہوجاتا ہوں تو سمجھئے ہمیشہ کے لیے بس اسی کا ہوجاتا ہوں!"

"واضح طور پر بیان کرونا!" مادام بڑبڑائی۔ "بھلا یہ کیسے مان لیا جائے کہ مارا ایمبل کی شفقت اور رحم دلی کے سبب تم زندگی بھر کے لیے اس کے ہولئے!"

"زندگی بھر مارا ایمبل کا ساتھ نبھانے کے لیے......؟اوں ہوں!" الیگزینڈر بے آرامی سے سیٹ پر پہلو بدلتے' موٹی موٹی مونچھوں تلے دھیرے سے گنگنایا اور پھر بولا۔ "در پردہ تو آپ کی ذات......!"

"بے بس وناتواں الیگزینڈر! کیا واقعی تم نے میری ذات کے لیے اتنا کشٹ کیا ہے؟ آخر تم کہنا چاہتے ہو؟"

الیگزینڈر نے دائیں بائیں نظریں دوڑائیں اور پھر دور فضا میں گھورتے' انتہائی شرمناک جرم کا اعتراف کرنے والے شرمسار انسان کی مانند سر جھکا کر کہنے لگا۔

"میرا یہ اعتراف مبنی بر حقیقت ہے۔ ایک عرصہ پیشتر میں لیفٹیننٹ کا رقعہ لے کر جب پہلی بار آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو آپ مجھے دیکھ کر مسکرادی تھیں اور مجھے ایک فرانک عطا کیا تھا چنانچہ میں اس من موہنی مسکراہٹ کے منصوبوں کا اسیر ہوگیا تھا۔"

"واضح طور پر کہو' تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

اعتراف جرم کے بعد ڈر سے مغلوب مجرم کی طرح الیگزینڈر کہنے لگا۔

"میرا دل کسی مقناطیسی کشش کے سبب اسی دن سے آپ کی طرف راغب ہے!"

مادام سے اس کا کچھ جواب بن نہ پڑا لہٰذا وہ اس کی طرف توجہ دیئے بغیر سوچنے لگی۔ اس نامراد کی چاہت کس قدر عظیم ہے کہ بنا اقرار محبت' اس نے دنیا بھر کی مسرتوں کو تج کر میری قربت میں رہنا قبول کرلیا۔ اس کا دل اپنے دیرینہ خدمت گار کے لیے پسیج سا گیا چنانچہ وہ دھیرے سے بولی۔

"چلو واپس چلیں!"

الیگزینڈر سیرگاہ کی سیٹ سے اٹھا' گاڑی کے گرد چکر لگا کر اس کی سیٹ پر جا بیٹھا اور گاڑی کھینچنے لگا۔

جونہی وہ گاؤں کے قریب پہنچے' انہوں نے کیپٹن مارا ایمبل کو سڑک کے درمیان اپنی طرف آتے دیکھا۔ ان کے نزدیک پہنچنے پر کیپٹن نے اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے استفسار کیا۔

"آج کھانے میں کیا ہے؟"

"سیم پھلیوں میں چوزے کا بھنا ہوا گوشت!"

اس کے خدوخال پر ناراضگی کے آثار امنڈ آئے اور وہ یکدم پھٹ پڑا۔

"چوزہ...... پھر چوزہ......میرے لیے کیا چوزے ہی کا گوشت رہ گیا ہے؟ لعنت ہو چوزے کے گوشت پر! میں تو یہ کھاتے کھاتے تنگ آگیا ہوں۔ تمہیں میرے لیے اور کچھ پکانے کو نہیں ملتا؟"

"لیکن ڈارلنگ!" مادام نرم و ملائم لہجے میں بولی۔ "ڈاکٹر کا یہ حکم...... تمہارے بھی علم میں ہے اور یہی تمہارے ہاضمے کے لیے سودمند بھی ہے۔ چیزیں تو کئی ایک ہیں لیکن بدہضمی کا شکار ہونے کے باعث میں تمہیں اور کچھ پکا کر دینے سے گریزاں ہوں۔"

وہ اشتعال بھرے انداز میں الیگزینڈر کے بالمقابل جا کھڑا ہوا۔

"میری یہ بیماری تو اس حیوان صفت انسان کی غلطی کا نتیجہ ہے کیونکہ یہ پینتیس سال تک غلیظ کچوان سے میرے جسم میں زہر بھرتا رہا ہے۔"

مادام نے پہلو بدل کر دزدیدہ نگاہوں سے اپنے پابریدہ پرستار کی طرف دیکھا۔ لمحہ بھر کے لیے دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور پھر جھک گئیں۔

※......※......※

☆☆☆☆
ادب سے انتخاب
☆☆☆☆

ڈیڑھ ہاتھ

غلام دستگیر ربانی

وہ دونوں بت بنے بیٹھے تھے اور ان کے پاؤں
ایک ایک انچ زمین میں دھنسے ہوئے۔
یہ کوئی اور ہی لمحہ تھا۔
اس سے پہلے جو لمحہ گزرا وہ میاں بیوی تھے مگر اب
جیسے ان کے درمیان کوئی رشتہ کوئی تعلق ہی نہیں۔مٹی کے دو
الگ الگ وجود۔ کمرے سے باہر دو کھڑکیوں میں سے ایک تارا نظر
آرہا تھا۔پھر منظر دھندلا گیا اور زہر سے بھیگی ہوئی آوازیں شہر کے
منظر نامے سے ابھر کر ایک دوسرے پر سپرامپوز ہونے لگیں۔

ادب سے انتخاب......ایک فکر انگیز وحساس تحریر

حیرتوں سے لبریز سورج اپنے تمام اسرار کے ساتھ ان دونوں جسموں پر شام کی خبر چسپاں کر جاتا ہے۔

عکس در عکس آئینوں کا جال ہیں۔ نم آلود گلیوں' پرانی اینٹوں کے مکانوں اور مٹیلے گھروں کی چلمنوں میں زندگی سرسراتی ہے۔ دل میں خواب کی ایک تصویر بنتی ہے۔ اک ڈولی بازار سے گزرتی ہوئی اور اندھیرے میں چھلانگ۔

شہر کے منظر نامے میں وہ منظر قدرے چھپا ہوا ایک میلا سا تین منزلہ مکان جس کی دوسری منزل میں کمرہ جسے ایک دیوار دو لخت کرتی ہے۔ اس چھوٹے سے گھر کی خبر نہیں کہ وہ عورت

کرائے دار ہے یا یہ شخص جو مدتوں بعد اس گھر میں آیا ہے اور عورت کے بہت قریب ہوکر رازوں بھرا بستہ کھولتا ہے۔

''تم سے دور رہ کر مجھے تمہاری طلب محسوس ہی نہ ہوئی۔''

عورت اس کڑوے سچ کو سن کر اس کا چہرہ دیکھتی ہے مگر کچھ ہی دیر بعد آنکھوں کے آگے دھند کا پہرہ۔

جذبوں سے نچڑی ہوئی بے مزہ شام۔ اس کے دل میں اچھے دنوں کی خواہش سر سراتی ہے۔ ہونٹوں کی جنبش ان دونوں کو یاد کرتی ہے جب کسی کو کسی کی طلب تھی اور وہ قدم یاد آتے ہیں جو کسی کی تلاش میں اٹھے تھے۔ وہ گل پوش راہیں جن کے ساتھ کچھ دیر کو شاخ سے ٹوٹا ہوا پتہ لپٹ گیا تھا۔

کمرہ جس میں وہ بیٹھے ہیں اس کی محراب والی کھڑکی کے درمیان ایک لکڑی کا گول ڈنڈا کیلوں سے اس طرح ٹھونک دیا گیا ہے کہ کھڑکی سے دو کھڑکیاں بن گئی ہیں جن میں پرانے شہر کا منظر دو لخت ایک ٹکڑے میں سارا شہر اپنی عریانی چھپانے کی کوشش میں مزید عریاں ہوتا ہوا اور دوسرے حصے میں شہر کے جسم پر چمکتے لباس کی چکاچوند اور آنکھیں خیرہ۔

''میں نے سوچ لیا کہ اب ہمیں علیحدہ ہوجانا چاہیے۔''

''کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔''

''ہاں۔''

''تمہاری آنکھوں کی سرخی تمہارا ساتھ نہیں دے رہی۔ کیا تم اپنے فیصلے سے مطمئن ہو۔''

''پتہ نہیں..... اصل میں میری زندگی میں کہیں کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ کہیں کوئی خلا رہ گیا ہے جس کے باعث مجھے پتہ ہی نہیں چلتا کہ کہاں خوش ہونا ہے اور کہاں آنسو بہانے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میری ماں مجھ سے اور میرے زمانے سے بچھڑی تو کوئی بادل نہیں رویا اور نہ ہی میری آنکھیں تر ہوئی۔ ان آنکھوں کو اس لمحے کوئی آنسو موم نہ کر پایا۔''

''کیا تم اپنے دکھوں کو میری جھولی میں نہیں ڈال سکتے تھے۔''

''دیر ہوچکی..... یوں بھی یہ غم ایسے ہیں کہ کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا۔''

''دروازہ کوئی کھڑکی کھلی رہنے ہی نہ دی کہ کوئی اندر داخل ہوسکتا۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو..... آج ہمیں اپنی اپنی غلطیوں کو بان لینا چاہیے۔''

''کونسی غلطیاں۔''

''سب سے بڑی غلطی یہ کہ بیاہ ہوا مگر گھر نہ بن پایا۔ دوسرے عشق کے اندھے کنویں میں اپنی دل کے بجائے آنکھوں کو جلایا اور تیسری غلطی جس کے دو ننھے منے پاؤں بھی ہیں اور چلتے پھرتے دوڑتے بھاگتے پہلی دو غلطیوں کی ایک پھانس بن کر رہ گئی ہے۔'' وہ بڑے صبر و تحمل سے اس کی باتیں سنتی ہے جیسے اس کے مستقبل کو کسی ترازو میں تولا جارہا ہو لیکن تیسری غلطی کا ذکر اسے اندر ہی اندر جلا کر راکھ کردیتا ہے۔

''تم نے ہمارے بیاہ کو ایک غلطی کا نام دیا ہے۔ اس لیے کہ شادی کے بعد جینے کا حوصلہ دن بدن کم ہوتا گیا اور ہمیشہ یوں محسوس ہوا کہ کوئی چیز اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹتی چلی جارہی ہے۔''

''حوصلہ چیزوں سے نہیں انسانوں سے آتا ہے..... میرے اندر جینے کا بے پناہ حوصلہ ہے اور میرا تم سے وعدہ ہے کہ جب تک تم اور تمہارا بیٹا زندہ ہیں، میری آنکھوں کی پیاس مر نہیں سکتی اور میرا زندگی پر ایمان قائم رہے گا۔''

''میں اب بھی پیاسا ہوں..... یوں لگتا ہے کہ جیسے رنگوں کی چمک پہلے جیسی نہیں رہی۔ تعلق پھیکا پڑ گیا ہو۔ ہم پہلے جیسا تعلق کیوں نہیں قائم کرسکتے.....''

''یہ وقت کا جبر ہے۔ تعلق کوئی برف کی ڈلی نہیں کہ ذرا سی گرمی سے پگھل کر پانی پانی ہوجائے۔ اس کی اپنی شرطیں اور اپنی ضرورتیں ہوتی ہیں جو ہم پوری نہ کر پائے کہ خود کو اب بھی اکیلا محسوس کرتا ہوں۔''

''تو کیا ہم ایک دوسرے کے دل سے پوری طرح نکل پائیں گے۔''

''شاید ہاں.....''

''سوچ لو کہ گزرے موسم کے نقش کہیں نہ کہیں بول پڑتے ہیں۔''

''سوچ لیا۔''

''کیا.....؟''

''یہی کہ روایتی لاتعلقی۔ یعنی طلاق۔''

''مگر یہ لفظ میرے لیے ایک طعنہ ہے۔ مرد ذات کا دیا ہوا مکروہ لفظ ایک قانونی داغ۔ ہم اس لفظ کے بغیر بھی جی سکتے ہیں۔ میرے ماموں کی مثال سامنے ہے۔ وہ شخص اپنی بیوی سے گزشتہ ۱۵ سالوں سے ناراض اور لاتعلق ہے۔ ان برسوں میں ان کے گھروں میں کیا کچھ نہ ہوا۔ بیٹے بیٹیاں جوان ہوئے۔ شادیاں ہوئیں۔ میاں بیوی ان میں شریک ہوتے رہے لیکن ایک دوسرے سے لاتعلق۔ مگر ممانی نے طلاق نہ لی۔''

''یہ تعلق میری سمجھ سے باہر ہے۔ گھر بنیں مگر لوگ اجڑ جائیں۔''

وہ دونوں بت بنے بیٹھے تھے اور ان کے پاؤں ایک ایک انچ زمین میں دھنسے ہوئے۔ یہ کوئی اور ہی لمحہ تھا۔ اس سے پہلے جو لمحہ گزرا وہ میاں بیوی تھے مگر اب جیسے ان کے درمیان کوئی رشتہ کوئی تعلق ہی نہیں۔ مٹی کے دو الگ الگ وجود۔ کمرے سے باہر دو کھڑکیوں میں سے ایک تارا نظر آرہا تھا۔ پھر منظر دھندلا گیا اور زہر سے بھیگی ہوئی آوازیں شہر کے منظرنامے سے ابھر کر

انداز فکر

خلیل جبران کہتے ہیں کہ:

☆ سردی کی شدت میں وہ چبھن نہیں جو دوستوں کی بے رخی سے آتی ہے۔

☆ ہماری محبت اور سرد مہری ایسی ہے جیسے سمندر میں جوار بھاٹا۔

☆ روح آگ ہے اور جسم کی راکھ۔

☆ اقوال بے معنی ہیں جب تک عادت پر اثر انداز نہ ہوں۔

☆ جو زخم تمہیں دوسروں نے دیے وہ بھول جاؤ اور جو تم نے انہیں دیے وہ یاد رکھو۔ مصیبت کی شکایت سے پرہیز کرو کیونکہ اس سے خدا ناراض، دشمن خوش اور دوست غمگین ہوتا ہے۔

ایک دوسرے پر سپر امپوز ہونے لگیں۔

نکاح خواں کو بلاؤ۔ حق مہر زیادہ ہے۔ جہیز کتنا، عائلی قوانین، لڑکے کا بھاؤ کم کرو۔ لڑکی کا بوجھ کتنا۔ جنازہ جائز کراؤ۔ مگر کیسے۔ ان دونوں کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی وہ اپنے بارے میں اور اپنے بچے کے بارے میں سوچتے ہیں کہ مستقبل کا خوف ان کے پاؤں میں زنجیریں اور ہونٹوں پہ تالے لگا دیتا ہے۔ تب وہ ممیاتا ہے۔

''تم میں کوئی کمی تھی جو میری شخصیت کو تبدیل نہ کر پائیں۔ یا پھر میں تمہیں کچھ نہ دے پایا۔'' دونوں شک کے اندھیرے میں تیرتے ہوئے۔

وہ کھڑکی کے قریب ہوگئی۔ اندھیرے کے دریا میں ایک کشتی ہے اور اس کا ساحل کہیں غائب ہوگیا ہے۔

☆☆☆☆
ادب سے انتخاب
☆☆☆☆

معمولی سی بات

دانش کمال

دوسری صبح جب سورج نے اپنا چہرہ زمین
کی کناروں سے آدھا ہی نکالا تو میرے جی میں آئی کہ
ابھی اٹھ کر دفتر روانہ ہوجاؤں اور دراستے میں اس کے
گھر جاؤں' تاکہ اپنے ذہن میں اٹھتے ہوئے
سوالات کے جواب پاسکوں۔
مجھے اپنے غیر معمولی فیصلے پر تعجب ہوا'

ادب سے انتخاب ..... حساس دل گداز تحریر

وہ مجھے سلام کرکے اپنے گرد آلود جسم پر پھسلتے پسینے کے قطرے کی طرح تیزی سے دفتر سے نکل گیا۔ اس کی شخصیت میرے لیے معمہ بن گئی تھی' کیونکہ اس نے آپریشن جیسی معمولی بات کو بھی مسئلہ بنادیا تھا' میں مسئلے کے حل کی کوشش میں رات دیر تک جاگتا رہا اور اپنے ذہن کے گوشوں میں ابھرنے والے مختلف سوالات سے الجھتا رہا۔

اس نے تقریباً ایک گھنٹے تک مجھے بور کیا' کیونکہ وہ اپنی ہی کہے جارہا تھا' وہ یا تو بے وقوف تھا یا میری بات سمجھنا نہیں چاہتا تھا' لیکن اس کی باتوں سے ظاہر تھا کہ وہ بے وقوف نہیں تھا' ورنہ صرف اپنے فائدے کی باتیں کیوں کرتا۔

آج سے پہلے میں نے کبھی اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ دوپہر کے وقت جب بیشتر لوگ کھانے کے لیے چلے گئے تو میں بھی اٹھنے لگا۔ وہ اسی وقت دفتر میں داخل ہوا۔ اس نے ایک بوسیدہ سی' میلی کچیلی لنگی پہنی ہوئی تھی' درمیانہ قد' الجھے ہوئے بال' بڑھی ہوئی داڑھی اور گہرے حلقوں کے درمیان اندر کو دھنسی آنکھیں' یہ تھا اس کا حلیہ۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر لگتا تھا کہ بغیر شیشے کی ٹارچ لائٹ ہیں' چہرے سے ٹپکتی ہوئی خستہ حالی کی وجہ سے وہ جوانی میں ہی بوڑھا نظر آرہا تھا' اس کے میلے' گرد آلود جسم پر پسینے کے قطرے پھسلتے ہوئے اس کی صاف رنگت ظاہر کررہے تھے' خوشیوں کے ان لمحات کی طرح جو گزر کر اپنی یادوں کی لکیر چھوڑ جاتے ہیں' اس نے دفتر میں داخل ہوتے ہی مجھے سلام کیا اور میرے جواب دینے سے پہلے ہی آنے کا مقصد بتایا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی اور دل ہی دل میں خوش ہوا کہ شہر کا کم از کم یہ فائدہ تو ہوا کہ لوگ اب خاندانی منصوبہ بندی کی اہمیت کو سمجھنے لگے ہیں اور آپریشن کروانے خود کلینک آنے لگے ہیں۔ میں نے اخلاقاً اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا' لیکن جب مجھے احساس ہوگیا کہ وہ بیٹھنا نہیں چاہتا تو میں نے دریافت کیا کہ وہ کسی کے ساتھ آیا ہے یا تنہا۔

وہ کہنے لگا۔ ''میں اکیلا آیا ہوں اور مجھے پتہ ہے کہ یہاں مردوں کا آپریشن ہوتا ہے۔''

میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہا۔ ''یہاں مردوں کا ہی نہیں بلکہ عورتوں کا بھی'' ..... لیکن وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ''جی' جی ہاں' مجھے معلوم ہے کیونکہ میرے محلے کی دو عورتوں نے بھی یہاں سے آپریشن کروایا ہے اور انہیں ایک ایک ساڑھی بھی ملی ہے اور کچھ روپے بھی..... لیکن

میں اپنا آپریشن کروانا چاہتا ہوں۔''

میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔ جب اس نے اپنی بات مکمل کرلی تو میں نے اسے اطمینان دلایا کہ اس کا آپریشن ہوجائے گا اور دوبارہ اسے بیٹھنے کو کہا' تاکہ فارم پر اس کا نام و پتا لکھ کر دستخط لے لوں۔ میرے اصرار پر پہلے تو وہ جھکا' پھر سمٹ کر یوں بیٹھ گیا جیسے سخت سردی میں کسی نے اسے غسل دے دیا ہو' میں نے اس کا نام جاننے کے بعد رسمی طور پر اس سے پوچھا۔

''تمہاری عمر کتنی ہے۔ بچے کتنے ہیں۔''

''عمر اٹھائیس سال ہے اور تین بچے ہیں۔''

''تم اپنی مرضی سے آپریشن کروانا چاہتے ہو یا تمہیں کوئی بہکا کر یا لالچ دے کر یہاں لایا ہے۔'' وہ میرے سوال پر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

وہ کہنے لگا۔ ''نہیں صاحب' مجھے کسی نے کوچھ نہیں کہا ہے' میں خود ہی یہاں آیا ہوں۔ میں اکیلا ہی.....''

میں نے بات کاٹ کر اسے بیٹھنے کو کہا۔ وہ بیٹھ گیا اور پھر بولنے لگا۔

''میں اکیلا کمانے والا ہوں۔ کام بہت کم ملتا ہے اور ملتا بھی ہے تو آمدنی اتنی کم ہوتی ہے کہ اس سے گھر چلانا مشکل ہوجاتا ہے۔ آمدنی سے میرا پیٹ بھی مشکل سے بھرتا ہے۔ اس لیے سوچا کہ آپریشن کروالوں..... لیکن صاحب۔'' وہ ایک لمحے کے لیے رک گیا اور پھر عجیب انداز میں کہنے لگا۔

''جب میرا آپریشن ہوجائے گا تو مجھے لنگی کے بجائے ساڑھی چاہیے۔''

یہ ایک عجیب و غریب درخواست تھی۔ آج تک کسی امیدوار نے ایسی درخواست نہیں کی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے آنکھیں جھکالیں۔ مجبوری تھی' اس لیے میں نے اسے صاف صاف بتادیا کہ لنگی مردوں کو ملتی ہے اور ساڑھی عورتوں کو۔ وہ میری صاف گوئی سے کچھ پریشان ہوگیا اور اپنی میلی کچیلی لنگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''میری لنگی میرے پاس ہے' آپ مجھے ساڑھی دے دیجئے۔ صاحب' بڑی مہربانی ہوگی۔''

''ناممکن ساڑھی تمہیں نہیں مل سکتی۔''

وہ خوشامد بھرے لہجے میں بولا۔ ”آپ چاہیں تو مجھے کیسے نہیں ملے گی۔“

مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہوئی‘ لیکن میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم ساڑھی کے لالچ میں آپریشن کروا رہے ہو تو.....“

”نہیں صاحب! لالچ میں نہیں۔“ اس نے اپنی صفائی پیش کی۔

لیکن میں نے اس کی بات کاٹ دی اور اسے سمجھایا کہ پہلے میری بات سن لو اور میری دشواریوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں نے اسے صاف صاف بتایا کہ لنگی کے بجائے ساڑھی دینا آسان سی بات ہے‘ لیکن یہ معمولی سی بات بھی قانونی گرفت میں آسکتی ہے۔ اگر صرف مجھے جھوٹ بولنا پڑے تو کوئی بات نہیں‘ لیکن اپنے ساتھ ڈاکٹر اور چند دوسرے افراد کو بھی جھوٹ بولنے پر آمادہ کرنا بہت دشوار‘ بلکہ ناممکن ہے‘ کیونکہ چھوٹے چھوٹے جرم شاید ہر انسان کرتا ہے‘ تاہم وہ اپنے جرائم کو اسی طرح پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔ جیسے خون جسم میں پوشیدہ ہوتا ہے‘ لیکن اس نے میری کوئی بات نہیں سنی اور مجھے تنگ کرتا رہا۔ آخرکار میں نے جھلا کر کہا۔

”تم نے آپریشن کروانا ہے تو کراؤ‘ ورنہ یہاں سے چلے جاؤ۔ میرے پاس اتنا فضول وقت نہیں ہے کہ تم سے مغزماری کرتا ہوں۔“

وہ میرے ناراض ہونے پر سہم گیا اور آہستگی سے کہنے لگا۔ ”نہیں صاحب‘ مجھے آپریشن تو ضرور کروانا ہے‘ ساڑھی کی بات میں نے ایسے ہی کہی ہے‘ کیونکہ میرے پاس لنگی.....“

”میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں‘ لیکن میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ تمہارا کام میری بس سے باہر ہے‘ میں ساڑھی نہیں دے سکتا‘ تم خوامخواہ ضد کیے جا رہے ہو۔“

وہ خاموشی سے میری باتیں سنتا رہا۔ اسے چپ چاپ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ وہ میرا مسئلہ سمجھ گیا ہے‘ میں نے اسی لیے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ”دیکھو! اگر تمہیں واقعی ساڑھی کی ضرورت ہے تو تم لنگی بیچ کر ساڑھی خرید سکتے ہو۔“

”نہیں صاحب! لنگی بیچ کر ساڑھی خریدی نہیں جا سکتی۔“

”تمہیں لنگی کے ساتھ پندرہ روپے بھی ملیں گے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے..... لیکن۔“ وہ یہ کہہ کر رک گیا‘ پھر نہایت ہی سلجھے ہوئے انداز میں بولا۔ ”میں کیا آپریشن کے بعد فوراً چل‘ پھر سکوں گا۔ کیا محنت مزدوری کر سکوں گا۔“ اس کا سوال واقعی قابل غور تھا۔

میں نے اسی لیے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”تم چل پھر سکو گے‘ لیکن مزدوری نہیں کر سکتے۔ کم از کم تین دن تک آرام کرنا ہوگا۔“

”صاحب‘ ہم لوگوں کی قسمت میں آرام کہاں ہوتا ہے۔ روز کماتا ہوں تو گھر کا چولہا جلتا ہے۔ جس دن کام نہ ملے‘ فاقے ہوتے ہیں۔ اگر میں نے تین دن تک کام نہ کیا تو صاحب‘ سب لوگ بھوک سے مر جائیں گے۔“

”تمہارے خاندان میں کوئی اور کام نہیں کرتا۔“

وہ کہنے لگا۔ ”نہیں صاحب‘ اپنے خاندان میں واحد کمانے والا ہوں۔ ایک چھ سال کا چھوٹا بھائی ہے۔“

میں نے اسے مشورہ دیا کہ تم اپنی بیوی کا آپریشن کروا لو۔ وہ کہنے لگا۔ کہ میری بیوی ہرگز تیار نہ ہوگی۔ میں نے معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے کہا۔

”تم مسائل میں گرفتار ہو‘ لیکن آرام بہت ضروری ہے‘ آرام تو دراصل ایک ہفتے تک کرنا چاہیے‘ لیکن کم از کم تین دن تو بہت ہی ضروری ہیں۔“

وہ کہنے لگا۔ ”میں نے اسی لیے گزارش کی ہے کہ مجھے ساڑھی دے دیں۔“

اس بار مجھے بہت غصہ آیا اور میں اس پر برس پڑا۔

”تم نہایت ہی گھٹیا آدمی ہو۔ ہزار بار تمہیں بتایا ہے کہ ساڑھی نہیں مل سکتی۔ یہ کام میرے اختیار سے باہر ہے‘ لیکن تم ایک ہی رٹ لگائے ہوئے ہو..... مجھے تو اب تم پر شک.....“

”نہیں صاحب‘ شک کی کوئی بات نہیں۔“ وہ اپنے جملے پر زور دیتے ہوئے معذرت طلب انداز میں بولا اور پھر کہنے لگا۔ ”صاحب‘ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ معاف کر دیں اور میرا آپریشن کر دیں۔“

میں نے بے رخی سے کہا۔ ”نہیں‘ اب تمہارا آپریشن نہیں ہو سکتا۔“

”کیوں صاحب۔ مجھ سے کیا قصور ہوگیا۔“

”میں تمہارے گھر آدمی بھیجوں گا۔“

”آدمی کیوں۔“

”یہ میں بہتر جانتا ہوں۔“ میں نے اسے خاموش کر دیا اور پھر سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ”تمہارا گھر کہاں ہے۔“

”جی۔“ وہ چونک گیا‘ پھر دھیرے سے بولا۔ ”میرا گھر یا تو ہارا کالونی میں ہے۔“

میں نے مزید سوال کرنا مناسب نہیں سمجھا اور تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”تم اب جاؤ۔ کل میرا آدمی تمہارے گھر جائے گا۔ اگر ضرورت پڑی تو تمہیں بلوا لیا جائے گا۔“

میری باتیں غور سے سننے کے بعد اس نے لجاجت سے پوچھا۔ ”کیا اب میرا آپریشن نہیں ہوگا۔“

”ہوگا! لیکن پہلے میرا آدمی تمہارے گھر جائے گا۔“

”صاحب‘ کا ہے کو جائے گا۔“

”وہ پتا کرے گا کہ تم ہاتوہارا کالونی میں رہتے ہو یا نہیں اور تم نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے‘ وہ سچ ہے یا غلط۔“

”سولہ آنے سچ ہے‘ صاحب۔“ وہ یقین دلانے کے انداز میں بولا۔

لیکن میں نے اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا اور اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے آہستگی سے کہا۔ ”مجھے بھی یقین ہے۔ تم اب جاؤ۔ میں کل یا پرسوں تمہیں بلوا لوں گا۔“

اس نے کچھ نہیں کہا‘ خاموشی سے اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا‘ دو چار قدم چل کر کچھ سوچ کر واپس ہوا اور میری میز سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے مجھے دیکھا اور مجھے اپنی طرف دیکھتا ہوا پا کر نظریں جھکا لیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے‘ لیکن حوصلہ نہیں کر پا رہا..... مجھے اس سے الجھن ہو رہی تھی اور میں جلد از جلد اس سے چھٹکارا چاہتا تھا‘ میں نے اسی لیے خود ہی پوچھ لیا۔ ”کیا بات ہے۔ تم واپس کیوں آئے ہو۔“

”ج..... جی..... ایک بات کرنی ہے..... اگر آپ برا نہ منائیں۔“

میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”بتاؤ.....“

لیکن شاید اسے میرے مزاج پر اعتبار نہ رہا۔ وہ مزید تصدیق چاہتا تھا۔ ”سچ! آپ برا تو نہیں منائیں گے۔“

میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ مجھے خاموش پا کر اسے یقین ہوگیا کہ میں نے برا نہیں مانا تو مشینی انداز میں کہنے لگا۔

”کسی کو میرے گھر بھیجنے کی ضرورت ہے۔ آپ خود میرے گھر چلیے۔“

میں نے تلخی سے کہا۔ ”تمہارا کیا دماغ خراب ہے۔ میں کیوں جاؤں۔ کسی کے گھر جانا میرا کام نہیں ہے۔“

”اس میں حرج ہی کیا ہے۔“

میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”نہیں بھئی! میں نہیں جا سکتا گھر پر جانے کے لیے ہمارے پاس ہر علاقے میں کارکن ہیں۔ اتفاق سے تمہارے علاقے میں کارکن موجود نہیں ہے‘ ورنہ اس سے تمہیں ملا دیتا۔“

وہ ہاتھ جوڑ کر ملتجی انداز میں کہنے لگا۔ ”نہیں صاحب‘ کسی اور کو میرے گھر نہ بھیجئے۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ خود چلیں۔ حضور‘ میں نے آپ کا بہت وقت برباد کیا‘ لیکن حضور‘ کسی دوسرے کو مت بھیجئے۔“

مجھے اس کی باتیں عجیب سی لگیں۔ میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ جب وہ خاموش ہوا تو ماحول میں بھی چند لمحوں کے لیے خاموشی طاری ہوگئی۔ آخر مجھے اس سے ہمدردی ہوئی اور میں نے اس کی دل جوئی کے لیے رضامندی ظاہر کردی۔

”ٹھیک ہے‘ اب تم جاؤ میں کوشش کروں گا کہ.....“

”صاحب‘ کیا آپ ابھی چل سکتے ہیں۔“

”نہیں بھئی‘ ابھی میرے پاس وقت نہیں۔ کل کسی وقت.....“ میں نے اس سے وعدہ کرلیا‘ لیکن شاید اسے میری بات پر یقین نہیں آیا۔ یا پھر وہ فطری طور پر اپنی بات منوانے کا عادی تھا۔ فوراً ایک تجویز پیش کرتے ہوئے بولا۔

”آپ روزانہ میرے گھر کے قریب ہی سے گزرتے ہیں۔ آج شام کو گزرتے ہوئے کچھ دیر کے لیے میرے آجائیں۔“

”اوہ‘ تم چھ نمبر‘ باتوہارا کالونی میں رہتے ہو۔“ میں نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔ اس نے سر اثبات میں ہلا کر جواب دیا۔ لیکن شام کو میری اہم مصروفیات تھیں‘ میں نے تجویز رد کردی اور صبح آنے کا وعدہ کرکے اسے رخصت کردیا۔

وہ سلام کرکے تیزی سے دفتر سے نکل گیا‘ لیکن میرے ذہن پر ایک گہری لکیر چھوڑ گیا۔ بالکل اپنے گرد آلود جسم پر پھسلنے والے پسینے کے قطرے کی طرح۔ اس کی شخصیت میرے لیے معمہ بن گئی‘ جس نے آپریشن جیسی معمولی سی بات کو بھی ایک اہم مسئلہ بنادیا۔ میں اس کے حل کی جستجو میں رات گئے تک جاگتا رہا اور اٹھنے ذہن میں اٹھنے والے مختلف سوالات سے الجھتا رہا۔

دوسری صبح جب سورج نے اپنا چہرہ زمین کے کنارے سے آدھا ہی نکالا تو میرے جی میں آئی کہ ابھی اٹھ کر دفتر روانہ ہوجاؤں اور راستے میں اس کے گھر جاؤں‘ تاکہ اپنے ذہن میں اٹھتے ہوئے سوالات کے جواب پاسکوں۔ مجھے اپنے غیر معمولی فیصلے پر تعجب ہوا‘ تاہم میں جلد ہی تیار ہوکر اپنے گھر سے نکل پڑا۔ لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ میں نے اسے ساڑھے آٹھ بجے کا وقت دیا تھا۔ مجبوراً مجھے اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا اور میں ڈیڑھ گھنٹے تک گھر بیٹھے انتظار کی کٹھن گھڑی گزارتا رہا۔ وقت ہونے پر میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کردی۔

جوں ہی باتوہارا کالونی کا علاقہ شروع ہوا‘ میں نے موٹر سائیکل کی رفتار آہستہ کردی اور سڑک کے دونوں جانب موجود لوگوں کا جائزہ لیتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھتا گیا۔ گلی میں ملبوس ہر شخص مجھے وہ ہی لگتا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ میں کسی سے ملاقات کی غرض سے نہیں بلکہ اخبار میں کسی گم شدہ کی تصویر دیکھ کر اس کی تلاش میں نکلا ہوں۔ جلد ہی وہ مجھے نظر آگیا‘ وہ دور ہی سے مجھے دیکھ کر یوں ہاتھ ہلانے لگا جیسے خود بھی شدت سے میرا منتظر ہے۔

مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر انجانی خوشی دوڑ گئی‘ لیکن اس کی بجھی بجھی آنکھیں دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ وہ گزشتہ کل سے بھی زیادہ پریشان اور الجھا ہوا ہے۔

اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا‘ وہ انتہائی پرخلوص لہجے میں کہنے لگا۔ ”صاحب‘ آپ آگئے‘ آپ کی بہت بہت مہربانی۔“ وہ پھر دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ آم کا پیڑ دیکھ رہے ہیں۔ اس کے سامنے والی جھونپڑی کا دوسرا کمرہ میرا ہے۔“ میں نے خاموشی سے اس کی بات سنی اور اس کی طرف دیکھتا رہا‘ میری اس حرکت سے اسے غلط فہمی ہوگئی کہ اس کی بات پر مجھے یقین نہیں آیا۔

اس لیے میں نے اسے یقین دلایا کہ ”مجھے

یقین ہے کہ تم یہیں رہتے ہو‘ لیکن میں یہ جاننے کے لیے نہیں آیا کہ تم یہیں رہتے ہو بلکہ.....“

وہ میری بات کاٹ کر حیرت سے بولا۔ ”تو پھر آپ کیوں.....“

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں دراصل تمہاری بیوی سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ میری بات پر وہ چونکا اور گڑبڑا سا گیا‘ لیکن فوراً سنبھل کر بولا۔

”آپریشن میں نے کروانا ہے‘ میری بیوی سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ کسی کے سامنے نہیں آتی۔“

”ٹھیک ہے‘ میں اس کے سامنے نہیں جاؤں گا‘ صرف باتیں کرنی ہیں۔“

”وہ کسی غیر سے بات بھی نہیں کرتی۔“

”اگر یہ بات ہے تو تمہارا آپریشن بھی نہیں ہوگا۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میری بات سن کر وہ مرجھا سا گیا‘ کچھ دیر سر جھکائے کھڑا رہا اور پھر سوچ کر مجھے یاس بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے‘ بجھے بجھے انداز میں بولا۔

”اچھا‘ تو آیئے میرے ساتھ۔“

میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ ہم گندی نالیوں اور کیچڑ سے گزرتے ہوئے ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی تک پہنچ گئے‘ وہ مجھے باہر چھوڑ کر جھونپڑی میں داخل ہوگیا‘ قریب ہی چند عورتیں ایک نلکے کے گرد بیٹھی کپڑے دھونے اور برتن مانجھنے میں مصروف تھیں‘ چند عورتیں پانی لینے کے لیے کھڑی تھیں۔ ان عورتوں نے مجھے تعجب سے دیکھا اور آپس میں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد جھونپڑی میں سے تنگ دھڑنگ‘ گرد و غبار میں لپٹا ہوا چھ سال کا ایک بچہ نکلا اور مجھے دیکھتے ہی واپس اندر چلا گیا۔ وہ جیسے ہی اندر گیا‘ اس کی آواز آئی۔

”صاحب‘ اندر آجائیں۔“

میں نے ابھی قدم بھی نہیں بڑھایا تھا کہ اندر سے ایک سہمی سہمی سی نسوانی آواز آئی۔ ”کون ہے۔ تم اسے کاہے کو اندر بلا رہے ہو۔“

”پریشان نہ ہو‘ میرے صاحب ہیں۔“

”جو کوئی بھی ہے‘ اسے اندر نہ بلاؤ۔“

انداز میں مزاحمت تھی‘ تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ وہ شخص پھر باہر آیا اور ”آپ آیئے نا۔“ کہتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے گیا۔

کمرے کا منظر دیکھ کر مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک خوبصورت سی لڑکی ایسی میلی کچیلی پرانی ساڑھی پہنے کھڑی تھی جو بے شمار پیوندوں کے باوجود مختلف جگہوں سے پھٹی ہوئی تھی۔ جسم کے حصے ساڑھی کے پھٹے ہوئے حصوں سے جھلک رہے تھے۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی لڑکی پر عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس نے خوفزدہ انداز میں وہاں سے بھاگ جانا چاہا‘ لیکن تین گز لمبے چوڑے کمرے سے باہر نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں الٹے پاؤں چل کر ایک کونے میں سمٹ گئی۔ اس نے جلدی جلدی ساڑھی کے پھٹے ہوئے حصوں کو اپنے ہاتھوں سے چھپانے کی کوشش کی‘ لیکن جب اس نے تار تار ساڑھی کے ٹکڑے سے بازو چھپائے تو بازو برہنہ ہوگئے۔ جب وہ پھٹی ہوئی ساڑھی سے بیک وقت دونوں حصوں کو چھپا نہ سکی تو بے بسی کے عالم میں چیخ مار کر اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

میں غصے سے آگ بگولا ہوگیا۔ میں نے اس شخص کے چہرے پر زوردار طمانچہ مارا اور کہا۔ ”کمینے‘ ذلیل‘ تجھے شرم نہیں آتی۔“ یہ کہہ کر میں نے باہر نکلنے کے لیے قدم بڑھائے لیکن اس سے پہلے کہ میرے دونوں پاؤں جھونپڑی سے نکلتے‘ وہ میرے قدموں میں گر پڑا اور گڑگڑا کر کہنے لگا۔ ”صاحب‘ مجھے معاف کردیں صاحب‘ میں نے سب کچھ جھوٹ بولا تھا‘ مجھے معاف کردیں۔ مجھے ساڑھی بس اسی کے لیے چاہیے..... یہ میری چھوٹی بہن ہے۔“

☆☆☆☆
سچی کہانیاں
☆☆☆☆

الجھاؤ

ہما صفدر

عمران اور اس کی امی سے ملنے کے لیے میں اپنے کمرے سے باہر نہیں آنا چاہتی تھی پھر اس سے مل کر میں کرتی بھی کیا' وہ لوگ کوئی ڈھنگ کی بات کرتے بھی نہیں تھے عمران تو خاموش بیٹھ کر اپنی شرافت کا رعب ماما پر ڈالتا رہتا اور اس کی امی ماما سے ایسی ہی باتیں کرتیں جیسے وہ ہمارے برابر کی ہوں حالانکہ ان کی حیثیت ماما کی حیثیت سے بہت کم تھی۔

اس شمارے کی ایک حساس و دلگداز تحریر

پاپا میرے ساتھ ماما سے زیادہ درست انداز میں گفتگو کرتے تھے' یہی وجہ تھی کہ میں ماما سے زیادہ پاپا کے قریب تھی' میں اپنے دل کی ہر بات بہت آسانی سے بغیر کسی خوف کے ان سے کہہ دیتی تھی لیکن میں باوجود کوشش کے عمران کی بات ان سے نہیں کہہ سکی تھی۔ عمران میرے پاپا کے دوست کا لڑکا تھا اور پاپا کی یہ خواہش تھی کہ میں عمران کو اپنے شریک حیات کی حیثیت سے قبول کرلوں۔ عمران کے والد' پاپا کے بچپن کے ساتھی ہیں' وہ اور ان کے گھر والے اکثر ہمارے گھر آتے تھے اور پاپا کے کہنے پر ماما ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی تھیں۔ اپنے گھر والوں کے ساتھ عمران بھی ہمارے گھر آتا تھا۔ عمران میرے ساتھ ہی کالج میں رہا اور اب یونیورسٹی میں بھی ہم لوگ ساتھ ہی تھے لیکن میں کبھی یونیورسٹی میں بھی اس کو منہ نہیں لگاتی تھی کبھی آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو بات علیک سلیک سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ اکثر تو میں اسے نظر انداز ہی کر دیتی تھی اور کرتی بھی کیوں نہیں' اس کی میری حیثیت میں زمین اور آسمان کا فرق تھا' اس کے والد کا کپڑا کا کاروبار تھا لیکن زیادہ بڑا نہیں جب کہ میرے پاپا کپڑے کی ایک نہیں دو ملوں کے مالک تھے۔ ایک میں کپڑا تیار ہوتا تھا اور دوسرے میں صرف کاٹن پھر سرمایہ برداری میں میرے پاپا کی پچیسویں سیٹ ہے۔

سرمایہ دار برادری میں میرے پاپا نے شہر میں پچیسواں نمبر کیسے حاصل کیا' یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ پاپا اکثر کہتے تھے۔ ''میری مینا تم نہیں جانتیں میں نے یہ مقام کیسے حاصل کیا۔''

میں نے کبھی پاپا سے یہ سوال بھی نہیں کیا کہ وہ اس مقام تک کیسے پہنچے۔ مجھے ضرورت بھی کیا تھی' ہاں ایک بات میں نے سیکھی تھی یا میرے اندر خود سے تھی وہ یہ کہ کم حیثیت اور کم رتبہ کے لوگوں کو منہ نہ لگایا جائے سو میں کسی کم حیثیت بندے کو منہ لگانا اپنی توہین سمجھتی تھی پھر بھلا میں عمران جیسے کو کہاں منہ لگا سکتی تھی پاپا میرے مزاج سے خوب واقف تھے پھر بھی ان کا جھکاؤ عمران کی طرف تھا۔

''آخر عمران میں کیا برائی ہے۔'' ایک روز پاپا نے سوالیہ انداز میں میری طرف رخ کر کے پوچھا تھا۔ ماما بھی میرے ساتھ ہی بیٹھی تھیں' وہ بات تو ماما سے کر رہے تھے لیکن مخاطب میں تھی۔

''تم بتاؤ کیا برائی ہے عمران میں..... خوب صورت ہے' معاشیات میں ایم اے کر رہا ہے وہ اگر چاہے تو ایک سے ایک اچھی لڑکی اسے مل سکتی ہے۔''

''یہ اچانک آج آپ نے عمران کی بات کیوں شروع کر دی۔'' میرے کچھ کہنے سے قبل ہی ماما نے کہا۔

''بس یونہی اس کا خیال آ گیا۔'' پاپا نے رسمی لہجے میں کہا۔ ''آج ایک محفل میں زاہد علی سے ملاقات ہو گئی تھی تم تو جانتی ہو میرے اور زاہد کے تعلقات کیسے اور کتنے پرانے ہیں' ہم نے ایک ساتھ ہی عملی زندگی کا آغاز کیا تھا یہ الگ بات ہے کہ وہ زندگی کے عملی میدان میں مجھ سے پیچھے رہ گیا۔ پھر بھی وہ اتنا غریب نہیں ہے۔''

''ایک معمولی کپڑے کا تاجر غریب تو ہوتا ہی ہے پاپا۔'' میں نے ماما کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو وہ ہمارے مقابلے میں غریب تو ہے لیکن میرا خیال ہے کہ جس کا ہاتھ دبا ہوا ہوتا ہے وہ رشتہ دار بہتر ہوتا ہے اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ زاہد کی اور میری دوستی رشتے داری میں تبدیل ہو جائے۔''

''لڑکوں کی شادیوں کے وقت تو آپ نے یہ نہیں سوچا تھا۔'' ماما نے کہا۔

''وہ الگ مسئلے تھے اب اس بات کو مت چھیڑو تم اچھی طرح جانتی ہو۔''

''میں تو نہیں جانتی پاپا۔''

''تمہارا جاننا ضروری بھی نہیں۔'' پاپا نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ ''جو کچھ میرا ہے وہ میرے لڑکوں کا اور تمہارا تو ہے پھر شمشاد اور ارشاد میرے ساتھ کاروبار سنبھال رہے ہیں ان دونوں کی پسند کو میں ٹھکرا نہیں سکتا تھا۔''

''اور لڑکی کی پسند اور ناپسند کو آپ ٹھکرا دیں گے۔''

''کیا پسند ہے مینا کی اسے کوئی پسند ہوتا تو وہ میرے علم میں ہوتا۔ مینا مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتی۔''

''عمران اسے پسند نہیں ہے۔'' ماما نے

میری وکالت کی۔

''یہ بات مینا نے مجھ سے کبھی نہیں کی۔'' پاپا نے کہا۔ ''وہ تو صرف عمران کی حیثیت کی بات کرتی ہے اور میرا خیال ہے انسان کی حیثیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن وہ لوگ کبھی ہمارے برابر نہیں ہو سکتے اگر اتفاق سے وہ لوگ ترقی کریں گے تو ہم بھی ترقی کریں گے ان کے ہمارے درمیان جو آج فاصلہ ہے وہ برقرار رہے گا۔''

''ایک تو نسرین تمہیں بحث کرنے کی عادت شروع ہی سے ہے اور میرا مزاج بحث کرنے کا نہیں عمل کرنے کا ہے۔''

''میں جانتی ہوں آپ کے مزاج کو۔'' ماما نے کہا ان کے لہجے سے بیزاری جھلک رہی تھی۔ ''بہر حال اس بحث کو ختم کریں کھانا لگ گیا ہے کھانے کی میز پر چلتے ہیں۔ شمشاد اور ارشاد کی بیگمات کے سامنے عمران وغیرہ کی کوئی بات نہیں ہوگی۔''

''یہ تمہارا حکم ہے۔'' پاپا نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''حکم تو میں کبھی دیتی نہیں صرف بات کرتی ہوں۔'' ماما نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کھانے کی میز پر پاپا نے کوئی بات نہیں کی لیکن میرا خیال تھا کہ رات وہ میرے کمرے میں ضرور آئیں گے کیوں کہ عمران کی بات جب بھی ہمارے گھر میں چھڑ جاتی تھی' وہ رات سونے سے قبل میرے کمرے میں ضرور آتے تھے اور دیگر گفتگو کے بعد جاتے ہوئے یہ ضرور کہتے تھے عمران کے بارے میں اچھی طرح غور کرو وہ لڑکا اچھا ہے میرا خیال ہے تم اس کے ساتھ خوش رہو گی۔ میں نے اس فقرے کے جواب میں کبھی کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس روز کھانا کھاتے ہوئے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ پاپا نے آج اس بات کمرے میں آ کر کی تو میں صاف منع کر دوں گی۔

جب کھانے کی میز سے سب اٹھ گئے تو میں بھی اٹھ کر سیدھے اپنے کمرے میں گئی تھی اور بہت دیر تک پاپا کا انتظار کرتی رہی لیکن خلاف توقع وہ میرے کمرے میں نہیں آئے۔ رات بارہ بجے کے بعد ہی میں سو سکی تھی کیونکہ بار بار مجھے پاپا کی باتیں یاد آ رہی تھیں اور عمران میرے بے ترتیب خیالات پر چھایا ہوا تھا۔

صبح میں دیر سے جاگی تھی گھر میں کوئی مجھے جگاتا نہیں تھا اور ان دنوں یوں بھی یونیورسٹی بند تھی جب یونیورسٹی کسی وجہ سے بند ہوتی تو میں عموماً گھر میں رہتی' میرے کمرے میں ٹی وی' وی سی آر اور مختلف قسم کی فلمیں رکھی تھیں۔ پڑھنے سے زیادہ میں فلمیں دیکھتی تھی یوں بھی میرے کمرے میں کوئی آتا نہیں تھا اکثر میں انگلش فلمیں پسند کرتی تھی بھارت کی فلمیں بھی میں دیکھ لیا کرتی تھی لیکن ان میں مجھے زیادہ مزا نہیں آتا ایک جیسی کہانیاں ایک جیسے سین مجھے بالکل نہیں بھاتے تھے' اس کے باوجود بھی ہر نئی فلم کو ایک نظر ضرور دیکھ لیتی تھی۔

نہانے کے بعد ناشتا میں نے اپنے کمرے ہی میں کیا اور پھر ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر ٹی وی آن کیا اور تھوڑی دیر تک ڈش سے آنے والے پروگراموں کو چیک کرتی رہی اور پھر وی سی آر پر گیت مالا کی کیسٹ لگا دی' روشنی میں نہائے ہوئے کلب ہوٹلوں کے ہال اور ان میں تھرکتے ہوئے بدن مجھے بہت پسند تھے اس لیے میری کیسٹ لائبریری میں جو گیت مالا کی کیسٹ تھیں وہ اسی انداز کی تھیں' پرشور میوزک مجھے پسند تھا اور میں کمرے کا دروازہ کیڑ کیاں بند کر کے تیز آواز میں کیسٹ لگا دیا کرتی تھی اس روز بھی میں نے جو کیسٹ لگائی تھی اس کی تیز آواز میرے کمرے میں گونجنے لگی۔

''رات بھر جام سے جام ٹکرائے گا۔ جب نشہ چھائے گا تب مزا آئے گا۔''

جیسے جیسے گانا آگے بڑھ رہا تھا مجھ پر خود نشہ سا چھا رہا تھا میری نظریں ٹی وی پر ٹھہر سی گئی تھیں' کمرے میں تو میں تنہا تھی ہی لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بنگلے میں ہی نہیں تمام دنیا میں تنہا ہوں۔ میری تنہائی بھی عجیب تھی نفرت انگیز اور نشاط آمیز تنہائی کبھی اس تنہائی میں کوئی مخل ہوتا تو میرا جی چاہتا اسے کچا ہی چبا جاؤں۔

''نور بے بی!'' اس آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ بسم اللہ خالہ کی آواز تھی۔ ''عمران صاحب اور ان کی اماں آئی ہیں۔''

میں نے خالی خالی نظروں سے بسم اللہ خالہ کی طرف دیکھا اور پھاڑ کھانے والی آواز میں کہا۔ ''تو میں کیا کروں۔''

''اچھا غلطی ہو گئی جی۔'' بسم اللہ خالہ نے کہا۔ بسم اللہ خالہ ہماری بہت پرانی ملازمہ تھی کہتے ہیں اس گھر میں وہ ماما کے ساتھ ہی آئی تھی ستر سال سے زیادہ اس کی عمر تھی لیکن خاصی صحت مند تھی شکل سے پچاس سال کی لگتی تھی۔ وہ خود تنہا تھی اور ہمارے گھر ہی میں رہتی تھی۔ ماما نے مجھے ایک بار نہیں کئی بار بتایا تھا کہ ماما کی شادی سے پہلے ان کے ایک پرانے ملازم ابراہیم سے بسم اللہ خالہ کی شادی ہوئی تھی لیکن شادی کے صرف دو ہفتے بعد ہی ابراہیم اور بسم اللہ خالہ کی لڑائی ہو گئی اور ابراہیم نے بجلی کے ننگے تار کو پکڑ کر خود کشی کر لی اس خودکشی نے بسم اللہ خالہ پر اتنا اثر کیا کہ اس نے تمام عمر شادی نہ کرنے کا عہد کیا اور اس عہد پر قائم رہی۔

''تم بار بار غلطی کیوں کرتی ہو۔'' میں نے ٹی وی کی آواز کم کرتے ہوئے ہلکی آواز میں کہا۔ ''تمہاری پہلی ہی غلطی اتنی بڑی تھی کہ تمہیں پھر کوئی غلطی کرنی ہی نہیں چاہیے۔''

''پہلی غلطی کونسی جی۔'' بسم اللہ خالہ نے چہرے پر یتیمی طاری کرتے ہوئے کہا۔

''میں تمہارے اس سوال کا جواب بار بار دے چکی ہوں کہ تمہاری غلطی ہی نے ابراہیم کی جان لی تھی۔''

''ایسا نہیں ہے جی۔''

''اچھا نہیں ہے تو نہ سہی اب تم جاؤ۔''

''لیکن نور بے بی۔''

''او میں کچھ نہیں سن رہی بس جاؤ۔'' میں نے بسم اللہ خالہ کی بات کاٹ کر کہا۔ بسم اللہ خالہ میرے مزاج سے اچھی طرح واقف تھی اس لیے خاموشی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔

عمران اور اس کی امی سے ملنے کے لیے میں اپنے کمرے سے باہر نہیں آنا چاہتی تھی پھر اس سے مل کر میں کرتی بھی کیا' وہ لوگ کوئی ڈھنگ کی بات کرتے بھی نہیں تھے عمران تو خاموش بیٹھ کر اپنی شرافت کا رعب ماما پر ڈالتا رہتا تھا اور اس کی امی ماما سے ایسی ہی باتیں کرتیں جیسے وہ ہمارے برابر کی ہوں حالانکہ ان کی حیثیت ماما کی حیثیت سے بہت کم تھی۔ ماما خود بھی بڑے گھر کی تھیں اور بیاہ کر بھی اپنے سے بڑے گھر میں آئی تھیں اور عمران کی امی کا میکے اور شوہر کے گھر میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا ان کے والد بھی کپڑے کا کاروبار کرتے تھے اور میاں بھی کپڑا فروخت کرتے تھے لیکن وہ باتیں ایسی کرتی تھیں جیسے وہ کپڑے کے کئی کارخانوں کی مالک ہوں۔

''میں کہتی ہوں میرا گھر جنت سے کم نہیں تم تو جانتی ہو میں نے اپنی تین لڑکیوں کی شادی اتنی دھوم سے کی کہ پوری برادری حیرت زدہ رہ گئی حالانکہ میری ثریا شادی کے وقت کم عمر تھی میرے عمران سے چھوٹی ہے جب وہ گھر آئی ہے تو عمران کا جینا حرام کر دیتی ہے بس صبح سے شام تک کہتی رہتی ہے بس بھائی جان اب بھابی لے آئیں آپ تو شادی کے بعد بھی پڑھ سکتے ہیں ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے' شادی کے بعد

بھابی گھر سنبھال لیں گی اور آپ ابا کا کاروبار سنبھال لینا نوکری تو آپ کو ویسے بھی نہیں کرنی ہے۔"

عمران کی امی کو سوائے اس انداز کی باتیں کرنے کے اور کچھ آتا ہی نہیں تھا جب تک ماما ٹوک نہیں دیتیں وہ بولتی ہی چلی جاتیں۔ دو تین بار تو میں نے بھی بہت حیرت سے ان کی گفتگو سنی تھی اور پھر ایک روز یہ کہہ کر اٹھ گئی کہ آنٹی آپ کو سوائے اپنی بیٹیوں اور گھر کی تعریف کے کچھ اور بولنا آتا نہیں کیا۔ اس وقت پاپا بھی گھر میں تھے اور انہوں نے مجھے آنکھیں دکھا کر اپنے غصے کا اظہار کر دیا تھا اور میں محفل سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی ان کے جانے کے بعد پاپا نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ آدمی دولت اور حیثیت سے بڑا نہیں ہوتا عمر اور تجربہ سے بڑا ہوتا ہے وہ بہرحال تمہاری ماما سے بڑی ہیں تمہیں ان کا لحاظ اور ادب کرنا چاہیے۔

میں بہت دیر تک اس انداز میں سوچتی رہی اس عرصے میں معلوم نہیں کتنے گانے نکل گئے تھے' آخر میں نے وی سی آر اور ٹی وی بند کیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی کمرے سے باہر آ گئی۔ میرے قدم خود بخود ڈرائنگ روم کی طرف اٹھ رہے تھے۔ وہ سب لوگ ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"آؤ میری بیٹی آؤ میں تو سمجھ رہی تھی تم گھر پر ہی نہیں ہو۔" آنٹی نے مجھ پر نظر پڑتے ہی کہا۔

"تمہاری نور بھی بالکل میری ثریا کی طرح ہے وہ بھی گھر میں آنے والے ہر فرد سے بے نیاز اپنی دھن میں مگن رہتی تھی جب اس کا رشتہ آیا تو وہ ایسی ہی اپنے کمرے میں بیٹھی کتابیں' کتابیں کیا ناول پڑھ رہی تھی جیسے گھر میں کوئی آیا ہی نہیں جب میں نے اس سے کہا ثریا چائے لے کر ڈرائنگ روم میں آ جاؤ تو اس نے بے تعلقی سے کہا امی آپ یہ کام کسی اور سے نہیں کہہ سکتیں میں نے کہا بیٹی تمہارے رشتے کی بات لے کر عورتیں آئی ہیں تو پتا ہے اس نے کیا کہا تھا تو امی میں کیا کروں آنے دیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن میری نور ایسی نہیں ہے۔" ماما نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ تو کہتی ہے' میں دیکھ دکھا کر اپنی پسند سے شادی کروں گی۔"

"یہ بھی ٹھیک ہی کہتی ہے لیکن اس کے پاس وہ تجربہ کار آنکھیں نہیں ہیں نا جو میرے اور تمہارے پاس ہیں اس معاملے میں لڑکیوں سے زیادہ ہوشیار لڑکے ہوتے ہیں اس لیے میں نے اپنے عمران کی پسند پر ہاں کہہ دی ہے۔"

"کون ہے وہ جسے عمران نے پسند کیا ہے۔" ماما نے حسب عادت مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"آنٹی یہ بات بتانے کا ابھی وقت نہیں آیا۔" اپنی امی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی عمران نے کہا۔ وہ کن انکھیوں سے میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ "بہرحال بہت جلد اس کا وقت آ جائے گا اور امی سب سے پہلے آپ ہی کو بتائیں گی۔"

"ہاں یہ بات تو عمران ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" عمران کی امی نے کہا۔

ڈرائنگ روم میں جو گفتگو ہو رہی تھی وہ سراسر میری مرضی اور میرے ذہن کے خلاف ہو رہی تھی لیکن میں خود چل کے ڈرائنگ روم تک گئی تھی' اس لیے اٹھنا اور ڈرائنگ روم سے باہر نکل جانا کوئی اچھی بات نہیں تھی لیکن اس گفتگو کو برداشت کرنا بھی میرے مزاج کے خلاف تھا "آنٹی!" میں نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ "میری ایک دوست ہے' مرینا اس نے اپنی مرضی سے شادی کی اور بہت خوش ہے اور آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ وہ شخص اس سے عمر میں بہت بڑا ہے لیکن ادویات کے دو بڑے کارخانوں کا مالک ہے آج کل اتنی دولت ہے میری دوست

کے پاس کہ آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ ساس دولت سے وہ دنیا کی ہر خوشی خرید سکتی ہے۔"

"پھر تو میرا خیال ہے وہ ذہنی اور جسمانی سکون بھی خرید خرید کر ہی گزارا کرتی ہوگی۔" عمران نے کہا۔ اس کے لہجے میں جو طنز چھپا ہوا تھا اس کو میں نے شدت سے محسوس کیا۔

"دولت سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے سوائے سکون کے۔" وہ بولا۔

"میرے خیال میں ان سے بڑا بے وقوف دنیا میں کوئی نہیں ہوتا جو بغیر دولت اور حیثیت کے پرسکون رہتے ہیں۔"

"یہ تم دونوں نے کون سی باتیں شروع کر دیں۔" ماما نے مجھے جملہ پورا کرنے نہیں دیا۔ "تم اٹھو نور ذرا بسم اللہ آپا کو بھیج دو' یہ لوگ دوپہر کا کھانا کھا کر جائیں گے۔"

"نہیں آنٹی ہم لوگ کھانے تک نہیں رکیں گے!" عمران نے کہا۔ "اصل میں ہم لوگ ثریا کو دیکھنے جا رہے تھے امی نے کہا آپ راستے ہی میں ہیں آپ سے مل لیں تو میں انہیں لے کر یہاں آ گیا۔ اب ہم لوگ چلتے ہیں۔"

عمران اور آنٹی سے پہلے ہی میں ڈرائنگ روم کے باہر آ گئی تھی۔ ماما نے شاید انہیں بہت روکا ہوگا لیکن وہ لوگ رکے نہیں کھانے کے بعد میں دو گھنٹے تک اپنے کمرے میں لیٹی رہی اور پھر ماما سے کہہ کر فردوس کے گھر چلی گئی۔ فردوس میرے ساتھ ہی یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ اپنی کلاس کی تین چار لڑکیوں سے ہی میری دوستی تھی اور فردوس ان میں سے ایک تھی۔

فردوس رنگ و روپ' قد و قامت میں مجھ سے بہتر نہیں تھی لیکن اس کے چہرے پر اتنا نمک اور کشش تھی کہ مجھے وہ اچھی لگتی تھی جب وہ کسی بات پر خوش ہو کر قہقہہ لگاتی تھی تو ایسا لگتا جیسے وہ کوئی گونج دار اور مسرت آمیز نغمہ سنا رہی ہو۔

میں جب بھی اس کے گھر جاتی تو دو ڈھائی گھنٹے سے قبل میری واپسی ممکن نہیں ہوتی۔ فردوس میری طرح اپنے گھر کی واحد لڑکی تھی۔ میرے اپنے دو بھائی ہیں لیکن وہ پورے پانچ بھائیوں کی واحد بہن تھی میرے بھائیوں کی طرح اس کے چار بھائی بھی شادی شدہ تھے جب کہ اس کا ایک بھائی اس سے چار سال چھوٹا تھا۔ فردوس اپنے چھوٹے بھائی سے بہت محبت کرتی اس کا بھائی بھی اسے بہت چاہتا تھا ان دونوں کو دیکھ کر پتا نہیں کیوں مجھے اپنے بھائیوں کا خیال آتا اور میں الٹے سیدھے خیالوں میں ڈوب جاتی۔ مجھے معلوم تھا کہ ماما سے کہیں زیادہ محبت مجھ سے پاپا کرتے ہیں اس کے باوجود بھی جب میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام کر جاتی ہوں تو وہ مجھ سے ناراض بھی ہو جاتے ہیں ان کی ناراضگی تھوڑی دیر کی ہی ہوتی تھی لیکن وہ اپنی ناراضگی کی وجہ بتا کر اور یہ کام آئندہ نہ کرنے کی تاکید کر کے مجھ سے بات چیت کرتے تھے۔

جب عمران کی بات ہمارے گھر میں چلنے لگی تھی اس وقت سے پاپا کا رویہ کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ میں سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی کہ وہ مجھ سے ناراض ہیں کہ خوش اگر وہ ناراض ہوتے تو میرے کمرے میں ضرور آتے وہ میرے کمرے میں آتے نہیں رہے تھے اس کا مطلب صاف یہی تھا کہ وہ مجھ سے ناراض نہیں ہیں لیکن مجھ سے بات چیت کرتے ہوئے ان کا رویہ پہلے جیسا بھی نہیں تھا یہی بات مجھے شک میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔ جب میرا دل کچھ پریشان ہوتا تو میں کچھ دیر کے لیے فردوس کے پاس ضرور جاتی تھی۔ اس روز بھی میں کچھ پریشان تھی اس لیے فردوس کے گھر پہنچی تھی۔

"بہت دن بعد تمہیں میرا گھر یاد آیا۔" فردوس نے مجھ پر نظر پڑتے ہی کہا۔ "دو دن بعد تو یونیورسٹی کھل رہی ہے آج میرے گھر آنے کی ضرورت کیا تھی یونیورسٹی ہی میں ملاقات

ہو جاتی۔"

"یونیورسٹی میں وہ باتیں نہیں ہو سکتیں جو گھر پر ہو جاتی ہیں۔" میں نے اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ فردوس لان ہی میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن تم شاید پورے پندرہ دن بعد آئی ہو۔"

"یہ کون سی کتاب پڑھ رہی ہو۔" میں نے فردوس کی بات نظر انداز کر کے کہا۔ "دیکھوں تو۔"

"تمہیں تو پتا ہے مجھے سعادت حسن منٹو پسند ہے' یہ ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے 'گنجے فرشتے'۔"

"مجھے منٹو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو۔"

"تجھے کوئی پسند نہیں آتا۔" فردوس نے مجھے بات پوری نہیں کرنے دی۔ "تجھے تو وہ بھی پسند نہیں جو تیرے آگے پیچھے گھومتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو پھر اگر عمران صاحب حیثیت ہوتا تو مجھے ضرور پسند آتا۔" میں نے کہا۔

"ارے تو کسی صاحب حیثیت کو پسند کر لے۔"

"کوئی ٹکرائے تو۔"

"ارے تو کیا عمر بیت جائے گی تو ٹکرائے گا اگر ایسا ہی ہے تو' تو خود کسی سے ٹکرا جا۔"

"میں تمہاری طرح نہیں کر سکتی۔" میں نے زیر لب کہا۔

"اچھا تو تمہارا خیال ہے مثال سے میں ٹکرا گئی ہوں۔"

"تو اور کیا۔" میں نے سرگوشی کی۔ "بس اس کا دعوت میں تمہارے گھر آنا ہی تو غضب ہو گیا نہ وہ بے چارا تمہارے گھر آتا اور نہ پھنس جاتا۔"

چائے آنے تک اسی انداز کی گفتگو ہوتی رہی اور پھر فردوس نے اپنے محبوب کی باتیں شروع کیں تو میں اس کی ایک ایک بات توجہ اور دلچسپی سے سنتی رہی پھر جب اس نے یہ بتایا کہ یونیورسٹی سے فارغ ہوتے ہی اس کی شادی ہو جائے گی تو میں نے ایک آہ بھر کے وہی کہا جو کئی بار اس سے کہہ چکی تھی کہ ابھی تک میں اپنے محبوب کا انتخاب نہیں کر سکی ہوں کہ یونیورسٹی سے نکلتے ہی میری بھی شادی ہو جائے اس پر فردوس نے کہا کہ میں عمران کو گھاس ڈال دوں کیوں کہ اب ہمارے پاس عمر کم ہے چند سالوں بعد جوانی ہوا ہو جائے گی ایسی صورت میں کسی جیون ساتھی کا ملنا یوں بھی مشکل ہو جائے گا تھوڑی دیر بعد میں وہاں سے اٹھ گئی۔

بنگلے پر پہنچ کر میں سیدھے اپنے کمرے میں گئی اور بیڈ پر تھکے تھکے انداز میں لیٹ گئی۔ میری آنکھیں بند تھیں لیکن ذہن چل رہا تھا اور میری یادداشت کے دریچے ایک ایک کر کے کھل رہے تھے۔ میں شاید ایک گھنٹے سے بھی زیادہ آنکھیں بند کر کے لیٹی رہی اور ماما' پاپا شمشاد بھائی ارشاد بھائی وغیرہ کے رویے پر غور کرتی رہی پھر اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ گھر میں شاید میں صرف پاپا کی بیٹی ہوں ماما' صرف ماما ہیں' ارشاد اور شمشاد بھائی بھی برائے نام بھائی ہیں اس نتیجے پر پہنچ کر شاید زندگی میں پہلی بار مجھے دکھ کا احساس ہوا تھا اور میری سدا کی خشک آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"بے بی آپ کی ماما کہہ رہی ہیں کب تک آپ کمرے سے باہر آ جائیں گی۔" بسم اللہ خالہ نے دروازے ہی میں سے کہا۔

جب میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو پھر بسم اللہ خالہ کی آواز آئی۔

"آپ جاگ رہی ہیں نا بے بی۔"

"ہاں تم کمرے میں آ جاؤ۔" میں نے آہستہ آواز میں کہا۔

جب بسم اللہ خالہ کمرے میں آ گئیں تو اس سے کہا۔

"فرمایئے۔"

"بیٹھ جاؤ۔" میں نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "خالہ تم تو ماما کی بہت پرانی ملازمہ ہو کیوں۔"

"بے بی یہ کونسی پوچھنے والی بات ہے۔"

"ہے تو واقعی نہیں لیکن پھر بھی میں پوچھ رہی ہوں۔" میں نے کہا۔ "ایک بات بتاؤ۔"

"پوچھو بے بی۔"

"کیا میں واقعی شمشاد اور ارشاد بھائی کی بہن ہوں۔"

بسم اللہ خالہ نے تھوڑی دیر تک تو کوئی جواب نہیں دیا اور پھر آواز دبا کر بولی۔ "بے بی آپ نے پہلے تو کبھی یہ سوال نہیں کیا۔"

"پہلے میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔"

"اپنی ماما سے پوچھیں۔" بسم اللہ خالہ نے کہا۔ "جس کی ماں زندہ ہو اسے دوسرے سے سوال کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔"

"ماما سے بھی میں نے کئی بار پوچھا لیکن وہ کہتی ہیں کیا پاگل ہو گئی ہو۔"

"ویسے بے بی آپ یہ سوال کرتی کیوں ہیں۔"

"اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔" میں نے بیڈ سے نیچے آتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہی میں ماما کے پاس بیٹھی تھی۔ میں چاہتی تو ایک بار پھر سوال کر سکتی تھی کہ کیا میں واقعی ان کی بیٹی اور شمشاد اور ارشاد بھائی کی بہن ہوں لیکن میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ ماما نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"جب تم فردوس کے گھر گئی تھیں تو عمران کی ماں اکیلی ہی یہاں آئی تھی۔"

"پھر ماما میں کیا کروں۔"

"یہ تو تمہارے پاپا بتائیں گے کہ تمہیں کرنا کیا ہے ویسے عمران کے گھر والے اب رشتہ لے کر آ رہے ہیں۔"

"آپ انکار کر دیں ان سے کہہ دیں کہ میں اپنی لڑکی کو کسی صاحب حیثیت خاندان میں۔"

"یہ میں نہیں کہہ سکتی۔"

"کیوں۔"

"اس لیے کہ تم پر ان کا حق ہے۔ آج سے بیس سال پہلے ہی انہوں نے تمہیں مانگ لیا تھا اور تمہارے پاپا نے زبان دے دی تھی۔"

"یہ بات تو میری مرضی کے خلاف ہے پھر میں عمران کے گھر میں خوش بھی نہیں رہ سکوں گی۔ وہ عملی زندگی میں آ کر کیا کما لے گا دس بارہ ہزار روپے اتنا تو میرا جیب خرچ۔"

"یہ کیوں سوچتی ہو تم۔" ماما نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"کیا ہم لوگ مر گئے ہیں۔ تمہارے ذاتی اخراجات میں بھی تو پورے کر سکتی ہوں۔"

"صرف اخراجات کی بات نہیں ماما۔" میں نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ "طبقے اور حیثیت کی بات بھی ہے آپ خود سوچیں ہم کہاں اور عمران کے گھر والے کہاں۔"

"عمران کے والد زاہد علی سے تمہارے پاپا کے بہت پرانے اور گہرے تعلقات ہیں۔ تمہارے رشتے کے سلسلے میں وہ بھی آئیں گے اور تمہارے پاپا انکار نہیں کر سکیں گے۔"

"اور آپ..... آپ تو انکار کر سکتی ہیں۔"

"شاید میں بھی انکار نہ کر سکوں۔" ماما نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔ "عمران کے والد اور والدہ کے احسان تلے میں بھی دبی ہوئی ہوں۔"

"میں کچھ سمجھی نہیں ماما۔"

"تمہیں سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں بس جو کہا جا رہا ہے اسے مان لو۔" ماما نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

ماما کے اس فیصلے کے بعد ان کے قریب بیٹھنا میرے لیے مشکل تھا میں وہاں سے یہ سوچ کر اٹھ گئی کہ پاپا رات آئیں گے تو ان سے میں صاف صاف الفاظ میں انکار کر دوں گی۔ اس روز میرا کہیں جانے کا پروگرام بھی نہیں تھا اس لیے میں لان کی طرف چلی گئی تاکہ کچھ وقت لان میں گزارا جائے میرے ذہن میں مختلف سوالات گردش کر رہے تھے اور میں ذہنی طور پر پریشان بھی تھی لان میں تنہا وقت گزارنا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں اکثر کوئی کتاب اٹھا کر لان میں چلی جاتی اور پھر دو ڈھائی گھنٹے سے پہلے نہیں اٹھتی تھی۔ آج میرے ہاتھ میں کتاب نہیں تھی مگر وقت گزارنے لان ہی کی طرف جا رہی تھی۔

بڑے سے لان کے قریب پہنچ کر میں نے جگہ کا انتخاب کیا اور پھر ایک کرسی اٹھا کر اس جگہ بیٹھ گئی۔ یہ جگہ ایسی تھی کہ یہاں بیٹھ کر انسان کا تعلق بنگلے اور گیٹ سے بالکل کٹ جاتا تھا کیوں کہ یہاں سے نہ بنگلے کا کوئی حصہ نظر آتا تھا اور نہ بیرونی گیٹ سے آنے والوں کی نگاہ اس طرف پڑ سکتی تھی۔ ایک طرح سے یہ گوشہ عافیت تھا میں نے گردن کرسی کی پشت سے ٹکا دی اور آنکھیں بند کر کے ذہن میں الجھی ہوئی بہت ساری گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

وقت کے گزرنے کا احساس مجھے بالکل نہیں ہو رہا تھا۔ جب میں بسم اللہ خالہ کی آواز پر چونکی تو مجھے علم نہیں تھا کہ میں یہاں کتنی دیر سے بیٹھی ہوں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بہت دیر سے مجھے تلاش کر رہی ہے سارا بنگلہ دیکھنے کے بعد وہ بس اتفاق ہی سے لان کی طرف نکل آئی تو میں اسے نظر آ گئی۔

''کیا بات ہے تم کیوں مجھے تلاش کر رہی ہو۔'' میں نے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ماما نے بلایا ہے۔''

''نہیں عمران صاحب آئے ہیں۔''

''عمران!'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''تو پھر میں کیا کروں۔''

''وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' بسم اللہ خالہ نے کندھے اچکا کر کہا اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ نہیں جانتی عمران کیوں آیا ہے۔

''ماما کہاں ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

میرے اس سوال کا جواب بسم اللہ خالہ نے بتایا کہ پہلے عمران ماما سے ملا اور پھر مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ابھی وہ مجھے بتا ہی رہی تھی کہ عمران پر میری نگاہ پڑ گئی وہ میری ہی طرف آ رہا تھا۔ میرے ساتھ ہی بسم اللہ خالہ نے بھی اسے دیکھ لیا۔ ''وہ ادھر ہی آ رہے ہیں۔''

''تم میرے پاس ہی رکنا اس کے آنے کے بعد بھی جانا نہیں۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''یہ اچھی مصیبت ہے پتا نہیں کیوں آ رہا ہے۔''

عمران میرے قریب آ کر رک گیا۔ وہ کئی بار پہلے مجھ سے تنہائی میں مل چکا تھا۔ گھر تو وہ اکثر آتا تھا اور یونیورسٹی میں تو تقریباً روز ہی اس کا میرا سامنا ہوتا تھا۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ یونیورسٹی کی کئی لڑکیاں اس میں دلچسپی لیتی تھیں وہ کسی کے قریب ہونے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔

تھوڑی دیر تک عمران نے کچھ نہیں کہا تو میں نے خود ہی پوچھ لیا۔ ''سنا ہے تمہیں میری تلاش تھی۔''

''اسی لیے پہنچ بھی گیا تمہارے پاس۔'' عمران نے بسم اللہ خالہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو آنٹی بلا رہی ہیں۔'' اس نے خالہ ہی سے کہا۔

''خالہ میرے ساتھ ہی جائے گی۔ تم بتاؤ کیا بات ہے۔''

''کچھ باتیں نجی نوعیت کی ہوتی ہیں۔'' عمران نے رک رک کر کہا۔ ''میں خالہ کے سامنے کرنا نہیں چاہتا پھر تم ہی نہیں سارا گھر جانتا ہے کہ

میں شریف۔''

''مجھے تمہاری شرافت سے غرض نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں غرض ہے یا نہیں میں خود بھی اس سلسلے میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا۔'' عمران نے کہا۔ ''بہرحال جو باتیں میں تم سے کرنا چاہتا ہوں اس سے خالہ اچھی طرح واقف ہیں' اس کے باوجود بھی میں پردہ رکھنا چاہتا تھا اگر تم نہیں چاہتی ہو تو ان کے سامنے ہی کر دیتا ہوں۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو۔''

''یہی کہ اب میری امی تمہارے گھر رشتے کی بات کرنے نہیں آئیں گی۔''

''یہ بات تو تم ماما سے کر سکتے تھے۔''

''کر دی' ان کے کہنے پر ہی میں تمہیں بتانے آیا ہوں۔ اب تم شوق سے اپنی حیثیت کا جیون ساتھی تلاش کر سکتی ہو۔''

''مجھے اس انداز کی باتیں پسند نہیں ہیں۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اپنی حیثیت میں رہ کر بات کرنے کی عادت ڈالو۔ انسان کو اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہیے۔''

''بالکل ٹھیک کہا تم نے' میں جانتا ہوں جو لوگ اپنی اوقات نہیں پہچانتے انہیں بعد میں پچھتانے کا وقت بھی نہیں ملتا۔''

اس سے پہلے کہ عمران کچھ کہتا میں کرسی سے نہ صرف اٹھ گئی بلکہ بسم اللہ خالہ کو ساتھ چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بنگلے کی طرف بڑھ گئی۔ میرا خیال تھا کہ عمران میرے ساتھ ساتھ چلے گا لیکن وہ نہیں آیا میں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ بسم اللہ خالہ نے چلتے چلتے ہی مجھے بتایا کہ وہ بیرونی گیٹ کی سمت گیا ہے۔

میں سیدھے اپنے کمرے میں گئی تھی۔ بسم اللہ خالہ کمرے کے دروازے تک تو میرے ساتھ ساتھ ہی تھی لیکن میں جب کمرے میں داخل ہوئی تو وہ شاید ماما کے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔

رات کے کھانے تک میں کمرے سے باہر نہیں آئی تھی میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ ماما نے عمران کے ذریعے مجھے کیوں کہلایا تھا کہ اس کی امی رشتے کی بات کرنے نہیں آ رہی ہیں بہت دیر تک اس بارے میں غور کرتی رہی لیکن بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ یہی نہیں کئی باتیں اور بھی تھیں جن پر میں غور کر رہی تھی۔ ماما اور پاپا صرف عمران میں کیوں دلچسپی لے رہے ہیں شمشاد اور ارشاد بھائی کا میرے ساتھ غیروں جیسا رویہ کیوں ہے پھر عمران کی امی بار بار یہ کیوں کہتی ہیں کہ مینا تو ہے ہی ہماری آج نہیں تو کل اسے ہمارے ہی گھر جانا ہے۔ ماما نے کبھی آنٹی کی اس بات کا نہ برا مانا اور نہ کبھی انہیں ایسی بات کرنے پر ٹوکا۔ پھر پاپا نے جب بھی کی عمران کی طرفداری کی۔ وہ ہمیشہ عمران کے گھر والوں کی حیثیت کو نظر انداز کرتے ہیں جب کہ انہیں میرا رشتہ کسی اپنے سے بڑے اور صاحب حیثیت خاندان میں کرنے کی سوچنا چاہیے سچ تو یہ ہے کہ کبھی ماما اور پاپا کو میرے رشتے کی تلاش ہی نہیں رہی۔ انہوں نے جب بھی بات کی عمران کی بات کی۔ پاپا تو بس عمران کے ابوزاہد علی کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔

میں اپنے کمرے میں لیٹی رات کے کھانے تک ان مسئلوں کے بارے ہی میں غور کرتی رہی۔ رات کے کھانے کے بعد پاپا میرے کمرے میں آئے ان کے کمرے میں آنے پر مجھے حیرت نہیں ہوئی کیوں کہ وہ اکثر آتے تھے' پاپا میرے برابر ہی تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ میں نے خود بھی کچھ نہیں کہا۔

''میں بہت دیر سے غور کر رہا ہوں لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ زاہد کی بیوی نے رشتے کے سلسلے میں آنے سے کیوں انکار کر دیا۔'' پاپا کا لہجہ تشویشناک تھا۔ ''آخر وجہ کیا ہوئی۔''

''یہ اتنی تشویشناک بات نہیں ہے پاپا۔''

میں نے کہا۔ ''ممکن ہے انہوں نے سوچا ہو کہ وہ اتنے بڑے گھر میں بات کیسے ڈالیں' آپ کے اور میرے انکار کا بھی تو انہیں خطرہ ہوگا۔''

''زاہد اور اس کی بیوی اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں انکار نہیں کروں گا۔''

''میں یہ تو نہیں جانتی کہ انہیں آپ کی طرف سے اتنا اعتماد کیوں ہے لیکن کیا پاپا آپ میری مرضی کے خلاف ہاں کر دیتے۔''

''حامی تو ہم نے برسوں پہلے بھر دی تھی۔'' پاپا نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''مسئلہ صرف میری زبان کا نہیں اور بھی کئی باتیں ہیں۔''

''لیکن پاپا۔''

''میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں مینا!'' پاپا نے میری بات کاٹ کر کہا۔

میں نے پاپا کی طرف حیرت سے دیکھا لیکن خاموش ہی رہی پاپا نے جو کہانی سنائی وہ زیادہ طویل نہیں تھی۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے پڑوس میں ایک عورت رہتی تھی۔ جس کا شوہر ایک حادثے میں مر گیا۔ جس وقت وہ شخص ہلاک ہوا اس وقت اس کی بیوی بھی اسپتال میں تھی۔ اس نے ایک لڑکی کو جنم دیا اور پھر جیسے ہی اسے اپنے شوہر کے مرنے کی خبر ملی وہ خود بھی اسی وقت مر گئی جس وقت وہ عورت مری اس وقت اس کے برابر لیٹی وہ نوزائیدہ بچی صرف چار گھنٹے کی تھی۔ اسپتال میں اس عورت کے ساتھ عمران کی ماں تھیں اور تمہاری ماما خود بھی اس اسپتال میں تھیں اور اپنی لڑکی کی پیدائش کے بعد بے ہوش پڑی تھیں پھر جب انہیں ہوش آیا تو ڈاکٹروں نے ان کی زندگی کی ضمانت دینے سے انکار کر دیا کیوں کہ وہ لڑکی کے لیے تڑپ رہی تھیں انہیں پتا نہیں تھا کہ لڑکی مردہ پیدا ہوئی ہے۔''

''بہر حال جب تمہاری ماما اسپتال سے گھر آئیں تو ان کی گود میں لڑکی تھی۔'' پاپا نے بات ختم کرتے ہوئے کہا اور میرے قریب سے اٹھ گئے۔

پاپا کے جانے کے بعد میں نے اس کہانی پر ذرا سا غور کیا تو ساری کہانی مجھے اپنے ہی گرد گھومتی لگی اس کا مطلب یہی تھا کہ میں بہت چھوٹے باپ کی بیٹی تھی یہ سب سوچ کر مجھے یوں لگا جیسے میں آسمان سے زمین پر گر گئی ہوں گویا ماما نے مجھے اپنی بیٹی بنا کر پالا اور..... اور شمشاد اور ارشاد میرے سگے بھائی نہیں ہیں ماما اپنے بیٹوں ہی کی وجہ سے شاید بعض اوقات مجھ سے ناراض ناراض سی رہتی ہیں۔ میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ زندگی کے بیس بائیس سال میں نے اس گھر میں گزار دیے تھے اور مختلف لوگوں کے رویے اور گفتگو سے بھی میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ میں اس گھر کی اصل فرد نہیں ہوں۔ صرف پاپا اس گھر میں ایسے تھے جن کا رویہ اور محبت ایک جیسی ہی تھی انہوں نے کبھی میری کسی خواہش کی تکمیل میں نہ دیر لگائی اور نہ منہ بنایا۔ بس جب عمران کا مسئلہ گھر میں چھڑ گیا تو کبھی کبھی انہوں نے میرے رویے پر ناراضگی کا اظہار کیا وہ بھی ایسے کہ ان کی ناراضگی کو سوائے میرے گھر میں دوسرا کبھی نہیں سمجھ سکا۔

''اب..... اب کیا ہوگا۔'' میں نے انتہائی کرب کے عالم میں سوچا۔ کیا اب میں اسی انداز میں اس گھر میں رہ سکوں گی جس انداز سے رہتی تھی۔ میرے غرور میری تمکنت اور میرے طمطراق کا کیا بنے گا۔ یہ ایسے سوالات تھے جن پر غور کرتے کرتے میرا سر پھٹنے لگا۔ یہ..... یہ عمران نے رشتے سے انکار کیوں کر دیا اسے تو سب پہلے ہی سے معلوم تھا اس نے بھی اپنی امی کی طرح دبے دبے لفظوں میں حقیقت کا اظہار کیا' یہ الگ بات ہے کہ میں سمجھ نہیں سکی۔ پھر..... پھر اس کے انکار کی وجہ' وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ اس سوال پر غور کرتے کرتے صبح ہو گئی میں نے بیڈ پر اتنی کروٹیں لی تھیں کہ بیڈ کی چادر اور تکیوں کا بیڈ پر پتا ہی نہیں

تھا وہ سب نیچے پڑے ہوئے تھے۔

صبح کمرے سے باہر نکلنا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا کمرے سے نکلنا اور گھر کے ہر فرد کا سامنا تو مجھے بہر حال کرنا تھا میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی سوچ سوچ کر میرے دماغ میں درد ہو رہا تھا رات جاگ کر گزارنے سے صورت پر بھی پھٹکار پڑ رہی ہوگی شیشے میں اپنا چہرہ دیکھنے کی بھی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ کمرے سے باہر آنے کی ہمت بھی میں خاصی دیر میں کر سکی تھی کمرے سے باہر آنے کے بعد سب سے پہلے میری نگاہ ماما پر پڑی انہوں نے ہر روز کی طرح اس روز بھی مسکرا کر استقبال کیا تھا میرے خیال میں انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

''آپ تھوڑی دیر اور کمرے سے باہر نہیں آتیں بے بی تو میں آپ کا ناشتا لے کر کمرے ہی میں آ جاتی۔'' بسم اللہ خالہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ میرے پیچھے تھیں۔

''ہاں مینا تم کمرے ہی میں ناشتا کر لو۔'' ماما نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہم سب نے ناشتا کر لیا ہے۔ کیا بات ہے آج تم بہت دیر سے جاگی ہو۔''

ماما کے رویے اور گفتگو میں جب مجھے کوئی فرق نظر نہیں آیا تو مجھے حیرت تو ہوئی لیکن فوراً ہی یہ خیال بھی آیا کہ شاید ہمیشہ کی طرح اس بار بھی میری اور پاپا کی گفتگو کا کسی کو پتا ہی نہیں ہے چند لمحے غور کرنے کے بعد میں نے بسم اللہ خالہ کو ناشتا کمرے ہی میں لانے کا اشارہ کیا اور کسی سے بغیر کچھ کہے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اب مجھے ایک اطمینان سا تو ہوا لیکن یہ سوچ سوچ کر میں اندر ہی اندر کٹنے لگی کہ میرے بارے میں گھر کا تقریباً ہر فرد واقف ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی بھی صاف صاف نہیں کہتا چونکہ شمشاد اور ارشاد بھائی بھی حقیقت سے واقف ہیں اس لیے ان کی بیویوں کو بھی کچھ نہ کچھ نہیں تو بہت کچھ معلوم ہوگا یوں بھی بھابیاں مجھ سے کم ہی بات کرتی تھیں۔

- مجھے اپنے کمرے میں گئے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ بسم اللہ خالہ ناشتہ لے کر آ گئی۔ جب وہ ناشتے کی ٹرے رکھ کر جانے لگی تو میں نے کہا۔ ''کوئی ضروری کام تو نہیں کر رہی ہو۔''

''نہیں بے بی صبح کا ہر کام تو ہو گیا۔ اب دوپہر ہی کا کرنا ہے۔ پھر بڑی بیگم کے گھر میں کوئی ہے بھی نہیں۔''

مجھے پتا تھا کہ بھابیاں اکثر شاپنگ وغیرہ کو چلی جاتی تھیں اس کے باوجود میں نے پوچھ لیا۔ ''کہاں گئے سب۔''

''شاید کچھ خریداری کرنی تھی۔''

''خیر تم بیٹھ جاؤ۔'' میں نے کپ میں چائے نکالتے ہوئے کہا۔ جب سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بسم اللہ خالہ بیٹھ گئی تو میں نے پوچھا۔ ''تم بتاؤ میرے ماں باپ کون تھے۔'' میرے اس سوال کا جواب دینا شاید اس کے لیے مشکل تھا۔ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ میں نے کہا۔ ''مجھے پتا ہے تم ہر بات جانتی ہو بتاؤ۔ کون تھے میرے ماں باپ۔''

''بڑے صاحب کچھ نہیں کہیں گے انہوں نے ہی مجھ سے کہا کہ میں تم سے پوچھ لوں۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

''آپ کی جو ماں تھیں' وہ عمران کی امی کی سگی بہن تھیں۔'' بسم اللہ خالہ نے کہا۔ ''اور والد..... والد ٹیکسی ڈرائیور تھے۔ جب وہ ایک حادثے میں مرے ہیں تو۔''

''اتنے عرصے میں تم نے یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی۔'' میں نے اسے جملہ پورا کرنے نہیں دیا شاید یہ فقرہ بھی میں نے اپنی سبکی اور شرمندگی کو مٹانے کے لیے کہا تھا۔

''ایک تو مجھے اجازت نہیں تھی پھر گھر میں کوئی کچھ کہتا ہی نہیں تھا تو پھر میں کیسے کہتی۔''

میں نے بہت کوشش کی کہ اس سے مزید سوال کروں لیکن میری زبان نے میرا ساتھ نہیں

دیا' میری خاموشی شاید بسم اللہ خالہ کو بھی گراں گزر رہی تھی وہ بھی بغیر کچھ کہے کمرے سے نکل گئی۔ میں نے جیسے تیسے ناشتا کیا اور اپنی خفت' شرمندگی اور سبکی مٹانے کے لیے کمرے سے نکل کر گیراج کی طرف گئی سوچا یہی تھا کہ کار نکال کر کہیں جائے پناہ ڈھونڈوں لیکن گیراج میں جا کر اپنی کار کے قریب بہت دیر تک کھڑی رہی کار کو ہاتھ لگانے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ ''یہ کار..... یہ کار تو اب میری نہیں ہے۔'' میرے ذہن سے بار بار یہی آواز آرہی تھی معلوم نہیں کتنی دیر بعد میں گیراج سے نکل کر اپنے کمرے میں آگئی یہ کمرا ہی نہیں بنگلے کی ایک ایک چیز مجھے اجنبی لگ رہی تھی۔

میرا دن کا چین اور راتوں کی نیندیں تباہ ہوگئی تھیں۔ شاید دس دن میں بڑی مشکل سے کاٹے اور پھر ایک رات گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا مگر صبح میں اپنے فیصلے پر عمل نہیں کرسکی اس روز پاپا گھر پر ہی تھے اور کمرے سے نکلتے ہی ان کا میرا سامنا ہوگیا۔ ''سارے گھر والوں کا خیال ہے کہ آج کل تم بہت پریشان ہو اور نہ یونیورسٹی جارہی ہو نہ کہیں اور کیا بات ہے۔''

''کوئی خاص بات نہیں پا..... پا.....''

''عمران کی بات پکی ہوگئی ہے اور اس کی شادی اختر علی کی لڑکی سے ہورہی ہے۔''

میں نہیں جانتی تھی کہ اختر علی کون ہے لیکن میں نے پوچھا نہیں' پاپا نے خود ہی بتایا کہ اختر علی خود بھی صنعت کار ہے اور اس کی بیٹی عمران کے قابل نہیں پھر بھی اس نے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ عمران کی ہونے والی بیوی کی ایک ٹانگ مصنوعی ہے۔ عمران کا یہ فیصلہ بھی شاید میری وجہ سے ہی تھا۔ پاپا نے ٹھیک ہی بتایا تھا۔ عمران کی شادی کی دعوت ہمارے گھر میں آئی تھی اور کارڈ پر صرف میرا نام اور رشتہ درج تھا اس دعوت نامے نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی تھی۔

اب پاپا کے گھر رہنا زیادہ مشکل ہوگیا تھا لیکن میں ان کا گھر نہیں چھوڑ سکی۔ ایک رات میں اپنے کمرے سے نکل کر بسم اللہ خالہ کے گھر میں آگئی۔ بسم اللہ خالہ نے مجھے سمجھایا لیکن میں ان کے گھر سے نہیں نکلی جب انہوں نے بہت زیادہ اصرار کیا تو میں نے خودکشی کرنے کی دھمکی دے دی دوسری صبح پاپا کو بھی یہ بات معلوم ہوگئی وہ خود چل کر میرے پاس آئے لیکن جب میں نے ان سے کہا کہ میں خالہ کے کمرے میں سکون سے سو سکی ہوں اگر میں نے یہ کمرا چھوڑ دیا تو مرجاؤں گی میری یہ بات سن کر پاپا یہ کہہ کر چلے گئے کہ انسان اپنا دشمن خود ہے وہ خود اپنا برا چاہے تو اس کا بھلا خدا بھی نہیں کرسکتا۔

اس بات کو کم و بیش سات سال گزر گئے۔ خالہ کا کمرا بنگلے کی پچھلی دیوار کے ساتھ بنا ہوا تھا میں نے پاپا کی اجازت سے اس کمرے کا ایک دروازہ بنگلے سے باہر بھی نکال لیا اور محلے ہی کے کئی ٹیوشن اس کمرے میں بیٹھ کر ہی کرتی ہوں۔ یونیورسٹی چھوڑے ہوئے بھی مجھے سات سال ہوگئے اور جوانی نے بڑھاپے کی سرحد میں بھی سات سال پہلے ہی قدم رکھ دیا تھا اس لیے بھول کر بھی مجھے کبھی اپنی شادی کا خیال نہیں آیا میں ہوں تو ٹیکسی ڈرائیور کی بیٹی لیکن اپنے ذہن کو کیا کروں مجھے آج بھی گوارا نہیں کہ میں کسی کم حیثیت شخص کی بیوی بن جاؤں۔ معلوم نہیں میری نفسیات میں کون سی گرہ پڑ گئی ہے۔

☆☆☆☆
سچی کہانیاں
☆☆☆☆

سازشی

سیما کاجل

تینوں خالاؤں کی اب تک شادیاں نہیں ہوئی تھیں۔
اس کے کئی اسباب تھے۔
سب سے بڑا سبب تو ممانی تھیں۔
جوان کی دشمنوں کے درمیان آجاتی تھیں اور لڑکے میں
کوئی نہ کوئی ایسی خامی ڈھونڈ لیا کرتی تھیں
کہ خالائیں رشتوں سے انکار کردیا کرتی تھیں۔

اس شمارے کی ایک حساس و دلگداز سچی کہانی

جیسے ہی میں نے واش بیسن کا نل کھولا شدید بدبو کا ایک بھبکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا۔ میرا دماغ چکرا کر رہ گیا تھا۔ میں نے جلدی سے پانی کو سونگھا' بدبو پانی میں سے ہی آرہی تھی۔ تب میں نے چلو میں پانی بھرا اور دیکھا تو میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

میری دونوں ہتھیلیوں میں کالے بال چپکے ہوئے تھے۔ یہ بال پانی کے ساتھ ہی آئے تھے اور بدبو بھی پانی میں سے ہی آرہی تھی۔ میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ رہی تھیں۔ میں نے فوراً نل بند کردیا۔ پھر باتھ روم میں آکر وہاں کا نل کھولا۔ پہلے اس میں سے گرم پانی نکلا اور بعد میں وہی چکرا

دینے والی بدبو اور کالے بال آنے لگے۔ میں نے وہ نل بھی بند کیا اور کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ میرا ذہن فوراً چھت پر موجود پانی کی ٹنکی کی طرف گیا تھا۔ شاید اس میں کوئی بلی وغیرہ گر کر مرگئی ہوگی' لیکن فوراً ہی میں نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے اس مفروضے کو رد کردیا۔ کیونکہ پانی کی ٹنکی پر سیمنٹ کی بھاری بھرکم سلیبیں اس طرح ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں کہ اس میں چوہے کا بچہ بھی داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ بلی اتنی بھاری سلیبیں کھسکا کر اندر داخل نہیں ہوسکتی تھی۔ میں پہلے ہی اتنے طویل سفر سے تھکا ہوا تھا۔ موسم بھی شدید گرم تھا اور پھر اس عجیب واقعے نے مجھے تھکن کے ساتھ تذبذب میں ڈال دیا تھا۔ آکر یہ بال کس جانور کے ہیں۔ پانی کی ٹنکی میں کوئی جانور کس طرح داخل ہوگیا۔

میں جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی میرا ذہن الجھتا چلا گیا۔ پھر میں اٹھا اور منہ ہاتھ دھونے کے لیے کولر میں سے کئی روز پرانا پانی نکالا تھا۔ مجھ میں ابھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں اوپر چڑھ کر پانی کی ٹنکی پر سے بھاری سلیب ہٹاتا اور پانی چیک کرتا۔ میں نے سوچا کہ جب فرحان خالہ کے فلیٹ سے واپس آجائے گا تو اس سے کہہ کر ٹنکی چیک کراؤں گا۔ میں بستر پر پیر پسار کر لیٹ گیا۔ جوڑ جوڑ درد کررہا تھا۔ اوپر سے قیامت خیز گرمی نے بے حال کردیا تھا۔ میرا دل نہانے کو کررہا تھا' لیکن اس بدبودار اور کالے بالوں والے پانی سے نہانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے خود پر جبر کیے بستر پر پڑا رہا۔ میرا چھوٹا بھائی فرحان شام میں ہی گھر لوٹا تھا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا۔

''ابھی آئے ہیں آپ۔'' اس نے اپنا بیگ کاندھے سے اتار کر صوفے پر ڈالا اور اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''نہیں میں تو تقریباً ساڑھے تین یا چار بجے تک آگیا تھا۔ تھکن ہورہی تھی اس لیے لیٹ گیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''نہا لیتے تو تھکن اتر جاتی' بال بھی میلے ہورہے ہیں۔'' اس نے بغور میرا جائزہ لیا۔

''کیسے نہاتا' پانی اتنا بدبو کا ہورہا ہے۔'' میں نے بتایا۔

''بدبو کا.....'' فرحان نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ ''بدبو کہاں سے آگئی پانی میں۔''

''آ میرے ساتھ۔'' میں اٹھا اور اسے ساتھ لیے واش بیسن کی طرف گیا۔ ''نل کھول کر دیکھ۔''

فرحان نے نل کھولا تو وہی بو بو وہاں پھیل گئی۔ کالے بھی واش بیسن میں دکھائی دینے لگے۔ فرحان نے اپنی ناک سکیڑ لی تھی۔

''یہ بال کس کے ہیں۔'' اس نے مجھ سے پوچھتے ہوئے اشارہ کیا۔

''مجھے کیا معلوم' میرا خیال ہے اوپر ٹنکی میں کوئی چیز مرگئی ہے۔'' میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''کوئی چیز کیا۔ مجھے تو یہ کسی بلی کے بال لگ رہے ہیں۔ کالی بلی کے۔'' فرحان نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ میں پرسوچ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے بڑے معنی خیز انداز میں یہ بات کہی تھی۔

''کالی بلی کہاں سے آگئی اور پھر وہ اتنی بھاری سلیب اٹھا کر اندر کیسے گھسے گی۔'' میں نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔

''ظاہر سی بات ہے بلی سلیب کیسے ہٹائے گی۔ کسی نے سلیب اٹھا کر اسے اندر ڈالا ہوگا۔'' فرحان نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس نے لفظ کسی پر خاص طور پر زور دے کر کہا تھا۔ میں سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلانے لگا۔

یہ گھر دراصل میری خالہ کا تھا اور گزشتہ ایک سال سے خالی پڑا تھا۔ یہ گھر خالہ نے اپنی محنت سے بنایا تھا۔ وہ ایک دواؤں کی کمپنی میں برسوں سے جاب کررہی تھیں۔ انہوں نے اپنے ذاتی

پیسوں سے یہ گھر خریدا تھا اور بعد میں ایک فلیٹ بھی بک کرالیا تھا۔ اس کی اقساط بھرتے ہوئے کئی سال گزر گئے تھے۔ گزشتہ سال فلیٹ کی قسطیں ختم ہوگئیں اور انہیں اس کا قبضہ مل گیا تو وہ وہاں شفٹ ہوگئیں۔

میری چھ خالائیں تھیں۔ تین خالائیں شادی شدہ تھیں۔ وہ اپنے گھروں کی ہوگئی تھیں۔ باقی تین خالائیں نانی کے ساتھ رہتی تھیں۔ ایک ہی ماموں تھے۔ وہ بھی شادی شدہ تھے۔ ان کے تین لڑکے تھے' وہ بھی جوان تھے۔ ممانی نے ماموں کو الگ گھر لینے پر مجبور کردیا تھا۔ کیونکہ ماموں ان دنوں بہت اچھی جاب کرتے تھے۔ ممانی کو یہ گوارا نہ تھا کہ ان کے شوہر کی کمائی اس اور ننددں پر بھی خرچ ہو۔ لہٰذا اپنے اچھے دنوں میں ماموں' خالاؤں اور اپنی والدہ سے الگ ہوگئے تھے۔ ممانی بھی بے شرم بن کر روتی دھوتی پہنچی تھیں۔ خالاؤں نے انہیں مایوں نہیں کیا تھا اور ہر طرح سے ان کی مدد کی۔

تینوں خالاؤں کی اب تک شادیاں نہیں ہوئی تھیں۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ سب سے بڑا سبب تو ممانی تھیں۔ جو ان کے رشتوں کے درمیان آجاتی تھیں اور لڑکے میں کوئی نہ کوئی ایسی خامی ڈھونڈ لیا کرتی تھیں کہ خالائیں رشتوں سے انکار کردیا کرتی تھیں۔ ایسا ایک مرتبہ نہیں بلکہ بارہا ہوا تھا۔ خالاؤں کی عقلوں پر پتھر پڑے ہوئے تھے وہ اس کے باوجود ممانی پر بہت بھروسہ کرتی تھیں اور پھر وہ بہت وہمی بھی تھیں۔ معمولی معمولی باتوں پر اتنا وہم کرتی تھیں کہ سر پیٹ لینے کو دل کرتا تھا۔

ہم لوگ حیدرآباد میں رہتے تھے۔ ہماری امی' بہنوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد ابو نے دوسری شادی کرلی اور پھر وہی روایتی سوتیلی ماں ہم بہن' بھائیوں کے سروں پر مسلط ہوگئی۔ جب ان سے ہماری نہ بنی تو میں اپنے تین بھائیوں اور چھوٹی بہن کو لے کر کراچی آگیا۔ وہاں میں نے ایک فلیٹ کرائے پر حاصل کرلیا۔ اللہ نے بڑا کرم کیا اور جلد ہی مجھے ایک معقول نوکری بھی مل گئی۔ ہم پانچوں بہن بھائی وہاں مناسب انداز میں زندگی گزارنے لگے' لیکن پھر دو بھائی اور بہن کو پڑھائی کی وجہ سے واپس حیدرآباد جانا پڑ گیا۔ اب وہ وہاں ایک چچا کے گھر رہ رہے تھے۔ یہاں صرف میں اور فرحان رہ گئے۔ فرحان نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا اس کے ساتھ وہاں کچھ ٹیوشنز بھی اسے مل گئی تھیں۔ اپنے اخراجات وہ خود ہی پورے کرلیتا تھا۔

نانی کے انتقال کے بعد تینوں خالاؤں نے وہ گھر چھوڑ دیا اور فلیٹ میں رہنے لگیں۔ انہیں وہم ہوگیا تھا کہ وہ گھر انہیں کبھی راس نہیں آیا تھا۔ وہ جب تک اس گھر میں رہیں انہوں نے پریشانیاں ہی دیکھی تھیں اور پھر وہاں رہتے ہوئے ان کی شادیاں بھی نہیں ہورہی تھیں۔ یہ بات پہلے ہی وہ آپس میں کیا کرتی تھیں' اوپر سے ممانی نے بھی ایسی ہی باتیں کرکے انہیں اس گھر سے مکمل طور پر بدظن کردیا تھا۔ پھر وہ گھر ایک سال تک یونہی خالی رہا۔ اس دوران میں ماموں کے سب سے بڑے لڑکے مجھے نے اپنی نگرانی میں وہاں کچھ کام بھی کروایا تھا۔ پیسے خالاؤں نے ہی خرچ کیے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ اس گھر میں رنگ و روغن نیا کرادیا جائے۔ کچن' باتھ روم میں ٹائلز لگوا دیے جائیں' تو گھر مناسب داموں فروخت ہوجائے گا۔ مجید نے بڑے شوق اور لگن سے اس میں کام کروایا تھا' لیکن اس لیے نہیں کہ اسے اپنی پھپھو سے محبت تھی' بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی شادی چند ماہ بعد ہونے والی تھی اور اسے یہ آس تھی کہ وہ اپنی پھپھو سے یہ گھر لے لے گا۔ اس وقت تک کے لیے جب تک کہ گھر فروخت نہیں ہوجاتا۔ مگر حقیقت میں تو وہ گھر مکمل طور پر حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ گھر حاصل

کرے گا اور انہیں گھر کی قیمت قسطوں میں دیتا رہے گا۔ مجید کو ایسا کرنے پر اکسانے والی اس کی ماں نہیں ہماری ممانی تھیں۔

نہ صرف ممانی اور ان کے گھر والے بلکہ جو خالائیں شادی شدہ تھیں وہ بھی اس گھر کو حاصل کرنے کی دوڑ میں شامل تھیں۔ جب میں حیدرآباد سے کراچی آ کر فلیٹ میں رہنے لگا تو ان خالہ نے ہم سے کہا کہ ہم دونوں بھائی کرائے کے فلیٹ میں کیوں رہ رہے ہیں۔ نانی والا گھر خالی پڑا ہے۔ وہاں جا کر رہ لو۔ جب تک کہ وہ فروخت نہیں ہو جاتا۔

عذرا خالہ نے یہ بات فرحان سے کہی تھی' وہ گھر اصل میں عذرا خالہ کا ہی تھا۔

''نہیں بھئی ہم فلیٹ میں کرائے پر ہی ٹھیک ہیں۔'' میں نے فرحان کے منہ سے یہ بات سن کر فوراً انکار کر دیا تھا۔

''لیکن وہاں رہنے میں حرج ہی کیا ہے آخر۔'' فرحان نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا۔

''تم جانتے ہو کہ اس گھر کو حاصل کرنے کے لیے کتنے لوگ خواب دیکھ رہے ہیں۔ ہم وہاں چلے گئے تو وہ سب کے سب ہمارے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جائیں گے اور سب سے خطرناک تو ہماری ممانی صاحبہ ہیں۔ کچا چبا جائیں گی ہم دونوں کو۔ وہ تو چاہتی ہیں کہ نانی والا وہ گھر ان کے بیٹے مجید کو مل جائے۔ سمجھے تم۔'' میں نے اسے تمام تر صورت حال سے آگاہ کیا۔

''لیکن ہم خود سے تو وہاں جائیں گے نہیں۔ عذرا خالہ ہی ضد کر رہی ہیں کہ وہاں چلے جاؤ۔ انہیں بھی ممانی وغیرہ سے خطرہ ہے کہ اگر ایک مرتبہ وہ یا ان کا بیٹا وہاں جم گیا تو پھر انہیں وہاں سے نکالا نہیں جا سکے گا' اس لیے وہ چاہتی ہیں کہ ہم دونوں جلد از جلد وہاں شفٹ ہو جائیں۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ دیکھا جائے تو بے چاری عذرا خالہ کافی مشکل کا شکار تھیں۔ دوسری خالائیں اور ممانی ان سے آئے روز مکان کا حق اضا کرتی رہتی تھیں۔ انہیں ان لوگوں سے بچنے اور انہیں خاموش کرانے کا یہی ایک طریقہ سوجھا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے مکان میں ہم دونوں بھائی شفٹ ہو جائیں۔ اس طرح وہ آسانی کے ساتھ مکان فروخت کر دیں گی۔

پھر میں چھٹی والے روز خالہ کے فلیٹ پر گیا اور ان سے بات کی۔ انہوں نے مجھ سے وہی بات کی جو فرحان بتا چکا تھا۔ بالآخر میں نے ہامی بھر لی اور پھر پندرہ روز کے اندر ہم نانی والے گھر میں آ گئے۔ ہمارے وہاں آنے سے دوسری خالاؤں اور ممانی کے سینے پر سانپ لوٹ گئے تھے۔ بہرحال اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ممانی وغیرہ نے عذرا خالہ سے ملنا بند کر دیا۔ کیونکہ انہوں نے ان کو گھر دینے کے بجائے ہم دونوں بھائیوں کے حوالے کر دیا تھا۔ ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ مجید نے ہم سے ملنا جلنا تو دور کی بات' بات چیت بھی ترک کر دی تھی۔ اس نے نانی والے اس مکان پر بڑی محنت کی تھی۔ اس کی ساری محنت اکارت چلی گئی تھی۔ ہم دونوں نے عذرا خالہ کی بات مان کر دیگر لوگوں کی ناراضگی مول لے لی تھی۔

ہمارے وہاں شفٹ ہونے کے چند روز بعد ہی عیدالاضحیٰ آ گئی تھی۔ ہم دونوں عید منانے کے لیے حیدرآباد گئے تھے۔ البتہ عید کی نماز پڑھنے کے بعد پہلے تینوں خالاؤں کے پاس فلیٹ گئے تھے اور ان سے سلام و دعا کے بعد ہی حیدرآباد روانہ ہوئے۔ ان تینوں کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ مکان جب تک خالی تھا تو کوئی ان کے فلیٹ میں موجود رہتا تھا' لیکن جب سے انہوں نے وہ مکان ہمارے حوالے کیا تھا' وہ سارے خود غرض لوگ غائب ہو گئے تھے۔

ایک روز میں اور فرحان چھٹی والے روز گھر کا سودا سلف لینے کے لیے بازار گئے۔ ویسے تو ہم

بازار سے کھانا کھاتے تھے لیکن چند چیزیں فرحان نے پکانا سیکھ لی تھیں۔ اس لیے ہم سودا لا کر احتیاطاً فریج میں رکھ لیتے تھے کہ بہ وقت ضرورت کام آئیں گی۔ ہم ابھی خریداری ہی میں مصروف تھے کہ دفعتاً فرحان نے دبے لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''فیضان بھائی..... وہ سامنے..... ممانی..... ادھر ہی آ رہی ہیں۔''

میں نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ بازار میں کافی رش تھا۔ ٹھیلے والے آوازیں لگا رہے تھے۔ بہت سی عورتیں بھی خریداری میں مصروف تھیں۔ انہی میں' میں نے ممانی کو پہچان لیا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتی ہوئی ہماری طرف ہی بڑھی آ رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ نزدیک آئیں' میں نے انہیں سلام کیا۔

وہ چونک گئی تھیں۔ انہوں نے پہلے مجھے اور پھر فرحان کو دیکھا۔ میں نے دوبارہ سلام کیا لیکن وہ جواب میں منہ بنا کر ایک طرف بڑھ گئیں۔ مجھے ان کے اس رویے پر حیرت کے ساتھ دکھ بھی ہوا تھا۔ بہرحال میرا جو فرض تھا' میں نے پورا کر دیا تھا' آگے ان کی مرضی تھی۔ محض مکان کی وجہ سے ممانی کے دل میں ہمارے لیے اتنا کینہ بھر گیا تھا۔ اس کا سوچ سوچ کر مجھے حیرانی ہوئی تھی۔ میں نے اس بات کا ذکر عذرا خالہ سے کیا تو انہوں نے بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر جواب دیا۔

''ان کی تو عادت ہی ایسی ہے۔ دو دن ٹھیک رہتی ہیں اور دو دن بعد پھر ویسی ہو جاتی ہیں۔ تم ان کی پروا مت کیا کرو۔''

''انہوں نے تو یہاں آنا بھی ختم کر دیا ہے۔'' نجمہ خالہ بھی بول اٹھیں۔ ''پہلے تو ہفتے میں ایک آدھ چکر لگا لیتی تھیں' اب تو وہ بھی ختم کر دیا۔''

''مجھے ان کے آنے یا نہ آنے کی پروا نہیں ہے۔ میں تو رویے کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''چھوڑیں فیضان بھائی۔'' فرحان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کوئی ہم سے ملے تو سر آنکھوں پر..... نہ ملے تو..... نہ ملے۔''

''مجید کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی ہے اور شاید کارڈ بھی چھپ چکے ہیں۔'' تیسری خالہ انجم نے بتایا۔

''اچھا یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔'' مجھے واقعی بڑی خوشی ہوئی تھی۔

''ماموں' ممانی تم لوگوں کو بھی کارڈ دینے آئیں گے۔ تم شادی میں جاؤ گے نا۔''

''یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ لازماً جائیں گے۔'' میں نے جلدی سے جواب دیا تھا۔

ایک ہفتے بعد ہی معلوم ہوا ماموں اور ممانی نے مجید کی شادی کے کارڈ خاندان بھر میں بانٹ دیے ہیں' لیکن ہمیں ابھی تک نہیں دیے۔ فرحان کا خیال تھا کہ وہ ہمیں شادی میں بلانا نہیں چاہ رہے ہوں گے۔ میں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ اسی شام میں انجم خالہ کا فون آ گیا۔

''ہاں فیضی تم ابھی آ سکتے ہو فلیٹ پر۔''

''کیوں خیریت۔ کوئی کام ہے۔'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''کام تو نہیں ہے۔ وہ تم دونوں کا کارڈ ماموں اور ممانی ہمیں دے گئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ ان دونوں کو دے دینا۔'' انہوں نے اطلاع دی۔ مجھے تعجب کے ساتھ غصہ بھی آیا۔ ''یعنی ہمارا کارڈ آپ لوگوں کو دے دیا۔ کیوں ہم لوگ فقیر ہیں کیا۔''

''نہیں وہ لوگ جلدی میں تھے۔ انہیں اور بھی بہت سی جگہوں پر کارڈ دینا تھے۔'' انہوں نے اپنے بھائی اور بھابھی کی حمایت میں کہا۔

''جس طرح دوسرے لوگوں کو کارڈ دینا ضروری ہے' اسی طرح ہمارے گھر بھی آ کر کارڈ دے سکتے تھے۔ دعوت اس طرح تو نہیں دی جاتی کہ کسی دوسرے کے گھر کارڈ دے دیا اور یہ بول دیا کہ وہ آئیں تو انہیں یہ کارڈ دے دینا۔'' میرا

غصہ ہونا فطری بات تھی۔

"کیا مطلب..... کیا تم....." انجم خالہ نے پوچھنا چاہا' لیکن میں نے ان کی بات کاٹ دی۔

"ٹھیک سمجھا آپ نے میں اور فرحان شادی میں شرکت نہیں کریں گے۔"

"نہیں فیضی غلط بات ہے یہ۔ تم لوگوں کو شادی میں ضرور جانا چاہیے۔" وہ مجھے سمجھانے لگیں۔

"سوری خالہ جی' اس طرح تو میں اور فرحان شادی میں شرکت نہیں کریں گے۔ یہ تو ان لوگوں نے ہماری بے عزتی کی ہے۔" میں نے صاف انکار کردیا۔

انہوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی' لیکن میں مسلسل انکار ہی کرتا رہا۔ بالآخر مجید کی شادی ہوگئی۔ ہم دونوں نے شادی میں شرکت نہیں کی۔ کئی لوگوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے بتادیا کہ ماموں اور ممانی کا دعوت دینے کا طریقہ کار انتہائی غیر مناسب تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے شادی میں شرکت نہیں کی۔

ویسے تو میں اپنے کام سے کام ہی رکھتا تھا۔ صبح اپنے آفس جانا تھا اور واپسی تک رات ہی ہوجاتی تھی۔ البتہ فرحان کو کچھ ٹائم مل جاتا تھا تو وہ خالہ کے فلیٹ کی طرف بھی چلا جاتا تھا۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ بے چاری تینوں خالائیں اکیلی ہوتی ہیں اور پھر عورت ذات بھی ہیں۔ معمولی معمولی کاموں کے لیے ان کو ہی باہر جانا پڑتا تھا۔ فرحان ان کے کام نمٹادیتا تھا۔ بلی فون' گیس' بجلی کے بلوں سے لے کر گھر کی ماچس تک لاکر دیتا تھا۔ جب ہم لوگ نہیں تھے تو پہلے یہی کام مجید کیا کرتا تھا' لیکن جب اسے مکان نہیں ملا تو اس نے کام کرنے بھی چھوڑ دیے تھے۔

محرم کی چھٹیوں میں ہم دونوں بھائی حیدرآباد جانے کا پروگرام بنانے لگے اور جس روز ہم نے جانا تھا اس سے ایک روز پہلے رات میں عذرا خالہ کا فون آگیا۔

"چھٹیوں میں کیا کرو گے تم دونوں۔"

"کچھ نہیں حیدرآباد جانے کا پروگرام ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"دونوں جاؤ گے۔" انہوں نے کچھ جھجکتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"ہاں ارادہ تو یہی ہے۔"

"اچھا۔" وہ کچھ توقف کے بعد بولیں۔ "فرحان کہاں ہے۔"

"یہ رہا' بات کریں۔" میں نے ریسیور نزدیک بیٹھے فرحان کے حوالے کردیا۔ وہ ان سے بات کرتا رہا۔ پھر ریسیور رکھ کر میری طرف گھوما۔

"فیضان بھائی خالہ کہہ رہی تھیں کہ تم مت جاؤ۔ فلیٹ پر آجانا۔ کچھ کام وغیرہ ہیں' میں نے کہہ دیا ٹھیک ہے۔"

"چلو اچھا کیا۔ وہ بے چاری اکیلی ہوں گی۔ ان تینوں کو پوچھنے والا ویسے ہی کوئی نہیں ہے۔ تو ایسا کرتے ہیں کل میں حیدرآباد کے لیے نکل جاتا ہوں اور تم فلیٹ چلے جانا۔ میں ڈپلی کیٹ چابیاں لے جاؤں گا اور جس روز واپس آنا ہوگا فلیٹ پر فون کردوں گا تم بھی آجانا۔" میں نے پروگرام سے آگاہ کیا۔ فرحان نے سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلادیا۔

اگلے روز صبح ہی میں حیدرآباد روانہ ہوگیا۔ محرم کی چھٹیوں کے تین روز گزار کر میں واپس کراچی پہنچا' لیکن حیدرآباد سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے خالہ کے فلیٹ پر فون کردیا تھا کہ میں گھر پہنچ رہا ہوں۔ فرحان کو شام تک وہاں بھیج دیں۔ یہ اسی روز کا واقعہ ہے جس روز میں حیدرآباد سے گھر پہنچا تھا اور نل میں سے بدبو اور کالے بال آنے لگے تھے۔ یہ ایک عجیب وغریب اور عقل وخرد سے بالاتر بات تھی۔

اگلے روز صبح میں تو آفس چلا گیا۔ البتہ فرحان گھر میں ہی موجود رہا تھا۔ اس نے کالج کی

چھٹی کی تھی۔ کیونکہ کئی روز گھر یونہی پڑا رہا تھا۔ اس کی صفائی ہونا تھی اور پانی کی ٹنکی چیک کرنا تھی۔ میری آفس سے واپسی ہوئی تو فرحان کو اپنا شدت کے ساتھ منتظر پایا۔ اس کے چہرے پر تھکن سے زیادہ حیرانی کے آثار نمایاں تھے۔

"کیا ہوا ٹنکی چیک کرلی تھی۔" میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں اور پتا ہے اس میں کیا تھا۔" فرحان عجیب سی شکل بنا کر مجھے تکنے لگا۔ "اس میں کسی عجیب سے خوفناک جانور کا آدھا دھڑ پڑا تعفن رہا تھا۔"

"کیا۔" میرے جسم پر دہشت کی چیونٹیاں چڑھ گئیں۔ میں ناقابل یقین نظروں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ "کیسا جانور۔ کیا تھا وہ۔"

"پتا نہیں کیا چیز تھی۔ اس کا آدھا دھڑ پورا پھولا ہوا تھا۔ پتا نہیں کتنے دن سے وہ ٹنکی میں تھا۔ پورا گوشت گل گیا تھا۔ میں نے ایک مزدور کو بلایا تھا' اس سے نکلوا کر پھکوا دیا تھا وہ۔" فرحان کی صورت ایسی ہورہی تھی جیسے ابھی ابکائی کردے گا۔ میرا دماغ متضاد سوچوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔

"آخر وہ جانور اس ٹنکی میں کہاں سے آگیا۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے خود کلامیہ انداز میں کہا۔

"ظاہر سی بات ہے کسی نے اندر ڈالا ہوگا۔" فرحان نے بتایا۔ "سیلبیں ویسی کی ویسی لگی تھیں۔ میں نے جب ایک سلیب کھسکا کر اندر دیکھا تو بدبو کے مارے میرا دماغ ہی پھٹ گیا اور جانور کا دھڑ دیکھ کر مجھے چکر آگئے تھے۔ بے چارے مزدور نے بھی بڑی مشکلوں سے ڈرتے ڈرتے اسے نکالا تھا۔

"ہو نہ ہو یہ ضرور کسی نے جان بوجھ کر حرکت کی ہے۔" میں تفکر آمیز لہجے میں بولا۔ "تین دن سے گھر خالی پڑا رہا۔ کسی نے موقع جان کر وہ جانور ٹنکی میں ڈالا ہوگا۔ تم نے ٹنکی صاف تو کروادی تھی نا۔"

"ہاں بھئی اچھی طرح اسے کئی مرتبہ واشنگ پاؤڈر سے دھلوایا تھا۔ جب بدبو پوری طرح ختم ہوگئی پھر اس میں نیا پانی بھرا تھا۔" فرحان بولا۔ "میں مطمئن ہوگیا' مگر اگلے چند روز بعد ہی ایک نیا واقعہ ہوا۔ میں نے کچن کے پاس رکھے ہوئے کولر میں سے پانی نکالنا چاہا تو اس کا ڈھکن مضبوطی سے بند ہونے کی وجہ سے پانی نہیں نکلا۔ تب میں نے اس کا ڈھکنا کھول دیا اور ایسے ہی اندر جھانک کر دیکھا تو دنگ رہ گیا۔

پانی کی تہہ میں مجھے ایک چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا پڑا دکھائی دیا۔ اس پر سنہرے رنگ سے کچھ لکیریں بنی ہوئی تھیں' جن کے خانوں میں کچھ تحریر بھی تھا۔ میں نے ہاتھ اندر ڈال کر بڑی احتیاط سے وہ کاغذ نکال لیا۔ اس پر زعفران سے نقشہ بنا ہوا تھا۔ ایک لمحے میں ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ تعویذ ہے جو کسی نے رات کے وقت زینے سے نیچے آکر کولر میں ڈال دیا تھا۔

گویا یہ دوسرا وار تھا جو ہم پر کیا گیا تھا۔ ہماری خوش نصیبی تھی کہ دوسری مرتبہ بھی ہم بچ گئے تھے۔ آخر وہ کون ہے جو یہ حرکتیں کررہا ہے۔ مجھے اس کی دلیری پر بھی حیرانی ہورہی تھی کہ وہ رات کے وقت میں گندی گلی سے پہلے چھت پر چڑھا ہوگا اور پھر زینے سے اتر کر کولر میں تعویذ ڈالا ہوگا۔ اگر میں انجانے میں پانی پی لیتا تو نہ جانے میرے ساتھ کیا ہوتا۔ یہ سوچ کر ہی مجھے جھرجھری آگئی۔

فرحان جب کالج سے لوٹا تو میں نے اسے تعویذ دکھایا اور کولر والی بات بتائی۔

"آخر وہ کون ہے جو ہمارے پیچھے پڑا ہوا ہے اور ایسی حرکتیں کررہا ہے۔" فرحان نے سوچتے ہوئے کہا۔ "یہ تو سیدھا سیدھا ہمیں مارنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ ہمیں فوری طور پر خالاؤں کو اطلاع کرنا چاہا۔ ان کے علم میں یہ بات ضرور آنا چاہیے۔"

''ہاں ٹھیک ہے۔تم ایسا کرنا کہ کل انہیں یہ سب بتا دینا۔فون کرنے کے بجائے خود سے چلے جانا تو زیادہ اچھا رہے گا۔'' میں نے تائید کی۔ فرحان نے ایسا ہی کیا۔ تینوں خالائیں سخت پریشان ہوگئیں۔

''تم دونوں ہوشیار رہنا' کھانے پینے میں احتیاط برتنا اور آس پڑوس والوں سے بھی کہہ دو کہ رات کے وقت چھت کا دھیان رکھا کریں۔ کوئی آتا جاتا نظر آئے تو فوراً شور مچادیں۔'' خالہ اتنی ہی بات کرسکتی تھیں جتنی ان میں سمجھ تھی۔

''ہم لوگ جلد از جلد اس گھر کو فروخت کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ تاکہ یہ جھگڑا ہی ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے۔'' عذرا خالہ نے پریشانی کے عالم میں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔''ہم نے تو تمہیں اس لیے گھر دیا تھا کہ تم لوگ فی الحال کرائے کی جھنجٹ سے بچ جاؤ اور جو لوگ مکان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں وہ بھی خاموش ہوجائیں' مگر یہ تو ایک اور نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوگیا ہے۔''

''بہرطور آپ فکر نہ کریں۔اب ہم ہر طرح سے ہوشیار رہیں گے۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔

یہ حرکات کون لوگ کرسکتے ہیں۔اس کا ہمیں بہ خوبی علم تھا اور خالائیں بھی سمجھتی تھیں' لیکن ہم لوگ ایک دوسرے کے سامنے دانستہ کسی کا نام نہیں لے رہے تھے۔اس کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا اور بغیر ثبوت کے کسی کا نام لینا مناسب بھی نہ تھا۔

لیکن یہ بات پکی تھی کہ یہ حرکات محض مکان کی وجہ سے کی جارہی تھیں' تاکہ ہم دونوں بھائی خوفزدہ ہوکر یہ مکان چھوڑ دیں۔ آناً فاناً یہ بات پورے خاندان میں پھیل گئی کہ نانی والے گھر میں عجیب وغریب واقعات پیش آرہے ہیں لیکن مجال ہے کہ کوئی خالہ ہماری خیریت پوچھنے آئی ہو۔ ماموں' ممانی سے تو ہمیں ایک فیصد بھی امید نہ تھی کہ وہ یہاں آئیں گے۔ پہلے ہی وہ ہم سے نالاں تھے اور پھر ہم نے مجید کی شادی میں شرکت نہ کرکے انہیں گویا بہانہ دے دیا تھا۔اب ممانی یہ کہتی پھرتی تھیں کہ ہم فیضان اور فرحان سے اس لیے نہیں ملتے کہ وہ مجید کی شادی میں نہیں آئے تھے۔بڑی خالہ نعیمہ ایک روز گھر آ پہنچیں۔

ویسے تو وہ بھی اس گھر کے امیدواروں میں تھیں' لیکن وہ زیادہ تر اپنے کام سے کام رکھتی تھیں۔ان کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ ان کا سب سے بڑا بیٹا عاصم بُرے لڑکوں کی صحبت میں اٹھ بیٹھ رہا تھا۔ وہ اس کی طرف سے بہت فکرمند رہا کرتی تھیں۔انہیں پولیس وغیرہ کا بھی خطرہ رہتا تھا۔ ان کو لوگوں نے یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ گھر تبدیل کرلیں اور کہیں دور جاکر رہیں' اس طرح عاصم اپنے دوستوں سے دور رہے گا اور پولیس وغیرہ کا بھی خطرہ ٹل جائے گا۔ جب نعیمہ خالہ آگئی تھیں تو میں اور فرحان گھر میں ہی موجود تھے۔وہ آتے ہی بڑبڑانے لگیں۔

''خدا غارت کرے ان کو' جنہوں نے یہ حرکتیں کی ہیں۔ایسے کپڑ دل ہوگئے ہیں لوگ' بھلا تم بچوں کا اس میں کیا قصور ہے۔ایک مکان کے پیچھے ایسی حرکتیں کرکے کسی کو کیا ملے گا۔ مجھے سب پتا ہے یہ حرکتیں کون کرسکتا ہے۔''

''بس خالہ' بس کریں۔ بلاوجہ کسی پر الزام دھرنے سے کیا ہوگا۔'' میں نے ہاتھ اٹھا کر انہیں آگے بولنے سے روکا۔''جس نے بھی کیا ہے اللہ اس کو دیکھ لے گا۔ بلکہ ہم سب اس کا حشر دیکھیں گے۔''

''ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔تم فکر مت کرنا میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' پھر وہ رک کر بولیں۔ ''ویسے تو میں نے بھی عذرا سے یہ مکان مانگا تھا' کیونکہ عاصم کا معاملہ تو سب کو پتا ہے' لیکن خیر تم لوگوں کو زیادہ ضرورت تھی۔ اس نے اچھا ہی کیا کہ کسی اور کو نہیں دیا۔ فیضان بیٹا میں ایک بات کہنا چاہ رہی تھی۔''

''ہاں بولیں خالہ کیا بات ہے۔'' میں نے بڑے ادب سے کہا۔

''جس طرح تم دونوں یہاں رہ رہے ہو۔ عاصم کو بھی اپنے ساتھ رکھ لو۔ یہ مکان جب فروخت ہوگا تو میں عاصم کو بلوالوں گی۔ اس طرح خراب دوستوں سے اس کی جان چھوٹ جائے گی اور تم اسے بڑے بھائی کی طرح سمجھاتے بھی رہو گے تو وہ سمجھ جائے گا۔'' خالہ نے اپنی آمد کا اصل مقصد بیان کر ڈالا اور میں ایک گہری سانس لے کر فرحان کو دیکھنے لگا۔ وہ معنی خیز انداز میں مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔

''مجھے تو کوئی انکار نہیں خالہ جی۔'' بالآخر میں نے محتاط انداز میں نرمی سے کہا۔''ظاہر سی بات ہے عاصم ہمارا بھائی ہے' مگر مجھے پہلے عذرا خالہ کو بتا کر اجازت لینا پڑے گی۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا' یہ ان کا گھر ہے اس لیے کسی اور کو یہاں ٹھہرانے سے پہلے ان کی اجازت ضروری ہے۔''

نعیمہ خالہ چند سیکنڈ تک سوچتی رہیں پھر سر اٹھا کر بولیں۔''جیسی تمہاری مرضی معلوم کرکے دیکھ لو۔''

ان کے جانے کے بعد میں نے فلیٹ پر فون کیا اور عذرا خالہ کو اس نئی صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے آخر میں پوچھا۔''اب آپ بتائیں کیا کہتی ہیں اس بارے میں۔''

''تم منع کرسکتے تھے ان کو' میں بھلا کیا بولوں۔ منع کروں گی تو نعیمہ باجی برا مان جائیں گی۔ سب جانتے ہیں کہ عاصم کتنا بگڑا ہوا لڑکا ہے۔ وہ چرس بھی پیتا ہے' تم تو سمجھ دار ہو' لیکن فرحان ابھی چھوٹا ہے۔ وہ عاصم کے ساتھ رہ کر بگڑ جائے گا۔ تم یہی بہانہ کردینا ان سے۔''

''گویا آپ کی طرف سے اجازت ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں بھئی وہاں تم رہتے ہو۔ اپنا اچھا برا خود دیکھ اور سمجھ سکتے ہو۔'' انہوں نے گویا اجازت دے دی اور میں مطمئن ہوگیا۔

پھر میں نے نعیمہ خالہ سے فون پر معذرت کرلی تھی۔ انہوں نے جواباً کہا۔''خیر کوئی بات نہیں۔تم بھی بھلا کیا کرسکتے ہو۔ خیر میں کچھ اور کرتی ہوں۔'' مجھے اس بات کا تھوڑا افسوس بھی تھا' لیکن میری مجبوری بھی تھی۔ واحد ممانی ایسی تھیں جنہوں نے کبھی ہماری خبر لی اور نہ ہی فون کرنے کی زحمت کی۔اس سے ان کی دلی کدورت اور بغض کا پتا چل جاتا تھا۔اس بات کو ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ میری طبیعت اچانک بگڑ گئی۔رات اچھا خاصا سویا تھا اور جب صبح اٹھا تو بستر سے اٹھا ہی نہیں گیا۔ایسا لگ رہا تھا کہ بدن میں جان ہی نہیں رہی ہے۔چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا۔

فرحان مجھے دیکھ کر بوکھلا گیا۔''یہ آپ کو ایک دم کیا ہوگیا ہے بھائی' ایک ہی رات میں یہ کیا ہوگیا ہے۔آپ تو اتنے کمزور دکھائی دے رہے ہیں۔'' خود میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آرہا تھا۔ رات کوئی ایسی الٹی سیدھی چیز بھی نہیں کھائی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ رات ہی رات میں کسی نے میرے بدن سے توانائیاں نچوڑ لی ہیں۔ میری طبیعت سنبھلی نہیں بلکہ وقت کے ساتھ بگڑتی چلی گئی۔ فرحان نے تینوں خالاؤں کو خبر کردی' وہ بے چاری بھاگی چلی آئیں۔

''صاف لگ رہا ہے کسی نے کچھ کروا دیا ہے۔'' نجمہ خالہ میری صورت دیکھتے ہی بول پڑیں۔''ورنہ ایک ہی دن میں کسی بیماری سے یہ حشر نہیں ہوتا۔''

''یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔'' عذرا خالہ الگ پریشان اور شرمندہ تھیں۔''میری ہی ضد کی وجہ سے تم لوگ اپنا فلیٹ چھوڑ کر یہاں آئے تھے' اس وقت سے ہی تم دونوں نے ایک دن بھی سکون سے نہیں گزارا۔ ہم نے بھی اس مکان کو اسی لیے خالی کیا تھا کہ ہمیں بھی یہاں ذہنی سکون نہیں ملا تھا۔ ہمیشہ پریشانیوں نے ہمیں گھیرا ہی رہا تھا۔''

"یہ سب وہم کی باتیں ہیں۔ ہونے والی بات تو ہو کر رہتی ہے۔" میں نے تحیف و نزار لہجے میں کہا۔ مجھے بولنے میں بھی دشواری پیش آ رہی تھی لیکن وہ میری بات ماننے کو تیار نہ تھیں۔ مجھ پر کوئی دوا اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔ آفس میں اطلاع کر دی گئی۔ آخر مجھے اسپتال میں ایڈمٹ ہونا پڑا۔ ڈاکٹرز خود حیران تھے کہ آخر مجھے ہوا کیا ہے۔ بظاہر مجھ میں کسی بیماری کی کوئی علامت نہ تھی۔ بس میں سوکھتا چلا جا رہا تھا۔ میں اپنے ہاتھ دیکھتا تو یقین نہیں آتا کہ یہ میرے ہی ہاتھ ہیں۔ وہ کسی درخت کی سوکھی پتلی ٹہنیوں کی طرح لگ رہے تھے۔

عذرا خالہ نے گھر میں قرآن خوانی کا اہتمام کیا۔ اس روز فرحان اور نجمہ خالہ کو ایک جگہ سے تہہ کیا ہوا ایک تعویذ ملا۔ نہ جانے اس میں کیا کیا نقش بنے ہوئے تھے۔ البتہ ایک جگہ فیضان اور میری امی کا نام واضح پڑھا جا سکتا تھا۔ وہ دونوں اس تعویذ کو لے کر ایک مولوی صاحب کے پاس گئے۔ انہوں نے اس تعویذ کو ضائع کیا۔ اس بارے میں مجھے بعد میں بتایا گیا تھا۔ جب تعویذ ضائع کیا گیا تھا۔ اسی وقت سے میری طبیعت خود بہ خود سنبھلنے لگی اور شام تک میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ کیونکہ ظاہر ہے مجھے کوئی بیماری تو نہ تھی' بلکہ خراب اثرات تھے وہ دور ہوتے ہی میں تندرستی کی طرف لوٹنے لگا۔

تینوں خالاؤں کے علاوہ مجھے اور فرحان کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ یہ سب کچھ ممانی جان کی طرف سے ہو رہا تھا۔ انہیں قرآن خوانی میں بلوایا تو وہ نہیں آئی تھیں اور اس کے علاوہ ایک نئی بات اور میرے علم میں آئی تھی کہ عذرا خالہ کا ایک جگہ رشتہ لگا تھا۔ لڑکے والے عذرا خالہ کو پسند کر گئے تھے اور اب خالہ کی طرف سے بڑوں کو لڑکے والوں کے گھر جانا تھا۔ وہ لوگ دعوت دے گئے تھے۔ خالاؤں نے ماموں اور ممانی کو کہہ دیا لیکن عین وقت پر ممانی نے کسی وجہ سے جانے سے انکار کر دیا۔ ادھر لڑکے والے انتظار کرتے رہ گئے اور یوں رشتے کی بات پکی ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔ اصل میں ممانی یہ چاہتی ہی نہیں تھیں کہ ان تینوں کی شادیاں ہوں۔ اگر ان کی شادیاں ہو گئیں تو ان کا فلیٹ' بینک بیلنس اور یہ مکان شوہروں کی تحویل میں چلا جائے گا۔ اگر وہ یونہی بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو گئیں تو لازمی سی بات ہے پھر ممانی کی اولاد ہی ان کی تمام چھوٹی موٹی جائیداد کی وارث ہو گی۔ ممانی کی ایک ہی بیٹی تھی اور اب وہ بھی جوان ہو چکی تھی۔ ممانی اس کے رشتے کی کوششیں کر رہی تھیں۔ بھلا وہ اپنی جوان بیٹی کے ہوتے ہوئے نندوں کی فکر کیوں کرنے لگیں۔

نجمہ خالہ کو اس بات پر شدید غصہ تھا کہ یہ تمام حرکات ممانی نے کی تھیں۔ وہ تو ان سے لڑنے کے لیے ان کے گھر جانے والی تھیں' لیکن میں نے اور فرحان نے انہیں روک لیا۔

"کیا فائدہ ہو گا ان سے جھگڑا کر کے۔" میں نے انہیں سمجھایا۔ "کون سا وہ اپنی حرکتیں چھوڑ دیں گی۔ آپ یہ تمام معاملات اللہ پر چھوڑ دیں اور تماشا دیکھیں' اگر انہوں نے کسی کے ساتھ برا کیا ہے تو قدرت انہیں خود سزا دے گی۔"

"ایسے کیسے چھوڑ دیں ان کو۔" نجمہ خالہ کا پارہ اب تک چڑھا ہوا تھا۔ "ابھی تمہیں کچھ سے کچھ ہو جاتا تو پھر۔"

"فی الحال تو اللہ نے بچا لیا ہے نا۔ کچھ ہو جاتا تو تب آپ چاہے کچھ بھی کریں۔ ابھی بات بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔" بمشکل ہم نے ان کا غصہ ٹھنڈا کیا تھا۔

آخر ایک روز یہ راز منکشف ہو گیا کہ یہ سب کچھ کس کا کیا دھرا تھا۔ اب تک ہمارا دماغ صرف ممانی کی طرف ہی جا رہا تھا۔ کیونکہ حالات و واقعات ان ہی کی طرف اشارہ کر رہے تھے لیکن پھر معلوم ہوا کہ یہ سب نعیمہ خالہ کروا رہی تھیں۔

مجھے یہ علم ہوا تو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا' مگر اب پوری کہانی واضح ہو چکی تھی۔ وہ بھی مکان حاصل کرنے کا خواب دیکھنے والوں میں سے تھیں۔ جب ہم دونوں بھائی وہاں آ گئے تو وہ غصے میں تلملا کر رہ گئیں' مگر انہوں نے جوش کے بجائے ہوش سے کام لیا اور کھل کر ہماری مخالفت کرنے یا نفرت ظاہر کرنے کے بجائے ایک عامل سے رابطہ کیا۔ وہ گندے علوم کرنے کا ماہر تھا اور معاوضے پر کام کرتا تھا۔ کسی جانور کا آدھا دھڑ اس نے خالہ کو دیا تھا کہ وہ کسی طرح پانی کی ٹنکی میں ڈلوا دیں۔ یہ کام عاصم نے رات کے اندھیرے میں کیا تھا۔ پھر کولر میں تعویذ بھی اس نے ہی ڈالا تھا۔

نعیمہ خالہ نے اس ہندو عامل کو کافی پیسے دیے تھے۔ دونوں ہتھکنڈے ناکام ہونے پر خالہ نے تلملا کر ہندو عامل کو برا بھلا کہا تھا۔ تب اس نے ایک اور تعویذ دیا جو خالہ نے ہمارے گھر آ کر نہ جانے کس وقت موقع پا کر چھپا دیا تھا۔ جس سے میں بیمار پڑ گیا تھا لیکن وہ تعویذ بھی برآمد ہو گیا۔ اب تو نعیمہ خالہ کا غصے کے مارے برا حال ہو گیا۔ انہوں نے ہندو عامل سے اپنے تمام پیسوں کا تقاضا کیا جو وہ اسے دے چکی تھیں۔ ہندو عامل نے کاموں سے ان کی رقم لوٹا دی۔ مگر وہ بدلہ لیے بغیر خاموش تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

اس نے نعیمہ خالہ اور ان کے گھر والوں پر گندا علم کر دیا تھا۔ جن کے اثرات سے خالہ کا چھوٹا بیٹا عامر شاید بیمار ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہوا تھا جو میرے ساتھ ہوا تھا۔ وہ چند دنوں میں ہی سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ پولیس نے عاصم کو ڈکیتی کے الزام میں دھر لیا تھا۔ کئی اطراف سے ان کو مصیبتوں کو گھیر لیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح ہندو عامل کو ڈھونڈ رہی تھیں' مگر اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ اپنا عارضی ٹھکانا چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ غرض یہ کہ مصیبتوں نے ان کے گھر ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ خالو کی ساری کمائی چھوٹے لڑکے کے علاج پر خرچ ہو رہی تھی۔ عاصم کے چکر میں تھانے کچہری میں آنا جانا لگا ہوا تھا۔ ادھر بھی پیسہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ دیکھنے سننے والے تھرا کر رہ گئے تھے۔

نعیمہ خالہ میرے پاس بھی آئی تھیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہی تھیں' میں نے کہا۔

"میں کون ہوتا ہوں خالہ معاف کرنے والا۔ معافی مانگنی ہے تو اللہ تعالیٰ سے مانگیں۔ وہی معاف کرنے والا ہے۔"

وہ روتے دھوتے چلی گئی تھیں۔ عذرا خالہ کا وہ مکان فروخت ہو گیا تھا۔ میں اور فرحان دوبارہ ایک کرائے کے فلیٹ میں آ گئے تھے۔ ہم اب ایک پرسکون زندگی گزار رہے تھے' لیکن خالاؤں کے بارے میں خبریں ملتی رہتی تھیں۔ نعیمہ خالہ اب تک ہندو عامل کو تلاش کر رہی ہیں۔ عاصم کو پولیس سے چھڑوانے کے لیے انہیں مکان تک فروخت کرنا پڑا تھا اور اب وہ کرائے کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہ رہی تھیں۔ ان کے چھوٹے لڑکے کا علاج اب بھی چل رہا تھا۔ اس کا شمار نہ زندہ لوگوں میں کیا جا سکتا تھا اور نہ مردوں میں۔ وہ اپنی ماں کے گناہوں کی سزا بھگت رہا تھا۔ عذرا خالہ' نجمہ خالہ اور انجم خالہ ممانی کو اچھی طرح سمجھ گئی تھیں۔ لہٰذا انہوں نے تقریباً ان سے قطع تعلق ہی کر لیا تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ زمانہ بہت ترقی کر گیا ہے۔ ہر چیز فاسٹ ہو گئی ہے۔ قدرت کا نظام بھی فاسٹ ہو گیا ہے۔ انسان کو اس کے گناہوں کی سزا اور پر تو ملتی ہی ہے' لیکن دنیا میں بھی گناہوں کا رزلٹ فوراً ہی دیا جاتا ہے' تاکہ دوسرے عبرت حاصل کر سکیں۔

☆☆☆☆
سچی کہانیاں
☆☆☆☆

درماندہ

صائمہ کاردار

میں ڈرتا تھا کہ یہ بات رضیہ کو معلوم ہو گئی تو کیا ہو گا۔
وہ یقیناً مجھ سے طلاق لے لے گی اور
جمیلہ کا عشق مجھے دیوانہ و بدنام ہی نہیں
مفلس و قلاش بھی کر دے گا۔
سب کچھ ہونے کے باوجود رضیہ کے بغیر میں کچھ نہیں تھا۔
میرے لیے رضیہ سے محرومی کا مطلب تھا'
اس عزت سے محرومی جو اب مجھے حاصل تھی اور.....!

اس شمارے کی ایک حساس و دلگداز سچی کہانی

ہفتے کو دوپہر کے بعد یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری کہ کسی نے میرے پڑوسی وحید کی حسین و جمیل بیوی جمیلہ کو قتل کر دیا ہے۔

اتوار کو سب دفتروں کی طرح میرے دفتر میں بھی چھٹی ہوتی ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر ہفتہ بھر کے دوران میں فرصت نہ ملنے کے باعث تھوڑا تھوڑا کر کے کچھ کام جمع ہو گیا ہو تو یہ کام میں اتوار کو ختم کر لیتا ہوں۔ اس روز بھی اتوار ہونے کے باوجود میں دفتر میں تھا اور کام میں اتنا مصروف تھا کہ مجھے وقت کا خیال بھی نہیں رہا۔ جب میں نے گھڑی دیکھی تو دو بج رہے تھے۔ میرے سوا کوئی چھٹی کے دن کو ضائع کرنا پسند نہیں کرتا چنانچہ اس روز بھی میں اکیلا تھا۔ میں نے آفس کو مقفل کیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

گھر پہنچنے تک مجھے حالات میں کسی نمایاں تبدیلی کا احساس نہیں ہوا۔ ہر چیز ویسی ہی تھی جیسی میں صبح چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے اپنی پرانی فوکس ویگن کو گیراج میں اپنی بیوی کی بالکل نئی اور شان دار مرسیڈیز کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

میری بیوی رضیہ پچھلے برآمدے میں کرسی ڈالے خاموش بیٹھی ہوئی تھی اور نہ جانے کس خیال میں گم تھی کہ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے 'ہیلو' کہا تو وہ چونک پڑی۔

''تم کب آئے۔'' وہ زبردستی مسکرائی۔

''مجھے تو گاڑی کی آواز بھی سنائی نہیں دی۔''

یہ بڑی عجیب بات تھی کیونکہ فوکس ویگن تو اپنی آواز سے اپنی آمد کا خود اعلان کرتی تھی۔ میں رضیہ کے پاس دوسری کرسی پر بیٹھ کر جوتے کھولنے لگا۔ ''معاف کرنا' میں کام میں ایسا مصروف ہوا کہ مجھے وقت کا خیال ہی نہیں رہا۔''

رضیہ اپنے سامنے دیکھتی رہی۔ ہمارا گھر کچھ بلندی پر ہے۔ ایک طرف تو وحید کا گھر ہے لیکن دوسری طرف تھوڑے سے نشیب کی جانب پھیلا ہوا شہر دکھائی دیتا ہے اور یہ منظر بہت دل کش ہے مگر میں نے محسوس کیا کہ رضیہ کی نگاہیں اس منظر پر مرکوز نہیں تھیں۔

''کیا بات ہے رضیہ!'' میں نے کہا۔ ''تم کچھ خاموش اور گم صم ہو۔''

''ایسی کوئی خاص بات تو نہیں۔'' وہ بولی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو مگر اسے مناسب اور موزوں الفاظ نہیں مل رہے۔ ''یہاں ایک ناخوشگوار حادثہ پیش آ گیا ہے۔'' اس نے ہاتھ سے پڑوسیوں کے گھر کی جانب اشارہ کیا۔ ''کسی نے جمیلہ کو قتل کر دیا ہے' تمہارے آفس جانے کے کچھ دیر بعد۔''

میں حیران رہ گیا۔ وہ پڑوس میں رہنے والی ایک عورت کے قتل کا ذکر اتنے سکون کے ساتھ کر رہی تھی جیسے یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہ ہو۔ قتل کا ذکر بھی اس نے کتنے عجیب الفاظ میں کیا تھا' ناخوشگوار واقعہ! میں رضیہ کو جانتا ہوں کیوں کہ وہ بھی ایک عورت ہے۔ اس سے پہلے اس نے معمولی واقعات پر بڑے جذباتی لہجے میں اس طرح بات کی تھی جیسے وہ مجھے تیسری جنگ عظیم کے شروع ہونے کی خبر سنا رہی ہو اور یہ روزمرہ کی بات ہے۔ وہ جو گلاب کا نیا پھول کھلتے دیکھ کر خوشی سے بے قابو ہو جاتی تھی اور باغ میں کسی چڑیا کو مردہ دیکھ کر افسردہ ہو جاتی تھی' اس وقت جذباتی طور پر بے حد پرسکون تھی اور یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ جمیلہ کے قتل کا ذکر کر رہی ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی حالت پر قابو پایا۔ ''رضیہ!'' میں نے بے یقین آواز میں کہا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ جمیلہ کو کون قتل کر سکتا ہے۔''

"ابھی یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ قاتل کون ہے اور اس نے قتل کیوں کیا۔" رضیہ نے میری طرف غور سے دیکھ کر کہا۔ "ابھی ایک گھنٹہ پہلے میرے پاس دو پولس والے آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آج میں نے کوئی بات خلاف معمول نوٹ کی تھی۔ ساتھ والے گھر سے کوئی آواز سنی تھی یا وہاں سے کسی اجنبی اور مشتبہ قسم کے شخص کو نکلتے دیکھا تھا۔ میں نے کہا کہ نہ میں نے کوئی آواز سنی اور نہ کسی اجنبی کو دیکھا لیکن معاملہ کیا ہے۔ میرے سوال پر انہوں نے کہا کہ وحید ایک بجے کے قریب اپنے گھر پہنچے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ بیڈ روم کے فرش پر ان کی بیوی کی لاش پڑی ہے۔ پولس والوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ کسی نے جمیلہ کا سر پھاڑ دیا تھا' غالباً کرکٹ کے بیٹ سے! کیوں کہ لاش کے قریب ہی کرکٹ کا بیٹ بھی پڑا ہوا تھا۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ جمیلہ کا شوہر کرکٹ کھیلتا ہے اور اس کے تین چار بیٹ گھر میں داخل ہوتے ہی ایک کونے میں کھڑے نظر آتے تھے۔"

میں نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ "یہ بات بڑی ناقابل یقین سی لگتی ہے۔ پولس نے کچھ بتایا کہ قتل کس وقت ہوا تھا۔"

"قتل' پولس کے آنے سے تقریباً تین گھنٹے پہلے' یعنی دس بجے کے قریب ہوا تھا۔" رضیہ نے کہا۔

"دس بجے کا مطلب ہے میرے جانے کے ایک گھنٹہ بعد!" میں نے دل ہی دل میں حساب لگا کر کہا۔

"جب انہوں نے وقت کی بات کی تو مجھے ایک بات یاد آ گئی۔" رضیہ بولی۔ "میں نے دس بجے کے قریب وحید کو کہیں سے کار میں گھر آتے دیکھا تھا۔ صحیح وقت کا مجھے اندازہ نہیں مگر ساڑھے نو اور دس کے درمیان مجھے اس کی کار نظر آئی تھی اور میں نے اسے اترتے دیکھا تھا۔"

"لیکن تم پہلے اعتراف کر چکی تھیں کہ تم نے کوئی غیر معمولی بات نوٹ نہیں کی۔" میں نے رضیہ کو یاد دلایا۔

"ہاں' مگر ایک آدمی کا اپنے ہی گھر میں آنا کوئی غیر معمولی بات کیسے ہوگی!" رضیہ بولی۔

"وحید پندرہ بیس منٹ بعد پھر گاڑی لے کر چلا گیا تھا۔ یہ بات میں نے پولس کو بتا دی۔ تمہارا کیا خیال ہے' مجھے یہ بات نہیں بتانا چاہیے تھی۔"

میں ذہنی طور پر بالکل غیر حاضر تھا۔ رضیہ کا سوال سن کر میں چونکا لیکن جواب دینے سے پہلے میں نے ٹیلی فون کی گھنٹی سنی اور اٹھ کر اندر چلا گیا۔ سامنے والے گھر سے ایک خاتون رضیہ سے بات کرنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ میں نے رضیہ کو بلا کر ریسیور اس کے حوالے کر دیا۔

میں نے انہیں باتوں میں مصروف چھوڑا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ حسن اتفاق سے مجھے یہ موقع مل گیا تھا کہ میں اس عجیب و غریب صورت حال کو سمجھ سکوں۔ بات یہ ہے کہ رضیہ نے پولس کے سامنے جانتے بوجھتے غلط بیانی کی تھی۔ ساڑھے نو بجے وحید نے مجھے حیدر آباد سے فون کیا تھا جو ایک سو دس میل دور ہے۔ اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی' مثلاً یہ کہ وحید نے شہر ہی کے کسی آفس سے فون کر دیا ہو' کیوں کہ درمیان میں ٹیلی فون ایکس چینج کے آپریٹر کی آواز آئی تھی جس نے کہا تھا کہ ایک کال کا وقت پورا ہو گیا ہے اور اب چارجز زیادہ ہوں گے۔ وحید ایک سو دس میل کا فاصلہ کسی صورت میں بھی دو گھنٹے سے پہلے طے نہیں کر سکتا تھا' چنانچہ ساڑھے نو اور دس کے درمیان وحید کے گھر آنے اور جانے کی کہانی سو فی صد جھوٹی اور من گھڑت تھی۔ اگر اس نے ایک بجے کے قریب گھر پہنچ کر بیوی کو مرا ہوا دیکھا تھا تو یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ تین ساڑھے تین گھنٹے میں وہ اپنے گھر تک ایک سو دس میل کا فاصلہ طے کر کے پہنچ گیا ہوگا مگر دس بجے اس کا پہنچنا بالکل نا

ممکن تھا۔

سوال یہ تھا کہ رضیہ نے یہ جھوٹ کیوں بولا اور ایک غلط بات بتا کر پولس کو گم راہ کرنے اور وحید سے کوئی عناد نہیں تھا۔

رضیہ کا رویہ ناقابل فہم تھا۔ اسے جمیل کی موت ناک اور بے وقت موت کا ذرا بھی رنج نہیں تھا۔ رضیہ اور جمیلہ کے تعلقات بہت اچھے تھے' بالکل اسی طرح جیسے میرے اور وحید کے ہم دوستانہ تھے۔ دونوں گھروں کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ چلتا رہتا تھا اور ہم رات گئے تک تاش کھیلتے رہتے تھے' ایک ساتھ فلم دیکھنے یا گپ شپ کرنے بھی چلے جاتے تھے۔ جمیلہ کے بارے میں عام رائے اچھی نہیں تھی' خصوصاً خواتین کی رائے! انہیں گلہ تھا کہ ان کے شوہر جمیلہ کے حسن و جمال میں ضرورت سے زیادہ دل چسپی محسوس کرتے ہیں اور خود جمیلہ بھی انہیں اپنے جلوہ و عشوہ و ادا سے زیر دام لانے کی کوشش کرتی ہے۔ بات اس سے کہیں زیادہ تھی۔ تقریباً ہر بیوی وفادار شوہر جمیلہ کا دیوانہ اور اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر تھا۔ ان میں سے بیشتر کو جمیلہ اپنے لطف و کرم سے نواز چکی تھی' اس طرح کی کسی کے ساتھ میں ایک ہی شب وصل آئی تو کسی کو ایسی بہت سی شبیں نصیب ہوئیں۔ وہ ایسی تتلی تھی جو ہر پھول کی خوشبو اور رنگ پر ذرا سی دیر کے لیے ٹھہرتی تھی پھر خوب سے خوب تر کی تلاش میں اڑ جاتی تھی۔ ان گنت حسن کے شیدائی اور ہوس پرست تتلی کے نظر فریب رنگوں کا تعاقب کر رہے تھے' مگر وہ کسی کے جال میں آ بھی جاتی تھی تو کامیاب شکاری کے احساس مسرت کو تمام چھوڑ کر نکل جاتی تھی۔ افواہیں تو بہت تھیں مگر حقیقت کا ان خوش نصیبوں کے سوا کسی کو نہ تھا جن پر جمیلہ کی نظر عنایت رہی تھی اور جو اسی امید میں جیتے تھے کہ وہ نظر پھر مہربان ہوگی۔ اگر جمیلہ کے شہر کو یا کی حاسد اور حوصلہ مند بیوی کو حقیقت کا علم ہو جاتا تو شاید جمیلہ اتنے دن بھی زندہ نہ رہتی۔ ان دنوں اس کا محبوب نظر میں تھا اور ممکن ہے یہ میری خوش فہمی ہو کہ کسی ایک مرد پر قناعت نہ کرنے والی جمیلہ بالآخر میرے عشق میں گرفتار ہو گئی تھی۔

میں ڈرتا تھا کہ یہ بات رضیہ کو معلوم ہو گئی تو کیا ہوگا۔ وہ یقیناً مجھ سے طلاق لے لے گی اور جمیلہ کا عشق مجھے دیوانہ و بدنام ہی نہیں مفلس و قلاش بھی کر دے گا۔ سب کچھ ہونے کے باوجود رضیہ کے بغیر میں کچھ نہیں تھا۔ میرے لیے رضیہ سے محرومی کا مطلب تھا' اس عزت سے محرومی جو اب مجھے حاصل تھی اور عیش و آرام کی اس زندگی سے محرومی جس کا میں سات سال میں عادی ہو گیا تھا۔ شاید مجھے پھر کسی معمولی سی ملازمت کے لیے دھکے کھانا پڑتے' کسی معمولی سے کمرے میں رہنا پڑتا اور روکھی سوکھی کھا کر پیٹ بھرنے پر مجبور ہونا پڑتا۔ میں اس انجام کے تصور سے بھی کانپ اٹھتا تھا لیکن دوسری طرف جب مجھے جمیلہ نظر آتی تھی تو میری عقل پر پردہ پڑ جاتا تھا۔ جب مجھے اس کا اشارہ ملتا تھا تو میں مستقبل کے سارے اندیشوں کو فراموش کر کے بے اختیار اس کی طرف کھنچ جاتا تھا۔ وحید کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کی بیوی کیا گل کھلا رہی ہے اور زبان خلق پر کیا افسانے ہیں۔ وہ سادہ دل تھا مگر بے وقوف آدمی کو آئینے میں اپنی ہی صورت دکھائی نہ دے تو اس میں آئینے کا کیا قصور! وہ خود برا نہیں تھا' پھر اسے دنیا بری کیسے نظر آتی۔ اسے جمیلہ پر بھی اعتماد تھا اور مجھ پر بھی! قریبی تعلقات کے باعث ہمارے لیے مواقع پیدا کرنا مشکل نہیں تھا' لیکن میں جانتا تھا کہ دنیا اندھی نہیں ہے بلکہ عشق میں خود آدمی اتنا اندھا ہو جاتا ہے کہ اسے کچھ نظر نہیں آتا۔

رفتہ رفتہ جذبات کی شوریدہ سری پر مصلحت کے تقاضے حاوی آنے لگے تھے اور میں جمیلہ سے کترانے لگا تھا' لیکن اب صورت حال یہ ہو گئی تھی کہ کمبل مجھے نہیں چھوڑتا تھا۔ ابھی چند روز پہلے

جمیلہ نے مجھے ایک خط میں دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے قطع تعلق کی کوشش کی تو وہ رضیہ کو سب کچھ بتا دے گی۔ وہ میری کم زوری سے واقف تھی۔ رضیہ اگر عام عورت ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی' لیکن عام عورت اتنی دولت مند کہاں ہوتی ہے چنانچہ جمیلہ نے بلیک میل کرنے پر آمادہ تھی۔

جمیلہ کے خط کو میں نے میز کی دراز میں کاغذات کے نیچے چھپا دیا تھا لیکن دراز میں کوئی قفل نہیں تھا۔ رضیہ کو ذرا بھی شبہ ہو جاتا تو کسی ثبوت کی تلاش میں وہ کاغذات کے نیچے سے یہ خط نکال سکتی تھی اور اس دستاویزی ثبوت کی موجودگی میں میرے لیے اپنی صفائی پیش کرنے کے امکانات صفر ہو جاتے۔ مجھے خط کو اسی وقت جلا دینا چاہیے تھا۔ میں نے فوراً میز کی دراز کھولی اور سارے کاغذات کے نیچے دبے ہوئے اس کاغذ کے پرزے کو نکال لینا چاہا جو کسی بارودی سرنگ کی طرح نظر نہ آنے کے باوجود ہاتھ پڑتے ہی میرے مستقبل کو تباہ کر سکتا تھا لیکن وہ خط اب وہاں نہیں تھا۔

کچھ دیر کے لیے میرے دل کی دھڑکن رک گئی اور میری نظروں کے سامنے اندھیرا سا پھیل گیا۔ پھر میں نے خود کو سنبھالا۔ ہو سکتا ہے' خط کاغذات میں مل گیا ہو۔ مجھے سکون سے اس کی تلاش کرنا چاہیے' مگر ایک ایک کاغذ دیکھ لینے کے باوجود وہ خط مجھے نہیں ملا۔ ناکامی کے احساس کے ساتھ میری گھبراہٹ اور پریشانی بڑھتی گئی اور مجھے یقین آنے لگا کہ وہ خط رضیہ کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ رضیہ کے سوا اس میز کی دروازوں تک کسی کی رسائی ناممکن تھی۔ میں ہارے ہوئے جواری کی طرح کرسی پر بیٹھ گیا اور تقدیر کی اس چال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس خط کا غائب ہو جانا اور جمیلہ کا قتل ہو جانا' واقعات کے ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں تھیں اور ان کے تعلق کو سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ جمیلہ کا قتل وحید نے نہیں کیا تھا' لیکن رضیہ چاہتی تھی کہ الزام وحید پر آ جائے۔ اس نے پولیس کو اپنی غلط بیانی سے یہ باور کرانے کی پوری کوشش کی تھی کہ قتل وحید نے کیا ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ رضیہ نے دراز میں سے جمیلہ کا خط نکال کر پڑھ لیا تھا اور سیدھی جمیلہ کے پاس چلی گئی تھی۔ ان کے درمیان تلخ کلامی ہوئی ہوگی۔ جمیلہ کو اپنے حسن پر ناز تھا تو رضیہ کو اپنی دولت پر' دونوں ایک دوسرے سے کم نہیں تھیں۔ بات یقیناً بڑھ گئی ہوگی اور رضیہ نے کرکٹ کا بیٹ اٹھا کر جمیلہ کے سر پر مار دیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے' وہ جمیلہ کو سمجھانے گئی ہو مگر قتل پر مجبور ہو گئی ہو۔

قتل اکثر حالات کے غیر متوقع رخ اختیار کرنے کا نتیجہ بھی ہوتا ہے۔ رضیہ نے اس عورت کو مار دیا تھا جو رضیہ سے اس کا شوہر چھین لینا چاہتی تھی لیکن بعد میں خود کو اور مجھے بچانے کے لیے اس نے وحید کو مجرم بنا دیا۔ اب وہ ذہنی الجھن اور بے یقینی کا شکار تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ تفتیش کے دوران میں بہت سی باتیں سامنے آ جائیں گی' بہت سے لوگ بتا دیں گے کہ جمیلہ کس قماش کی عورت تھی اور انہوں نے جمیلہ کی شوقین مزاجی کے کیا چرچے سنے تھے۔ پولیس اس نتیجے پر پہنچے گی کہ وحید اپنی بیوی کے کردار سے مطمئن نہیں ہوگا۔ شوہر سے بیوی کی فطرت کیسے پوشیدہ رہ سکتی ہے۔ اس نے رقابت یا حسد کے باعث جمیلہ کی کسی بات یا حرکت سے مشتعل ہو کر اسے قتل کر دیا۔ حالات اور رضیہ کی شہادت سے مجرم صرف وحید ثابت ہوتا تھا۔

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد کہ رضیہ نے میری خاطر جمیلہ کو قتل کیا لیکن مجھ پر حرف نہیں آنے دیا' میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ رضیہ نے میری محبت میں بے مثال جرات کا مظاہرہ کیا تھا۔ اب میرا بھی یہ فرض تھا کہ رضیہ پر الزام نہ آنے دوں اور اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش

کروں کیوں کہ جمیلہ کا مسئلہ بہر حال ختم ہو گیا تھا۔ ظاہر تھا کہ مجھے بھی رضیہ کے جھوٹ کو نباہنا تھا' خواہ اس کے لیے مجھے دس جھوٹ بولنا پڑتے۔ اگر میں نے کہہ دیا کہ ساڑھے نو بجے تو وحید نے ایک سو دس میل سے مجھے ٹیلی فون کیا تھا تو رضیہ کی کہانی غلط ہو جائے گی اور اس پر غلط بیانی کا الزام آ یا تو ممکن ہے' تحقیق و تفتیش کا رخ ہی بدل جائے۔ میں صاف انکار کر دوں گا کہ وحید نے مجھے کوئی ٹیلی فون نہیں کیا تھا۔ میرا یہ بیان بے گناہ وحید کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کے مترادف ہوگا' لیکن محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔

اس فیصلے سے میری ساری پریشانی ختم ہو گئی اور میرا اعتماد بحال ہو گیا۔ ہماری ازدواجی زندگی کے گلستان میں کہیں سے ایک کانٹا آ گیا تھا۔ ہم دونوں نے جانتے بوجھتے ایک دوسرے کی نظر بچا کر اس کانٹے کو نکال پھینکا تھا اور اب ہمارا مستقبل محفوظ تھا۔ شاید زندگی کی آخری سانس تک ہم ایک دوسرے کی خوشی کے لیے اس جھوٹ کا بھرم رکھیں گے۔ میں نے کپڑے بدلے اور باتھ روم میں گھس گیا۔

جب میں باتھ روم سے باہر نکلا تو مجھے رضیہ کی آواز سنائی دی۔ ''ذرا ایک منٹ کے لیے ادھر آ جاؤ' کوئی تم سے ملنے آیا ہے۔''

جب میں نیچے اترا تو مجھے ڈرائنگ روم میں وحید بیٹھا ہوا نظر آیا۔ سادا کپڑوں میں دو افراد اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے جو صورت سے ہی پولیس والے نظر آتے تھے۔ وحید کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ وہ سخت مایوس اور افسردہ بیٹھا تھا۔

''وحید! مجھے تمہاری بیوی کی موت کے بارے میں سن کر بہت افسوس ہوا۔'' میں نے ظاہری اخلاق اور ہمدردی کا مظاہرہ کیا۔

وحید نے نظر اٹھا کے مجھے دیکھا لیکن میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اگر وہ چاہتا تو بہت کچھ کہہ سکتا تھا۔ آنے والے دونوں افراد پولس

حاصل

لڑکی نے منگنی کی انگوٹھی لڑکے کو واپس دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایک اور لڑکے سے محبت ہو گئی ہے۔''

لڑکے نے کہا۔ ''اس کا نام اور ایڈریس مجھے بتاؤ گی۔؟''

''کیوں کیا تم اسے اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے قتل کرنا چاہتے ہو۔؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''بالکل نہیں..... میں تو صرف یہ انگوٹھی فروخت کرنا چاہتا ہوں۔''

☆

☆ایک عورت نے اپنی سہیلی سے کہا۔ ''شادی کے بعد مجھے اپنے شوہر کی ہر بات زہر لگتی ہے لیکن شادی سے پہلے ان کی ہر بات بڑی پیاری لگتی تھی۔''

''اف یہ مرد کتنی جلدی بدل جاتے ہیں۔'' سہیلی نے جواب دیا۔

☆''سنو جب تم رنج میں گھر جاؤ..... اور جب غم کے بادل تمہارے سر پر منڈلانے لگیں..... جب..... حیات کے لمحے پر اذیت ہو جائیں..... تو یاد رکھنا کہیں کسی گوشہ زمین پر..... کوئی..... ہمہ وقت تمہارے لیے دعا گو رہتا ہے۔

☆دوسروں کی اچھائی اپنانے کی کوشش کرو اور اپنی برائی سے نجات حاصل کر لو۔ خوب صورت یادیں ستاروں کی طرح ہیں جو اندھیرے میں بھی جگمگاتے ہیں۔

☆حسن کو نکھار غرور سے نہیں بلکہ سادگی سے آتا ہے۔

☆دنیا اور آخرت کی مثال ایسی ہے جیسے ندی کے دو کنارے جو کبھی ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے۔

☆دل سیب کی مانند ہے جس میں سچائی کے موتی ہیں۔

انسپکٹرز ثابت ہوئے۔ ان دونوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ایک کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی مگر اس کی عمر زیادہ نہیں تھی دوسرا سنجیدہ اور ذہین ہونے کے علاوہ زیادہ تجربہ کار نظر آتا تھا۔ ذہانت کی چمک نوجوان کی آنکھوں میں بھی تھی۔

''جناب! یہ تو آپ کی بیوی نے بتا ہی دیا ہوگا کہ آج صبح ساتھ والے گھر میں ایک قتل کی واردات ہوگئی ہے۔'' ایک انسپکٹر نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ''ہم کوشش کررہے ہیں کہ کسی غلطی نتیجے پر پہنچ سکیں اور ہمیں صحیح حالات معلوم ہوجائیں۔'' اس کا نام منصب علی تھا۔

''جو کچھ مجھے معلوم ہے' وہ آپ مجھ سے پوچھ سکتے ہیں۔'' میں نے کسی فرض شناس شہری کی طرح کہا۔

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آج صبح سے دوپہر تک آپ کہاں رہے۔'' دوسرے نے روایتی انداز میں تفتیش کا آغاز کیا جس کا نام غلام رسول تھا۔

''میں صبح نو بجے اپنے آفس گیا تھا اور دو بجے تک آفس سے باہر نہیں نکلا۔'' میں نے اعتماد کے ساتھ کہا۔

''آفس میں آپ کی موجودگی کا کوئی گواہ ہے۔'' منصب علی نے حسب توقع دوسرا سوال کیا۔

''نہیں۔ چھٹی کے روز لوگ آفس نہیں آتے۔'' میں نے کہا۔ ''میں کبھی کبھی چلا جاتا ہوں۔''

''آفس میں آپ نے کسی کو یا کسی نے آپ کو فون کیا تھا۔'' غلام رسول نے سوال کیا۔

یہ سب سے مشکل سوال تھا مگر اب میں جھوٹ بولنے کا فیصلہ کرچکا تھا چنانچہ میں نے نفی میں سر ہلادیا۔

''مسٹر وحید کا کہنا ہے کہ ساڑھے نو بجے انہوں نے آپ سے آفس میں فون پر بات کی تھی۔'' منصب علی نے کہا۔ ''اور اس وقت یہ تقریباً سو میل دور تھے۔''

''مجھ سے۔'' میں نے حیرانی سے وحید کی طرف دیکھا جو میری بجائے قالین کو گھور رہا تھا۔ ''میری کسی سے کوئی بات نہیں ہوئی۔''

''جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' غلام رسول نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ٹیلی فون ایکس چینج میں اس بات کا ریکارڈ موجود ہے کیوں کہ یہ ٹرنک کال بک کرائی گئی تھی۔''

''ٹیلی فون والوں نے اگر غلطی سے میرا نمبر لکھ لیا ہے تو اس کا ذمے دار میں نہیں ہوں۔'' میں نے برہمی سے کہا۔ ''ٹیلی فون والے غلطیاں کرتے ہی رہتے ہیں۔''

میرا لہجہ اتنا فطری تھا اور میری اداکاری اتنی اچھی تھی کہ غلام رسول اپنا رویہ بدلنے پر مجبور ہوگیا۔ اس نے سر ہلایا' جیب سے ایک سگریٹ نکالی اور منصب علی کے لائٹر سے جلائی۔ پھر وہ کچھ سوچتا رہا اور سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ ''یہاں سے آپ کے دفتر کا فاصلہ کتنا ہے۔'' وہ بولا۔

''کیوں۔ میں نے کبھی صحیح اندازہ نہیں لگایا۔'' میں نے کہا۔

''لیکن پندرہ بیس منٹ لگ جاتے ہیں۔''

''یعنی یہ ممکن ہے کہ ساڑھے نو بجے کے بعد آپ دفتر سے وحید کے گھر آئے ہوں کیوں کہ آپ کو معلوم ہوگیا تھا کہ وحید صاحب گھر پر نہیں ہیں۔'' غلام رسول نے کہا۔

''اور آپ تقریباً دس بجے یہاں پہنچے ہوں گے۔'' منصب علی نے اس کی بات میں اضافہ کیا۔

''یہ کیا بکواس ہے!'' میں نے مشتعل ہوکر اس کی بات کاٹ دی۔

''یہ بکواس نہیں' حقیقت ہے!'' منصب علی بولا اور جیب سے ایک کاغذ کا پرزہ نکال کر میری نظروں کے سامنے لہرایا۔ ''اگر تم وہاں نہیں گئے

تھے تو بتاؤ یہ خط وہاں کیسے پہنچا جو ہمیں لاش کے قریب پڑا ہوا ملا تھا۔ اسے پہچانتے ہو تم۔''

میں نے محسوس کیا کہ رضیہ اور وحید کی سوالیہ' حیرت زدہ اور ملامت کرتی ہوئی نظریں مجھ پر جمی ہوئی ہیں۔ منصب علی نے وہ خط دونوں کناروں سے تھام کر میرے سامنے کردیا تھا جسے نہ پہچاننے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ یہ وہی خط تھا جو مجھے جمیلہ نے لکھا تھا اور جو میری دراز میں سے غائب ہوگیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ یہ خط مجھے جمیلہ نے لکھا تھا۔'' میں نے کہا' لیکن میرا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ ''میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا کہ میرے جمیلہ سے مراسم تھے' لیکن اسے میں نے نہیں اس کے شوہر نے قتل کیا ہے۔'' میں نے وحید کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ''تم جانتے ہو اسے میری بیوی نے آج صبح دس بجے گھر آتے دیکھا تھا۔''

منصب علی کی صورت پر حیرت کے آثار نمودار ہوگئے اور غلام رسول کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ ان دونوں نے باری باری مجھے اور رضیہ کو دیکھا' پھر منصب علی نے رضیہ سے کہا۔ ''آپ نے تو اپنے بیان میں ایسی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ نے کسی کو بھی آتے جاتے نہیں دیکھا تھا اور کوئی آواز نہیں سنی تھی۔''

رضیہ اب مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی اور میں اس کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھا۔ ''میرا خیال ہے میں نے اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہا تھا۔''

''کیا۔'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''کیا تم نے پولس کو نہیں بتایا تھا کہ دس بجے کے قریب وحید اپنی کار میں آیا تھا اور پندرہ بیس منٹ بعد چلا گیا تھا۔''

رضیہ نے اسی پرسکون و پراعتماد انداز میں سر ہلایا۔ ''میں نے تو پولس سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ تمہیں کس نے بتایا۔''

اس کا لہجہ اتنا فطری اور اس کی اداکاری اتنی اچھی تھی کہ میں اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکا۔ دونوں پولیس والے وحید کو چھوڑ کر کھڑے ہوگئے۔ ان میں سے ایک میری دائیں طرف ہوگیا اور دوسرا بائیں جانب۔ پھر انہوں نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا اور میں سر جھکائے چل پڑا۔ رضیہ نے اس شخص کو بچانے کے لیے یقیناً جھوٹ بولا تھا جس سے وہ محبت کرتی تھی' لیکن بدقسمتی سے وہ شخص میں نہیں' میرا پڑوسی وحید تھا۔ جب پولس جیپ مجھے لے کر روانہ ہوگئی تو میں نے اپنی اس دنیا پر الوداعی نظر ڈالی جو اب میری نہیں رہی تھی۔ میں نے وحید کو رضیہ کے ساتھ یوں کھڑے دیکھا جیسے سات سال پرانی ایک تصویر میں وہ میرے ساتھ کھڑی تھی۔

کاش!

کافی عمر ہو جانے کے باوجود ایک خاتون کی شادی نہیں ہوسکی تھی۔ ایک روز ان کی دو شادی شدہ سہیلیاں انہیں اسی موضوع پر چھیڑ رہی تھیں ان میں سے ایک ذرا نخوت سے بولی ''اچھا یہ بتاؤ تمہیں کبھی کسی نے پروپوز بھی کیا یا نہیں۔؟''

تب غیر شادی شدہ خاتون نے باری باری اپنی دونوں شادی شدہ سہیلیوں کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولی ''کاش یہ سوال تم نے اپنے اپنے شوہروں سے کیا ہوتا۔''

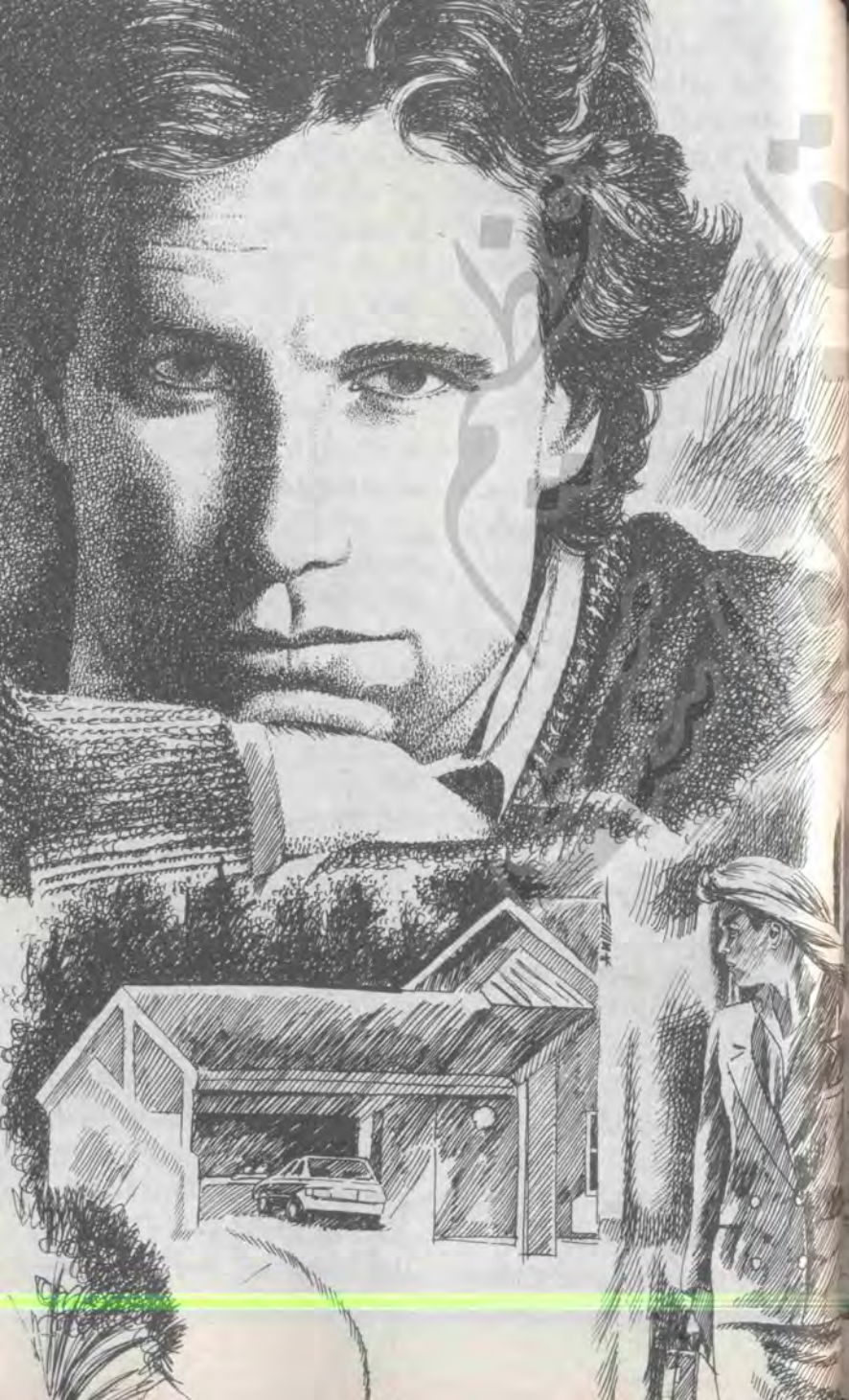

انوکھی داستان

ایم اے راحت

دو تین دن گزر گئے۔ اس دوران فائزہ نے قصبہ نوید آباد جا کر فیکٹری کا چارج سنبھال لیا۔ جمشید یاور بیگ کا خاص آدمی تھا اور اس کی تمام کاروبار سے واقف تھا۔ فیکٹری میں لپ اسٹکس تیار کرنا اس کی ذمہ داری تھی اور یہی ان میں ہیروئن بھرنا بھی اسی کی ذمہ داری تھی۔ وہ یاور بیگ اور فائزہ کے تعلقات سے بھی آگاہ تھا اور یاور فائزہ کو کچھ بھی سمجھتا ہو مگر جمشید اسے وہی عزت دیتا تھا۔ جو مالک کی بیوی کو دینا چاہیے۔

ایک معاشرتی کہانی، عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے

دونوں بظاہر ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ درمیانہ درجے کی زندگی تھی۔ احسان کو فائزہ سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ سوائے اس جنون کے جو فائزہ کو تھا۔ یہ جنون بہت پرانا تھا۔ فائزہ ایک بار شدید بیمار پڑ گئی تھی۔ اس بیماری کی وجہ ہی ایک خواب تھا۔ جس نے اس نے اپنی موت کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس دن سے اسے وہم ہو گیا تھا کہ وہ بہت جلد مر جائے گی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔ بس وہ نفسیاتی بحران کا شکار ہے۔ وہ شخص کوئی فقیر نہیں بلکہ ماہر نفسیات تھا۔ جس نے فائزہ کا نفسیاتی علاج کر دیا تھا۔ اس نے فائزہ کی ایک تصویر فریم کرا کے اسے دی اور کہا تھا۔

''جب تک یہ شیشہ سلامت ہے' فائزہ کو کچھ نہیں ہوگا' جب اسے موت آنی ہوگی یہ شیشہ چور چور ہو جائے گا' اور اس کی کرچیوں سے خون ابل پڑے گا۔'' فائزہ ٹھیک ہو گئی' اسے اس بات پر یقین ہو گیا کہ یہ تصویر اس کی زندگی کی ضمانت ہے۔

احسان ایک غریب گھرانے کا ہوشیار' ذہین اور محنتی نوجوان تھا۔ ماں' باپ مر چکے تھے۔ پرورش سوتیلے بھائی نے کی تھی۔ بی اے کرنے کے بعد بڑے بھائی نے ملازمت کا انتظار کیے بغیر اسکی شادی فائزہ سے کر دی گئی' جو اگرچہ خود بھی ایک غریب بلکہ مفلس گھر کی لڑکی تھی۔ مگر خواہش و عشرت سے بھرپور زندگی گزارنے کے خواب دیکھتی رہتی تھی۔ اسے اپنی خوبصورتی پر بڑا ناز تھا۔ نتیجہ یہ کہ شادی کے بعد جب اس نے سسرال کو بھی میکے سے کچھ مختلف نہیں پایا تو جھلا کر عدم تعاون کی پالیسی پر چل پڑی' کچھ مزاج میں بے پروائی اور کاہلی شامل تھی۔ چنانچہ بات بات پر احسان سے جیٹھانی سے لڑائی جھگڑے ہونے لگے۔ احسان کو ایک کاسمیٹکس بنانے والی چھوٹی سی فرم میں ملازمت مل گئی تھی اور گھر میں سکون پیدا کرنے کے لیے اس نے ایک الگ گھر لے لیا تھا۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑا' سوائے اس کے کہ احسان کے بھائی' بھاوج' فائزہ کی زبان درازیوں سے محفوظ ہو گئے۔ اور وہ یہ سارے زخم تن تنہا اپنے سینے پر کھانے لگا۔

ویسے احسان کی ملازمت اچھی تھی۔ مزید سنز کاسمیٹکس صرف لپ اسٹک بناتی تھی اور اس کا سارا مال جام گڑھ میں چار سول ایجنٹس کو سپلائی کیا جاتا تھا۔ کم سے کم احسان کی معلومات یہ ہی تھیں۔ کمپنی کا دفتر اور فیکٹری نادر پور سے چند میل کے فاصلے پر واقع آ ایک قصبہ میں واقع تھے۔ وہ ہر ہفتے پیر کے دن فیکٹری جاتا۔ وہاں پر ایک میڈیم سائز سوٹ کیس میں بھرا ہوا مال تیار ملتا۔ یہ مال اسے منگل کی شام تک چار مقررہ ڈیلرز کو باری باری پہنچانا ہوتا تھا۔ منگل کو مال ڈیلر کے حوالے کرنے کے بعد اسے اجازت تھی کہ وہ ایک دو دن جام گڑھ میں گزارے یا پھر فوراً واپس آ جائے۔ مگر ہر صورت میں سوٹ کیس اور ڈیلر سے ملنے والی رقم جو لپ اسٹک کی کوالٹی کے مطابق پانچ سے دس ہزار تک ہوتی تھی۔

جمعرات کی شام تک کمپنی کے مالک یاور بیگ کے سپرد کر دے۔ اس آمد و رفت کے لیے اسے ڈھائی ہزار روپے الاؤنس ملتا تھا۔ اور پندرہ ہزار روپے تنخواہ اس کے علاوہ تھی۔ مزید یہ کہ کبھی مہینے میں کبھی دو مہینے کبھی مہینے میں ایک چکر جام گڑھ کا ایک چکر اور لگانا پڑتا تھا۔ یہ خصوصی چکر ممبرون ڈیلر نور علی سے ملاقات کے لیے ہوتا تھا۔ نور علی باقی تین ڈیلروں کے مال کی نکاسی کا اسٹیٹمنٹ بنا کر کمپنی بھیجے' احسان کو اسٹیٹمنٹ لینے ہی نوردین کے پاس جانا پڑتا تھا' اور اس خصوصی چکر کے لیے احسان کو یہ ہدایت تھی کہ وہ نور علی کے

ہوٹل میں قیام کرے۔ نور علی گرانڈ ہوٹل کا مالک تھا جو ایک تیسرے درجے کا اچھا خاصا ہوٹل تھا۔

چونکہ اس ٹرپ کے بارے میں پہلے سے کوئی اطلاع نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے جب بھی نور علی یاور بیگ کو مطلع کرتا کہ اسٹیٹمنٹ تیار ہے۔ یاور بیگ اس کے گھر آ کر بتاتا کہ اسے فوری طور پر اسی دن یا اگلے روز پہلی ٹرین سے جام گڑھ روانہ ہونا ہے اور احسان کو جانا پڑتا۔ چاہے وہ اس سے ایک دن پہلے ہی جام گڑھ سے واپس آیا ہوتا یا اسے ایک دن بعد ہی جام گڑھ جانا ہوتا اور یہ بات احسان کو ناگوار گزرتی تھی۔ جام گڑھ آنا جانا نہیں' بلکہ یاور بیگ کا اپنے گھر آنا جب بھی یاور اس کے گھر آتا تو احسان کو اخلاقاً اس کی خاطر تواضع کرنا پڑتی' گھر آئے مہمان کی مدارت میں تو کوئی مضائقہ نہیں' لیکن فائزہ ایسے مواقع پر جس جوش و خروش کا مظاہرہ کرتی۔ وہ ندیم کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ خاص طور پر فائزہ کا یاور بیگ کے سامنے آنا۔ اس نے اشاروں کنایوں سے کئی بار فائزہ کو سمجھانے کی کوشش کی' مگر فائزہ نے یا تو اس کا مطلب نہیں سمجھا یا' وہ دانستہ انجان بنی رہتی تھی۔ اور کھل کر احسان کہنا نہیں چاہتا تھا کہ پھر اسے بتانا پڑتا کہ وہ ایسا کیوں نہیں چاہتا۔ چنانچہ وہ خاطر مدارت کے انداز پر بات رکھ کر کہتا کہ اتنا سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک کپ چائے کافی ہوتا ہے۔ یاور بیگ ہمارا کوئی عزیز رشتے دار تو نہیں ہے اور فائزہ جواب دیتی کہ تم بالکل بدھو ہو۔ عزیز رشتے دار نہ سہی' وہ کمپنی کے مالک تو ہیں۔ مالک کو خوش رکھا جائے تو ترقی کے مواقع بڑھ سکتے ہیں۔ اب وہ فائزہ کو کیا بتاتا کہ اسے بیویوں کا سہارا لے کر ترقی کرنے والوں سے سخت نفرت ہے۔

غنیمت ہوا کہ بس نہیں چھوٹی' وہ ٹھیک وقت پر دفتر پہنچ گیا۔ یاور اس کا منتظر تھا۔ اس نے لپ اسٹکوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس اور مقررہ ٹریولنگ الاؤنس احسان کے حوالے کیا۔ آدھ گھنٹے کے بعد احسان دوسری بس پکڑ کر رسول پور پہنچا۔ یہاں اسٹیشن پر اس نے ناشتہ کیا۔ گھنٹہ بھر اس کی ٹرین بھی آ گئی۔ احسان ہمیشہ فرسٹ کلاس میں سفر کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جب کمپنی اسے فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کا کرایہ دیتی ہے تو اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ سیکنڈ کلاس میں سفر کر کے پیسے بچانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ اس نے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خریدا اور ٹرین میں سوار ہو گیا۔

اس مرتبہ احسان کو نیو اسٹور میں مال پہنچانا تھا۔ نور علی اور نیو اسٹور کے علاوہ فرید سنز لپ اسٹک کے باقی دو ڈیلروں میں میک جنرل پرویژن اسٹور اور کیفے نائٹ شامل تھے۔ کبھی کبھی احسان کو حیرت بھی ہوتی تھی کہ لپ اسٹک اور ہوٹل کا لپ اسٹک اور میڈیکل اسٹور کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ مگر ملازمت دیتے ہوئے یاور بیگ نے بڑی تاکید سے کہا تھا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے گا تو فائدے میں رہے گا اور کمپنی کے بارے میں بے جا تجسس اس کے لیے انتہائی نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ انتہائی نقصان دہ کا مطلب احسان نے یہ ہی نکالا تھا کہ اسے ملازمت سے برطرف کر دیا جائے گا اور نادر پور جیسے شہر کا کیا ذکر' جام گڑھ جیسے بڑے شہر میں ہی اسے کوئی ایسی ملازمت نہیں مل سکتی۔ جو ہفتے میں تین' چار دن کام کرنے کا معاوضہ اتنا زیادہ دے دیتے ہیں' چنانچہ وہ کبھی غیر ضروری سوالات میں الجھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔

نیو اسٹور اپنے علاقے میں انگریزی ادویات کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ دکان بھی اتنی وسیع و عریض تھی کہ اسٹور کے مالک احمد خان نے اپنے بیٹھنے کے لیے ایک دفتر جیسی جگہ اسی دکان کے پچھلے حصے میں بنا رکھی تھی۔ احسان اگلے روز دوپہر کے وقت اسی دفتر میں داخل ہوا' اور سلام

کرنے کے بعد ہاتھ میں پکڑا ہوا سوٹ کیس احمد خان کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

''یہ لیجیے اپنا مال سنبھالیے۔'' اس نے کہا۔ ''چیک کرلیں' اور جلدی فارغ کردیں تو اچھا ہے۔''

یہ تاکید احسان کو اس لیے کرنا پڑی تھی کہ پچھلی بار احمد خان نے رقم ادا کرنے کے لیے اسے دو دن تک دوڑایا تھا اور وہ بڑی مشکل سے جمعرات کی شام تک کمپنی کے دفتر واپس لوٹ سکا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ تم اسٹیشن سے سیدھے یہیں آئے ہو۔'' احمد خان نے جواب دیا۔ ''اس لیے ابھی کھانا وغیرہ بھی نہیں کھایا ہوگا۔ یہاں بیٹھ کر انتظار کرنے کے بجائے بہتر ہوگا کہ ساڑھے چار بجے تک اطمینان سے کھانا کھا کر واپس آجاؤ' تمہیں رقم تیار ملے گی۔''

احسان نے بھی یہ ہی سمجھا اور ساڑھے چار بجے آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد احمد خان نے سوٹ کیس کھولا جو اوپر تک لپ اسٹک کی ڈبیوں سے بھرا ہوا تھا۔ سوٹ کیس میں پانچ سو سے لے کر ساڑھے سات سو تک ڈبیاں رکھی جاسکتی تھیں۔

اور یاور بیگ سوٹ کیس دیتے ہوئے احسان کو بتا دیا کرتا تھا کہ اس نے کتنی ڈبیاں رکھی ہیں۔ قیمت کی وصول یابی بظاہر ان کی بنیاد پر ہوتی تھی۔ مگر اندر کے معاملات کیا ہیں۔ ان کا احسان کو کوئی علم نہیں تھا۔ ہر ڈبیا میں تین لپ اسٹک ہوتی تھیں۔ احمد خان نے ایک ڈبیا اٹھائی' اس میں سے ایک لپ اسٹک نکالی' اس کا ڈھکنا کھولا۔ الٹا کر کے لپ اسٹک کے سیڈ کو دائیں طرف گھمایا تو لپ اسٹک باہر آگئی۔ پھر اسٹک ایک حد تک جا کر رک گئی۔ مگر احمد خان برابر گھماتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ الگ ہو کر اس کے ہاتھ میں آگیا۔

اب اس نے اسے سیدھا کیا تو اس کی ہتھیلی پر سفید پاؤڈر کا ڈھیر لگ گیا۔ یہ ہیروئن تھی۔ جسے بڑی کاری گری سے لپ اسٹک کے اندر چھپایا گیا تھا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے ہیروئن کو دوبارہ لپ اسٹک کے اندر بھر دیا۔ پھر اس کا سیڈ لگا کر لپ اسٹک واپس ڈبیا میں رکھ دی۔

احسان جمعرات کے دن سہ پہر کو سوٹ کیس اور رقم دینے کمپنی کے دفتر پہنچا' یاور بیگ حسب معمول اس کا منتظر تھا۔ اس نے مسکرا کر احسان کا استقبال کیا۔

''آگئے' میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ جام گڑھ سے کب واپس ہوئے تھے۔''

''کل رات۔''

''کوئی خاص مصروفیت تو درپیش نہیں ہے۔''

''جی نہیں' کیوں۔''

''ہوتی تب بھی تمہیں اسے ملتوی کرنا پڑتا۔ یاور بیگ نے کہا۔ تمہیں ابھی فوراً جام گڑھ واپس جانا ہے۔''

''کیوں۔ خیریت۔'' احسان نے چونک کر پوچھا۔

''جام گڑھ میں ایک نئی پارٹی نے ڈیلر شپ کی درخواست دی ہے۔'' یاور بیگ نے بتایا۔ ''اس کے تمام ضروری کوائف کے بارے میں نور علی نے اسٹیٹمنٹ تیار کیا ہے۔ وہ لانا ہے' بڑی پارٹی ہے' اور ایک ہفتے میں ہمارا جواب چاہتی ہے۔ جس میں سے دو' تین دن ضروری کوائف معلوم کرنے میں خرچ ہو چکے ہیں۔ اب میں ایک منٹ کی تاخیر بھی نہیں کرنا چاہتا۔ اس سے اندازہ کرلو میں تمہیں ٹرین سے نہیں جہاز سے۔''

احسان واقعی حیرت میں رہ گیا۔

''ہاں تم فوراً گھر واپس جاؤ۔ لباس تبدیل کرو۔ جو بھی سواری ملے اس سے رسول پور روانہ ہو جاؤ۔ میں نے رات کی فلائٹ میں تمہاری سیٹ

بک کرادی ہے۔ یہ رہا اس کا ٹکٹ' جہاز تمہیں رات کے بارہ' ایک بجے جام گڑھ پہنچا دے گا۔ ایئر پورٹ سے سیدھے گراؤنڈ ہوٹل جانا' نور علی تمہارا منتظر ہے۔ وہ تمہیں جو بھی کاغذات دے انہیں لے کر کل صبح تک پہلی ٹرین سے واپس آجانا۔''

''اور یہ پانچ سو روپے تمہارے ضروری اخراجات اور معمول کے خلاف جام گڑھ بھیجنے کا الاؤنس ہے۔''

''شکریہ۔ مگر اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہی روپے کافی ہوتے ہیں۔''

''ضرورت تھی یا نہیں۔ یہ میں بہتر جانتا ہوں۔'' یاور بیگ مسکرایا۔ ''تم بڑی لگن سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہو۔ میں جلد ہی تمہاری تنخواہ بڑھا کر تمہیں ہزار کرنے والا ہوں۔''

''مہربانی ہے۔ آپ کی' اچھا تو پھر میں چلوں۔'' احسان نے ٹکٹ اور روپے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں' جاؤ۔ اس ٹرپ کے لیے تمہیں ایک ہی ہدایت ہے کہ نور علی سے ملنے' اس سے کاغذات لینے اور مجھے پہنچانے تک اپنے کام کے علاوہ اور جانب توجہ نہ دینا۔ سیدھے جانا اور سیدھے واپس آنا۔''

''میں سمجھ گیا جناب' مگر آپ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں کسی بھی ٹرپ کے دوران اپنی ذمہ داری پوری کرتا ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے۔ پھر بھی احتیاطاً یاد دہانی کرادی ہے۔ اچھا خدا حافظ۔'' یاور بیگ نے کرسی سے اٹھ کر احسان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

احسان گھر پہنچا تو یاور بیگ سے ملنے والے پانچ ہزار روپے میں سے ڈیڑھ ہزار فائزہ کو دیے۔

''یہ کیسے روپے ہیں۔'' فائزہ نے پوچھا۔

''تم بہت دن سے اپنا کوئی اچھا سا جوڑا بنانے کے لیے کہہ رہی ہو' ہیں نا۔''

''اوہ شکریہ۔'' فائزہ مسکرانے لگی۔ ''آج کیسے خیال آگیا تمہیں۔''

''خیال تو ہمیشہ رہتا ہے۔'' احسان نے جواب دیا۔ ''مگر حالات کبھی سازگار ہوتے ہیں۔ اور کبھی نہیں ہوتے۔''

''تمہارا خیال ہے کہ میں حالات خراب کرتی دیتی ہوں۔''

''میرا ایسا کوئی مطلب نہیں تھا۔ اور پلیز اب اس وقت کوئی بحث مت کرنا۔ بس ذرا جلدی سے کھانا نکال دو' مجھے بھی باہر جانا ہے۔''

''باہر کہاں۔''

''جام گڑھ اور کہاں۔''

''کل تو آئے ہو۔''

''ہاں۔ مگر یاور بیگ صاحب کا کوئی ضروری کام ہے' دوبارہ بھیج رہے ہیں۔''

''یاور بیگ بھیج رہے ہیں یا خود جا رہے ہو۔'' فائزہ کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''میں کیوں جاؤں گا!''

فائزہ کی تیوری پر بل تھے۔ ''ہر مہینے چار' پانچ چکر لگاتے ہو' کون جانتا ہے کہ یاور بیگ کے کام کی آڑ میں وہاں کیا کچھ کر رہے ہو' جام گڑھ کو بڑا رنگین شہر کہا جاتا ہے۔''

''اب تم یہ بلاوجہ کی لڑائی کا بہانہ تلاش کر رہی ہو۔'' احسان نے ٹالنے کی کوشش کی۔ ''ورنہ تم خود بھی جانتی ہو کہ میں کیا کرنے جاتا ہوں۔ بہرحال مجھے دیر ہو رہی ہے' گھر میں کچھ پکا ہو تو دے دو۔''

فائزہ اس وقت کچھ نیکی کے موڈ میں تھی کہ منہ بناتی ہوئی خاموشی سے کھانا نکال لائی۔ احسان کھانا کھانے بیٹھا تو اس نے بھی فائزہ کو بھی ساتھ کھانے کی دعوت دی' مگر فائزہ نے انکار کردیا کہ اسے بھی بھوک نہیں ہے۔ احسان نے

چپ چاپ کھانا کھایا۔ یا تو منہ دھو کر اپنا بریف کیس اٹھا کر جانے لگا۔

"اس وقت تمہیں جام گڑھی جانے کے لیے کون سی ٹرین ملے گی۔" فائزہ نے پوچھا۔

"میں ٹرین سے نہیں' ہوائی جہاز سے جا رہا ہوں۔"

"اچھا۔" فائزہ نے اسے چونک کر دیکھا۔ تھوڑا سا مسکرائی۔ "تب تو پریاور بیگ صاحب کے کام سے ہی جا رہے ہو گے۔"

"یقین آ گیا۔"

"کچھ کچھ' مگر سنو' کیا یہ ہی کپڑے پہن کر جاؤ گے۔"

"کیوں خراب ہیں۔"

"ہوائی جہاز سے جا رہے ہو۔ تو ذرا شان سے جاؤ' نیا سوٹ پہن لو۔"

"وہ میں نے عید پر پہننے کے لیے سلوایا تھا۔"

"عید میں ابھی بہت دن ہیں یاور بیگ مہربان ہوئے تو بونس دے دیں گے' دوسرا سوٹ سلوا لینا۔"

"مگر۔"

"اب تم بحث کرو گے۔" فائزہ نے آنکھیں نکالیں۔

"اچھا۔ بھئی اچھا گھر سے چلتے وقت لڑو نہیں۔" احسان نے بریف کیس اٹھایا اور خدا حافظ کہہ کر گھر سے باہر نکل گیا۔

چوراہے سے ایک تانگہ پکڑا اور اسٹیشن کی طرف چل دیا۔

ادھر وہ نظروں سے اوجھل ہوا' ادھر یاور بیگ کی سیکنڈ ہینڈ مزدا گھر کے سامنے رکی اور یاور بیگ بڑی بے تکلفی سے سیٹی بجاتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔

"تم کیسے اس وقت۔" فائزہ چونکی۔

"میں دیکھنے آیا تھا کہ تم نے احسان کو نیا سوٹ پہنایا یا نہیں۔"

"کیوں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔"

"بات بھروسے کی نہیں۔ اپنے اطمینان کی ہے۔" یاور بیگ نے جواب دیا۔ "وہ اس وقت اپنے کوٹ کے شولڈر پیڈز کے نیچے تقریباً ایک کروڑ کے ہیرے لیے جا رہا ہے۔"

"چلو پھر اب تو تم نے اپنی آنکھوں سے اسے وہ سوٹ پہن کر جاتے دیکھ لیا۔" فائزہ مسکرانے لگی۔

"ہاں۔ دیکھ لیا۔" یاور بیگ بھی ہنسنے لگا۔ "اس کے علاوہ میرے آنے کا ایک دوسرا مقصد بھی تھا۔"

"وہ کیا۔"

"بتاؤں گا' اطمینان سے بتاؤں گا۔ کیا تم ایک پیالی چائے بھی نہیں پلاؤ گی۔"

"اطمینان کی بات رہنے دو۔ اس وقت کار میں آئے ہو۔"

"تو کیا ہوا۔"

"تمہیں زیادہ دیر ٹھہرنا نہیں چاہیے۔ محلے میں بہت سی آنکھیں دیکھتی رہتی ہیں۔"

"تو دیکھنے دو۔ میں اس وقت دعوت کھائے بغیر نہیں جاؤں گا۔ چلو جلدی سے چائے بنا لاؤ۔ میں اندر کمرے میں بیٹھتا ہوں۔"

یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ ادھر تانگے میں اسٹیشن جاتے ہوئے احسان کو اچانک جہاز کے ٹکٹ کا خیال آیا۔ روپے تو اس نے بریف کیس میں رکھ دیے تھے۔ مگر فائزہ نے کوٹ کی جیب سے ٹکٹ بھی نکال کر رکھ دیا تھا یا نہیں۔ اس نے گھبرا کر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مگر ٹکٹ نہیں تھا۔ جلدی جلدی باقی دوسری جیبیں دیکھیں' رومال' قلم' سگریٹ کیس' لائٹر' فائزہ نے باقی سب چیزیں اس کوٹ سے اس کوٹ میں رکھ دی تھیں۔ مگر ٹکٹ رکھنا بھول گئی تھی۔

"بھیا....." تانگے والے' اس نے کہا۔

"واپس چلنا پڑے گا۔ میں ٹکٹ بھول گیا ہوں۔"

تانگے والے نے خاموشی سے تانگہ موڑ لیا۔

"ذرا جلدی چلو۔" احسان نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر رسول پور جانے والی ٹرین چھوٹ گئی تو میرا جہاز نکل جائے گا۔"

"فکر نہ کرو بابو جی۔" تانگے والے نے چابک لہراتے ہوئے کہا۔ "گاڑی چھوٹ گئی تو میں آپ کو اپنے تانگے میں رسول پور چھوڑ آؤں گا۔ اور خدا نے چاہا تو گاڑی سے پہلے میرا تانگہ رسول پور پہنچے گا۔"

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ گھوڑا چابک کھاتے ہی ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں احسان اپنے گھر کی گلی کے سامنے تھا۔

"بس یہیں روک لو۔" اس نے تانگے والے سے کہا۔ "ورنہ تانگہ پھیرنے میں دشواری ہو گی۔"

وہ تانگے سے اتر کر لپکتے ہوئے گلی میں داخل ہوا۔ مگر گھر کا دروازہ آنے سے پہلے ہی اس کے قدم آہستہ ہو گئے۔ یاور بیگ کی کار اس کے لیے انجانی نہیں تھی۔ یاور بیگ اسوقت میرے گھر کیوں آئے ہیں۔ اس نے سوچا' اور وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ ذہن میں طرح طرح کے پریشان کن خیالات آ رہے تھے۔ اور جو خیالات آ رہے تھے۔ وہ ان پر یقین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ احسان نے پلٹ کر کھولا اور بے آواز اندر داخل ہو گیا۔ سامنے والے کمرے سے باتیں کرنے' ہنسنے اور قہقہے لگانے کی آوازیں آ رہی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور آگے۔

"اس قدر احمق آدمی ہے۔" فائزہ کہہ رہی تھی۔ "کہ اسے آج تک ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوا۔"

"ویسے تم اس کی شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو۔" یاور کی آواز آئی۔ "میرا مطلب اپنے اور تمہارے تعلقات سے نہیں ہے۔ روزمرہ زندگی میں تمہارا اس کے ساتھ جو برتاؤ ہے۔ یہ اگر میری بیوی کا میرے ساتھ ہوتا تو میں اب تک اسے طلاق دے چکا ہوتا۔"

"میں دوسری عورتوں کی بات نہیں کرتی۔" فائزہ نے جواب دیا۔ "لیکن میں دو روٹی اور ایک جوڑے کپڑے کے عوض اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتی' جو کر رہی ہوں۔ اس کے علاوہ احسان میری زندگی کے راستے کا ایک پڑاؤ ہے۔ منزل نہیں' مجھے جلد بدیر اسے چھوڑ کر آگے بڑھنا ہے۔"

"کبھی کبھی تمہاری باتیں سن کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک چھوٹے سے قصبہ نما شہر میں رہنے والی لڑکی کے ذہن میں ایسی سوچیں کہاں سے آئیں۔"

"میری پیدائش نادر پور کی ضرور ہے' لیکن لڑکپن اور جوانی کے درمیان تقریباً بارہ سال کا عرصہ میں نے اپنے چچا کے گھر ایک بڑے شہر میں گزارا ہے۔ جہاں ہر قسم کے لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ وہیں میں نے میٹرک کی تعلیم بھی حاصل کی۔ کہنے کو میٹرک تعلیم کی ابتدائی سند ہے لیکن میں نے تیسری جماعت سے دسویں تک جو علم سیکھا ہے وہ عام لڑکیاں یونیورسٹی جا کر بھی حاصل نہیں کر پاتیں۔"

"سچ کہہ رہی ہو۔" یاور بیگ نے ایک قہقہہ لگایا۔ "اچھا۔" اب باتیں کیے جائے گی یا کچھ خاطر مدارت ہوں گی۔"

احسان نے دروازے کی باریک جھری سے جھانکا اور اس کے دماغ میں اٹھتی ہوئی آندھیوں کا زور اور زیادہ بڑھ گیا۔ غیرت و غصے کی ایک تیز لہر سی اٹھی۔ اس نے چاہا کہ اس بے وفا عورت اور اس کے شناسا کو جان سے مار دے۔ مگر وہ ایک شریف انسان تھا۔ معاملات کو اس انداز سے اسے طے کرنا نہیں آتا تھا۔ ڈگمگاتے قدموں سے

وہ واپس لوٹا گھر سے باہر آیا۔ تانگے میں بیٹھا اور ایک مشینی انداز سے کوچوان کو اسٹیشن لینے کے لیے گیا۔

اپنی اسی جذباتی کیفیت میں وہ نادر پور اسٹیشن پہنچا۔ تانگے والے کو کرایہ دے کر آگے بڑھا ہی تھا کہ تانگے والے نے پہلے اسے آواز دے کر رہ جانے والے بریف کیس کی طرف توجہ دلائی لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ برابر چلتا جارہا ہے' تو خود ہی بھاگ کر بریف کیس اس نے دے دیا۔ احسان کو اس پورے عمل کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ تانگے والے نے بریف کیس اس کے ہاتھوں میں پکڑا دیا۔ اس نے لے لیا اور اس کھوئے کھوئے انداز میں چلتے ہوئے اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوگیا۔

پلیٹ فارم پر آیا۔ ایک سبز ٹرین نوکنڈی سے رسول پور جانے والی' نادر پور کے پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ وہ اس کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور ایک خالی برتھ پر بیٹھ گیا۔ کمپارٹمنٹ میں پانچ' چھ مسافر اور بھی تھے۔ انہوں نے دلچسپی سے احسان کی طرف دیکھا۔ لیکن اسے گم صم اور بے تعلق سا پا کر انہوں نے بھی خاص توجہ نہ دی۔

تقریباً پانچ منٹ بعد انجن نے وسل دی۔ گاڑی کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اور پھر ٹرین آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی اور پھر ٹرین کے ساتھ جیسے احسان کو بھی ایک جھٹکا لگا۔ نہ جانے اتنی دیر میں اس کے دماغ میں شور مچاتی آندھیوں نے کیا کچھ تباہی مچائی تھی کہ وہ اٹھا اور کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر کھڑا ہوگیا۔ ٹرین فراٹے بھرتی چلی جارہی تھی۔ دریا کی مچلتی لہروں سے چھو کر آنے والی ٹھنڈی ہوا اس کے دل و دماغ کو سکون دینے کے بجائے اس آگ کو اور بھڑکا رہی تھی۔

ویسٹ بینک کا اسٹیشن آنے والا تھا۔ گاڑی کی رفتار پل سے گزرتے ہوئے ہلکی ہوگئی۔ مگر احسان کے ذہن میں کھولتے ہوئے لاوے کی تپش اور بڑھتی جارہی تھی۔ وہ دروازے سے فٹ بورڈ پر آ کر کھڑا ہوا اور اس سے پہلے کہ ڈبے کے مسافر اس کا اندازہ جان کر کچھ کر سکتے اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

☆☆

رات کے تقریباً گیارہ بجے کسی نے دروازے پر دستک دی۔ یادر بیگ اور فائزہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ دستک کی آواز سن کر چونک گئے۔

''اس وقت کون ہوسکتا ہے۔'' یادر بیگ نے گھبرا کر کہا۔

''میں کیا جانوں۔'' فائزہ نے جواب دیا۔ ''تم نے تو اپنے کسی آدمی کو نہیں بلایا تھا۔''

''نہیں۔ البتہ جب میں کار چھوڑنے گیا تھا تو میں نے جمشید کو بتا دیا تھا کہ میں تمہارے گھر پر ہوں۔ اگر کوئی بہت ہی ضروری بات ہو تو یہاں آجائے۔ ممکن ہے وہی آیا ہو۔''

''تم نے جمشید کو یہاں آنے کے بارے میں کیوں بتایا۔''

''اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔'' یادر بیگ نے جواب دیا۔ ''وہ میرا خاص آدمی ہے۔ وہ میرے اور تمہارے بارے میں بھی جانتا ہے' مجھ جیسا کاروبار کرنے والا اپنے آدمیوں سے رابطہ توڑ کر چند گھنٹوں کے لیے بھی غائب نہیں ہوسکتا۔ کون جانے کس وقت کیسی ایمرجنسی پیدا ہوجائے۔''

دستک پھر دہرائی گئی اور اس مرتبہ کسی نے احسان کا نام لے کر آواز بھی دی۔

''نہیں..... یہ وہ نہیں ہوسکتا۔'' یادر بیگ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''شاید احسان کا کوئی دوست ہے۔ تم جا کر دیکھو۔''

''احسان کے گنے چنے دوستوں میں سے کوئی اس وقت نہیں آسکتا۔''

''تم جا کر دیکھو تو سہی۔ ورنہ وہ دروازہ پیٹ پیٹ کر سب محلے والوں کو جگا دے گا۔'' یادر بیگ بولا۔ ''اور دیکھو' جو کوئی بھی ہو اسے یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں گھر میں موجود ہوں۔''

''تم سمجھتے ہو کہ میرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔'' فائزہ نے بگڑ کر جاتے ہوئے کہا۔

مگر دروازہ کھولنے پر اس نے جو کچھ دیکھا۔ اس کی فائزہ کو بعید ترین توقع بھی نہیں تھی۔ اس نے دیکھا کہ اتنی رات گئے دروازہ کھٹکھٹانے والا ایک پولیس آفیسر تھا۔

''یہ احسان صاحب کا گھر ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' فائزہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

''وہ گھر پر ہیں۔''

''جی نہیں۔''

''کہیں باہر گئے ہیں۔''

''جی ہاں۔ آج ہی جام گڑھ کے لیے روانہ ہوئے ہیں۔'' فائزہ نے جواب دیا۔ ''مگر آپ کون ہیں' اور آپ کو ان سے کیا کام ہے۔''

''میرا نام انسپکٹر خان ہے' اور مجھے ایک ضروری بات کہنا ہے۔ اجازت ہو تو گھر میں آجاؤں۔''

فائزہ کوئی جواب دیے بغیر پیچھے ہٹ گئی۔ انسپکٹر شیر خان اندر داخل ہوگیا اور تب صحن میں گئے ہوئے بلب کی روشنی میں فائزہ نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس دبا ہوا ہے۔ احسان کا بریف کیس۔

''یہ..... یہ بریف کیس کس کا ہے۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''آپ اسے پہچانتی ہیں۔''

''پلٹ کر دیکھا ہے۔ اگر اس پر احسان کا نام لکھا ہے تو یہ سو فیصدی میرے شوہر کا ہی ہے۔''

''جی ہاں اس پر احسان احمد کا نام لکھا ہے۔'' انسپکٹر شیر خان نے بریف کیس پلٹتے ہوئے کہا۔ ''مزید یہ کہ اس میں رکھے ہوئے کچھ کاغذات سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ آپ کے شوہر کا ہی بریف کیس ہے۔''

''مگر یہ آپ کے پاس کیسے آیا۔ اسے تو احسان صاحب اپنے ساتھ جام گڑھی لے گئے تھے۔''

''مسز احسان! اس وقت آپ اکیلی ہیں گھر میں۔'' انسپکٹر نے پوچھا۔

فائزہ بری طرح چونک پڑی' پولیس کو یادر بیگ کی موجودگی کی اطلاع کیسے ہوسکتی ہے۔ اس نے سوچا' مگر یہ صرف ایک لمحے کے لیے تھا' دوسرے لمحے اس نے غصے سے پوچھا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا۔''

''برا نہ مانیے مسز احسان!'' انسپکٹر نے نرمی سے کہا۔ ''میں کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا' یہ سوال اس لیے پوچھا تھا کہ اگر کوئی آپ کے ساتھ ہوتا تو اچھا ہوتا۔''

''میں بھی نہیں' آپ کیسی خبر لے کر آئے ہیں۔'' فائزہ نے پریشانی کا مظاہرہ کیا۔ ''احسان صاحب تو خیریت سے ہیں۔''

''احسان صاحب! نادر پور' کنڈی سے رسول پور جانے والی ٹرین میں سوار ہوئے تھے۔'' انسپکٹر شیر خان نے بڑی سنجیدگی سے ایک ایک لفظ واضح طور پر بولتے ہوئے کہا۔ ''فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں' اس ڈبے میں چھ مسافر پہلے سے موجود تھے۔ ان سب کا کہنا ہے کہ احسان صاحب بہت کھوئے کھوئے اور غمگین لگ رہے تھے۔ اردگرد کے ماحول سے بالکل بے خبر وہ ڈبے میں آئے اور دروازے کے قریب ایک برتھ پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں ٹرین چل دی۔ وہ دروازہ کھول کر کھڑے ہوگئے اور گاڑی جیسے ہی دریا کے پل پر پہنچی' انہوں نے

دریا میں چھلانگ لگادی۔ ان کی یہ حرکت اتنی اچانک تھی کہ ڈبے میں موجود لوگوں میں سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ آگے ویسٹ بینک کا اسٹیشن تھا۔ مگر وہاں کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس لیے انہوں نے نور شاہ جنکشن پر ریلوے پولیس کو رپورٹ کی اور احسان صاحب کا یہ بریف کیس جو برتھ پر رکھا ہوا تھا۔ پولیس کے حوالے کردیا۔ نور شاہ پولیس نے یہ کیس رسول پور ریفر کردیا۔ میرا تعلق رسول پور پولیس سے ہے۔''

فائزہ صرف حیران تھی۔ مگر غم اندوہ کا مظاہرہ کرنا بھی ضروری تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔ انسپکٹر شیر خان اسے چند لمحے متجسس نظروں سے دیکھتا رہا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں اسے تکلیف دہ موضوع پر آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔'' وہ بولا۔ ''مگر میرے لیے حالات جاننا ضروری ہے' میں اس کیس کی تحقیقات کررہا ہوں۔''

''کیسے حالات۔'' فائزہ نے چہرے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے پوچھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

''جنہوں نے آپ کے شوہر کو خودکشی پر مجبور کردیا۔'' انسپکٹر شیر خان نے جواب دیا۔ ''آپ بتائیں گے کہ آپ دونوں کے گھریلو تعلقات کیسے تھے۔''

''بہت خوشگوار۔'' فائزہ نے فوراً کہا۔ ''ہماری شادی کو ایک سال ہوگیا' مگر اس دوران معمولی سی شکر رنجی تک نہیں ہوئی مجھے یقین نہیں کہ احسان نے خودکشی کی ہوگی۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ کھلے دروازے سے کھڑے ہوں اور ٹرین کا جھٹکا لگنے یا پیر پھسل جانے سے گر گئے ہوں۔''

''ممکن ہے۔ ڈبے کے تمام مسافروں کا خیال اس کے برعکس ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ اگر گھر کے معاملات ٹھیک تھے تو کیا کوئی اور مسئلہ انہیں پریشان کررہا تھا۔ مثلاً کوئی معاشی الجھن یا کوئی اور المیہ حادثہ وغیرہ۔''

''اگر ایسی کوئی بات تھی تو میرے علم میں نہیں ہے۔'' فائزہ نے جواب دیا۔ ''میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ ہماری زندگی بہت خوشگوار گزر' کوئی گھریلو یا معاشی پریشانی سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔''

''بہت خوب۔'' انسپکٹر شیر خان نے کہا۔ ''تب پھر مجھے اجازت دیں اس وقت رات میں تو کچھ ممکن نہیں ہے۔ البتہ کل ہم غوطہ خوروں کی مدد سے لاش کو تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ سردست یہ بریف کیس بھی لیے جارہا ہوں' دو' چار دن میں واپس کردوں گا۔ لاش مل گئی تو آپ کو اطلاع کردی جائے گی۔ اس دوران اگر آپ کو ایسی کوئی بات یاد آجائے جو مسٹر احسان کی خودکشی کے معاملے پر روشنی ڈال سکے تو مجھے ضرور بتایئے گا۔ آپ رسول پور پولیس ہیڈ کوارٹر کے ذریعے مجھ سے رابطہ قائم کرسکتی ہیں۔''

وہ سلام کرکے چلا گیا۔ فائزہ دروازے تک اس کے ساتھ گئی۔ اور پھر اندر سے کنڈی لگا کر واپس آئی تو یاور بیرونی کمرے میں کھڑا تھا۔

''یہ کیا غضب ہوگیا اور کیسے ہوا۔'' احسان نے خودکشی کیوں کرلی۔'' اس نے کہا۔ ''چلتے وقت تم سے کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا تھا۔''

''بالکل نہیں۔ یوں چھوٹی موٹی تکرار تو ہر روز ہوتی رہتی تھی۔'' فائزہ نے جواب دیا۔

''کہیں اسے ہمارے تعلقات کا علم تو نہیں ہوگیا تھا۔''

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ کم سے کم اس کی باتوں سے تو اندازہ نہیں ہوتا تھا۔''

''ایک منٹ۔'' یاور بیگ کو ایک دم کوئی خیال آگیا۔ ''تم نے اس کے کوٹ کی جیبوں سے اس کی تمام چیزیں نکال کر نئے کوٹ میں رکھ دی تھیں۔ ایسا تو نہیں کہ کوئی چیز رہ گئی ہو۔ اور وہ اسے لینے واپس آیا ہو۔ اور ہماری باتیں سن لی ہوں۔''

''غضب ہوگیا۔'' فائزہ کو یاد آگیا۔ ''واقعی میں ہوائی جہاز کا ٹکٹ اس کی جیب سے نکالنا بھول گئی تھی۔''

فوراً کوٹ دیکھا گیا۔ اس کی اندرونی جیب میں ہوائی ٹکٹ موجود تھا۔ یاور بیگ نے سر پیٹ لیا۔

''تمہاری حماقت سے میرا ایک کروڑ کا نقصان ہوگیا۔'' وہ بولا۔ ''اس کوٹ کے ساتھ تمام ہیرے بھی دریا میں برد ہوگئے۔''

''ابھی ہوئے نہیں ہیں۔'' فائزہ نے جواب دیا۔ ''ہمیں لاش نہ مل سکی تب ضرور ہوجائیں گے۔''

''لیکن ہوجائیں تک بھی اربوں کی ہیروئن کے مقابلہ میں ان کی کیا حیثیت ہے۔ حالانکہ وہ ہیرے نہ تمہارے تھے' نہ ہیروئن تمہاری ہے' جسے گزشتہ ڈیڑھ سال سے بڑی ہوشیاری کے ساتھ تھوڑی تھوڑی کرکے جام گڑھ اسمگل کررہے ہو مسٹر شاہد خان ایکسائز انسپکٹر نادر پور۔''

یاور کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ کئی منٹ تک وہ بالکل خاموش رہا۔

''اب تو تم نے بک دیا۔'' آخر وہ بولا۔ ''لیکن آئندہ اگر یہ بات تم نے خواب میں بھی زبان سے نکالی تو میں تمہیں جان سے ماردوں گا سمجھ گئیں۔''

''سمجھ گئی۔ لیکن ذرا سے نقصان پر تم آپے سے باہر کیوں ہوجاتے ہو۔''

''یہ ذرا سا نقصان ہے۔''

''بڑا سہی لیکن ابھی بات ہمارے ہاتھ سے تو نہیں نکلی۔ ہم بھی لاش کو ڈھونڈ لیں گے اور وہ ہمیں ملے یا پولیس کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ پولیس لاش کو کپڑے اتار کر تو ہمیں نہیں دے گی۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہم بھی لاش کو تلاش کرسکتے ہیں۔'' یاور بیگ نے جوش بھرتے ہوئے کہا۔ ''مگر اس کے لیے ہمیں اس مقام کا علم ہونا ضروری ہے۔ جہاں احسان احمد دریا میں گرا ہے تم تیار ہوجاؤ۔ میں کار لے کر آتا ہوں' ہم ابھی چلیں گے۔''

''ابھی۔'' فائزہ نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں ابھی تقریباً بارہ بجے ایک ٹرین رسول پور جاتی ہے۔ ہم اس میں سوار ہوکر اندازاً اس مقام کو نشان زدہ کرلیں گے اور کل صبح ہوتے ہی تلاش شروع کردیں گے۔ میں ایسے کچھ لوگوں کو جانتا ہوں جو اس کام میں مدد کرسکتے ہیں۔''

''اچھی بات ہے لیکن تمہیں یہاں کار لانے کی ضرورت نہیں' میں ابھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ غنیمت ہوا کہ تمہاری کار یہاں نہیں تھی۔ ورنہ وہ پولیس انسپکٹر بڑا ہوشیار آدمی تھا۔ ہم براست شبہے کی زد میں آجاتے۔''

فائزہ پانچ منٹ میں تیار ہوگئی۔ دونوں گھر سے باہر نکلے۔ فائزہ نے دروازے میں قفل ڈال دیا اور دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے روانہ ہوگئے۔

یاور خان نے اپنی کار اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر ایک..... محفوظ جگہ چھوڑ دی۔ فائزہ گھر سے بغیر برقع کے نکلی تھی۔ مگر برقع اس نے بغل میں دبا رکھا تھا۔ یاور بیگ کے ساتھ اسٹیشن جاتے ہوئے اس نے برقع پہن لیا۔ آدھی رات ہونے کے باوجود نادر پور کے پلیٹ فارم پر مسافر خاصی تعداد میں موجود تھے۔ یہ رسول پور جانے والی آخری ٹرین تھی اور کسی کام سے رسول پور یا نور شاہ جانے والے لوگ عموماً اسی ٹرین کو پسند کرتے تھے۔ تاکہ وہ وقت ضائع کیے بغیر اگلی صبح ہوتے ہی اپنے کام میں لگ جاتیں۔

دس منٹ ٹرین بھی آگئی جو کم و بیش نصف گھنٹہ لیٹ پہنچی تھی۔ یاور بیگ نے پوری ٹرین کا ایک چکر لگا کر فرسٹ کلاس کا وہ ڈبہ پسند کیا جس

میں کوئی مسافر نہیں تھا۔ ان کے چڑھتے ہی ٹرین حرکت میں آ گئی۔ فائزہ برتھ پر بیٹھ گئی تھی۔ یاور بیگ کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔

''احسان کو تیرنا آتا تھا۔'' اس نے دفعتاً پوچھا۔

''معلوم نہیں۔'' فائزہ نے جواب دیا۔ ''مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو۔''

''بالفرض وہ اگر بچ گیا ہو تب۔'' یاور بیگ نے کہا۔ ''ہمارے لیے کافی مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔''

''چلتی ٹرین سے دریا میں گرنے والا بچ نہیں سکتا۔'' فائزہ زور دے کر بولی۔ ''اور میں تو سوچ رہی ہوں جو ہوا اچھا ہوا' خس کم جہاں پاک اب تم اس کے بجائے مجھے کاروبار میں شامل کر لو۔ یہ جو تم ڈیڑھ برس سے تولہ تولہ بھر ہیروئن بیچ رہے ہو۔ اس جھمیلے سے بچ جاؤ گے' میں تمہیں کوئی ایسا گاہک تلاش کر دوں گی جو ایک ہی مرتبہ ساری ہیروئن خرید لے گا۔''

''تم احمق ہو۔ میں بھی ایک ہی بار پورے مال کا سودا کر سکتا تھا۔ مگر میں نے دانستہ ایسا نہیں کیا۔ ایک ٹرک اعلا درجے کی ہیروئن غائب ہوئی تھی۔ پولیس سے زیادہ لوگ پریشان ہوں گے' جن کا یہ مال تھا اور ایسے لوگوں کے انڈر گراؤنڈ مارکیٹ میں وسیع تعلقات ہوتے ہیں۔ میں کسی کے ہاتھ بھی فروخت کرتا۔ ان کو خبر ہو جاتی' ظاہر ہے کہ میں کوئی باقاعدہ اسمگلر نہیں ہوں۔ سوچا جا سکتا تھا کہ میرے پاس اتنا مال کہاں سے آیا۔ پھر میں ان کے ایک آدمی کو قتل بھی کر چکا تھا۔ سودا کرتے ہی میں ان کی نظروں میں آ جاتا اور آدمی ایک مرتبہ قانون سے بچ سکتا ہے۔ لیکن ان نادیدہ دشمنوں سے نہیں بچ سکتا۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' فائزہ نے تائید کی۔ ''پھر بھی می ں تمہارے لیے احسان سے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتی ہوں۔''

''ارادہ کیا ہے۔'' یاور بیگ مسکرایا۔

''احسان مر چکا ہے۔ میرے راستے کی رکاوٹ خود بخود دور ہو گئی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ کیوں نہ اب شادی بھی کر لیں۔''

''شادی۔'' یاور بیگ نے ایک قہقہہ لگایا۔ ''اور وہ بھی تم سے۔''

''ہاں..... کیوں نہیں۔ مجھ میں کس بات کی کمی ہے۔'' فائزہ نے بڑے ناز سے کہا۔

''وفا کی مائی ڈیئر' وفا کی۔'' یاور بیگ کے لہجے میں طنز کا نشتر تھا۔ ''تم جیسی عورتوں کے ساتھ محبت کی جا سکتی ہے۔ عیاشی کی جا سکتی ہے۔ شادی نہیں کی جا سکتی۔ شادی تو تم نے احسان سے بھی کی تھی پھر اسے کیا دیا۔''

''ایسی باتیں مت کرو یاور بیگ۔'' فائزہ کھڑی ہو گئی۔ ''میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔''

یاور بیگ کا ہاتھ اٹھا اور چٹاخ کی آواز پورے کمپارٹمنٹ میں گونج اٹھی۔ فائزہ کا منہ پھر گیا۔

''مجھے دھمکی دے رہی ہو۔'' یاور بیگ دانت پیس کر بولا۔ ''میں چاہوں تو تمہیں یوں چٹکی میں مسل سکتا ہوں۔ یہ دوسری مرتبہ ہے کہ تم نے اپنی اوقات بھول کر بات کی ہے۔ یاد رکھنا تیسرا موقع نہیں آنا چاہیے۔''

تھپڑ کھا کر ایک لمحے کے لیے یوں لگا جیسے فائزہ بھوکی شیرنی کی طرح یاور پر ٹوٹ پڑے گی۔ مگر پھر رفتہ رفتہ اس نے خود پر قابو پا لیا' ایک ہاتھ گال پر رکھے چوٹ کی تکلیف ضبط کرتے ہوئے اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''میں..... میں شاید اپنے ہوش میں نہیں تھی۔'' وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''مجھے معاف کر دو۔''

ٹرین پوری رفتار سے رواں دواں تھی۔ یاور اپنا موڈ بدلنے کے لیے ٹرین کے باہر دیکھنے

لگا۔ جہاں چٹکی ہوئی چاندنی میں خوبصورت نظارے بڑی تیزی سے بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ فائزہ آگے بڑھی اور دروازہ کھول کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ماتھے پر سوچ کی شکنیں ابھری ہوئی تھیں۔

''میں نے انسپکٹر کی باتوں سے یہ اندازہ لگایا ہے۔'' وہ دفعتاً یاور سے مخاطب ہوئی۔ ''کہ احسان ویسٹ بینک سے کچھ پہلے اس جگہ دریا میں کودا ہے' جہاں سے ٹرین کی رفتار کم ہونا شروع ہوئی ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' یاور بیگ نے جواب دیا۔ ''وہ جگہ اب آنے والی ہے' ذرا غور سے دیکھنے اور کنارے کے حوالے سے اندازہ لگانے کی کوشش کرنا۔ کل ہمیں اسی مقام سے اپنی تلاش کا آغاز کرنا ہوگا۔''

''مگر لاش اب تو وہاں نہیں ہوگی۔ دریا کی لہروں کے ساتھ بہتی ہوئی کہیں آگے نکل گئی ہوگی۔''

''جگہ کا اندازہ ہو جائے۔ تو پانی کے بہاؤ کو دیکھ کر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ لاش کتنی دور پہنچی ہوگی۔ ہم وہاں بھی دیکھیں گے۔ ویسے بھی ممکن ہے کہ وہ دریا میں کسی چیز سے اٹک کر رک جائے یا کنارے سے جا لگے۔''

''ذرا یہاں آنا یاور بیگ۔'' فائزہ کی آواز میں دبا ہوا جوش تھا۔ ٹرین اس وقت پل پر سے گزرنے والی تھی۔

''کیا بات ہے۔'' یاور بیگ اس کے قریب آ کر بولا۔

''وہ.....'' فائزہ نے دریا میں آگے کی جانب انگلی سے اشارہ کیا۔ ''وہ اس جگہ کالی کالی کیا چیز ہے۔''

''کہاں۔'' یاور بیگ آگے بڑھتا۔

''وہ..... میری انگلی کی سیدھ میں۔''

''تم ہٹو میں دیکھتا ہوں۔ احسان کے سوٹ کا رنگ نیوی بلو تھا۔ جو دور سے وہی لگتا ہے۔''

یاور' فائزہ کو ہٹا کر خود دروازے میں کھڑا ہو گیا اور قدرے جھک کر نیچے دیکھنے لگا۔ فائزہ اسی موقع کی منتظر تھی۔ اس نے پوری قوت سے یاور بیگ کو دھکا دیا' دروازہ یاور بیگ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ پل سے ٹکرا کر فضا میں قلابازیاں کھاتا ہوا دریا میں جا گرا۔

دو' تین دن گزر گئے۔ اس دوران فائزہ نے قصبہ نوید آباد جا کر فیکٹری کا چارج سنبھال لیا۔ جمشید یاور بیگ کا خاص آدمی تھا اور اس کے تمام کاروبار سے واقف تھا۔ فیکٹری میں لپ اسٹکس تیار کرنا اس کی ذمہ داری تھی اور بھی ان میں ہیروئن بھرنا بھی اسی کی ذمہ داری تھی۔ وہ یاور بیگ اور فائزہ کے تعلقات سے بھی آگاہ تھا اور یاور فائزہ کو کچھ بھی سمجھتا ہو' مگر جمشید اسے وہی عزت دیتا تھا۔ جو مالک کی بیوی کو دینا چاہیے۔ چنانچہ جب اس نے فیکٹری جا کر اسے یہ بتلایا کہ احسان اور یاور ہیروں کا سودا کرنے جام گڑھی گئے ہیں تو اس کے بیان پر شک وشبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ بعد میں بھی فائزہ جیسی چالاک اور چرب زبان عورت کے لیے جمشید جیسے خوش اعتقاد آدمی کو مطمئن اور اپنا وفادار رکھنا کچھ زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔

تیسرے دن انسپکٹر شیر خان ایک بار پھر فائزہ سے ملنے آیا اور فائزہ نے سیاہ ماتمی لباس اور اداس چہرے سے اس کا استقبال کیا۔

''کہیے انسپکٹر کچھ پتا چلا۔'' اس نے افسردگی سے پوچھا۔

''جی ہاں میں اس سلسلے میں ایک ناگوار زحمت دینے آیا ہوں۔'' انسپکٹر کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔

''جی فرمائیے۔''

''ہمیں دریا سے ایک لاش ملی ہے۔ مگر

اسے شناخت کرنا مشکل ہے' کپڑے تار تار ہو چکے ہیں۔ مچھلیوں نے کئی جگہ سے گوشت بھی کھا لیا ہے۔ چہرہ بالکل بگڑ گیا ہے۔ کپڑے پھٹ جانے کی وجہ سے اگر جیبوں میں کچھ کاغذات تھے بھی تو اب جیبیں نہیں ہیں۔ کاغذات کیا باقی بچتے۔ اس لیے ہمارے لیے یہ کہنا ناممکن ہے کہ وہ لاش احسان صاحب کی ہے' یا کسی اور کی۔''

''تو پھر۔'' فائزہ بڑی اچھی اداکاری کر رہی تھی۔

''آپ ہماری مدد کر سکتی ہیں۔'' انسپکٹر شیر خان نے کہا۔ ''وہ آپ کے شوہر تھے۔ ممکن ہے' آپ کسی طرح کی نشانی سے انہیں شناخت کر لیں۔''

''اب اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ انسپکٹر صاحب

ممکن!

ہے وہ لاش احسان ہی کی ہو۔ ممکن ہے نہ ہو' کسی اور کی ہو' مگر اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔ لاش احسان کی نہ بھی ہو تب بھی میں ان کی زندگی کی آس تو نہیں لگائی جا سکتی۔''

''مگر ہمارے لیے فرق پڑتا ہے۔'' انسپکٹر شیر خان نے جواب دیا۔ ''اگر وہ لاش احسان صاحب کی ہے تو اس کیس کی فائل بند ہو جائے گی' اور اگر وہ لاش کسی اور کی ہے تو ایک دوسری فائل کھل جائے گی اور پولیس کے لیے معلوم کرنا ضروری ہو جائے گا' وہ لاش کس کی ہے۔''

''میں سمجھ گئی۔'' فائزہ نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔

''لاش کہاں ہے۔ مجھے وہاں لے چلو' میں شناخت کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔''

لاش نادر پور کے پولیس اسٹیشن میں تھی۔ انسپکٹر شیر خان' فائزہ کو اپنی جیپ میں وہاں لے گیا۔ وہ بظاہر بڑے حوصلے کا ثبوت دے رہی تھی۔ صرف اس وقت جب لاش کے اوپر سے چادر ہٹائی گئی۔ اس کے منہ سے ایک سسکی سی نکلی اور وہ چکرا کر گرنے لگی تھی کہ انسپکٹر شیر خان نے اسے تھام لیا اور اسے سہارا دیتے ہوئے دوسرے کمرے میں لایا۔ پانی پلایا اور پھر چند منٹ کا وقفہ دے کر پوچھا۔

''آپ نے لاش شناخت کر لی۔''

فائزہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ایک سنگدل اور خود غرض تھی' مگر اس وقت جو لاش اس نے دیکھی وہ ایسی بگڑی ہوئی حالت میں تھی کہ اس جیسی عورت بھی حواس باختہ ہو گئی تھی' اور اس کے سفید چہرے' پھٹی پھٹی آنکھوں اور کپکپاتے ہونٹوں نے اس کی اداکاری کو اور زیادہ موثر بنا دیا تھا۔ لاش کا چہرہ بلاشبہ ناقابل شناخت تھا۔ اسے اس بات میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں تھا کہ یہ لاش یاور کی ہے' اور اگر یہ لاش یاور کی تھی تو اس کے ساتھ آپ ہی آپ یہ سوال ابھرتا تھا کہ پھر احسان کا کیا بنا۔ کیا اس کی لاش مکمل طور پر مچھلیوں کی خوراک بن گئی یا وہ بہتی ہوئی کہیں اور چلی گئی کیا بنا۔ کیا اس کی لاش مکمل طور پر مچھلیوں کی خوراک بن گئی یا وہ بہتی ہوئی کہیں اور چلی گئی ہے۔

''یہ آپ کے شوہر کی لاش ہے۔'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''آپ کو یقین ہے۔''

''جی ہاں۔ یہ ان ہی کی لاش ہے۔'' فائزہ اب خود پر قابو پاتی جا رہی تھی۔

''کوئی خاص نشانی ہے' جس سے آپ اتنے یقین کے ساتھ شناخت کر رہی ہیں۔''

''ہاں...... دو نشانیاں ہیں۔'' فائزہ نے کہا۔ ''ایک تو ان کا دایاں کان بائیں کان کے مقابلے میں کافی بڑا تھا' اور دوسری وہ اپنے ہاتھ میں چھلا پہنتے تھے۔ جو کسی مرض کے سلسلے میں انہیں ایک فقیر نے دیا تھا۔ میں کان نہیں دیکھ سکی'

لیکن بائیں ہاتھ میں چھلا موجود تھا۔ بہت کم لوگ اس ہاتھ میں کوئی انگوٹھی یا چھلا پہنتے ہیں۔''

فائزہ نے بڑے اطمینان سے یاور کے شناختی نشانات بیان کر دیے۔

''آپ کا خیال درست ہے۔'' انسپکٹر شیر خان نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔ ''یہ لاش احسان ہی کی تھی۔ میں اس کے کان دیکھ چکا ہوں۔ بہت بہت شکریہ۔ آیئے میں آپ کو گھر چھوڑ دوں۔ لاش آپ کو سہ پہر تک مل جائے گی۔''

☆☆

احسان نے ایک جذباتی کیفیت سے مغلوب ہو کر دریا میں چھلانگ لگا دی تھی۔ مگر وہ پانی کی سطح کو چھونے سے پہلے بے ہوش ہو چکا تھا۔ پھر جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک آرام دہ بستر پر پایا۔ سر پر اور دو' تین جگہ پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں اور وہ خود کو بہت تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ تکلیف ضبط کرتے ہوئے اس نے اردگرد دیکھا۔ یہ ایک چھوٹا سا مگر صاف ستھرا کمرہ تھا۔ ابھی وہ حیرت سے سوچ ہی رہا تھا کہ یہاں کیسے پہنچا یہ کون سی جگہ ہے وغیرہ وغیرہ کہ دروازہ کھلا اور دو افراد کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک ادھیڑ عمر مرد اور عورت خوبصورت لڑکی اسے ہوش میں دیکھ کر ان کے چہروں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ادھیڑ عمر آدمی جلدی سے اس کی طرف لپکا۔

''خدا کا شکر یہ ہے کہ تمہیں ہوش آ گیا۔'' وہ بولا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے۔''

''میں کہاں ہوں۔''

''میرا نام عبدالستار ہے اور یہ میری بیٹی ہے' تم اس وقت میرے مکان میں ہو۔ ہم نے تمہیں دریا کے کنارے بے ہوش پڑا ہوا پایا۔ تمہارے سر اور ہاتھ پیروں میں کچھ چوٹیں بھی آئی ہیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ کوئی چوٹ خطرناک نہیں ہے۔ شاید کہیں سے گر پڑے تھے۔''

''جی جی۔'' احسان نے جواب دیا۔ ''یہ کون سی جگہ ہے۔''

''نور پور۔''

احسان نے کوئی دوسری بات نہیں کی اور آنکھیں بند کر لیں۔ عبدالستار نے بھی مزید گفتگو کی کوشش نہیں کی اور یہ کہتے ہوئے بیٹی کے ساتھ واپس چلے گئے کہ ڈاکٹر صاحب نے اسے سکون کا انجکشن دیا ہے' ابھی اسے آرام کی ضرورت ہے۔

''آؤ بیٹی چلو اسے سونے دو۔''

مزید تین' چار دن گزرنے پر احسان کو معلوم ہوا کہ عبدالستار آرمی کے کرنل ہیں۔ اس کے ساتھ وہ ایک چھوٹے موٹے زمیندار بھی ہیں۔ ان کی زمینیں ہیں۔ باغات ہیں' شکر بنانے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ ہے۔ ان کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ اولاد میں صرف ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹے کا نام سعد اور وہ رسول پور میں اپنے ماموں کے یہاں رہتا ہے اور وہیں بی اے فائنل میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ بیٹی ثناء' سعد سے دو سال بڑی ہے۔ بی اے کر چکی ہے' اور اس کے لیے کرنل صاب کسی ایسے شریف لڑکے کی تلاش میں ہیں جو ان کے ساتھ رہ سکے۔ خود آرمی میں رہ چکے تھے' اس لیے چاہتے تھے کہ بیٹا بھی فوج میں کمیشن لینے کی کوشش کرے' مگر سعد پولیس میں جانا چاہتا تھا اور اس بارے میں دونوں باپ' بیٹوں میں دوستانہ بحثیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ ڈاکٹر افتخار جو احسان کا علاج بھی کر رہے تھے۔ کرنل صاحب کے گہرے دوست تھے۔ اور کرنل صاحب ان سے اپنے گھریلو' کاروباری' معاملات میں اس طرح مشورہ کرتے تھے جیسے وہ ان کے بھائی اور گھر کے ایک فرد ہوں۔

یہ سب لوگ انتہائی شریف' مخلص اور محبت کرنے والے تھے' احسان کے ساتھ ان کا طرز عمل بہت مشفقانہ اور ہمدردانہ تھا۔

احسان کو بھی اپنے بارے میں بہرحال کچھ نہ کچھ بتانا پڑا۔ اسے فائزہ کی بے وفائی کا بے حد صدمہ تھا اور وہ اپنی سابقہ زندگی کو فراموش کر دینا چاہتا تھا' اگر وہ سب کچھ سچ سچ بتا دیتا تو ظاہر تھا کہ اسے فائزہ کا حال بھی سنانا پڑتا اور یہ اسے کسی طرح گوارا نہیں تھا۔ یوں بھی بڑے بھائی سوتیلے ہونے کی وجہ سے کچھ ایسے شفیق نہیں تھے اور فائزہ کی زبان درازی کے باعث رہے سہے تعلقات بھی کشیدہ ہو چکے تھے' احسان اپنے آپ کو دنیا میں تنہا محسوس کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے کرنل صاحب اور تمام دوسرے افراد کو یہ ہی بتایا کہ وہ دنیا میں بالکل تنہا ہے۔ والدین بچپن ہی میں ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ سوتیلے بھائی نے بی اے تک ساتھ دیا' اور پھر یہ کہہ کر دامن چھڑا لیا کہ یہاں اس کی ذمہ داری تمام ہوئی' اس نے احسان کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنا دیا ہے۔ اب احسان جانے اور اس کا کام قدرتی بات تھی کہ یہ جان کر کرنل صاحب کی ہمدردیاں اور زیادہ ہو گئیں۔ اور وہ احسان کو بیٹے کی طرح چاہنے لگے۔ اس کا کوئی ارادہ احسان سے رحمان بننے کا نہیں تھا۔ مگر تیسرے دن جب ڈاکٹر اسے دیکھنے کے لیے آئے تو انہوں نے بتایا کہ دریا سے احسان نامی لڑکے کی لاش ملی ہے۔ لاش ناقابل شناخت تھی۔ صرف اس کی بیوی ہی اسے پہچان سکی۔ بے چارہ چلتی ٹرین سے نیچے کود گیا تھا' نامعلوم کیوں۔

فائزہ کا کسی دوسرے کی لاش کو احسان کے نام سے شناخت کر لینا تو سمجھ میں آتا تھا کہ احسان اس کے راستے کی دیوار تھا۔ اب وہ اس سے آزاد ہو کر وہ یاور کے ساتھ رنگ رلیاں منا سکتی تھی۔ لیکن احسان ایک مدت تک اس الجھن میں مبتلا رہا کہ آخر وہ لاش کس کی تھی۔ جسے فائزہ نے اس کی لاش قرار دیا تھا۔ اس الجھن کا جواب اسے چار سال کے بعد جا کر معلوم ہوا۔

پندرہ' بیس روز میں احسان کے تمام زخم ٹھیک ہو گئے۔ اور وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا۔ اس شام ڈاکٹر آئے تو وہ کرنل صاحب کی حویلی کے سامنے باغ میں کرسی ڈالے اکیلا بیٹھا ہوا اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو۔ صاحبزادے۔" انہوں نے اس کے برابر دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"آئیے۔ ڈاکٹر صاحب۔" احسان نے ایک پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔ "میں اب پوری طرح تندرست ہو چکا ہوں۔ اس لیے سوچ رہا ہوں کہ مجھے آپ کا شکریہ ادا کر کے اپنی راہ لگنا چاہیے۔"

"مگر جاؤ گے کہاں۔"

"خدا کی یہ دنیا بہت وسیع ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہیں بھی چلا جاؤں گا۔"

"ایسا ہے تو پھر یہیں کیوں نہیں رہ جاتے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں پہلے ہی کرنل صاحب کے احسانات کے بوجھ سے دبا ہوا ہوں۔"

"تم چاہو تو ایک صورت نکال سکتا ہوں۔"

"وہ کیا۔"

"دیکھو بیٹے تم دنیا میں اکیلے ہو' تمہیں ایک گھر اور ایک شفیق سرپرست کی ضرورت ہے اور ستار کو ایک نیک طبیعت نوجوان کی جو ثناء کے مستقبل کا سہارا بن سکے۔ ایک سعادت مند بیٹے کی طرح ان کے ساتھ رہ سکے۔ ان ضرورتوں کا آپس میں سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" احسان حیرت سے بولا۔ "میں اپنے آپ کو ہرگز اس اعزاز کے قابل نہیں سمجھتا۔"

"تم کس قابل ہو۔ اس کا فیصلہ دوسرے بہتر کر سکتے ہیں۔" ڈاکٹر صاحب مسکرائے۔ "تم

تو صرف یہ بتاؤ کہ اگر ایسا ہو جائے تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔"

"مگر۔"

"پھر وہی' اگر مگر..... تم ایک سیدھی سی بات کا سیدھا سا جواب نہیں دے سکتے۔"

"میں کیا جواب دوں ڈاکٹر صاحب! میں تو اس خوش نصیبی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"بس تو تم تصور کرنے کی کوشش کرو۔ باقی سب کچھ میں سنبھال لوں گا۔"

ظاہر تھا کہ ڈاکٹر یہ ذکر کرنل صاحب کے پیشگی عندیہ کے بغیر نہیں چھیڑ سکتے تھے۔ مگر احسان کو اصل فکر ثناء کی جانب سے تھی' گزشتہ پندرہ' بیس دنوں میں بلاشبہ اس کا رویہ ہمدردانہ رہا تھا۔ اس کی باتوں میں اپنائیت اور لہجے میں خلوص بھی تھا۔ مگر یہ سب کچھ بربنائے انسانیت' شرافت اور مہمان نوازی بھی ہو سکتا تھا۔ محض اتفاق سے اس رات احسان کھانے کے بعد باغ میں چہل قدمی کے لیے نکلا تو کچھ دیر بعد ثناء شال لے کر آ گئی۔

"موسم سرد ہو رہا ہے' یہ اوڑھ لیں۔"

"آپ میری عادت خراب نہ کریں۔ کل جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو موسموں کے تغیرات سے اکیلے ہی نمٹنا ہوگا۔"

"مگر آپ یہاں سے جائیں ہی کیوں۔"

"یہی بات آج ڈاکٹر نے بھی کہی تھی' لیکن انہوں نے اس کے لیے جو صورت تجویز کی ہے مجھے اسے ماننے میں تامل ہے۔"

"کیوں۔" ثناء نے نظریں جھکاتے ہوئے پوچھا۔

"اس لیے کہ یہ زندگی بھر کا سودا ہوتا ہے اور میں تمہارے لیے مکمل طور پر اجنبی ہوں۔ تم میری پچھلی زندگی کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتیں۔ وہ اچھی بھی ہو سکتی ہے اور خراب بھی اور میری مشکل یہ ہے کہ میں بتا بھی نہیں سکتا۔"

"میں آپ کو جتنا جان چکی ہوں' وہ میرے لیے کافی ہے۔"

"تمہیں اس فیصلے پر کبھی افسوس تو نہیں ہوگا۔"

"اس سوال کا جواب اپنے آپ سے پوچھیں' مجھے بہرحال نہیں ہوگا۔" ثناء نے جواب دیا۔ اور جانے کے لیے گھوم گئی۔

اور یوں ثناء اور احسان کی شادی ہو گئی۔ کرنل صاحب کو اپنی زمینداری باغات اور کارخانے کی دیکھ بھال اور انتظام سنبھالنے کے لیے جس محنتی اور دیانتدار آدمی کی ضرورت تھی۔ وہ انہیں مل گیا تھا۔ احسان نے یہ تمام فرائض اس خوش اسلوبی سے انجام دیے کہ آمدنی کہیں سے کہیں پہنچ گئی اور کرنل صاحب نے اس محنت کی داد بھی دی۔ انہوں نے احسان تشکر کے کارخانے کا مالک بنا دیا۔

ہنستے کھیلتے چار سال بیت گئے۔ ایسا نہیں تھا کہ سودے میں تمام فائدہ کرنل صاحب کو ہی ہو۔ ثناء نے احسان کی زندگی بھی جنت بنا دی تھی' اسے اپنی کسی ضرورت کسی کام کے لیے زبان سے کہنا نہیں پڑتا تھا۔ ثناء اس کے مزاج' اس کی پسند ناپسند کو اس حد تک سمجھ گئی تھی کہ سب کچھ جیسے خودکار سسٹم کے تحت ہوتا چلا جا رہا تھا' ان چار برسوں میں سعد نے بھی ترقی کی کئی منزلیں طے کر لیں تھیں۔ گریجویشن کے بعد وہ کرنل صاحب کی خفگی کے باوجود اے ایس آئی کے سلیکشن میں بیٹھ گیا اور کامیاب بھی ہو گیا۔ ضروری تربیت کے بعد اس کا تقرر رسول پور میں کر دیا گیا۔ جہاں وہ اپنی انتھک محنت اور ذہانت کے باعث جلد ہی اعلا افسران کی نظروں میں آ گیا' پھر لگاتار کئی کیس حل کیے۔ نتیجہ یہ کہ جونیئر ہونے کے باوجود اسے تین سال کی مختصر مدت میں انسپکٹر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔

سعد نور پور مس ہی ایک ہفتے کی چھٹی گزار کر

آ رہا تھا۔ نور شاہ جنکشن پر وہ چائے پینے کے لیے نیچے اترا' تو اس نے فرسٹ کلاس کے ایک دوسرے کمپارٹمنٹ سے ایک نوجوان کو اترتے دیکھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک میڈیم سائز سوٹ کیس اٹھایا ہوا تھا۔ بظاہر ایسا لگتا تھا' جیسے وہ نور شاہ اترنے والے مسافروں میں شامل ہو۔ مگر اسے چائے کے اسٹال کی طرف بڑھتے دیکھ کر سعد کو حیرت ہوئی۔ کوئی مسافر اپنے سامان سمیت چائے پینے نہیں اترتا' خاص طور سے فرسٹ کلاس کا کوئی مسافر' اس کا مطلب یہ ہی ہو سکتا تھا کہ سوٹ کیس میں کوئی ایسی قیمتی چیز ہے جسے وہ نوجوان چند منٹ کے لیے بھی اپنی نظروں سے الگ کرنا گوارا نہیں کرتا۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ کوئی ناجائز چیز ہی ہو۔

لیکن سعد نے اسے چیک کرنے کا ارادہ کرلیا۔ وہ ٹھہر گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ ٹی اسٹال والے نے نوجوان کو چائے کی پیالی دے دی ہے۔ اور وہ پینے لگا ہے' تب وہ آگے بڑھا' ٹہلنے کے انداز میں چلتا ہوا۔ اسٹال پر پہنچا۔ نوجوان نے اسے آتے دیکھا۔ اور جلدی سے رخ بدل کر کھڑا ہو گیا۔ سعد نے ایک پیالی چائے طلب کی اور نگاہ جما کر اس نوجوان کو دیکھنے لگا۔ نوجوان نے جلد ہی اس کے گھورنے کو محسوس کرلیا۔ قدرے گھبرا کر اس نے پیالی کو کاؤنٹر پر رکھا۔ حالانکہ وہ ابھی نصف خالی تھی۔ پیسے ادا کیے' اور سوٹ کیس اٹھا کر ٹرین کی طرف چل دیا۔ سعد نے اسے ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں چڑھتے ہوئے دیکھا۔ اطمینان سے چائے ختم کی۔ پیسے دیے' اس کمپارٹمنٹ میں ایک دروازے سے داخل ہوا اور نوجوان کو گھورتے ہوئے دوسرے دروازے سے اتر گیا۔

پہلی خوراک کے لیے اتنا ہی کافی تھا' سعد اپنے ڈبے میں آ کر بیٹھ گیا۔ ٹرین چل پڑی' اگلا اسٹیشن رسول پور ہی تھا۔ اس کے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا۔ ٹرین کے رکتے ہی وہ تیزی سے اترا اور گیٹ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ نظر اسی کمپارٹمنٹ پر جمی ہوئی تھی۔ جس میں وہ نوجوان سوار تھا۔ اگلے لمحے سعد نے اسے چوکنا انداز میں اترتے ہوئے دیکھا۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے وہ گیٹ کی طرف بڑھا۔ دوسرے مسافروں کے پیچھے چلتے ہوئے اس نے اپنا ٹکٹ گیٹ پر کھڑے ٹکٹ چیکر کو دیا' مگر گیٹ سے گزرتے ہوئے جیسے ہی اس کی نظر سعد پر پڑی وہ گھبرا کر تیزی سے آگے بڑھا۔ سعد کو اب کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ یہ آدمی ضرور کوئی ناجائز چیز لیے جا رہا ہے۔ وہ پھرتی سے اس کے پیچھے لپکا' نوجوان نیا سے آتے دیکھا تو بھاگ کھڑا ہوا۔ مگر بھاری سوٹ کیس کے ساتھ وہ زیادہ دور نہ جا سکا تھا کہ سعد نے اسے پکڑ لیا۔

"اس سوٹ کیس میں کیا ہے۔" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں انسپکٹر صاحب' لپ اسٹکس ہیں' میں فرید سنز کاسمیٹکس کا گشتی سیلز مین ہوں اور یہ مال لے کر جام گڑھی جا رہا ہوں۔" نوجوان نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔

"اسے کھولو۔" سعد نے حکم دیا۔

نوجوان نے جیب سے چابی نکال کر سوٹ کیس کے دونوں قفل کھول دیے' اندر واقعی لپ اسٹکس بھری ہوئی تھیں۔ سعد نے ایک ڈبیا اٹھا کر کھولتے ہوئے اس میں سے ایک لپ اسٹک نکالی۔

"میں نے کہا تھا نا انسپکٹر کہ لپ اسٹکس ہیں۔"

"تمہارا نام کیا ہے۔"

"فیروز۔"

"تو فیروز تم مجھے دیکھ کر بھاگے کیوں تھے۔" سعد نے لپ اسٹک کا ہیڈ گھماتے ہوئے پوچھا۔

"ہر شریف آدمی پولیس سے ڈرتا ہے۔

میں نے سوچا پتا نہیں آپ کیوں میرے پیچھے پڑے ہیں۔ اور گھبرا کر بھاگ نکلا۔"

سعد' فیروز کو گرفتار کر کے ہیڈ کوارٹر لے گیا' اور وہاں تھوڑی سی سختی کے بعد فیروز نے سب کچھ قبول دیا۔ فوراً جام گڑھ پولیس سے رابطہ قائم کیا گیا اور ایک ساتھ ہوٹل' نیو اسٹور پر چھاپے مارے گئے اور باقی دونوں ٹھکانوں پر چھاپے مار کر متعلقہ گاہکوں کو گراں قیمت پر دیا' دوسری طرف قصبہ نوید آباد میں فرید سنز کاسمیٹکس کے دفتر اور فیکٹری پر خود سعد نے چھاپہ مارا۔ مگر فیکٹری میں کام کرتے ہوئے چند ورکرز کے سوا کوئی ہاتھ نہیں آیا۔ فیکٹری میں ہیروئن کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ ورکرز نے فیروز کے بیان کی صرف اس حد تک تصدیق کی کہ کمپنی کے مینیجر کا نام جمشید ہے اور مالک ایک عورت ہے۔ جسے جمشید بیگم صاحب کہتا ہے۔ انہیں نہ تو جمشید اور بیگم صاحبہ کی رہائش گاہوں کا علم تھا اور نہ وہ لپ اسٹکس میں ہیروئن رکھے جانے کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔ سعد نے کئی دن تک فیکٹری کی خفیہ نگرانی بھی کی' مگر مینیجر یا مالکہ دونوں میں سے کسی نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔

فائزہ اس ناگہانی آفت سے بہت چراغ پا تھی۔ اس کا پورا کاروبار تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ اتنا ہی نہیں وہ فیکٹری میں قدم بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔ جس کے نیچے بڑی فنکاری سے تعمیر کیے گئے تہہ خانے میں اس ہیروئن کا باقی حصہ محفوظ تھا۔ جو اب سے ساڑھے پانچ برس پہلے اس تہہ خانے میں پوشیدہ کر دی گئی تھی' اب بھی اس ہیروئن کا کم و بیش نصف حصہ باقی تھا۔

"میں اس کمبخت انسپکٹر کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" اس نے جمشید سے کہا۔ "تم ذرا پتا تو لگاؤ یہ انسپکٹر کون ہے۔ کہاں رہتا ہے' اور اس کی بیوی بچے یا عزیز و اقارب کون ہیں' اور کہاں ہیں۔" اور جمشید ایک ہفتے کی غیر حاضری کے بعد بڑی کارآمد چیز لے کر واپس لوٹا۔ اس نے سعد کے گھر سے ایک کینٹ سائز تصویر پر حیرانی تھی۔

"آپ اس تصویر میں سے کسی کو پہچانتی ہیں۔" جمشید نے فائزہ کو فوٹو دکھاتے ہوئے کہا۔

"احسان۔" فائزہ فوٹو دیکھتے ہی اچھل پڑی۔ "یہ ابھی زندہ ہے۔"

"بڑی شان و شوکت سے۔" جمشید نے جواب دیا۔

"اس انسپکٹر کا اس سے کیا رشتہ ہے۔"

"انسپکٹر کا نام سعد ہے۔ احسان نے اس کی بڑی بہن سے شادی کی ہے' اور وہ نور پور میں عیش کر رہا ہے۔"

"بس تو اب اس کے عیش کے دن تمام ہوئے۔" فائزہ کھڑی ہو گئی۔ "اس نے مجھے برباد کیا' میں اسے تباہ کر دوں گی۔ تم یہیں رہو' میں نور پور جا رہی ہوں۔"

ثناء اور احسان کی شادی کی چوتھی سالگرہ میں شرکت کے لیے سعد خاص طور پر صرف ایک دن کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ صبح تقریباً گیارہ بجے کا وقت تھا۔ سعد ابھی پہنچا تھا' اور وہ سب باہر باغ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک فائزہ ان کے سامنے پہنچ گئی۔

"آپ کو کس کی تلاش ہے۔" سعد نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ احسان فائزہ کو دیکھتے ہی خاموش اور سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"جی ہاں۔ میں چار سال سے اس شخص کی تلاش میں ہوں۔" فائزہ نے احسان کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ رحمان بھائی کو جانتی ہیں۔"

"رحمان۔" فائزہ نے ترشی سے کہا۔ "تو یہ یہاں رحمان بنا بیٹھا ہے۔ مگر جب اس نے مجھ سے شادی کی تھی تو یہ احسان تھا۔ دو سال تک اس نے میرے ساتھ حیوانوں سے بدتر سلوک کیا۔ پھر یہ جس کمپنی میں کام کرتا تھا۔ اس کا مالک یاور

بیگ کے ایک بڑے سودے کے لیے جب جام گڑھ جانے لگا تو حفاظت کے خیال سے اسے ساتھ لے گیا۔ اس کے پاس ایک کروڑ کے ہیرے تھے۔ مگر یہ آدمی بغلی چھری نکلا۔ اس نے چلتی ٹرین سے یاور بیگ کو دریا میں دھکا دے دیا اور خود ہیرے لے کر غائب ہوگیا۔ دریا سے ایک لاش برآمد ہوئی۔ لاش ناقابل شناخت تھی۔ میں بدبخت اسے اس شیطان کی لاش سمجھی اور رو پیٹ کر صبر کرلیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس نور پور میں ایک نیا سوانگ رچایا ہوا ہے۔ آپ میری طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نہ دیکھیے۔ پوچھیے اس آدمی سے پوچھیے' کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں۔"

"یہ عورت کیا کہہ رہی ہے رحمان۔" کرنل صاحب نے نرمی سے پوچھا۔ سب کی نظریں احسان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"میں چار سال سے آپ لوگوں کے درمیان رہ رہا ہوں۔ میرے شب و روز آپ کے سامنے ہیں۔" احسان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اگر اس مدت میں میرا کردار اس عورت کے الزامات کی تصدیق کررہا ہے۔ تب کچھ کہنے سے کچھ فائدہ نہیں' اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہے' تو اس کو دھکے مار کر نکال دیجیے۔ یہ وہ ناگن ہے جو اس گھر کی خوشیوں کو ڈسنے آئی ہے۔"

"اب تیری چرب زبانی تجھے نہیں بچا سکتی ندیم۔" فائزہ نے دانت پیستے ہوئے کہا اور سعد کی طرف دیکھا۔ "انسپکٹر صاحب! سچ جھوٹ کا فیصلہ آپ کرسکتے ہیں۔ رسول پور جاکر انسپکٹر شیر خان سے ملاقات کریں' اس چالاک آدمی نے اپنے مالک کو قتل کرنے کے بعد ایک ڈرامہ کھیلا۔ اسی ٹرین کے دوسرے کمپارٹمنٹ میں گیا اور وہاں اپنا بریف کیس چھوڑ کر مسافروں کے سامنے دریا میں چھلانگ لگادی۔ کسی کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ یاور اس کے ساتھ جام گڑھ جارہے ہیں۔ اس نے سوچا اگر یہ خودکشی کا ڈھونگ رچائے تو کوئی اس کو یاور کی موت کا ذمے دار نہیں ٹھہرا سکے گا۔

سب اسے مردہ سمجھیں گے' جبکہ یہ دنیا کے کسی بھی حصے میں ان ایک کروڑ کے ہیروں کی بدولت ایک نئی اور شاندار زندگی بسر کرتا رہے گا۔ انسپکٹر شیر خان کے پاس س کیس کی پوری فائل ہوگی۔ پھر یہ احسان ہے یا نہیں' اسے ثابت کرنے کے لیے میرے پاس...... اس کی مختلف تحریریں ہیں' جن پر اس کی انگلیوں کے نشانات لیں اور ان کا موازنہ ان کاغذات پر پائے جانے والے نشانات سے کریں' اس کی تحریر ان کی تحریر سے ملائیں۔ حقیقت خود ظاہر ہوجائے گی۔ اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لیے میں اس کے دو خط لائی ہوں' جو اس نے مختلف تاریخوں میں مجھے لکھے تھے۔"

اور اتنا کہہ کر فائزہ نے اپنے پرس سے دو لفافے نکال کر سعد کی طرف بڑھائے۔ سعد انہیں لینا چاہتا تھا کہ احسان بول اٹھا۔

"کسی موازنے کسی تصدیق کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں احسان ہوں اور یہ بھی سچ ہے کہ یہ عورت میری بیوی ہے لیکن میں نے ثناء سے شادی کرنے سے پہلے اسے طلاق دے دی تھی۔ اخبارات میں میری موت کی خبر آچکی تھی۔ اس لیے اس خیال سے کہ یہ مجھے مردہ سمجھ رہی ہوگی۔ میں طلاق نامے پر اس دن کی تاریخ ڈال کر جس دن میں نادر پور سے چلا تھا' اسے سادہ ڈاک سے اس کے پتے پر پوسٹ کردیا تھا۔ سادہ خطوط کبھی کبھی کئی برسوں کے بعد بھی ملتے ہیں۔ مجھے توقع تھی کہ طلاق نامہ ملنے کے بعد یہ یہی سمجھے گی کہ میں مرنے سے پہلے اسے طلاق دے چکا تھا۔ ہرچند یہ میری کہلائے یا مطلقہ' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا رہا۔ یاور بیگ کو قتل کرنے کا سوال تو میں نادر پور سے اکیلا روانہ ہوا

تھا۔ یاور بیگ میرے ساتھ نہیں تھا' اور ٹرین سے میں اس لیے کودا تھا کہ اس عورت نے مجھے زندہ رہنے کے لائق نہیں چھوڑا تھا۔"

"اگر آپ بے قصور تھے تو آپ نے ہم سے جھوٹ کیوں بولا۔" سعد نے تیز لہجے میں کہا۔

"میں نے جو کہنا تھا کہہ چکا' اب میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔" احسان نے گہری افسردگی سے کہا۔

"اور وہ ایک کروڑ کے ہیرے۔" فائزہ چیخی۔ "اس سے پوچھیے انسپکٹر صاحب وہ ہیرے کہاں ہیں۔"

"میں ہیروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ نہ وہ میرے پاس کبھی تھے اور نہ اب ہیں۔"

"جھوٹ بول رہا ہے' انسپکٹر صاحب یہ جھوٹ بول رہا ہے۔"

"خاتون آپ خاموش رہیں' یہ جھوٹ بول رہے ہیں یا سچ اس کی تحقیقات کرنا پولیس کا کام ہے۔" سعد نے کہا۔ "آپ ایک جرم کی رپورٹ کرچکیں اب اپنا نام اور پتا مجھے لکھوایئے اور گھر تشریف لے جایئے۔ پولیس اور قانون اپنی ذمے داری پوری کریں گے۔"

"جو حکم انسپکٹر صاحب۔" فائزہ نے اپنے بیگ سے کاغذ قلم نکال کر اپنا نادر پور کا پتا لکھا۔ "مگر اسے چھوڑیئے گا نہیں۔ اس نے جیتے جی مجھے مردوں سے بدتر کردیا ہے' جب تک اسے اپنے کیے کی سزا نہیں ملے گی مجھے چین نہیں آئے گا۔"

وہ ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ لیے گھومی اور باغ سے باہر نکل گئی۔ کرنل صاحب اور ثناء اب تک خاموش تھے۔ فائزہ کے جانے کے بعد کرنل صاحب اپنے بیٹے سے مخاطب ہوئے۔

"کیا تم اس عورت کی داستان سچ سمجھ رہے ہو۔" انہوں نے پوچھا۔

"اس کی باتیں قرین قیاس ہونے کے علاوہ اپنی تائید میں پولیس ریکارڈ بھی رکھتی ہے۔ یہ بات فوراً چیک کی جاسکتی ہے۔ اس لیے اس نے غلط نہیں کہا ہوگا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رحمان صاحب نے اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں جھوٹ بول کر اپنی پوزیشن خود خراب کرلی ہے۔ ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے میں انہیں ابھی گرفتار کرسکتا ہوں۔ لیکن اگر آپ ان کی ضمانت لیں تو میری رسول پور سے واپسی تک یہ یہاں رہ سکتے ہیں۔"

سعد اٹھ کر حویلی کی طرف چلا۔

"کہاں جارہے ہو۔" کرنل صاحب نے پوچھا۔

"جب تک میں اس واقعہ کی تحقیق نہ کرلوں چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔" سعد نے جواب دیا۔ "میں رسول پور جارہا ہوں' انسپکٹر شیر خان اب وہاں ڈی ایس پی ہیں۔"

"صاحب رحمان ہوں یا احسان' اگر ان کے بارے میں کوئی پولیس ریکارڈ ہے تو میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

احسان اور ثناء اپنے کمرے میں اکیلے تھے۔

"ساری دنیا آپ کے بارے میں کچھ بھی کہے۔" ثناء نے احسان کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"میرے لیے اسے مسترد کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ اس سے انکار کررہے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے بھی یہ مت سوچیے گا کہ کوئی مجھے آپ سے بدگمان کرسکتا ہے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ مت سوچیے گا کہ کوئی مجھے آپ سے بدگمان کرسکتا ہے اور مجھے دنیا کی بھی پروا نہیں ہے' مگر قانون کا معاملہ مختلف ہے' یہ تو ظاہر ہے کہ اس عورت نے آپ کے خلاف سازش کی ہے۔ مگر

مجھے بتایئے کہ کیا وہ عورت اتنی چالاک اور مکار ہے کہ جھوٹے سچے گواہ اور ثبوت پیش کر کے قانون کو آپ کے خلاف رائے قائم کرنے پر مجبور کردے۔''

''وہ سب کچھ کرسکتی ہے۔'' احسان نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''تب آپ کا خاموش رہنا کیا ان لوگوں پر ظلم نہیں ہے' جو آپ سے محبت کرتے ہیں۔''

''وہ عورت کچھ بھی سہی' کبھی میری بیوی تھی' میں اپنے اندر اتنا حوصلہ نہیں پاتا کہ بھری عدالت میں اس کی گندی فطرت کی نقاب کشائی کرسکوں' جبکہ میرے پاس اپنے بیان کی تائید میں کوئی ثبوت بھی نہ ہو۔''

''ہم سب مل کر سوچیں گے تو ثبوت حاصل کرنے کی راہ بھی نکل آئے گی۔ آپ کا جذبہ اپنی جگہ چاہے کتنا ہی لائق تحسین ہو' مگر جرم و بے گناہی کی پردہ پوشی کرنا شرافت نہیں' اس کی توہین ہے۔ اس کے علاوہ آپ نہیں جانتے کہ اگر آپ کو کچھ ہوگیا تو میں بھی جیتے جی مرجاؤں گی۔'' ثناء کی آنکھیں غمناک ہوگئیں۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اپنے اور تمہارے مستقبل کی سلامتی کے لیے مجھے شکوک و شبہات کے ان اندھیروں کو ختم کرنا ہوگا۔'' احسان نے ایک پھیکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

''یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نادر پور میں.....'' احسان نے اپنی کتاب زندگی کا ایک ایک ورق کھول کر ثناء کے سامنے رکھ دیا۔ ثناء نے یہ دکھ بھری آپ بیتی کرنل صاحب کے گوش گزار کردی۔ کرنل صاحب تجربہ کار جہاندیدہ انسان تھے۔ انہوں نے فائزہ کے بیان کردہ حالات کو اس داستان کی روشنی میں دیکھا۔ سب سے زوردار صورت یہ نظر آئی کہ اگر فائزہ کو کسی طرح اس سازش کے اعتراف پر آمادہ کیا جاسکے تو پھر کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوگی۔

''تم نے بتایا۔'' کرنل صاحب سوچتے ہوئے بولے۔ ''کہ فائزہ کا خیال ہے کہ جب تک اس کی وہ تصویر سلامت ہے' اس کی سلامتی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوسکتا۔''

''خیال نہیں۔ اسے پختہ یقین ہے۔'' احسان نے جواب دیا۔

''اور سلامت نہ رہنے کا مطلب بھی صرف یہ نہیں کہ شیشہ ٹوٹ جائے' بلکہ ٹوٹے شیشے کی کرچیوں سے خون نکلنا بھی ضروری ہے۔''

''اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک وہمی عورت ہے' اور اس کے وہم سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔''

کرنل صاحب نے کہا۔

''تم نے یہ بھی بتایا کہ جب تم چلنے لگے تو اس نے تم سے سوٹ بدلنے کے لیے کہا۔ یہ سوٹ کون سا تھا۔''

''یاور بیگ نے میرے کام سے خوش ہوکر بطور انعام وہ سوٹ سلوا کر دیا تھا۔''

''وہ سوٹ اب کہاں ہے۔''

''رکھا ہوا ہے ابو۔'' ثناء نے جواب دیا۔

''اسے لے آؤ۔ میرا خیال ہے ہیروں کا معمہ حل ہوجائے گا۔'' کرنل صاحب نے جواب دیا۔ یاور بیگ کے اور فائزہ کے تعلقات تھے' یاور بیگ نے سوٹ سلوا کر دیا۔ فائزہ نے وہی سوٹ پہننے پر اصرار کیا۔ اس لیے یقینی بات ہے کہ ہیرے اس سوٹ میں پوشیدہ ہیں۔

سوٹ لایا گیا تو جلد ہی یہ اندازہ سچ ثابت ہوگیا۔ اس کے دونوں شولڈر پیڈز سے تین چھوٹے بڑے ہیرے برآمد ہوئے۔ ابھی اس بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ سعد رسول پور سے واپس آگیا۔ وہ اپنی جیپ پر سوار ہوگیا تھا اور جیپ پر ہی واپس آیا تھا' وہ بڑے جوش میں نظر آرہا تھا۔

''میں نے وہ کیس فائل دیکھی۔'' اس نے

کرنل صاحب کو بتایا۔

''ندیم' احسان صاحب کی لاش کی نام نہاد دستیابی اور تدفین کے تین' چار روز بعد فرید سنز نامی کمپنی کے ایک ملازم جمشید نے رپورٹ درج کرائی تھی کہ اس کا مالک یاور بیگ کمپنی کے ایک ملازم احسان کے ساتھ کسی کاروباری سلسلے میں جام گڑھ گیا تھا' مگر وہاں نہیں پہنچا اور اب وہ دونوں غائب ہیں۔ اس کا مالک یاور بیگ کافی رقم ساتھ لے کر گیا تھا۔ اب دونوں کی پراسرار گمشدگی سے اسے شبہ ہے کہ احسان نے روپے کے لالچ میں یاور بیگ کو قتل کردیا اور رقم لے کر کہیں روپوش ہوگیا۔ انسپکٹر کو ذاتی طور پر معلوم تھا کہ احسان دریا میں کود کر مر چکا ہے' اس لیے جمشید کی رپورٹ بے بنیاد ہے' چنانچہ انہوں نے کچھ دن تک یاور بیگ کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور پتا نہ لگنے پر فائل بند کردی۔ اب جو میں نے ان سے فائزہ کے شبہات اور فائزہ کے زندہ ہونے کا حال بیان کیا تو جوش میں بھر کر بولے کہ فوراً اس شخص کو گرفتار کرلو' اس نے یقیناً یاور بیگ کا خون کیا ہے' وہ ملنے والی لاش احسان کی نہیں' یاور بیگ کی تھی۔''

''ان کا خیال بالکل غلط ہے' اصل حقیقت.....'' کرنل صاحب نے کہنا شروع کیا' مگر سعد نے انہیں روک دیا۔

''پہلے میری بات پوری سن لیں۔'' وہ بولا۔ ''شیر خان اس قدر جوش میں تھے کہ فوراً پرانی فائل نکلوائی اور بڑی توجہ سے اس کا مطالعہ کیا۔ پھر آپ جانتے ہیں کیا ہوا۔''

''کیا ہوا۔'' کرنل صاحب نے پوچھا۔

''وہ جو کسی عقلمند نے کہا کہ دروغ گو حافظہ نباشد۔''

سعد نے جواب دیا۔ ''یعنی جھوٹ بولنے والے کا حافظہ بڑا کمزور ہوتا ہے' تو اس فائل میں ایک ایسی بات درج تھی جس نے پورا معاملہ ہی الٹ دیا۔ فائزہ کو اگر یہ بات یاد ہوتی تو وہ کبھی ہرگز گڑے مردے اکھاڑنے کی کوشش نہ کرتی' مگر وہ بھول گئی کہ اس نے یاور بیگ کی لاش کو احسان کی لاش کی حیثیت سے شناخت کیا تھا۔ یہ ایک دانستہ غلطی بھی ہوسکتی تھی' لیکن اس نے اس موقع پر احسان کی شناخت کے لیے دو نشانیاں بھی بتائی تھیں' نمبر ایک اس کا بایاں کان داہنے کان سے بڑا تھا اور نمبر دو' وہ اپنے الٹے ہاتھ میں لوہے کا چھلا پہنتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ فائزہ نے جھوٹ بولا تھا' یہ دونوں نشانیاں یاور بیگ کی تھیں' وہ لاش کو شناخت کرتے وقت بھول گئی کہ یہ لاش احسان کی نہیں' یاور بیگ کی ہے' پھر اس نے اسے احسان کی لاش کیوں کہا' صرف اس لیے کہ وہ یاور بیگ کا قتل چھپانا چاہتی تھی تاکہ یاور بیگ کی لاش احسان کے نام سے دفن ہوجائے تو پھر بعد میں کوئی اس پر یاور بیگ کے قتل کا کتنا ہی یقینی شبہ ظاہر کرے' کیونکہ کسی قتل کو ثابت کرنے کے لیے پہلی ضروری بات مقتول کی لاش کا موجود ہونا ہے۔ اب ہم نے اس زاویے سے غور کیا تو معلوم ہوگیا کہ احسان بے گناہ ہے' قاتل فائزہ ہے' لیکن مشکل یہ ہے کہ شیر خان نے لاش کی شناخت کے سلسلے میں اس کی رپورٹنگ کردی تھی' چنانچہ اب وہ اس بات سے منحرف ہوسکتی ہے کہ اس نے کبھی ایسی دو نشانیاں بیان کی تھیں اور ان باتوں کے علاوہ سردست اس کے خلاف کوئی ایسا ثبوت حاصل کرنا بھی غالباً ممکن نہ ہوگا۔''

''برخوردار

!خدا

کا شکر ہے کہ اپنے جوش میں کوئی غلط قدم اٹھانے سے پہلے تمہیں احسان کی بے گناہی کا یقین ہوگیا۔ اب جہاں تک فائزہ کے خلاف ثبوت کا تعلق ہے تو یہ ثبوت خود وہی فراہم کرے گی۔''

''وہ کیسے۔'' سعد نے دلچسپی سے پوچھا۔

''تم مجھے ضروری تیاری کے لیے صرف دو

دن دو۔'' کرنل صاحب نے جواب دیا۔ ''گویا آج پیر ہے تو تم جمعرات کے روز اس کے گھر پہنچ جاؤ۔ پھر جس طرح میں تمہیں بتاتا ہوں اس طرح اپنی بات کا آغاز کرو' خدا نے چاہا تو وہ خود ہی گھبرا کر اقبال جرم کرے گی۔''

اور اس کے بعد کرنل صاحب کافی دیر تک سعد کو کچھ سمجھاتے رہے۔ سعد کی دستک کے جواب میں فائزہ نے دروازہ کھولا۔ اور اسے دیکھ کر ہونٹوں پر بڑی دل آویز مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے بولی۔

''ارے انسپکٹر صاحب آپ! آیئے تشریف لایئے۔'' وہ اسے اپنے ساتھ لیے ہوئے اندر گھر میں آگئی۔

''یہ وہی مکان ہے جس میں احسان بھی رہ چکا ہے۔'' سعد نے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''میں وہ کمرہ دیکھ سکتا ہوں جس میں احسان رہتا تھا۔''

''یہ سامنے والا کمرہ اس کا اور میرا مشترکہ تھا۔ اب یہ میری خواب گاہ ہے۔''

''تو آیئے اسی کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔'' سعد نے کہا۔

فائزہ انکار نہ کرسکی۔ کمرے میں قدم رکھتے ہوئے سعد نے سامنے دیوار پر فائزہ کی تصویر دیکھ لی تھی۔ ''کہیے آپ نے کچھ تحقیقات کی۔'' فائزہ نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ کافی پیش رفت ہوئی ہے' لیکن کسی نتیجے پر پہنچنے سے قبل میں آپ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

''پوچھیے۔ مجھے کچھ معلوم ہوگا تو بتانے سے دریغ نہیں کروں گی۔''

''آپ نے کہا تھا کہ یاور بیگ اور احسان ہیرے لے کر جام گڑھ جارہے تھے' تو کیا احسان کو اس بات کا علم تھا۔''

''یقیناً۔'' فائزہ نے جواب دیا۔ ''ورنہ وہ مجھ سے ذکر کیوں کرتا۔''

''وہ دونوں کس وقت روانہ ہوئے تھے۔''

''یہ میں کیسے بتا سکتی ہوں' احسان بہرحال مغرب کے بعد گھر سے چلا گیا تھا۔''

''احسان کے جانے کے بعد یاور بیگ یہاں آیا تھا۔''

''وہ یہاں کیوں آتا۔'' فائزہ چونک کر بولی۔

''انسپکٹر شیر خان دوبارہ پھر آئے۔'' سعد نے سرسری لہجے میں کہا۔

''لیکن جب وہ آرہے تھے تو انہوں نے آپ کو کسی کے ساتھ کار میں اسٹیشن جاتا دیکھا تھا۔''

''اوہ ہاں۔ میں یاور بیگ کے ملازم جمشید کے ساتھ وہ جگہ دیکھنے گئی تھی جہاں احسان کا ٹرین کا گرنا بیان کیا گیا تھا۔''

''اچھا جب شیر خان نے آپ کو احسان کے دریا میں گرنے کی خبر دی تھی تو آپ نے نہ یہ بتایا کہ یاور بیگ بھی اس کے ساتھ سفر کررہا تھا اور نہ یہ پوچھا کہ یاور بیگ کس کے ساتھ تھا۔''

''مجھے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے یہ سمجھا کہ یاور بیگ کی رپورٹ پر ہی پولیس کارروائی کررہی ہے۔'' فائزہ نے جواب دیا۔

''یہ تو اب اندازہ ہوا کہ یاور بیگ بے چارہ کیسے رپورٹ کرتا۔ احسان تو اسے پہلے ہی ختم کرچکا تھا۔''

''لیکن نادر پور کے اسٹیشن ماسٹر کا بیان کچھ اور ہی ہے۔''

''کیا ہے۔'' فائزہ چونکی۔

''اسٹیشن ماسٹر نے اس رات آپ کو ایک آدمی کے ساتھ ٹرین میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔'' سعد نے جواب دیا۔

''اور ان کا کہنا ہے کہ آپ کے ساتھ سفر

کرنے والا جمشید نہیں تھا۔''

''انسپکٹر صاحب۔'' فائزہ تیزی سے بولی۔ ''آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔''

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بیگم صاحبہ کہ احسان نے جس ٹرین سے دریا میں چھلانگ لگائی تھی وہ تقریباً تین گھنٹے کے بعد تم اور یاور بیگ نادر پور سے گزرنے والی ایک دوسری ٹرین میں سوار ہوئے' مگر نور شاہ جنکشن پر جب تم ٹرین سے اتریں تو یاور بیگ تمہارے ساتھ نہیں تھا' دوسرے الفاظ میں اسے ٹرین سے دریا میں گرکر ہلاک کرنے والی تم تھیں' احسان نہیں تھا۔''

''بہت خوب انسپکٹر۔'' فائزہ کھڑی ہوگئی۔ ''مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ تم اپنی بہن کے سہاگ کو پھانسی کے پھندے پر نہیں چڑھا سکتے' تم نے احسان کی جگہ وہ پھندہ میری گردن میں ڈالنے کی کوشش تو کرڈالی' مگر یہ نہیں سوچا کہ میرا یاور بیگ کے ساتھ کیا واسطہ تھا' میں اسے کیوں قتل کرتی۔''

''اس سوال کا جواب بھی میرے پاس ہے بیگم صاحبہ۔''

سعد نے سخت لہجہ میں کہا۔ ''تمہارے یاور بیگ کے ساتھ تعلقات مناسب نہ تھے' تم اپنے شریف شوہر سے بے وفائی کررہی تھیں۔ تمہیں یہ بھی معلوم تھا کہ یاور بیگ لپ اسٹک کے اندر ہیروئن بھر کر جام گڑھ میں اپنے چار اڈوں کو سپلائی کرتا تھا۔ احسان اس غیر قانونی کاروبار اور تم دونوں کے ناجائز تعلقات سے ناواقف تھا۔ یاور بیگ کے پاس کچھ ہیرے بھی تھے جنہیں وہ گاہے گاہے جام گڑھ میں گاہک میسر آنے پر احسان کے ہی ذریعے بھیجتا تھا۔ یہ ہیرے احسان کے کوٹ کے اندر چھپے ہوئے تھے اور اس کام میں تم یاور بیگ کی مددگار تھیں کہ احسان ہی کوٹ پہن کر جام گڑھ جائے' جس میں ہیرے چھپے ہوئے ہیں۔ ہیروں کا ایک بڑا گاہک ملا اور زیادہ تعداد میں ہیرے چھپانے کے لیے احسان کو ایک نیا سوٹ بنوا کر دیا گیا۔ ٹرین کے بجائے اسے ہوائی جہاز سے بھیجنے کا انتظام کیا گیا۔ یاور بیگ اسے جلد از جلد جام گڑھ پہنچانا چاہتا تھا۔ احسان دوسرا سوٹ پہن کر جارہا تھا۔ مگر تم نے اصرار کرکے اسے نیا سوٹ پہنایا اور یہ تمہاری بدقسمتی تھی کہ تم ایک کوٹ سے دوسرے کوٹ میں تمام چیزیں منتقل نہیں کرسکیں۔ ہوائی جہاز کا ٹکٹ پرانے کوٹ میں رہ گیا۔ احسان کو راستے میں اس کا احساس ہوا۔ وہ گھر واپس آیا اور اس نے تمہیں اور یاور بیگ کو قابل اعتراض حالت میں دیکھا' اس صدمے نے اس کے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا اور وہ اسی جذباتی کیفیت میں ٹرین سے دریا میں کود گیا۔ انسپکٹر شیر خان سے تمہیں اور یاور بیگ کو اس حادثے کی اطلاع ملی۔ تمہیں احسان کی موت کا کوئی دکھ نہیں ہوا' بلکہ یہ فکر ہوئی کہ ایک کروڑ کے ہیرے بھی احسان کے ساتھ ہی دریا برد ہوگئے۔ تم اور یاور بیگ فوراً وہ جگہ دیکھنے بھاگے جہاں احسان دریا میں گرا تھا' تاکہ اگلے روز اپنے طور پر اس کی لاش کو تلاش کرسکے۔ احسان کے مرنے سے تم یاور بیگ کے ساتھ عیش کرنے کے لیے بالکل آزاد ہوگئیں تھی۔ ٹرین میں تم نے اس موضوع پر گفتگو کی' مگر تم یاور بیگ کا کھلونا تھیں۔ وہ تم سے کھیل سکتا تھا۔ زندگی بھر کے لیے اپنے گلے کا طوق نہیں بنا سکتا تھا۔ اس نے تمہیں آئینہ دکھا دیا۔ دوسری طرف تمہارے لیے بھی یاور بیگ کی کوئی جذباتی حیثیت نہیں تھی۔ تم اسے طاقت و دولت کے حصول کے لیے زینے کی طرح استعمال کررہی تھیں۔ جب تم نے دیکھا کہ وہ تمہارے لیے خطرہ بن رہا ہے تو تم نے اسے فریب دے کر ٹرین سے دھکا دے دیا۔ اس کی لاش کو احسان کی لاش بنا کر اسے بیوقوف بنا کر فیکٹری اور پورے کاروبار پر قبضہ کرنا کچھ بھی مشکل نہ ہوا۔ چار سال تک تم عیش کرتی رہیں' مگر یاد رکھو' قدرت

کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں' پھانسی کا پھندا بڑی تیزی سے تمہارے طرف بڑھ رہا ہے۔''

''کمال کا ذہن پایا ہے انسپکٹر۔'' خوفزدہ ہونے کے باوجود فائزہ نے ایک جملہ لگایا۔

''کیا عمدہ کہانی سوچی ہے' مگر یہ بھول گئے کہ قانون کے فیصلے خیال باتوں پر نہیں' ثبوت و شہادتوں کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ تم میرے خلاف ایک بھی ثبوت پیش نہیں کر سکتے۔''

ابھی آخری لفظ اس کی زبان سے نکلا ہی تھا کہ ایک چھناکا ہوا۔ فائزہ نے گھبرا کر دیوار پر اس جگہ دیکھا جہاں اس کی تصویر آویزاں تھی۔ فل سائز تصویر کا شیشہ چیخ گیا تھا اور اس کے چیختے ہوئے ٹکڑوں سے خون کی بوندیں بہہ رہی تھیں۔ ایک طرف چھوٹا سا گول سوراخ تھا جسے دیکھ کر انسپکٹر سعد ہی یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ تصویر کو کسی سائلنسر لگے ہتھیار سے نشانہ بنایا گیا ہے۔

شیشے کے ٹوٹنے اور اس کے ٹکڑوں سے خون کی بوندیں نکلنے کا فائزہ پر شدید ردعمل ہوا۔ اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیل گئیں۔ چہرہ کسی ٹاش کی طرح سفید ہو گیا۔ جسم سر سے پاؤں تک کانپنے لگا۔ دفعتاً اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پکڑ لیا۔ چہرے پر انتہائی تکلیف کے تاثرات ابھرے اور وہ اسی طرح فرش پر گرتی چلی گئی۔

''قدرت کبھی کبھی اس دنیا میں بھی آدمی کو اس کے برے اعمال کی سزا دے دیتی ہے۔''

کرنل صاحب نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''فائزہ اس تصویر کو اپنی سلامتی کا ضامن خیال کرتی تھی۔ میں نے اس کے اس یقین پر ضرب لگانے کی صرف اتنا ہی کیا تھا کہ تصویر کے شیشے کا ناپ لے کر اس سائز کے دو شیشے خریدے' انہیں ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر کناروں کو سیل کر دیا۔ تھوڑی سی جگہ خالی چھوڑ دی تھی' اسکے ذریعے ذرا سا گہرا سرخ رنگ ڈالا اور شیشوں کے درمیان ویکیوم پیدا کر کے اس جگہ کو بھی بند کر دیا۔ ویکیوم کے باعث رنگ کناروں کی طرف چلا گیا اور نظروں سے چھپ گیا۔ شیشے شفاف ہو گئے' میں نے انہیں تصویر پر فریم میں فٹ کر کے لگا دیا۔ پھر جب سعد کا بیان اپنے نقطۂ عروج پر پہنچا تو سائلنسر لگی رائفل سے تصویر کو نشانہ بنا دیا۔ گولی نے ویکیوم توڑ دیا اور شیشے کے ٹکڑوں سے رنگ بہنے لگا۔ یہ اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح الیکٹرونک گھڑیوں کی پلیٹ میں کاربن بھر دیا جاتا ہے جو الیکٹرک کرنٹ کے ذریعے مختلف اعداد کی صورت میں نظر آتا رہتا ہے اور اس پلیٹ کا ویکیوم ٹوٹ جائے تو پوری پلیٹ سیاہ ہو جاتی ہے۔''

''تو کیا آپ وہاں فائزہ کے گھر میں موجود تھے۔'' ثناء نے پوچھا۔

''ہاں میں صحن میں کھڑا تھا۔ صحن کے سامنے اس کمرے کی کھڑکی ہے جس کے بالمقابل وہ تصویر آویزاں تھی۔''

کرنل صاحب نے جواب دیا۔

''ایسا لگتا تھا جیسے وہ تصویر واقعی اس کی سلامتی کی ضامن تھی۔'' سعد نے کہا۔

''یہ بات نہیں۔ جب وہ بیمار تھی تو کسی تجربہ کار فقیر آدمی نے جسے نفسیات پر بھی عبور تھا' اس تصویر کو بہانہ بنا کر اس کے ذہن میں یہ بٹھا دیا کہ جب تک تصویر سلامت ہے اسے بھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ مناسب تھا کہ اس کی صحت یابی کے بعد تصویر کو ہٹا دیا جاتا' مگر وہ اس کے ذہن میں بسی رہی' جب اس نے شیشے کے ٹکڑوں سے خون بہتے دیکھا تو اتنا شدید ذہنی دھچکا لگا کہ دل کی حرکت بند ہو گئی۔''

''مائی گاڈ' مائی گاڈ۔'' ثناء کی خوفزدہ آواز ابھری تھی۔